TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222233

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣٣٣ Accession No. ١٢٠٣١ / 12031

Author ح - ع عبدالغفور

Title حق بحق دار

This book should be returned on or before the date last marked below.

(ہزار بار خراب کر مگر تیرہ ہوا سے)

(ہزار بار سے پیشہ مگر خراب نہ کر)

مغلط

حق بحقدار رسید

1939

منشی عبدالرؤف

مصنفہ

پہلا

۱۲۰۳۱

حق بحق دار

1952
Checked 1965

مصنفہ محمد عبد الغفور صاحب مینیجر ڈیوٹی شاپ علیگڈھ

Checked 1975

پہلا باب

سلی بے ڈھنگی گھوڑا گاڑی کے تھکے ماندے گھوڑوں نے جھال آصف نگر کے ہیبت ناک بچتہ میں پر قدم ڈالے۔ اور خوفناک قیامت خیز دھماں دھماں کے شور میں پہیوں اور سموں کی آواز بالکل دب گئی۔ مصنوعی آبشار کے موّاج پانی کا شور ریل سے آنے والے مسافر کامران[1] کو نصف گھنٹے سے زیادہ عرصہ سے سنائی دے رہا تھا۔ اور اس کی بے چین آنکھیں اور تیز سماعت کان دیر سے اس عظیم الشان نمونہ آبجینیری جھال آصف نگر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ گاڑی کے پل پر آتے ہی تلاطم پانی کے قرب اور خوفناک دھماں دھماں کے اسکی

[1] کامران بی اے۔ لاہور کا مشہور سراغرسان تھا جس کا مفصل ذکر ہمارے اضافہ نسبت ذیل میں آیا ہے۔

آنکھیں اٹھتے ہوئے جھاگ دار پانی پر جھک گئیں۔ اس کا دل دھلنے لگا۔ ماہ دسمبر کی سرد شام کے کانوں کو چیرنے والے ٹھنڈے جھونکوں نے اس کے چہرے پر تھپیڑ مارے۔ گورے خوبصورت چہرے پر بدحواسی چھانے لگی۔ اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ اس ملک میں کبھی نہ آیا تھا۔ اور جھال آصف نگر کا نام اس نے محض ایک خط میں پڑھا تھا جس کی تعمیل میں لاہور سے روانہ ہو کر ریل پر روڑکی آیا۔ اور چار میل کی مسافت بکنارہ نہر گنگ طے کر کے جھال آصف نگر پر پہونچ گیا تھا۔ مگر ایسی غضب ناک جھال اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ کہ جس میں کروڑھا من پانی بے تحاشا زبردست پتھروں پر گر کر شور محشر بپا کر رہا تھا۔ آبشار کا پل ہی ایک فرلانگ سے کم لمبا نہ تھا وہ کیسی خوفناک آبشار؟ اُس کا بدن خوف سے کانپ گیا۔ اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس کے جزو رس دماغ میں جو دن رات سراغ رسانی کے بیدار رازوں میں الجھا رہتا تھا۔ اس قابل یادگار آبشار کے نظارے سے طرح طرح کے خیالات سمانے لگے جن میں سے ایک یہ تھا۔ کہ یہ موجِ آبشار اگرچہ محض ذرائع آب پاشی کو وسعت دینے کے لیے تعمیر کی تھی۔ مگر اس سے جرائم پیشہ یا کینہ پرور لوگ اپنے شکار یا حریف کو دم کے دم میں دوسری دنیا دکھلا سکتے تھے۔ بے مقدار پانی کی پیٹ ایسی زبردست تھی۔ کہ آدمی تو آدمی اُس میں ہزاروں من کے پتھر کا بھی ایک دفعہ پتہ نہ لگے۔ کیسی عجیب و غریب بات ہے۔ کہ خود ناچیز انسان کے دماغ اور ہاتھوں سے ایسی ایسی چیزیں نکلتی ہیں۔ کہ بنی نوع انسان کا زہرہ ان کے سامنے آپ مرجائے۔ ایام جہالت میں اگر قدرتی مناظر کی لاانتہا طاقت سے بے سمجھ انسان چیزوں کے وجود کو ذات باری کا ہاتھ سمجھنے لگا تھا۔ تو وہ ضرور قابل معافی تھا۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا۔ کہ آبشار کے کنارے پر اُسے بجانب جنوب اونچے گھنیرے شیشم کے درختوں کے اندر سے دو رکش کا سفید دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے خیالات آنے والی

ملاقات کی طرف رجوع ہو گئے۔ اُس نے بہ طمانیت لمبا سانس لیا۔ اور جیب سے سفید رومال نکال کر چہرے سے آبشار کے بخارات پونچھنے لگا ہیبت ناک سیاہی مائل پانی کی رو اور تر ہواؤں کی نم ناک بو ابھی تک اس کی آنکھوں اور ناک میں موجود تھی۔ گاڑی والے نے اپنی مسافت کا اختتام قریب سمجھ کر گھوڑوں کو تیز کرنے کے لئے چابک اوٹھایا۔ اور گاڑی پختہ سڑک پر مغرب سے جنوب کی طرف مڑی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور مغرب کی جانب درختوں سے ملا ہوا آسمان سرخ زردی مائل رنگ میں بڑا سہانا معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک کے آس پاس شب کو بسیرا کرنے والے پرند اپنے آرام میں گھوڑا گاڑی کی کھڑکھڑ کو خلل انداز سمجھ کر ڈر رہے تھے۔ انسان اور حیوان میں موافقت دشوار ہے۔ اسی واسطے موخر الذکر نے بستی کو چھوڑ کر جنگل اور ویرانوں میں گھر بنایا ہے گھوڑا گاڑی آبشار سے ایک فرلانگ نکلی ہو گی۔ کہ بائیں جانب کنارہ آبشار پر سُرخ اینٹوں کا خوبصورت حسن پوش بنگلہ نظر پڑا۔ جس کی عربی دیوار کی منڈیر پر شفق کی سُرخی چمک پیدا کر رہی تھی۔ بنگلہ کا احاطہ چاروں طرف پختہ چالی دار دو گز اونچی دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر سرسبز بیلیں شام کی تاریکی میں سیاہی مائل نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی آہنی پھاٹک کے اندر داخل ہو کر تھوڑی دور تک پختہ سڑک پر چلتی رہی۔ اور بنگلہ کے قریب پہونچ کر تھم گئی کوچبان نے دروازہ کھولا۔ اور کامران ہاتھ میں چمڑے کا بیگ لئے ہوئے نیچے اترا۔ گاڑی بان ابھی چھت سے بستر ہی اتار رہا تھا۔ کہ ایک بوڑھے خدمتگار نے جو غالباً کامران کی آمد سے پیشتر ہی مطلع ہو چکا تھا۔ موخر الذکر کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ کامران نے بوڑھے ملازم کو بہ نظر تعمق سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سراغ رسانی ابتدائی اصول پر چپکے چپکے غور کرتا اور زبان بند رکھنا سمجھا گیا ہے۔ جس سے کامران خوب واقف تھا۔ بوڑھے خدمتگار نے جوش و خروش میں کامران سے کہیں حصہ زیادہ تھا۔ اجنبی مہمان کے دبلے پتلے جسم کی طرف

دیتی تھی۔ کہ وہ نامحرم عورت کی طرف آنکھ ڈالے۔ مگر اس نوجوان عورت کے چہرے میں ایسی دل آویزی تھی۔ کہ وہ کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے بڑے دروازے کے پیچھے لیمپ کی روشنی میں کمرے کی طرف نظر دوڑائی لیکن خوب صورت قالین کے فرش پر دور تک پردے کھنچے ہوئے دکھلائی دیئے۔ وہ اس خیال کو دل سے نکالنے کے لئے پھر کرسی پر چڑھا۔ اور اپنا سگار سلگا کر وہ چاروں طرم کھینچنے۔ اس شغل میں ابھی اسے ایک منٹ سے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ کہ اندر سے کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ پھر اس کی نگاہ بوڑھی خادمہ پر پڑی جو اسے چھپی ہوئی جیبیں چہرے سے دیکھ کر کہہ رہی تھی "آیئے اندر تشریف لے آیئے۔ کامران اچھل کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے سگار کو ایک صندوق پر رکھ کر خادمہ کے پیچھے ہولیا۔ خادمہ نے کمرے کے اندر داخل ہو کر پھر کامران کی طرف دیکھا۔ اور وسط کمرے سے پردہ اٹھا کر کامران سے کہا "ادھر تشریف لایئے" کمرہ خوب روشن تھا۔ بائیں جانب دیوار کے وسط میں آگ تیزی سے جل رہی تھی۔ تمام کمرے میں قالین کا فرش تھا۔ اور چمکدار پردوں اور جگمگاتے ہوئے سامان سے کمرہ سجا ہوا تھا۔ انگیٹھی کے اوپر خوبصورت پرانے کلاک نے چھ بجائے۔ اور کامران خادمہ کے پیچھے غرب رویہ دروازہ سے ایک چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوا جہاں ایک کرسی سے اُٹھ کر سبز مخملی برقعہ لپٹی ہوئی مالکہ مکان نے اس کا استقبال کیا۔ اور نہایت نرم اور دل کش آواز میں بولی "تشریف رکھیئے" یہ کمرہ نہایت مختصر تھا اور چند چھوٹی چھوٹی الماریوں ایک بڑی میز اور دو تین کرسیوں کے علاوہ اس میں زیادہ سامان نہ تھا۔ الماریوں میں کتابیں تھیں۔ اور بظاہر یہ کمرہ پڑھنے کا تھا۔ کامران نے کرسی پر بیٹھ کر سب سے پہلے تو برقعہ پوش لیڈی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ چمک دار لیمپ پر گئی۔ جو سامنے کی میز پر بڑی تیزی سے جل رہا تھا۔ اس نے لیمپ کی بتی ذرا نیچے کر دی۔ جس سے کمرہ کسی قدر تاریک ہونے لگا۔ اور کامران کے دائیں ہاتھ پر گرم انگیٹھی کے اندر سرخ انگارے چمک اُٹھے۔ کامران اس

تھکا ہوا تھا۔ کہ اسے گرم انگیٹھی کے خیال سے نرم بستر اور گرم لحاف کا خیال آگیا جو اس وقت باہر کے برآمدہ میں ایک میز پر رکھے تھے۔ دنیا کی جس قدر ضروریات ہیں ان کی ضرورت انسان کو محض واقفیت سے ہوئی ہے۔ سردی کے وقت آگ کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گرمی کے وقت برف اپنا کس قدر اشتیاق پیدا کر دیتی ہے۔ اگر آگ اور برف سے انسان ناواقف رہتا۔ تو ان اشیاء میں سے کسی کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اگر کامران کو سردی اور تکان کے مارے گرم چائے اور گرم بستر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ تو یہ نوجوان میزبانہ بھی اس کے دل کے رازوں کو پڑھ رہی تھی۔ اس نے برقعہ کے اندر سے بوڑھی ملازمہ کو دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا "رحمت دیکھو چائے بنگاؤ" رحمت کے چلے جانے کے بعد ایک منٹ تک کمرے میں بالکل سناٹا رہا۔ پھر نوجوان لڑکی نے برقعہ کے اندر سے کامران کی طرف دیکھ کر کہا "آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ مگر میں آپ کی قابلیت کا اس قدر شہرہ سن چکی ہوں۔ کہ سوائے آپ کے دوسرے کو قابل مشورہ نہیں سمجھتی تھی۔ یہ الفاظ نوجوان لڑکی کے منہ سے بہت زور سے نہیں نکلے تھے۔ مگر کامران کرسی سے اُٹھا۔ اور ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا "آہستگی سے بات کیجئے" پھر دروازے سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ کہ بوڑھی ملازمہ تو نہیں سن رہی تھی۔ خادمہ اس وقت دور نکل گئی تھی۔ کامران نے چھوٹے کمرے کی چٹخنی لگا دی۔ اور کرسی پر بیٹھا ہوا کہنے لگا "مس شکیلہ ہیرنگٹن معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کی گفتگو میں مداخلت کی۔ مگر سراغرساں لوگ بڑے شکی ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ مجھ سے کہنا چاہتی ہیں میں نہیں چاہتا۔ کہ کوئی دوسرا سنے" اور یہ کہکر کامران نے غور سے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا۔ اگرچہ اس کے اور اس کے مابین برقعہ حائل تھا۔

شکیلہ ہیرنگٹن۔ کامران کے کلمہ سے کچھ بے چین ہوئی۔ پھر کہنے لگی "مگر رحمت تو میری بڑی سچی رفیق ہے۔ اس نے مجھے لڑکپن میں پالا تھا۔ کامران کے چہرے پر تبسم کے آثار پیدا ہوئے۔ اور وہ بائیں طرف منہ پھیر کر بولا۔ معزز بیگم

یہ بالکل درست ہے لیکن پہلے یہ معلوم ہو جائے۔ آیا آپ جو کچھ مجھ سے کہنا چاہتی ہیں وہ آپ کی خادمہ رحمت کے کانوں میں پڑنے کے قابل ہے یا نہیں"۔ یہ کلمہ ادا کر کے کامران نے پھر استفہامیہ نگاہ سے شکیلہ کی طرف دیکھا جو اس کی نظر سے کسی قدر جھجک گئی۔ اور اپنی میز کی دراز میں کوئی کاغذ تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں رحمت نے کیواڑوں پر دستک دی۔ کامران کی پیشانی پر ناراضی اور دل تنگی سے شکن پڑ گئی۔ مگر اس نے آہستہ سے کیواڑ کھول کر چائے کا سامان لے لیا اور سینی کو میز پر رکھ کر شکیلہ ہیرنگٹن کا شکریہ ادا کر کے ایک پیالی چائے کی اپنے لئے۔ دوسری اپنی میزبانہ کے لئے بنائی پھر ہاتھ بڑھا کر ایک پیالی شکیلہ ہیرنگٹن کے سامنے رکھ دی۔ نوجوان لڑکی نے خوبصورت صاف شفاف ہاتھوں کو برقعہ سے نکال کر چائے کی پیالی اٹھائی۔ اور چند منٹ تک دونوں ایکدوسرے سے ناواقف اپنی واقفیت اور دوستی کو چائے کی پیالیوں پر تازہ کرتے رہے جانے ختم کر کے کامران نے دوسرا سگار جیب سے نکالا۔ اور رحمت سے دیا سلائی مانگی۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے رحمت کو چائے کے برتن اوٹھا دینے کا حکم دیا۔ اور آہستہ سے کہا "مجھے کچھ ضروری باتیں مسٹر کامران سے اپنی جایداد کے متعلق کرنی ہیں۔ رحمت تم باہر کے دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ کسی دوسری خادمہ کو اندر نہ آنے دینا"۔ رحمت کے چلے جانے پر شکیلہ ہیرنگٹن تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی۔ بعد ازاں کامران کے چہرے پر نظر ڈال کر بولی "اب آپ چٹخنی بند کر دیجئے۔ میں مختصر الفاظ میں سب قصہ سنائے دیتی ہوں"۔ کامران نے چٹخنی لگا دی۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شکیلہ نے اپنی میز میں سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک کاغذ کھینچ کر آہستہ سے کہنے لگی "مسٹر کامران۔ آپ تعجب کر رہے ہونگے کہ میرا نام نصف ہندوستانی اور نصف انگریزی کیوں ہے... لیکن کامران نے مسکرا کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا "معزز بیگم میں سمجھ گیا ہوں۔ شاید آپ کے والدین میں سے کوئی فرنگی النسل تھا +

شکیلہ ہیرنگٹن جھجک گئی۔ اور میز کی طرف دیکھ کر بولی "میری والدہ آلیو ہیرنگٹن ایک معزز باپ کی بیٹی تھیں مجھے بالکل یاد نہیں وہ کب اس دنیا میں تھیں میں نے کبھی ماں کی محبت نہیں دیکھی۔ میری والدہ مجھے شیر خوار چھوڑ کر مر گئیں۔ البتہ اپنے والد مجھے خوب یاد ہیں۔ جب والد نے انتقال کیا میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ اس وقت میں سترھویں سال میں ہوئی۔ جس خاص مشورہ کے لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں اس کے لئے کوئی معاوضہ مقرر کرنے سے معذور ہوں لیکن اگر مجھے اس کام میں کامیابی ہوئی۔ تو میں ضرور آپ کی خدمت کرونگی" معاوضہ کے نام سے کامران کچھ چونکا۔ اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ہونٹوں کو پونچھ کر کچھ سوچنا شروع کیا شکیلہ ہیرنگٹن کو اندیشہ ہوا کہ شاید کامران بغیر تصفیہ معاوضہ اس کے کام کو ہاتھ میں نہ لے گا۔ اور وہ گھبرا کر بولی "مسٹر کامران آپ میرے ساز و سامان سے مجھے بڑی مالدار عورت سمجھ رہے ہونگے لیکن میں دراصل اس وقت بالکل مفلس اور مقروض ہوں۔ مگر جس کام کے لئے میں نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ روپے کے لئے ہے۔ آپ پہلے معاملہ سن لیں۔ پھر معاوضہ کی فکر کریں" کامران کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اس کے خیالات آناً فاناً اس خوبصورت غمگین چہرے پر پہونچ گئے۔ جسے وہ تھوڑا عرصہ گذرا دوسرے کمرے کے آئینے میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے فوراً گھبرا کر جواب دیا "نہیں نہیں مغرز بیگم میں معاوضہ کی فکر میں نہیں۔ بس آپ کی تقریر سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ آپ اب تک اس ساز و سامان سے کس طرح گذر کر رہی ہیں۔

بہرحال آپ اپنا ماجرا سنائیے۔ میں سردست معاوضہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرونگا۔ نوجوان لڑکی نے اطمینان کا لمبا سانس لیا جس کی آواز کامران کے کانوں تک پہونچی۔ پھر وہ لفافہ کے خط کو سامنے کھول کر گویا ہوئی "مسٹر کامران جس وقت میرے والد مرحوم مسٹر شفیع احمد نزع کی حالت میں

تھے۔ انہوں نے یہ لفافہ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ میری معصوم بیٹی رنج مت کرنا موت ہر شخص کے لئے ہے۔ میں تیری والدہ سے ملنے کو جا رہا ہوں۔ اس کاغذ کو ہمیشہ احتیاط سے رکھنا۔ تجھے دنیا میں کبھی روپے کے بارے میں تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن اپنے ستر صویں سال گرہ تک اس خط کا مضمون معلوم کرنے کی فکر نہ کرنا۔ ورنہ تو بڑی مصیبتوں میں پڑ جاوے گی۔ اس جملہ کے ادا کرتے ہی میرے والد مغفور کی روح کالبد خاکی سے پرواز کر گئی تھی۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ اور مرحوم کے کمرے میں سوائے میرے اور رحمت کے اور کوئی نہ تھا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ میں والد کے انتقال پر دنیا میں بالکل بے بس اور یتیم رہ گئی تھی۔ میری خادمہ رحمت نے بڑی دلداری اور مادری شفقت سے میری پرورش کی اسی وجہ سے میں اسے ماں کے برابر سمجھتی ہوں۔ میں نے اس خط کے مضمون پر بارہا غور کیا ہے۔ لیکن کبھی ٹھیک مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔" یہ کہہ کر شکیلہ ہیرنگٹن نے کاغذ کا پرزہ کامران کی طرف بڑھایا جس نے اوٹھ کر اُسے لے لیا۔ اور مضطرب آنکھوں سے اُسے لیمپ کے آگے پڑھنے لگا خط کے الفاظ بعینہٖ حسب ذیل تھے۔

"مشرقی برآمدہ وسطی ستون چالیس گز شرق پیپل کا درخت۔ دست راست دس گز دست چپ پندرہ گز۔ میری لاڈلی بیٹی شکیلہ ہیرنگٹن میری اصلی وارث خدا کی لعنت اس شخص پر جو شکیلہ ہیرنگٹن کو دھوکا دے"

یہ الفاظ اگرچہ بے معنی اور بے ترتیب تھے۔ لیکن کامران جیسے فہمیدہ و جہاندیدہ سراغ رساں کے دماغ نے ان کے خطاب کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور وہ مسکرا کر بولا "معزز بیگم اب آپ سب سے پہلے یہ بتلایئے۔ کہ آپ کے والد نے انتقال کے وقت کس قدر روپیہ چھوڑا تھا۔ اور کہاں۔ نیز یہ کہ آپ کے والد صاحب کس شغل میں زندگی گذارتے تھے" یہ کلمہ ادا کر کے کامران نے شکیلہ ہیرنگٹن کی جانب تکنا شروع کیا۔ ایک لمحہ بعد اس کی نگاہ

کاغذ کے پرزے پر گئی۔ اور اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف جواب کی امید میں دیکھا شکیلہ ہیرنگٹن کچھ سوچ رہی تھی۔ بظاہر اُسے بہت سے فراموش شدہ واقعات کی تلاش تھی جنہیں اس کا بے فکر لڑکپن بے پرواہی سے نظر انداز کر گیا تھا۔ لیکن عالم طفولیت کے واقعات عموماً ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ اس کے نرم گلوبے کھنگار کی آواز نکلی۔ بعد ازاں وہ نرم زبان سے اس طرح گویا ہوئی۔ "میرے والد کی حین حیات مجھے ایک پادری صاحب کی بیوہ مسز بالٹی مور اردو انگریزی پڑھانے آیا کرتی تھی۔ وہی میری ایک قسم کی محافظہ تھی۔ ایک سال گذرا مسز بالٹی مور کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے چند روز پہلے میرے والد صاحب نے پانچ ہزار روپیہ نقد اپنی تحریری ہدایات کے ساتھ مسز بالٹی مور کے ہاتھ میں دیا تھا۔ مسز بالٹی مور مجھے پچاس روپے ماہوار اخراجات ضروری کے لئے دیتی رہیں۔ بہت سا زاید روپیہ بنگلہ اور باغ کی درستی نیز میرے کپڑوں پر صرف ہوا۔ مسز بالٹی مور کے انتقال کے وقت جب میں انہیں دیکھنے رڑکی گئی۔ تو انہوں نے صرف پچاس روپے میرے ہاتھ میں پرچہ حساب سمیت دیئے۔ اور بتایا۔ کہ میرے والد کا ایک حبہ بھی اب باقی نہیں رہا تھا۔ مسز بالٹی مور کی خدمات کے اعتراف میں میرے والد نے دو ہزار روپیہ نقد مرحومہ کو عطا کیا تھا۔ علاوہ ازیں مسز بالٹی مور خوشحال عورت تھی۔ پس مجھے کامل یقین ہے۔ کہ اس نے میرے روپے کے استعمال میں ہمیشہ دیانت داری سے کام لیا۔ کامران نے اس وقت ایک نوٹ بک جیب سے نکال لی تھی۔ اور وہ کچھ باتیں قلم بند کر رہا تھا۔ اس نے نوٹ بک سے ہاتھ اُٹھا کر باطمینان جواب دیا۔ "میں بھی مسز بالٹی مور کی ایمان داری کا قائل ہوں۔ اب یہ فرمایئے۔ آپ کے والد صاحب کیا کام کرتے تھے اور آپ کی والدہ صاحبہ سے کہاں اور کس طرح شادی ہوئی۔ اپنی والدہ کے تذکرے سے شکیلہ ہیرنگٹن کچھ متغلر ہوئی۔ وہ اگرچہ انگریزی ماں کے بطن سے

ہوئی تھی۔ لیکن مسلمان باپ کی حیا و عصمت اس کے اندر موجود تھی۔ پھر بھی اس وقت سراغ رساں کے ارشاد کو کسی طرح ٹال نہ سکتی تھی۔ اور در اصل بلا تحقیقات و بلا علم واقعات گذشتہ کامران کسی طرح تحقیق نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے اُٹھ کر ایک ٹرنک کھولا۔ اور اس میں سے ایک ریشمی رومال نکال کر میز پر لائی جس کے اندر تصویروں کا البم بندھا ہوا تھا اس نے پر تقدس نظر سے دیکھتے ہوئے البم کو نکالا۔ اور چند اوراق اُلٹ کر بولی "مسٹر کامران آپ سے کوئی بات مخفی نہیں رکھی جا سکتی۔ اس البم میں میرے نانا۔ والد اور والدہ کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر پر نیچے نام لکھا ہوا ہے۔ میرے نانا کا نام ہربرٹ ہیرنگٹن تھا۔ والد کا نام شفیع احمد اور والدہ کا نام آلیو ہیرنگٹن" کامران نے تصویروں کا البم شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاتھوں سے لے لیا اور ورق گردانی کر کے ایک عورت کی تصویر پر اُس کی نگاہ جم گئی۔ جو عین شباب میں بہ لباس فاخرہ کھڑی ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی گرجا سے نکاح کرا کر آئی ہے۔ اس نوجوان عورت کی صورت سے حسن تندرستی اور تبسم ٹپک رہا تھا۔ اور اس تصویر میں ایسی آزادی اور بے فکری بھری ہوئی تھی۔ کہ ایک منٹ کے لئے کامران دنیا و مافیہا کے تردوات سے بے خبر ہو گیا۔ یہ تصویر آلیو ہیرنگٹن کی تھی۔ تصویر کے نیچے آلیو ہیرنگٹن سنہرے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں جس دلکش صورت کو کامران دوسرے کمرے کے آئینے میں دیکھ چکا تھا۔ وہ بعینہ اس تصویر کی نقل تھی۔ فرق اتنا تھا۔ کہ منکوحہ عورت کے چہرے سے آزادی اور فرحت مترشح تھی۔ اور آئینہ کے عکس میں خوبصورتی کے ساتھ ایک قسم کی پُر تاثر حیا اور کسی قسم کے غم کا پتہ لگتا تھا۔ آہ دنیا کس قدر تضاد سے مرکب ہوئی ہے جس گوشت و پوست میں آلیو ہیرنگٹن کی خوبصورتی اور بے فکری دلوں کو مسحور کر رہی تھی۔ اسی کے بطن سے شکیلہ ہیرنگٹن پیدا ہوئی تھی۔ اور گو وہ صورت ظاہر اپنی ماں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ لیکن لوں

کی خواہش و انتشارات میں کس قدر فرق تھا۔ ایک قابل باپ کے دو بچے تو ام پیدا ہوئے ہیں۔ ایک ہی خون سے نو مہینے تک غذا حاصل کرتے ہیں۔ مگر آہ ایک کسی زبردست دولت کا مالک بنجاتا ہے۔ دوسرا در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اگر یہ انقلابات دنیا میں نہ ہوتے۔ تو دنیا کے رنج اور خوشیاں قابل تذکرہ ہی نہ رہتیں۔ دوسرے صفحہ پر ایک خوبصورت پچیس سال کا مسلمان شریف زادہ تھا جس کے خط و خال میں یقیناً بلا کی خوبصورتی تھی۔ اور غالباً اسی وجہ سے اسے ایک انگلش لیڈی نے شوہر تسلیم کرنے میں عذر نہ کیا۔ یہ مسلمان نوجوان شکیلہ ہیرنگٹن کا باپ تھا۔ اس کی وضع و قطع بالکل انگریزی تھی۔ سر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ اور ڈاڑھی بالکل منڈی ہوئی تھی۔ تیسری تصویر ایک بوڑھے معزز تنومند انگریز کی تھی جس کے چہرے سے غوشحالی رعب اور شرافت پر تبسم ہونٹوں کے اندر سے دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ یہ معزز آدمی شکیلہ ہیرنگٹن کا نانا تھا۔"

کامران نے پر تبسم لہجہ میں البم کے دیگر اوراق الٹے۔ اور اسے چند دیگر تصویریں نظر پڑیں۔ ایک تصویر میں ایک نوجوان دل کش لڑکی تھی جس کے شاداب اور پر تبسم چہرے میں حیرت ناک اثر پڑا ہوا تھا۔ یہ شبیہ شکیلہ ہیرنگٹن کی تھی۔ مگر کامران کو سخت تعجب ہوا۔ کہ آئینے میں شکیلہ ہیرنگٹن اس قدر مغموم معلوم کیوں ہو رہی تھیں۔ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے برقعہ کا خیال کر کے اسے عام رسوم کی طرح تصویر میں دیکھنے سے جھجک گیا۔ اور جلدی سے دوسرے ورق پر پہونچ گیا۔ اس کی نگاہ نئی تصویر پر اچھی طرح نہ پہونچی تھی۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن نے گھبرا کر البم پر ہاتھ بڑھایا۔ اور خوف زدہ آواز میں بولی "مسٹر کامران میں پردہ کرتی ہوں آپ براہ کرم میری تصویر نہ دیکھیں۔" کامران نے حیرت زدہ خیالات سے البم جھٹ پٹ شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر اس کے دل میں آنکھوں میں ایک نوجوان آدمی کی تصویر کا ڈھانچہ تھا۔ جسے وہ اچھی طرح

سامنے نہ لاسکتا تھا۔ اس نے البم شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاتھ میں تو دیدیا مگر اس کے
سراغرس سینے میں کچھ بے کلی پیدا ہوئی۔ یہ نوجوان کون شخص تھا۔ کیا شکیلہ
ہیرنگٹن اس شخص کے چہرے سے اسے نابلد رکھنا چاہتی ہے آخر کیوں شکیلہ
ہیرنگٹن کی تصویر اور آئینے کے عکس میں اس قدر تفاوت کیوں ہوگیا تھا؟ اس کے
بے چین دل میں یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن نے اسے اپنی
طرف متوجہ کرنے کے لئے گفتگو کا سلسلہ اس طرح چھیڑا۔ مسٹر کامران۔ میرے نانا
مسٹر ہربرٹ ہیرنگٹن بڑے انجینیر اور ٹھیکہ دار تھے۔ میں نے سنا ہے۔ کہ نہر گنگ
کے سارے بڑے بڑے کام انہوں نے تکمیل کو پہونچائے اور لاکھوں روپیہ پیدا
کیا۔ میرے والد صاحب نے رڑکی کالج سے اسٹنٹ انجینیری کا امتحان بڑے
اعزاز سے پاس کیا تھا۔ اور ان کی قابلیت سے متاثر ہوکر میرے نانا صاحب نے
انہیں بطور اپنے سیکریٹری کے ملازم رکھ لیا تھا۔ میرے نانا کی عمر اُس وقت
ساٹھ سال سے متجاوز تھی۔ اور میری والدہ جن کا سن بیس اکیس سال سے
زاید نہ ہوگا۔ نانا صاحب کے انتقال پر ان کی ٹھیکہ داری بھی ختم ہوگئی۔ لیکن
میرے والد ماجد اس عرصے میں میری والدہ سے اس قدر مانوس ہو لئے تھے
اور اپنی محبت کا اعتبار ایسے زور وشور سے کرنے لگتے تھے۔ کہ اگر میرے نانا
زندہ رہتے۔ تو یقیناً ایسے گوارا نہ کرسکتے۔ اور عجب نہ تھا۔ کہ میرے والد کو بڑی اذیت
پہونچاتے۔ مگر اُن کے انتقال پر میری والدہ کو بڑی آسانیاں مل گئیں۔ اور
واقفیت کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ میرے والد اور والدہ میں باہم دگر تعشق پیدا ہوگیا۔ اور
چند ہی ماہ بعد دونوں نے شادی کرلی۔ مجھے معلوم نہیں۔ کہ میری والدہ
کی دولت کہاں گئی۔ والد صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ یہ سب روپیہ ایک
بینک میں جمع ہے۔ اور مجھے اُس وقت ملے گا جب میری عمر کا سترھواں سال
ختم ہوگا۔ مگر بڑے تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ والد صاحب نے کوئی وصیت نامہ
نہیں چھوڑا۔ اور مجھے قطعی علم نہیں۔ کہ روپیہ کون سے بینک میں ہے۔ اور کتنا

ہے۔" یہ کہہ کر مس شکیلہ خاموش ہو گئی۔ گویا وہ اپنی گفتگو ختم کر چکی جس پر کامران نے جو اس گفتگو کے جملہ ضروری نکات اپنی نوٹ بک میں درج کرتا جاتا تھا سر اٹھا کر مس شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھا۔ اور ایک مردانہ وار لہجہ میں کہا۔ کہ معزز خاتون میرے خیال میں آپ کے والد کثیر دولت چھوڑ گئے ہیں۔ اور وہ سب آپ کو مل سکے گی۔ اس پرزہ کاغذ سے یہ پتہ لگتا ہے۔ کہ آپ کے والد نے ذاتی حیلہ سازی برت کر آپ کے رشتہ داروں یا دوستوں کو روپے کی بو سے دور رکھا ہے لیکن میرے خیال میں روپیہ آپ کے احاطہ میں موجود ہے۔ اور جس پیپل کے درخت کا اس خط میں ذکر ہے۔ وہ بڑے رہنما کا کام دیگا۔ البتہ ..... اس موقعہ پر کامران لیکن اپنی تقریر میں رک گیا کیونکہ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن نے زور سے میز کو پکڑا۔ اور وہ آگے جھک گئی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے شکیلہ ہیرنگٹن کے منہ سے "پیپل کا درخت" سنائی دیا۔ اُس نے متعجب ہو کر اس کی طرف استفہامیہ نظر ڈالی۔ جس کے بعد مس شکیلہ ہیرنگٹن گھبرا کر بولی "پیپل کا درخت تو ہمارے احاطہ میں کوئی بھی نہیں۔ اس خط میں شاید ابا جان نے کچھ غلطی کی۔ البتہ شرقی برآمدہ کی طرف جہاں اب باغ ہے۔ چند درخت ببول کے تھے مگر وہ سب باغ لگاتے وقت علیحدہ کر دیئے گئے۔" ببول کے درختوں اور ان کی علیحدگی کا حال سنکر کامران کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوا۔ اور گھبرا کر کہنے لگا "آہ پیاری لیڈی۔ یہ کیا غضب کیا مجھے ڈر ہے۔ کہ شاید تم نے ساری دولت برباد کر دی۔ شکیلہ ہیرنگٹن بھی گھبرا کر کرسی سے اُٹھ گئی۔ اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی جس سے گویا کامران کے دور رس دماغ کو مہمیز لگی۔ اس کے دل میں اچانک کوئی نیا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے گھبرا کر پھر اس پرزہ کاغذ کو لیمپ کے آگے کر کے دیکھنا شروع کیا۔ اس کا چہرہ حیرت سے مسخ ہو گیا اور وہ پیشانی پر بل ڈال کے بولا۔ مس شکیلہ ہیرنگٹن تم نے اس پرزہ کاغذ کو

پہلے کسی دوسرے شخص کو دکھایا ہے" شکیلہ ہیرنگٹن ایک ہاتھ سے میز کا سہارا لے کر کرسی پر بیٹھنے لگی۔ اور آہستہ سے بولی" نہیں میں نے کبھی کسی شخص کو نہیں دکھایا" کامران کے چہرے پر اضطراب کی علامات پیدا ہوئیں۔ اُس نے تیزی مگر احتیاط سے موٹے کاغذ کے خط کو لیمپ کے سامنے کیا۔ اور جیب سے ایک چھوٹی سی خوردبین نکال کر اُس خط کو بغور پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک لمحہ کی بات تھی۔ کہ اس نے اپنے سر سے ترکی ٹوپی اتار کر میز پر رکھدی۔ اور سر کھجا کر بولا مس شکیلہ تم مجھ جیسے تجربہ کار سراغ رساں کو دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے۔ اس خط میں پہلے ببول کا درخت لکھا ہوا تھا کسی شخص نے اسے چاقو سے چھیل کر پیپل کا درخت بنایا ہے۔ جب تک آپ مجھے اُس شخص کا نام نہ بتلادیں گی جس کی تصویر اس البم کے آخری ورق پر ہے اس وقت تک میں تمہارا کام اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ خیر اب میرے قیام کا بندوبست کیجئے۔ میں اس وقت بہت تھکا ماندہ ہوں۔ ان واقعات کا کسی سے ذکر نہ کیجئے۔ اور رحمت کو بلا کر حکم دیجئے۔ کہ مجھے کوئی کمرہ شب کے لئے بتلادے کیونکہ تکان اور نیند کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے"

دوسرا باب

اے مقدس باپ میری مدد کر

رات کے دس بجے ہونگے۔ ماہ دسمبر کی سرد یخ رات ساری کائنات کو سردی اور تاریکی میں جکڑتی جا رہی تھی۔ خوب صورت شکیلہ ہیرنگٹن کا بنگلہ اندر سے گرم اور آرام دہ تھا۔ مگر باہر چپہ چپہ پر بے رونقی اور یخ بستہ ہوائیں مسلط ہو رہی تھیں۔ اندھیری رات میں خوبصورت بنگلہ اور اینٹ اور پتھروں کا ایک سیاہ ہیولہ ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ بنگلہ کے دو تین دودکش سیاہ سیاہ دھواں نکال رہے تھے۔ مگر تاریک شب کی سیاہی میں یہ دھواں بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ نیلے آسمان پر سفید نقرئی ستارے رنگ بدل رہے تھے۔ اور اشرف المخلوقات انسان کی بے بسی اور کمزوری پر ہنس رہے تھے۔ جو سردی کی تکلیف سے آگ کی طرف اور گرمی کی مصیبت سے پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ بنگلہ کا پھونس۔ درخت اور پھول پھل سردی سے کانپ رہے تھے۔ ہوا کی شاں شاں جو کسی دوسرے مقام پر تکلیف دہ ہو جاتی۔ یہاں آبشار آصف نگر کی وہاں وہاں سے جو زندہ ہو کر شعلہ کے کولوں سے لپٹ جاتی تھی۔ مالکہ مکان رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں آگ کے سامنے شکم سیری کر رہے تھے۔ کامران کے قیام کے لئے اس کے حسب مرضی شرقی برآمدہ کی طرف جنوب رویہ مختصر سا کمرہ خالی کر دیا گیا تھا جس میں اس وقت ایک مدھری اور تیز روشنی کی دیوار گیری کے سوا زیادہ سامان نہ تھا۔ کمرے میں دری کا فرش بچھا ہوا تھا۔ کامران نے اپنا بستہ

ایک کرسی پر رکھ دیا۔ اور روپیہ پیسہ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھکر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بھاری اوورکوٹ اس کے سرہانے لکڑیوں کی کھونٹیوں پر ٹنگا ہوا تھا۔ بیگ کے اوپر اس کی ترکی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ بظاہر کمرہ کچھ زیادہ پر تکلف اور آرام دہ نہ تھا۔ مگر اس ساز و سامان کی حقیقت کوئی ان لوگوں سے پوچھتا۔ جو اس سردی اور تاریک رات میں وسیع و مرتفع گیرۂ آسمان کے نیچے محض درختوں کے سایہ کو جائے پناہ بنا کر پھٹے پرانے کپڑوں میں ٹھٹھرکر پڑے ہوئے آہ و بکا کر رہے تھے۔

دنیا میں کروڑوں آدمی دن رات اپنے مقدر کی شکایت کرتے رہتے ہیں اور حالت موجودہ پر کبھی قانع نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لئے مناسب ہے۔ کہ وہ کبھی اپنے مصائب و شکایات کا دوسروں کی حالت سے موازنہ کریں پھر وہ لاریب اپنی زندگی کو بدرجہا خوشگوار پائیں گے۔ اور کفران نعمت کے وبال سے بچیں گے۔ کامران گو نئی روشنی کے تمدن اور لوازم زندگی سے خوب واقف تھا لیکن اس نے جب سے سراغ رسانی کا کام اختیار کیا۔ اس وقت سے آرام طلبی کو بالائے طاق رکھدیا تھا۔ اور وقت بے وقت ہر طرح گذر کرنی سیکھ چکا تھا۔ چنانچہ اس وقت آرام دہ بستر پر لیٹ کر گرم لحاف اوڑھ لینے کے بعد اسے اپنی حالت پر پوری طرح قناعت تھی لیکن پھر بھی اس کا دماغ خیالات سے خالی نہ تھا۔ مثل مشہور ہے۔ کہ بیس کے دماغ میں کوئی بات سوچنے کے قابل نہ ہو۔ وہ شخص بے فکر کہلا سکتا ہے۔ لیکن بے فکری انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دماغ دراصل سوچنے ہی کے لئے بنا ہے دنیا کے مختلف واقعات اطوار میں نئے نئے کام انسانی دماغ کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ بھوکا آدمی روٹی کی سوچتا ہے۔ شکم سیر آدمی بیہودگی پر دوڑتا ہے۔ ایک ناول نویس قصہ گوئی کے واسطے واقعات تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح سراغرساں اپنے شکوک و شبہات میں مستغرق رہتا ہے۔ کامران

کو لحاف سے منہ ڈھانکے دو تین منٹ ہی گذرے ہونگے۔ کہ اُسے اپنے دماغ کے سامنے ایک زبردست معمہ معلوم ہوا جس کے متعلق وہ ابھی نوجوان شکیلہ سے گفتگو کر کے آیا تھا۔ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کو اس کی جائداد کے متعلق مشورہ دینے آیا تھا لیکن اس بات کا اسے ذرا بھی علم نہ تھا۔ کہ وہ ایسے نامدار آدمی کی بیٹی ہے۔ نیز اب سب سے زیادہ بوجھ اس کے دل پر ان شبہات کا تھا جو اُس خط کے اندر پیپل اور ببول کے درختوں کی الجھن سے پیدا ہو گئے۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے اُسے صاف طور پر مطلع کر دیا تھا۔ کہ پیپل کا کوئی درخت اس بنگلہ کے احاطہ میں نہ تھا۔ اور صاف ظاہر ہے۔ کہ ببول کے درخت اُکھاڑ کر جب چمن لگایا گیا۔ تو سارا دفینہ دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں جا پڑا۔ اگرچہ کامران کو اس وقت اس امر کا علم قطعی نہیں تھا۔ کہ ببول کے درخت کب کاٹے گئے۔ اور دفینہ کس طرح خورد برد ہو گیا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن نے دو تین چھوٹی چھوٹی باتوں سے اس کے شبہات کو مستحکم کر دیا۔ سب سے پہلی وجہ تو شبہ کی یہ تھی۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن نے کامران کو وہ تصویر نہ دیکھنے دی۔ جو البم کے آخیر میں تھی۔ اور جو ہلکی جھلک اُس کی کامران نے دیکھی۔ اس میں وہ کسی مرد کی معلوم ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ شکیلہ نے کامران کے استفسار پر اسے یقین دلایا۔ کہ اس کے والد کی تحریر کسی اور شخص نے نہیں دیکھی۔ حالانکہ کاغذ میں "پیپل" کا درخت چلی ہوئی جگہ پر لکھا ہوا تھا تیسرا سبب شبہ کا یہ تھا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن جیسی کم سن حسین لڑکی کا جنگل بیابان میں تن تنہا رہنا اس کے لئے کسی طرح قابل اطمینان نہ تھا۔ کیا معلوم اس عرصے میں اس کی کتنے نوعمر لوگوں سے واقفیت یا دوستی ہوئی۔ اور ان میں سے کس نے اُسے دھوکا دیا۔ کامران کو شکیلہ ہیرنگٹن کے چال چلن کی نسبت کچھ بدگمانی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسا معصوم و غمگین چہرہ جیسا وہ آئینے میں دیکھ چکا تھا۔ بدچلنی کا مرتکب نہیں ہو سکتا

لہٰذا اس بات کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔ اور اس کا دنیاوی تجربہ غالباً اُسے زیادہ دیر دھوکے میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر سب سے زیادہ اُلجھن اُسے یہ تھی۔ کہ جس شخص کی تصویر شکیلہ ہیرنگٹن نے اُس سے چھپائی۔ وہ بظاہر اس کا عاشق یا دوست ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا۔ کہ جن وجوہ سے شکیلہ ہیرنگٹن اس شخص کے حسب و نسب کو مخفی رکھنا چاہتی ہے وہی وجوہ غالباً دفینہ اور اُس پُراسرار خط کے معاملہ پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گی۔ یہ بات بالکل ناممکن تھی۔ کہ اس کا خیال بالکل غلط ہو۔ ممکن سراغ رساں لوگ ایک اصول کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور اس سے اپنی تحقیقات کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ اس اصول کے مطابق یہ شتبہ آدمی اس کی تحقیقات کا نشانہ بن سکتا تھا۔ اور اس شخص سے نبٹ کر وہ دوسروں پر شبہ کرنے کی وجوہ ٹٹول سکتا تھا۔ سردست اس کے سامنے یہی شاہراہ آپڑی تھی اور اسی پر چلنا ضروری تھا۔ اس معرکہ کے انکشاف کے لئے اُسے بڑا میدان مل سکتا تھا۔ اور اس کا رکن دماغ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا تھا۔ ان خیالات کے ساتھ ہی یہ بھی قیاس ہو سکتا تھا۔ کہ دفینہ کو شاید اب تک کسی نے نہ چھیڑا ہو۔ اور کیکر کے درخت یونہی جگہ صاف کرنے کے لئے کاٹے گئے ہوں۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھکر اُس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن سے جب تک دیگر حالات نہ معلوم ہو جائیں۔ کوئی عملی قدم اس معاملہ میں آگے نہ بڑھایا جاوے جس کمرے میں کامران مقیم تھا اس سے شکیلہ ہیرنگٹن کا ریڈنگ روم بالکل قریب تھا۔ لیکن ریڈنگ روم کی کھڑکیاں اندر کی جانب سے بند تھیں۔ ریڈنگ روم سے ملا ہوا کمرہ بجانب شمال غسلخانہ تھا۔ اور اُس کے مشرق میں شکیلہ ہیرنگٹن کا مکلف استراحت خانہ تھا۔ دنیا کی تہذیب کیا ہے؟ گذشتہ زمانہ کے مراسم کی اصلاح۔ کسی زمانہ میں انسان جنگلوں کی غاروں میں رہتا تھا۔ پھر اُس نے مکان بنانا

سیکھا۔ مکانات کی اصلاحات کے ساتھ دیگر لوازم میں تبدیلی واقع ہوئی موجودہ زمانہ تغیرات کا ہے۔ اسباب راحت و آسائش کی بہم رسانی میں جتنی ترقی اقوام متمدنہ نے آج کل کی ہے۔ اس کی مثال تاریخ کے کسی دور میں نہیں مل سکتی شکیلہ ہیرنگٹن ایسے باپ کی بیٹی تھی جس کے گھر میں انگریزی بیوی رہ چکی تھی۔ لہذا یہ امر ذرا بھی حیرت انگیز نہ تھا۔ کہ اس بنگلہ کے جملہ ساز و سامان کی ہر چیز اعلے درجہ کی ہو۔ چنانچہ شکیلہ ہیرنگٹن کے استراحت خانہ میں نہایت ملائم پر بہار اونی قالین کا فرش تھا۔ تمام دیواروں پر بیل و بوٹہ دار کاغذ منڈھا ہوا تھا۔ چاروں طرف چمک دار چوکھٹوں میں خوب صورت تصویریں لٹک رہی تھیں۔ خوشنما و بیش قیمت مسہری نرم صاف و شفاف گدوں اور سرخ و سپید شالوں سے دل فریبی و آرام بخشی کی ضمانت دیتی تھی۔ مسہری کے قریب سنگ مرمر کی میز پر دھرا ہوا ایک تیز لیمپ کمرہ کے جگمگاتے ہوئے پردوں کی دودھ بالا کر رہا تھا۔ میز کے قریب سیاہ لکڑی کی دو تین خوب صورت کرسیاں پڑی تھیں شکیلہ ہیرنگٹن نے استراحت خانہ میں قدم رکھا تو ایک نوجوان خادمہ نے اُسے کپڑے اتارنے میں مدد دی شکیلہ ہیرنگٹن نے دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جاکر اپنا گون و پٹی کوٹ اتار ڈالا جس سے اُس کی خوبصورت گردن اور بازو دور تک کھل گئے۔ اُس کے بدن میں ایک چست رنگین اونی جاکٹ اور ٹانگوں میں بٹن دار اونی تنگ پائجامہ رہ گیا۔ اور اس ہیئت میں شکیلہ ہیرنگٹن آئینے کے سامنے بڑی دل فریب معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کے پھول کی مانند گلابی چہرے پر بکھرے ہوئے لمبے بھورے بال اس کی مکمل دل فریبی کو آگے کھینچے لئے جا رہے تھے۔ دراصل اس کا کشیدہ قد صاف شفاف رنگ بڑی بڑی بھوری آنکھیں لمبی ناک۔ اونچی پیشانی پتلی بیضاوی۔ زنخدان زبردست صناع کے ہاتھ کی اعلے کاریگری کے نمونے تھے۔ اور ان سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر

نہ رہ سکتا تھا مگر اس کے دل کی کیفیت کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے مسہری پر بیٹھ کر سرخ کمبل اوڑھ لیا۔ تو خادمہ نے دوسری میز پر ایک چھوٹا سا لیمپ روشن کر دیا۔ اور بڑا لیمپ گل کر کے دود کش میں آگ دھکانے بیٹھ گئی۔ ایک دو منٹ کے بعد شکیلہ ہیرنگٹن کو کوئی بات یاد آ گئی۔ اُس نے خادمہ کو مخاطب کر کے کہا "دیکھو موم بتی جلا کر ریڈنگ روم سے میرا اٹریک اٹھا لاؤ"۔ خادمہ نے جھٹ پٹ موم بتی روشن کی۔ اور غسل خانہ کے اندر سے گذر کر ریڈنگ روم سے اٹریک اٹھا لائی۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے اٹریک کو کونہ میں رکھوا کر چٹخنیاں لگانے کا حکم دیا۔ اور ایک دروازے سے خادمہ کو رخصت کر کے اُس میں بھی قفل بند کر دیا۔ شکیلہ ہیرنگٹن کی نوجوان خادمہ اور بوڑھی رحمت قریب کے کمرے میں رہتی تھیں لیکن جب وہ بستر پر چلی جاتی تھی کسی کو مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے بھاری کمبل سر تک تان لیا۔ اور اطمینان سے بستر پر کمر لگائی۔ سرد اور طوفانی رات میں نرم نرم گدوں اور حرارت خیز لحاف اور دوشالوں کے باوجود اگر انسان کا دل بے چین ہو۔ تو دنیا میں قناعت کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعی شکیلہ ہیرنگٹن کی حالت قناعت سے کوسوں دور تھی۔ تمام راتوں میں سے آج کی رات اس کے لیے چند دل خراش یادگاریوں سے بھری ہوئی تھی۔

پندرہ سال گذرے آج ہی کی شب اس کی والدہ نے انتقال کیا تھا۔ آج پچھلے دو تین گھنٹوں میں اُسے اس بات کا اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ شاید وہ عنقریب بالکل افلاس کے درجہ پر پہونچ جائے۔ اُسے اپنے باپ کے پُراسرار خط سے اکثر گمان ہوا کرتا تھا۔ کہ اس کے نانا کی دولت کسی نہ کسی روز اُس کے ہاتھ آ جائیگی لیکن آج اُس بے رحم سراغ رساں کامران نے نہ صرف پیپل اور بیول کے درختوں کے نام سے اُس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بلکہ اس کے لیے نئے متوحش خیالات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اول تو اس گم گشتہ ماں کی یاد سے

اس کے سینہ پر ایک سانپ لوٹ رہا تھا جس کی محبت اور تقویت کی اُسے
اس وقت اس قدر ضرورت تھی۔ دوسرے اپنے موجودہ قرضہ اور آئندہ زندگی
کے خیال کو بار بار وہ اپنے دل میں چٹکیاں لیتا ہوا پاتی تھی۔ اُس کا دماغ
خوفناک خیالات سے پریشان ہو رہا تھا۔ اور اس کا دل رہ رہ کر رونے کو
چاہتا تھا۔ اگر اس کے باپ کی دولت دوسروں نے خورد برد کر لی۔ تو وہ
اپنے قرضے کو کس طرح بے باق کرے گی۔ اور اس عیش و آرام کی زندگی کی عادی
بن کر آئندہ زمانہ کس طرح گذارے گی۔ ان ہی دلخراش باتوں میں .....
اس شخص کا خیال بھی ملا ہوا تھا جس کی تصویر اس کے البم کے خاتمہ پر
تھی۔ اس کے آنکھوں کے سامنے معاً وہ نوجوان خوب صورت مرد آگیا۔ جسے
وہ ایک سال سے برابر بھلا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہ کیا عاشق و معشوق
کی محبت اور یادگار کا پیالہ ہمیشہ تلخی سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے تکیہ پر آنکھیں
رکھ کر اپنے گریہ کو دبانا چاہا۔ مگر ان غمگین آنکھوں میں جو کامران کو اس قدر
مؤثر معلوم ہوئی تھیں۔ رنج اور شکایات کا مواد اس قدر جمع ہو گیا تھا۔ کہ وہ
آنسوؤں کی رو کو کسی طرح نہ روک سکی۔ ایک دو مرتبہ اس کے منہ سے چیخ
بھی نکلی۔ اور اگر اس کے سر پر بھاری کمل نہ ہوتا۔ تو شاید ملحقہ کمرے میں خدام
عورتوں تک آواز پہونچ جاتی۔ آنسوؤں سے اس کا تکیہ ایک طرف سے تر ہو گیا
تھا۔ مگر وہ دل پر جبر کر کے اٹھی۔ اور کرسی سے تولیہ اٹھا کر اپنی آنکھیں پونچھیں۔
تھوڑی دیر تک بستر پر بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ بعد ازاں اس نے دراز و سیاہ اونی
موزے پہنے۔ اور مسہری سے اتری۔ اور اپنے کوٹ میں سے چابی نکال کر
باہستگی ٹرنک کھولا۔ جس کمرے میں اس کی دونوں خادمہ سو رہی تھیں۔ اسکے
دروازے پر بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ اگر عورتیں اس کی آہٹ سے چونک بھی
جاتیں۔ تو اسے ڈر نہیں۔ اس ٹرنک میں سے اس نے تصویروں کا البم نکالا
اور بڑے لیمپ کو روشن کر کے میز کے آگے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں

ہنوز سرخ ہو رہی تھیں۔ اور نازک گلابی ہونٹوں میں کربیہ وزاری سے ایک غیر معمولی جھٹک اضطراب کی ہویدا تھی۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھ سے اپنی والدہ کی تصویر کو نکال کر سامنے رکھا۔ مگر اس کا دل دوبارہ بھر آیا۔ اس کی والدہ کا ہنس مکھ چہرہ اُسے محبت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی جیتی جاگتی ماں اپنے پیارے بچے کو دیکھ رہی ہو۔ شکیلہ بیگم نے لاڈلے بچہ کی طرح ماں کی طرف دیکھا۔ اور وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کس سے کہتی۔ پھر بھی حقیقی ماں کی محبت کے جوش نے اُسے تھوڑی دیر کے لئے بے خبر کر دیا۔ اور وہ رو کر بولی۔ "پیاری ماں تو قیامت تک ہنستی رہے۔ مگر اپنی لاڈلی بیٹی کی مصیبت میں مدد کر۔ ایک طرف اوسے دنیا کے جھگڑے روپے پیسے کی آواز میں تنگ کر رہے ہیں اس کے پاس قرضوں کے سوا کچھ نہیں۔ آخر نانا جان کی دولت کہاں گئی دوسرے تو میرے لئے ایک ایسا حکم چھوڑ گئی ہے جس کی تعمیل کے لئے میں کسی طرح اپنے دل کو مستحکم نہیں پاتی۔ مقدس خداوند کا مذہب مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ اور میں تیرے حکم کے مطابق سچے مذہب پر جان دوں گی مگر میں کیا کروں عجب مصیبت میں ہوں جس شخص کی محبت میرے دل میں سما گئی ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ اور مجھے مسلمان کئے بغیر شادی نہ کرے گا۔ میں تیرا حکم مانوں یا اُس کا تو دوسری دنیا میں چلی گئی۔ اس دنیا کے جھگڑوں سے چھوٹ گئی۔ میں اس دنیا کے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی ہوں۔ کاش مجھے مقدس مذہب کی پابندی میں مہربان خداوند کی طرح صلیب پر چڑھنا نصیب ہو جائے۔" ان فقرات کے ادا کرتے ہی نوجوان پرجوش شکیلہ بیگم کی آنکھوں سے بے اختیار گرم گرم آنسوؤں کے تار جاری ہو گئے۔ اس نے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کو قابو میں کر کے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت لازوال جسم سے اُسے دیکھ کر بصورت حال کہہ رہی تھی۔ میری لاڈلی بچی

صبر کرنے شکیلہ ہیرنگٹن کے دل میں ماں کی پرتم تصویر سے اُس وقت کچھ ڈھارس بندھی۔ گریہ میں خاص اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ اس سے انسان کا بے قابو دل اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ جیسے طغیانی کی حالت میں دریا کا پانی کناروں سے بہ نکلنے کے بعد دریا کی اصلی حالت رہ جاتی ہے اسی طرح انسان کا دل رنج و شکوہ کے آنسو بہا کر مجتمع ہونے لگتا ہے شکیلہ ہیرنگٹن کے دل پر مضبوطی اور آسودگی پیدا ہوئی۔ اور اُسے اپنا سارا بدن ہلکا معلوم ہوا۔ اس نے اپنی ماں کی تصویر کو البم کے فریم سے علیحدہ کر کے بوسہ دیا۔ اور اس کے نیچے سے ایک موٹے کاغذ کا خط نکال کر آنکھوں سے لگایا۔ یہ خط نیلے موٹے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کتنے ہی سال اس پر گذر چکے ہیں شکیلہ ہیرنگٹن نے خط باحتیاط کھولا۔ اور اپنی جاکٹ کی جیب سے ریشمی رومال نکال کر خط کے نیچے بچھا دیا۔ اس خط کو شکیلہ ہیرنگٹن ہر سال اپنی والدہ کی برسی کی شب کو پڑھا کرتی تھی۔ اور اس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

میرے پیارے شوہر میری بیماری کو ڈاکٹر براڈوڈ نے لاعلاج بتایا ہے اور میرے مرنے میں دیر نہیں۔ میں اس خط کو احتیاط سے اپنے پاس رکھوں گی تاکہ تم میری حالت سے واقف ہو کر گھبرا نہ جاؤ۔ واقعی مجھے تمہاری محبت پر ناز ہے۔ اور میرا ضمیر سچ سچ کہتا ہے۔ کہ میری لاڈلی شکیلہ کو بھی تم ہی جیسا محبت کرنے والا شوہر ملے۔ لیکن میری ایک آخری درخواست تم سے ہے۔ کہ جیسے ظلم تم نے کبھی میرے مذہب میں مداخلت نہیں کی۔ اسی طرح شکیلہ ہیرنگٹن کو بھی اسلام لانے پر مجبور نہ کرنا۔ میری لاڈلی اس وقت میری خواہش سے واقف نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب وہ سمجھ دار ہو جائے۔ تم اس خط کو اس کے حوالہ کر دینا۔ میں نے مسز بالبی مور کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کو سچے سچے کے سچے مذہب پر قائم رکھنے کی

جو کوئی شخص میری لاڈلی سکیلہ کو سچے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کرے اُس پر خدا اور اس کے فرزند کا قہر نازل ہو۔ آمین۔

میں ہوں تمہاری تابعدار زوجہ۔ آلیو ہیرنگٹن

اس پر زور خط کے مطالعہ سے سکیلہ ہیرنگٹن کے دل میں جوش کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو دعا کے لئے اُٹھا کر کہا "آمین" پھر اس نے اپنے دائیں طرف مڑ کر دیوار میں لگی ہوئی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی مقدس شبیہ پر نظر ڈالی۔ جس میں لوگ انہیں صلیب پر چڑھا رہے تھے۔ وہ جھٹ پٹ کرسی سے اتر پڑی۔ اور تصویر کے نیچے نہایت ادب سے دوزانو بیٹھ دونوں ہاتھ باندھ کر خضوع و خشوع سے بولی "اے میرے مہربان مقدس باپ میری مدد کر۔ اور مجھے اپنے سچے مذہب پر قایم رہنے کی ہدایت کر" پھر وہ باہمگی قالین کے فرش سے اُٹھی۔ اُس کی آنکھیں جوش سے ٹمٹما رہی تھیں۔ اور اُس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اُس کے خوب صورت چہرے پر ناوقت کی زحمت سے کسی قدر افسردگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی والدہ کے خط کو پھر بوسہ دیا۔ اور چند کلمات دھیمی دبی ہوئی آواز میں ادا کر کے خط کو تصویر کے نیچے رکھ کر البم بند کر دیا۔ شال کے اس کی گردن سے سرک جانے کے باعث اس وقت اُس کے خوب صورت شانے کھل گئے تھے اور لیمپ کی روشنی میں چمک اٹھے تھے۔ اس نے سردی سے کانپ کر شال کو سترک اوڑھ لیا۔ پھر بار دیگر البم کو کھولا۔ اور آخر صفحہ پر نوجوان مرد کی تصویر کو پُر شوق نگاہ سے دیکھتی رہی۔ اب سے نصف گھنٹہ پیشتر اگر شکیلہ ہیرنگٹن اس شخص کی تصویر کو دیکھتی۔ تو شاید اس کے منہ سے کچھ اور الفاظ سنتے۔ مگر مقدس خداوند کی تصویر کے آگے سر عجز رکھنے سے اس کا دل نہایت نرم ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت دبی ہوئی آواز سے تصویر کو مخاطب کر کے کہا۔ میرے پیارے رفیق تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا

ہے +

مگر میں سچے مسیح کے مذہب کو تیرے کہنے سے بھی ہرگز نہ چھوڑوں گی۔ کیا تجھے خبر نہیں۔ کہ میرا دل تیری یاد میں تڑپ رہا ہے لیکن خواہ میں تیری صورت کے انتظار میں صلیب چڑھ جاؤں۔ لیکن اپنی ماں کا مذہب کسی طرح نہ چھوڑونگی" پھر اس کے دل میں کامران کے وہ الفاظ آ گئے۔ جن سے اُس کے پیارے دوست پر دفینہ کے متعلق شبہات عاید ہوتے تھے۔ مگر اُس نے آہستہ سے سر ہلا کر اپنے دل میں کہا "نہیں تو ہرگز چوری کے قابل نہیں تیری ناچیز کنیز تجھ پر ایسا الزام کبھی نہیں لگا سکتی" پھر اُس نے اس نوجوان کی تصویر کو آنکھیں بند کر کے بوسہ دیا۔ اور اس کے پُرجوش دل سے یہ آواز نکلی "میرے پیارے آسمان کے مقدس فرشتے تیری حفاظت کریں۔ اسی وقت اس کو اس کی بے اختیاری سے خود بخود نیند ہو گیا۔ اور نوجوان لڑکی نے بڑے پیار کو کھل کر دیا۔ اس وقت وہ کرسی سے اُٹھ کر مسہری پر آئی۔ اور گرم گرم کمبلوں میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ تو اسے چند منٹ کے بعد نیند جھٹکے دینے لگی۔ کبھی کبھی نیند میں آنکھ بند ہو جاتی تھی۔ کبھی کھل جاتی تھی۔ دس منٹ کے بعد وہ گہری نیند میں سو گئی۔ اور رویائے صادقہ میں اپنے محبوب کے گلے میں جا گی۔ انسان دراصل اپنے آپ کو بڑا زبردست اور عقلمند سمجھتا ہے لیکن محض نیند ہی کے وقت اُسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس سے کام لینے والی کوئی دوسری طاقت ہے۔ دراصل لیل و نہار کے یہ مناظر باری تعالےٰ کے وجود کی شہادت دیتے رہتے ہیں +

تیسرا باب

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

وہ پریشان کن متوحش رات جس میں شکیلہ ہیرنگٹن نے بڑی مضبوطی اور جوش دلی سے محض اپنی متوفی جوشیلی ماں کی تقلید میں سچے مسیح کے مذہب پر مرنے رہنے کا عہد کیا تھا۔ جھال آصف نگر سے چند میل کے فاصلے پر ایک دوسرے معزز اور پرامن گھرانے میں بھی خوشی اور رنج کے تغیرات پیدا کرنے میں مصروف تھی۔ بے رحم دنیائے دوں معلوم نہیں کتنے قرنوں سے عجیب و نامعلوم طریقوں میں خوشی اور رنج کے قابل یادگار نغمے جابجا بکھیرتی آئی ہے۔ ان نغموں سے بحرہائے محبت یا تلخی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی لذت یا تلخ کامی سے وہی اشخاص متاثر ہوتے ہیں جو ان نغموں کے محافظ بنے ہوں۔ ایک گھر میں نقارہ شادمانی بج رہا ہے۔ اور اس کے ملحقہ مکان میں محض ایک دیوار کی آڑ میں دوسرے بنی نوع انسان کی لاش پر دنیاوی تعلقات کی پابندی میں اشک حسرت بہائے جاتے ہیں مگر ان سب جذبات کی شادکامی یا حسرت پر بتدریج نامعلوم فراموشی کا دھندلا پردہ کھنچتا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ گذشتہ زمانہ ایک بے اثر گھر کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ جس کی یاد بمرور زمانہ متاثر کرنے سے بھی معذور ہو جاتی ہے جن متوحش تکلیف دہ خیالات نے شکیلہ ہیرنگٹن کو البم میں ایک خوب صورت نوجوان کی تصویر سے رازونیاز کی باتیں کرنے پر آمادہ کیا۔

وہ قصبہ رڑکی کا نوجوان رئیس زادہ رفیق احمد تھا جس کے والد بزرگوار مولوی شفیق احمد ایک بڑے رئیس اور زمیندار کی حیثیت سے قرب وجوار میں خاص اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولوی شفیق احمد کی صحرائی و شہری جائداد کی آمدنی پانچ سو روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ اور جیسی کہ دنیا کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ یہ سنا گیا تھا۔ کہ مولوی شفیق احمد کا ایک لاکھ روپیہ بنک آف بنگال آگرہ میں جمع تھا جس پر وہ سود نہیں لیتے تھے۔ مولوی شفیق احمد صاحب نے نہ صرف زمینداری اور ریاست ہی میں نام پیدا کیا تھا۔ دینداری و مذہبی حلقہ میں عام طور پر بڑے متقی۔ جوشیلے مسلمان اور شرع شریف کے نہایت پابند تسلیم کئے گئے تھے۔ اور اگرچہ انہوں نے پیری مریدی کی نیت سے کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیا۔ مگر پھر بھی ہزارہا آدمی ان کو اپنا مرشد مانتے اور ان سے وابستہ رہتے تھے۔ اور نوجوان رفیق احمد عام طور پر "صاحبزادہ" کے خطاب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ مولوی شفیق احمد نے گذشتہ دس بارہ سال میں حج بیت اللہ سے واپس آکر مذہب عیسوی اور آریہ سماج کی بیخ کنی میں بڑے جوش اور استقلال سے قدم اٹھائے تھے۔ اور وہ جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے بعد بہت سے معرکوں میں بمقام بریلی لاہور و میرٹھ شریک ہوئے تھے۔ یہ کہنا بالکل درست ہوگا۔ کہ مولوی شفیق احمد صاحب ایک متعصب اور محض جوشیلے آدمی تھے۔ جنہوں نے پرانے طریقے کی تعلیم سے دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ اہل کتاب کے سوا سب لوگ کفار کی موت مریں گے۔ اور انہوں نے چند اسلامی واعظین کی مدد سے عرصہ دراز تک رڑکی و سہارنپور میں عیسائی مشنریوں سے خوب مجاہدہ کیا تھا۔ اس وقت مولوی شفیق احمد صاحب کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی۔ اور وہ اس وقت بستر مرگ پر پڑے

تھے۔ رات کے ۱۲ بجے ہونگے۔ مولوی شفیق احمد کی عالیشان حویلی جسے دراصل ایک قسم کی کوٹھی کہنا درست ہوگا تاریک شب میں موت جیسی خاموشی میں ڈراونی معلوم ہو رہی تھی۔ طامسن کالج رڑکی کے عالیشان گنبد پر شاندار کلاک ٹن ٹن ۱۲ بجا رہا تھا۔ مولوی شفیق احمد کی کوٹھی طامسن کالج سے نصف میل کے فاصلے پر بجانب شمال اُس بنجر میدان کے کنارے پر واقع تھی۔ جہاں اکثر صاحب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا کیمپ لگا کرتا تھا کوٹھی نہایت شاندار اور خوب صورت تھی۔ گو اُس وقت شب کی تاریکی اُس کی خوب صورتی دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف وسیع باغ لگا ہوا تھا۔ پھولوں کی خوشبو ضرور پھیلی ہوئی تھی۔ مگر تاریکی میں کچھ پتہ نہیں لگتا تھا۔ کہ جن پھولوں کی یہ خوشبو ہے۔ وہ کس طرف لگے ہوئے ہیں۔ تین اطراف میں بالکل تاریکی اور سناٹا تھا۔ لیکن شرقی برآمدہ کے چقوں اور آئینہ دار کیواڑوں کے پیچھے روشنی معلوم ہو رہی تھی۔ برآمدے کے پیچھے ایک بڑے کمرے میں دس بارہ آدمی جو مولوی شفیق احمد کی عیادت و مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بطور مہمانوں کے مقیم تھے۔ لیکن اس وقت سب لوگ گرم گرم لحافوں کے اندر میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ کوٹھی کا وسیع ہال جو کہ معمولی دری کے فرش اور معمولی میز کرسیوں سے آراستہ تھا۔ گول میز پر بڑا ہنکس کا لیمپ جل رہا تھا۔ اور دو تین ضعیف العمر ملازم دری پر دو لائیاں اوڑھے اونگھ رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک نوجوان اور دوسری بوڑھی خادمہ بھاری رضائیاں اوڑھے خراٹے لے رہی تھی۔ دنیا کے نیرنگ واقعی عجیب و غریب ہیں۔ جو لوگ ان گرم کمروں میں آرام اور مزے کی گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں اُس پریشانی اور تکلیف کا اس وقت ذرا بھر بھی احساس نہ تھا۔ جو مرنے والے بوڑھے

..... رئیس کو گورِ غریباں کے لئے تیار کر رہی تھی بڑے ہال سے بجانب مغرب ایک بڑے کمرے میں جس کے دونوں دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مولوی شفیق احمد دنیا کے عیش و تکلف سے آخری بوس و کنار میں مشغول تھا۔ ایک شاندار مسہری پر جس کی نواڑ کاٹ دی گئی تھی۔ اسے گرم و نرم گدے پر لٹا رکھا تھا۔ سر کے نیچے بھاری تکیہ تھا۔ کمرے سے دری کا فرش اٹھا دیا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ شمالی گوشے میں بے ترتیب لیٹا ہوا تھا۔ جنوبی کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر ڈٹھار کا چھوٹا لیمپ جل رہا تھا۔ لیکن بیمار کی مصیبت اور تکلیف سے اس کے اعر اکو لیمپ کی صفائی کی مہلت نہیں ملی تھی۔ لیمپ کی چمنی منہ کی طرف سے کالی ہو گئی تھی۔ اور سیاہ کاجل کے ذرے مہرے پر جمع ہو گئے تھے۔ بوڑھے مریض کی چارپائی کے نیچے تمام صینی کی سیلابچی میں بول و براز جمع ہو رہا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں دو مراد آبادی اوگالدان رکھے ہوئے تھے۔ چارپائی کے قریب چٹائی پر دنیا کے تکلفات سے بے خبر ایک بوڑھی شریف عورت رضائی اوڑھے بیٹھی تھی جس کے چہرے پر بہ کثرت شکن پڑے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں بے خوابی سے گہرے گڑھے دکھلائی دیتے تھے۔ بوڑھی عورت کے قریب ایک کرسی پر نوجوان رفیق احمد ہکا بکا بیٹھا تھا۔ اس کے بڈھے باپ کے بدن پر نرم لحاف چاروں طرف کھنچا ہوا تھا۔ ابرؤں پر بل پڑا تھا۔ اس کے بے رونق سوکھے چہرے پر مردنی نے زردی پیدا کر دی تھی۔ ناک بالکل سوکھ گئی تھی۔ آنکھیں بالکل بند تھیں۔ چہرے پر گوشت کا نام و نشان نہ رہا تھا صرف ہڈیاں اور کھال رہ گئی تھی۔ اس ہیئت میں اسے کوئی شخص جس نے اسے تندرستی میں دیکھا ہو ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا۔

بحالت جوانی مولوی شفیق احمد لانبے قد مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اسے

حکیم و طبیب تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر پھر بھی دوہرے جسم کا آدمی تھا۔ دنیا کے تعلقات کیسے زبردست رشتے ہوتے ہیں۔ بوڑھے مریض کی ضعیف بیوی اور نوجوان اکلوتا بیٹا اس غلیظ اور بیمار ڈالنے والے کمرے میں کئی روز سے دن رات محبوس رہے تھے۔ انہیں اپنے آرام اور تکلیف کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ بول و براز کی بو ان کے ناک میں بس گئی تھی۔ خوشبو سمانے کی قابلیت مفقود ہو گئی تھی۔ بوڑھا مریض ایک ماہ سے خون کے دستوں میں مبتلا تھا۔ اور حکیموں اور ڈاکٹروں کی جملہ ادویہ افاقہ پیدا کرنے سے عاری رہی تھیں۔ دو روز سے مریض کی حالت نزع پر پہونچ گئی تھی۔ اور غریب مصیبت زدہ زوجہ اور نوجوان فرزند اس عالیشان کوٹھی کے مالک کی طرف سے قطعی ناامید ہو کر اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ اُن سے رخصت ہو کر سفر جاوداں پر کمر باندھے۔ مگر بوڑھے مریض کی ہڈیوں میں غضب کی جان تھی۔ وہ اس تکلیف اور مصیبت میں بھی اپنی روح کو جسم میں رکھ رہی تھیں۔ مگر آج کی رات آخری تھی۔ اور یوروپی شریف عورت جو بہت سے عزیزوں کی موت دیکھ چکی تھی۔ اپنے دل کو ہاتھوں سے دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ آہ آج اُس شخص کی دائمی رخصت تھی۔ جو جوانی میں اس شریف عورت کے ناز و نعم کا قدردان اور اُس کا سرتاج رہا۔ جوانی کی یادگاریں دل سے کس طرح محو ہو سکتی ہیں۔ آہ وہ سب باتیں خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جوانی کے ولولوں اور منصوبوں کی جگہ اب اس بستر پر مٹی کا ہلکا ڈھیر پڑا تھا۔ کیا اس ڈھیر میں کسی وقت یہ طاقت تھی۔ کہ اپنی گرج سے سارے گھر کو لرزا دے۔ کیا اس خاک کی آواز میں یہ اثر تھا۔ کہ روتے ہوئے بیوی اور بچے کو ہنسا دے۔ سب کچھ تھا۔ مگر اب سب باتوں کا خاتمہ تھا۔ اور یہ بستر

پر یہ بوڑھا مریض اس وقت بظاہر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ مگر دراصل اپنے جملہ اعمال کی نیک کرداری یا بدکرداری سے واقف پڑا تھا۔ روح جو تمام عمر دنیا کی برائی بھلائی کی بڑی مستعد گواہ رہی تھی۔ اب تمام باتوں کو ایک ایک کر کے یاد دلا رہی تھی۔ اور اس کے ناتوان جسم میں اپنی ملامت کے تیز چاقو سے کچوکے دے دے کر کہہ رہی تھی "

"تیرے ہاتھ پاؤں دل و دماغ نے جو کچھ اچھا یا بُرا کیا۔ میں اس کا خمیازہ یا انعام لینے جا رہی ہوں۔

روح کے اس طعن و تشنیع سے بوڑھا مریض کانپ گیا۔ اس کے بدن میں حرارت پیدا ہوئی۔ چراغ سحری جیسی آنکھیں ٹمٹما اُٹھیں اس نے ایک ہاتھ لحاف سے باہر کر کے بزور کہا "ملک الموت۔ ملک الموت" بوڑھی مصیبت زدہ بیوی کانپ گئی۔ اور اچھل کر مرنے والے شوہر کے سرہانے آئی۔ نوجوان رفیق باحواس باختہ اپنی اونگھ سے اُچھل کر ماں کے بائیں بازو پر آ کھڑا ہوا۔ ناتوان مریض نے بڑی حیرت اور افسوس بھری نگاہوں سے اپنی وفادار بیوی اور اپنے لاڈلے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ باتیں کرنی چاہتا تھا۔ مگر زبان قابو میں نہ تھی اس نے زور سے بستر پر ہاتھ مارا۔ اور اس کے ہونٹوں سے یہ آواز نکلی "میرا کہا سنا معاف ۔ ۔ ۔ ۔" بوڑھی جان نثار بیوی کی دھندلی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ نوجوان فرزند کا دل بھر آیا۔ اور اس نے رو کر باپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اُس کی پیاری ماں نے اسے قریب المرگ شوہر علیحدہ کرنا چاہا۔ مگر نوجوان لڑکا ضدی بھیڑیئے کی طرح باپ کے بستر پر چمٹا رہا۔ اور زور سے چلا کر بولا "کہ آپ اب دوسری دنیا کو جا رہے ہیں۔ اب دنیاوی تعصبات کو دور کر دیجئے۔ مجھے ٹھنڈے دل سے اجازت

دے دیجئے ۔ کہ شکیلہ ہر گز عیسائی سے شادی کر لوں ۔ اہل کتاب سے نکاح کس طرح ناجائز ہے یہ نیم جان مریض نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیں ۔ اس کے دانت کھل گئے ۔ آنکھوں میں سُرخی پیدا ہوئی ۔ اور ہلتے ہوئے ہونٹوں سے یہ آواز نکلی "عیسائی عیسائی ۔ ہاں عیسائیوں کا دشمن ۔ . . . . . اگر مسلمان ہو جاوے . . . . . اجازت میرا وصیت نامہ . . . . . آہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" نوجوان رفیق کی آنکھیں باپ کی آنکھوں سے لڑیں ۔ اُسے مردہ آنکھوں سے اندر سے کوئی چیز نکلتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ بوڑھی شریف عورت نے ایک چمچہ شربت کا رخصت ہونے والے شوہر کے منہ میں ٹپکایا ۔ اسی لمحہ میں بوڑھے مریض کے ہاتھ بستر پر گر گئے ۔ اور اس کا لازوال روح تڑپ تڑپ کر کالبد خاکی سے پرواز کر گئی ۔ کمروں کے دروازوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے دلخراش جھونکے اس کمرے میں داخل ہوئے ۔ بوڑھی ماں اور نوجوان فرزند کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔ بوڑھی شریف عورت غش کھا کر بوریئے پر گر گئی اور نوجوان تنومند فرزند نے اُس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر زور سے نوکروں کو آواز دی ۔ ایک لمحہ کے اندر تمام کوٹھی میں بوڑھے رئیس کی موت مشتہر ہو گئی ۔ اور نصف شب کی تاریکی میں سب اُس دن کو یاد کرنے لگے ۔ جو ساری دنیا کی تاریکی سے بدرجہا زیادہ تاریک اور کرب خیز ہو گا ۔ اور جہاں مٹی کا پتلا انسان اپنی ماں شفیق کے سینہ سے چمٹ جائے گا ۔

چوتھا باب

پیچ در پیچ

جب کامران کی آنکھ گہری نیند کے بعد کھلی۔ گو اگرچہ اس کی تکان بالکل دور ہو گئی تھی۔ تاہم اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ تھوڑی دیر سویا ہے ابھی اس کے کمرے میں تاریکی تھی۔ اگرچہ آئینہ دار کپواڑوں کے اندر سے اُسے دھندلی دھندلی روشنی معلوم ہو رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلی آواز جو اس کے کان میں آئی۔ وہ خوفناک آبشار کی دھاں دھاں تھی۔ جو چہار طرف سے پہاڑوں دروازوں سے ان تھک سرگرمی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بے جان چیزیں اپنے موعودہ کاموں کو ایسے استقلال اور مستعدی سے پورا کریں۔ اور جان دار انسان جس میں بے جان چیزوں سے کام لینے کی طاقت ہے۔ اپنے ہی مفید مطلب کاموں میں سستی اور کاہلی سے کام لے۔ یہ خیال چست و مستعد کامران کے دل میں پیدا ہی ہوا تھا۔ کہ وہ اچھل کر بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ اور اُسے اس کام کا خیال پیدا ہونے لگا۔ جس کے لئے وہ کل لاہور سے آیا تھا۔ یہ اصفہ کہ آنکھ کھلتے ہی اُسے اپنا لاہور والا گھر معلوم ہوا تھا مگر اب وہ سمجھ گیا۔ کہ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں بمقام آصف نگر تھا۔ اُس نے پاس کی کرسی سے دیا سلائی اٹھا کر جلائی۔ پھر اُٹھ کر اپنے اوور کوٹ کی جیب گھڑی دیکھی۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے اس نے دیوار میں لگا ہوا لیمپ روشن کیا۔ اور اپنے پلنگ پر بیٹھ کر

سوچنے لگا۔ کہ آج اس نے کیا کیا کام شروع کرنے ہیں۔ گو وہ لاہور سے آرہا تھا۔ جہاں سردی ماہ دسمبر میں کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی لیکن اس کمرے کی سردی سے اس کا بدن کانپ اٹھا۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ اس بنگلہ میں آبشار آصف نگر نہر گنگ اور چھوٹی شاخ نہر کے سبب سے رطوبت بہت زیادہ جمع ہے۔ اور اسی باعث سے ہوا میں خنکی زیادہ ہو رہی ہے۔ اس مقام سے نہر گنگ اور راجباہ تین فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔ وہ شام کو نہر میں چند کشتیاں پڑی دیکھ کر اس مقام کی دل آویزی کو قابل رشک سمجھنے لگا تھا۔ دراصل آبشار آصف نگر اور بہانگی نہر معہ راجباہ کشتی رانی کی قابل دید چیزیں ہیں۔ وہ صدری میں سردی محسوس کر کے پھر لحاف اوڑھنا چاہتا تھا۔

لیکن اپنے موجودہ موقعہ کو کار ہائے سراغرسانی کے لئے بسا غنیمت سمجھ کر اس نے جھٹ پٹ پاؤں میں اونی موزے پہلے اور کوٹ پہننے لگا۔ بعد ازاں اس نے آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولی۔ اور ٹرکی ٹوپی سر پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے سب سے پہلی نظر بنگلے کے اس جنوب رویہ دروازے پر ڈالی۔ جس کے ذریعے سے اسے بوڑھی خادمہ اندر لے گئی تھی۔ دوسری بار اس کی نظر اس کھڑکی پر پڑی۔ جس کے پیچھے اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کا چہرہ آئینہ میں دیکھا تھا۔ اسے تمام دروازے بند معلوم ہوئے۔ اور بنگلہ کے اندر کی کوئی چیز دکھلائی نہ دی۔ کھڑکی اور دروازہ کے اوپر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ اور سوائے چند پرندوں کی آواز کے جو دور کے درختوں پر بیدار ہو گئے تھے۔ سب صرف سناٹا تھا۔ جس کے توڑنے میں آبشار آصف نگر کی دھیمی دھیمی کا سیابی سے کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اوور کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال لئے۔ اور برآمدے سے نیچے اتر کر پہلے وسیع باغیچہ پر نگاہ

ڈالی۔ بعد ازاں بنگلہ کے دائیں طرف نوکروں کے مکانات کو دیکھنا شروع کیا جملہ مکانات کے دروازے بند تھے۔ ایک پختہ اصطبل میں اُسے گھوڑے کی لات نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور وہ سمجھا شاید سائیس جاگ اٹھا ہو۔ لیکن اُس نے نظر جما کر دیکھا۔ تو گھوڑے کے پاس ہی ایک چارپائی پر کوئی شخص میلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ بنگلہ کے چاروں طرف چکر لگایا۔ شکیلہ میڈنگٹن پھلواڑی کی بڑی شایق تھی۔ بنگلہ کے چاروں طرف جہاں چمن لگانے کا موقع تھا۔ پھول دار درخت اور سبزی کے پودے نظر آ رہے تھے۔ پودوں اور پھولوں پر شبنم کے سفید سفید قطرے چمک رہے تھے۔ کامران کی آنکھ بنگلے کے خس پوش پر گئی۔ اُسے چھپر کے کناروں پر بھی نمی معلوم ہوئی۔ بنگلہ کے چاروں طرف سے دیکھتا ہوا وہ شمالی دیوار کے سہارے پر ٹھیرا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ اس کمرے میں شاید شکیلہ میڈنگٹن کی خواب گاہ ہے۔ معلوم نہیں تجربہ کار سراغ رساں کو یہ خیال کس وجہ سے ہوا۔ لیکن وہ اس مقام پر غسل خانہ کے حوض کو دیکھ کر جس میں نالی کے اوپر صابون کی سفید جھاگ جمع ہو رہی تھی۔ نالی کی بو کا امتحان کر رہا تھا۔ اس نے رومال سے اپنی ناک پونچھی۔ جس میں اس وقت سردی ہوا سے رطوبت آگئی تھی۔ پھر اپنے دل میں کہنے لگا "یہ غسل خانہ ہے۔ ضرور اس کمرے میں پری چہرہ لڑکی آرام کر رہی ہے۔ واللہ کیسی خوب صورت عورت ہے" یہ کلمہ ادا کر کے اُس کے چہرے پر تبسم ظاہر ہوا۔ اور اسے اپنی ہونے والی کا خیال آ گیا۔ جو اس وقت لاہور میں بستر خواب پر پڑی ہو گی۔ اور جسے وہ دل سے عاشق تھا۔ اس لئے اس مقام سے جلدی جلدی قدم اٹھائے اور شرقی برآمدے کے سامنے باغیچہ کی ایک روش پر آ کھڑا ہوا۔ باغیچہ کے اندر پیسیوں روشوں پر سرخ کنکر عجیب و غریب صنعتوں سے بچھے ہوئے

تھے۔ کامران شکیلہ ہیرنگٹن کے مالی کی داد دیتا ہوا باغیچے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اور اپنے دل سے کہنے لگا "بظاہر ببول کے درخت اس جگہ تھے احاطہ کی دیوار سے باہر ببول کے درخت کے اندر اب کوئی درخت ببول یا پیپل کا نہیں شکیلہ ہیرنگٹن کا دفینہ ضرور ضائع ہو گیا۔ یہ کہہ کر اُس نے دور تک زمین کو بغور دیکھا۔ مگر اُسے کہیں کسی درخت کا نشان نہ معلوم دیا۔ پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک فیتہ نکالا۔ اور اس کا کنارہ ایک اینٹ سے دبا کر برآمدے تک سیدھی لائن میں کھینچتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو فیتہ تھا۔ وہ برآمدہ تک نہ آسکا۔ اس نے زمین پر جوتہ سے نشان لگا کر فیتے کا دوسرا کنارہ زور سے کھینچ لیا۔ اور باقی برآمدہ حصہ زمین کو برآمدہ کے وسطی ستون تک ناپا۔ تو ایک سو بائیس فیٹ شمار میں آئے۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور وہ تھوڑی دیر سوچ کر اپنے دل سے کہنے لگا "اُس پُراسرار خط کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس مقام پر اس وقت پختہ نالی ہے۔ بظاہر وہاں کبھی ببول کے درخت تھے" یہ کہہ کر وہ پھر پختہ نالی کے اوپر آیا۔ جو اس وقت بے آب تھی۔ تمام بنگلہ کے چاروں طرف احاطہ کی دیوار سے پانچ فیٹ اندر کی جانب مضبوط پختہ نالی باغیچوں کو سیراب کرنے کے لئے بنی ہوئی تھی۔ پانی بنگلہ کے کنوئیں سے اور شرقی باغیچے کی طرف ایک آہنی نل کے ذریعے سے آسکتا تھا۔ بظاہر نہر آبشار سے پانی حاصل کرنے کے لئے شکیلہ ہیرنگٹن کو کچھ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہوگا۔ اگرچہ اُس وقت کوئی ببول کا درخت احاطہ کے اندر نہیں تھا۔ لیکن پُراسرار خط کی ہدایات ایسی سیدھی سادی تھیں۔ کہ اگر کسی زمانہ میں ببول کے درخت ہوتے۔ تو موٹی سی موٹی عقل کا آدمی بھی اس دفینہ پر ہاتھ مار سکتا تھا۔ کامران کو نہایت حیرت تھی۔ کہ ایک روشن ضمیر آدمی نے جس کے گھر میں انگلش لیڈی تھی۔ محفوظ

بینک گھروں کو چھوڑ کر ایسے بے ڈھنگے طریقے سے روپیہ کیوں گاڑ دیا تھا وہ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اُسے شاگرد پیشہ کے مکانات میں سے ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ جھپٹ کر ایک درخت سے گلاب کا پھول توڑنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا برآمدے کے باہر آکھڑا ہوا۔ جس شخص نے کوٹھڑیوں میں سب سے پہلے کامران کی صورت دیکھی وہ شکیلہ ہیرنگٹن کا بوڑھا نوکر احمد خاں تھا جس نے اُٹھتے ہی دوسرے کیوارٹروں پر دستک دی۔ اور پانچ چار منٹ کے اندر سب نوکر بیدار ہو کر اپنے اپنے کاموں پر لگ گئے۔ اس وقت چاروں طرف خاص روشنی ہو گئی تھی۔ اور آس پاس کے درختوں پر شب کے اکڑے ہوئے پرند نکلنے والے آفتاب کے استقبال میں بہت پیشتر سے باہر آ بیٹھے۔ کامران چاہتا تھا۔ کہ اس وقت وہ آبشار پر جا کر پانی کی طاقت کا اچھی طرح مطالعہ کرے۔ لیکن اول تو سردی بے حد تھی۔ دوسرے اُس نے منہ ہاتھ بھی نہ دھویا تھا۔ اس وجہ سے رک گیا۔ اور اپنے کمرہ میں آکر ٹہلنے گھومنے کرنے لگا۔ اسی اثنا میں شکیلہ ہیرنگٹن کی خادمہ نے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اور ایک سرخ شال کے اندر سے تاک کر کامران کی طرف دیکھا۔ اس عورت کی آنکھیں اس وقت کچھ ایسی میلی کچیلی اور ڈراؤنی ہو رہی تھیں کہ کامران نے اُسے تاریک کمرے کے اندر سے بغور دیکھا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا "یہ عورت مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھتی ہے۔ مگر وہ تو بالکل جاہل عورت ہے نہیں۔ یہ سب کام اس شخص کا معلوم ہوتا ہے جس کی تصویر مجھ سے شکیلہ ہیرنگٹن نے چھپائی"۔ بوڑھی خادمہ کو برآمدے سے گذر کر باہر گئے ہوئے پانچ سات منٹ گذرے ہونگے۔ کہ کامران کیلئے ایک خدمتگار گرم پانی لایا۔ کامران نے سامنے کے کمرے میں جس سے وہ شب گذار چکا تھا۔ اور بات سے فراغت پائی۔ اور ہاتھ منہ

دھو کر باہر نکل آیا۔ وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا منہ پونچھ رہا تھا۔ اور چرٹ پیتا جاتا تھا۔ کہ بوڑھی رحمت اس کے دروازے پر آئی۔ اور اسے خوف زدہ نگاہ سے دیکھ کر کہنے لگی "آئیے چائے تیار ہے" وہ سگار کو باہتگی کمرے کی انگیٹھی پر رکھ کر رحمت کے پیچھے ہو لیا۔ اور مس شکیلہ ہیرنگٹن نے اُسے ملاقات کے کمرے میں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چائے ختم ہو جانے پر جب برتن اٹھ چکے۔ تو کامران نے برقعہ پوش شکیلہ سے باہتگی کہا "تو آپ نے اب کیا رائے قایم کی" شکیلہ چائے نوشی ختم کر کے ایک خوبصورت گدے دار کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ یہ کمرہ خوب وسیع اور خوب صورت تھا۔ اس کی شرقی دیوار پر بڑے آئینے میں کامران نے شکیلہ کے چہرے کی جھلک دیکھی شکیلہ ہیرنگٹن نے آہستہ سے جواب دیا "میں اس وقت ہواخوری کے لیے بند گاڑی میں باہر جایا کرتی ہوں" کامران نے اس انتظام پر اطمینان ظاہر کیا۔ اور رحمت کے واپس آجانے پر شکیلہ نے گاڑی تیار کیے جانے کا حکم دیا۔ رحمت کے باہر چلے جانے پر کامران نے سنجیدہ چہرے سے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو۔ اپنے والد صاحب کا خط اور اپنے دوست کی تصویر بھی لانی چاہیئے۔ میں ان دونوں چیزوں کے بغیر کوئی رائے قایم نہیں کر سکوں گا۔

اگرچہ شب گذشتہ کو شکیلہ ہیرنگٹن نوجوان کی تصویر کامران سے چھپانا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت بظاہر اُس نے رائے بدل دی تھی۔ وہ باہتگی اٹھ کر ریڈنگ روم میں گئی۔ اور دونوں کاغذات مطلوبہ ساتھ لے آئی۔ کامران نے کرسی سے اُٹھ کر شکیلہ کے ہاتھ سے اضطراب بسیار خط اور تصویر لے لی۔ اور بڑے اشتیاق سے فوٹو کو دیکھنے لگا۔ جس نوجوان کا یہ فوٹو تھا۔ وہ خوب صورت آدمی کوئی اکیس سال کی عمر میں تھا۔ اس کا قد کشیدہ۔ بدن کسی قدر دبلا مگر مضبوط تھا۔ چہرے سے تندرستی اور بشاشت

مترشح تھی۔ آنکھیں بڑی اور بھوری۔ ناک لانبی۔ پیشانی تارک۔ کمر کشادہ
زنخدان گول۔ فی الجملہ یہ نوجوان دل کش آدمی تھا۔ اور اس کے چہرے
میں ایسی وجاہت موجود تھی۔ کہ اگر مردوں کو نہیں۔ تو خواتین کو اپنی طرف
مروہ متوجہ کر لیتی۔ اس کے سر پر ترکی ٹوپی اور پاؤں میں انگریزی بوٹ تھا
جس کے اندر سے سیاہ موزے دکھلائی دے رہے تھے۔ بدن میں
انگریزی کوٹ تھا۔ اور گلے میں خوشنما نکٹائی چمک رہی تھی۔ پائجامہ
انگریزی پتلون نما ہوتا تھا۔ نوجوان سبزہ آغاز تھا۔ مونچھیں چھوٹی۔
چھوٹی اور ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ خدا کی قدرت ہے۔ کہ جس مشہور
متقی آدمی کا یہ نوجوان بیٹا نام لیوا تھا۔ وہ جملہ انگریزی چیزوں سے
نفرت کرتا تھا۔ اور یہ شخص ان کا دلدادہ تھا۔ نوجوان کا نام جیسا کہ معلوم
ہو چکا ہے۔ رفیق احمد تھا۔ اور اس نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے
پاس کیا تھا۔ رفیق احمد کے والد نے اُسے انگریزی کی تعلیم اس نیت
سے نہیں دلائی تھی۔ کہ وہ ڈاڑھی منڈوا کر کوٹ پتلون پہننے لگے۔ اور ایک
انگلش لیڈی کی لڑکی پر فریفتہ ہو جاوے۔ بلکہ اُن کی اصلی غرض یہ تھی۔
کہ یہ بی اے تک تعلیم دی جاوے۔ تو اُسے تحصیل علم عربی کے لئے مصر
بھیجیں۔ اور دینیات فقہ و حدیث میں خوب ماہر ہو کر یہ نوجوان بیٹا اپنے
باپ کے نقش قدم پر چلے۔ اور عیسائی دنیا میں اپنے اسلامی مجاہدانہ
سے تہلکہ ڈال دے۔ انسان راہ کرتا ہے۔ اور قسمت ہنسا کرتی ہے
مولوی شفیق احمد کے تمام منصوبے مانند پڑ گئے تھے۔ اس نوجوان
نے بی اے ضرور پاس کر لیا تھا۔ اور وہ اپنے کالج میں نہایت ہونہار
اور ذہین بھی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن باپ کو جس قدر انگریزی چیزوں
سے نفرت تھی۔ اسی قدر اُسے محبت تھی۔ جس کی دو بڑی مثالیں اس
وقت یہ موجود تھیں۔ کہ وہ باوجود طعن و تشنیع پدر بزرگوار انگریزی لباس

نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اور پھر شکیلہ ہیرنگٹن پر حالانکہ اُسے معلوم تھا۔ کہ وہ انگریزی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ فریفتہ ہو گیا تھا۔ رحمت نے جس وقت گاڑی تیار ہو جانے کی اطلاع کی۔ تو کامران نے تصویر اور پرزہ کاغذ کو جیب میں ڈال لیا۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کے پیچھے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ رحمت حسب معمول شکیلہ ہیرنگٹن کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ مگر معوذ الدکر نے اُسے آہستہ سے یہ کہہ کر روک دیا "میں آج چند دفتروں میں جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ نہ آؤ" گاڑی سرخ کنکر کی سڑک پر کھڑکھڑاتی ہوئی باہر نکلی۔ اور پختہ سڑک پر پڑتے ہی کامران کو سبز لہلہاتے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کے رقبہ کے رقبے بجانب غرب دکھائی دیئے۔ جن پر تازہ تازہ دھوپ شبنم کے قطروں کو چوس رہی تھی۔ اگرچہ غرب کی جانب سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کامران کے کانوں میں کچھ کہے جاتے تھے۔ اور بدن میں دور تک لرزہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر ان سبزہ زار کھیتوں اور نکلتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے جگہ ایسی پرفضا اور دل کش ہو رہی تھی۔ کہ اگر انسان کو کبھی موسم گرما میں یہ موقعہ ہاتھ آجاوے تو وہ بے اختیار اس فرش زمردین پر لیٹ جائے۔ اونچے اونچے شیشم کے درختوں پر تازہ دھوپ اطلس کی چادر کا دھوکا دے رہی تھی۔ اور پرند کے چہچہوں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ جانب شمال ہمالیہ کے پہاڑوں کا سلسلہ سیاہ رنگت کے چٹانوں میں آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اور اس پر تازہ آفتاب کی کرنوں سے ایسی گوناگوں سبزی مائل رنگتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ جنہیں کوئی صناع کاغذ پر نہیں لا سکتا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد گھوڑا گاڑی خوفناک آبشار کے پل پر جہاں مخ بستہ ہوائیں کہر ابن کر آفتاب کی کرنوں کے آگے پانی کی صورت میں آبشار کے جھاگ دار پانی سے لپٹ جاتی تھیں۔ دور تک آبشار کا

پانی مطلق نظر نہ آتا تھا۔ مشرقی کنارے سے غربی کنارے تک وہاں ہی وہاں پھیل رہا تھا۔ آبشار کے اوپر سردی ایک درجہ زیادہ ہو رہی تھی۔ اور ہواؤں میں پانی کی بوُ اُس وقت کسی قدر ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ کامران کھلے ہوئے منہ سے آبشار کے خوفناک تلاطم کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن جو اس نظارے کو لڑکپن سے مطالعہ کر رہی تھی۔ اُسے کچھ تعجب نہیں تھا۔ آبشار کے کونے پر گاڑی بان نے زور سے پوچھا "مس صاحب گاڑی کدھر کو جائے گی" لیکن ان دونوں میں سے کسی کو آواز نہ سنائی دی۔ وہ سیدھا کشتی نالہ کی طرف بڑھا چلا گیا جہاں اس وقت ایک کشتی نہر کے اندر سے کشتی نالہ میں داخل ہو رہی تھی۔ اور ملاح نے دونوں طرف کے آہنی پھاٹک بند کر کے پانی بلند کر دیا تھا کامران کو یہ منظر نہایت دلکش معلوم ہوا۔ اس لیے گاڑی بان کو آواز دے کر گاڑی ٹھیرائی۔ اور گاڑی سے اتر کر کشتی رانی کا تماشا دیکھتا رہا۔ شکیلہ ہیرنگٹن بدستور گاڑی میں بیٹھی رہی یہانتک کہ دو تین منٹ بعد کامران مسکراتا ہوا آیا۔ اور کہنے لگا "میں نہری پن چکیوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر خیر اب چلیں۔ پھر دیکھا جائے گا" کامران کے اندر بیٹھتے ہی کوچبان نے مستعدی سے دریافت کیا "گاڑی کدھر جائے گی" منگلور کی طرف یا رڑکی" شکیلہ ہیرنگٹن نے کشتی نالہ کے شور میں آواز بلند کر کے کہا "رڑکی" اسی وقت تیز رفتار گھوڑے پر چابک پڑا جس نے اُچک کر زور سے گاڑی کو کھینچا۔ اور کشتی نالے کے کنارے کنارے گھاس اُگی ہوئی سڑک پر بائیں جانب کشتی اور محکمہ نہر کے مکانات کوٹھی بنگلے وغیرہ تھے۔ دائیں جانب شیشم اور جامن کے اونچے درختوں کے گنج سبز سبز کھیت دور تک پختہ سڑک سے جاتے تھے۔ جو قصبہ منگلور سے رڑکی کو چلی گئی ہے۔ نصف میل کے فاصلے پر کشتی نالہ اصلی نہر گنگ سے جا

ملا۔ جس کا پانی ہیبت ناک رفتار سے آبشار کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس مقام پر نہر گنگ اس قدر وسیع اور ڈراونی معلوم ہوتی ہے۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے ہوشیار سے ہوشیار پہرا بھی کھڑا ہو کر سوچنے لگے جب کامران ان تعجب خیز نظاروں سے سیر ہو گیا۔ تو اس نے باہستگی شکیلہ ہیرنگٹن سے کہا۔ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں" شکیلہ نے بہ نرمی جواب دیا "میں روڑکی تک محض ہوا خوری کو آئی ہوں۔ آپ شب گذشتہ کے معاملہ میں مجھ سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ میں نے کل آپ سے جھوٹ بولا۔ دراصل جس شخص کی تصویر اس وقت آپ کے پاس ہے۔ وہ ایک سال گذرا۔ میرا بڑا گہرا دوست تھا۔ اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس شخص کا باپ بڑا ضدی اور متعصب مسلمان ہے۔ اس نے اس شخص کو میری طرف سے متنفر کر دیا۔ اور میں اب عرصے سے اوسے بھلا دینے کی کوشش کر رہی ہوں" یہ الفاظ ایسے سادے اور معصوم آواز سے ادا ہوئے کہ کامران کے قلب پر گہرا اثر ہوا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا یہ پری چہرہ لڑکی اس سے اس نوجوان کی بے رُخی کی فریاد کر رہی ہے۔ جہاندیدہ آدمی کا مضبوط دل ہلنے لگا۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ اُن خوب صورت آنکھوں کی غم ناکی بے وجہ نہ تھی۔ کہ جنہیں اُس نے کہر کی سے آئینہ میں دیکھا تھا۔ اور یہ نوجوان خوب صورت لڑکی بھی اُس شخص کے دام الفت میں پھنسی ہوئی تھی جس کی کج ادائی کا وہ خود ذکر کر رہی تھی۔ اُس نے تھوڑی دیر گاڑی کے تختے پر نگاہ رکھی۔ پھر آہستہ سے آنکھ اٹھا کر بولا" مجھے آپ کے دفینہ کے متعلق شبہات نہیں ہیں۔ میرا خیال ..... " کامران ابھی گفتگو کے پورے کلمات ادا بھی نہ کر چکا تھا۔ کہ شکیلہ نے تختے پر نظر ڈال کر کہا" آپ اس شخص سے واقف نہیں۔ وہ بڑے امیر آدمی کا بیٹا ہے۔ اُس کے باپ کا ایک لاکھ روپیہ کسی بنک میں جمع ہے۔ ایسے آدمی کو چوری کی کیا ضرورت ہے *

کامران نے شکیلہ کے والد کا خط اور وہ تصویر پھر جیب سے نکالی۔ اور تصویر کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "بالکل ممکن ہے۔ کہ یہ شخص اس سازش میں شریک نہ ہو۔ مگر اس کی ٹھوڑی بہت کمزوری کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارادے کا مضبوط نہیں۔ اور دھوکے میں جلدی آسکتا ہے۔ شاید اسی طرح اُسے کسی دباؤ نے آپ سے علیحدہ کر دیا ہے" شکیلہ ہیرنگٹن کے رگ وپے میں اس نوجوان کی یاد اس قدر بھری ہوئی تھی۔ کہ اس کا ذرا سا تذکرہ اس کی دلچسپی میں مہمیز لگانے کو تیار ہو جاتا تھا۔ گو کامران نہ دیکھ سکا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن کا چہرہ شرم وحیا سے سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں رونق آگئی اور اس نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ "وہ مجھ سے دو سال گذرے واقف ہوا تھا۔ اس عرصے میں اُسے میرے اور مجھے اُس کے سب حالات معلوم ہو گئے۔ میں نے اُسی ہی کے کہنے سے پردہ شروع کیا لیکن ایک سال گذرا۔ وہ مجھ سے بلا وجہ کشیدہ خاطر ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ مجھے صاف طور پر کہہ دیا۔ کہ جب تک میں مذہب اسلام اختیار نہ کرونگی۔ وہ میرے ہاں نہ آویگا۔ کامران نے پیشانی پر بل ڈال کر کھڑکی کے دائیں جانب نگاہ ڈالی اُسے نہر کے درختوں میں چند بندر دکھائی دیئے تھے۔ دل میں سوچنے لگا کیا عجب ہے۔ کہ اس شخص نے اپنا مطلب نکال کر اس عورت کو دھوکا دینا چاہا ہو۔ شاید دفینہ اس شخص کے ہاتھ آیا۔ مجھے تحقیقات کرنی چاہیئے پھر اُسے کچھ خیال آگیا۔ اور اُس نے اُس کے والد کا خط بغور دیکھا۔ اور کہا اچھا یہ تو بتلایئے۔ آپ نے یہ ببول کے درخت کب قطع کرائے۔ اور جس کب لگایا گیا،، شکیلہ ہیرنگٹن کو اس وقت جمائی آگئی تھی۔ اس نے ذرا دیر تھم کر جواب دیا "شاید پانچ سال گذرے،، کامران نے پُر تعجب آنکھوں سے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھا۔ پھر گھبرا کر بولا "پانچ سال تب تو میری برابر کوئی گدھا نہیں۔ آپ اس شخص سے صرف دو سال گذرے واقف

ہوں۔ یہ شخص اس سازش میں شریک نہیں لیکن پھر کون شخص ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اس عرصے میں کسی دوسرے آدمی سے بھی واقف ہوئیں جس سے اس نوجوان کی طرح دوستانہ رہا ہو۔" شکیلہ ہیرنگٹن کچھ سوچنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی "مجھ سے کئی نوجوان واقف ہیں۔ ہندوستانیوں میں تو صرف یہی شخص رفیق احمد مجھ سے واقف ہوا۔ مگر انگریزوں میں کئی نوجوان مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔" کامران نے بھی دلچسپی سے انگریزوں کا ذکر سنا۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "اگر کسی انگریز ہی نے آپ کو دھوکا دیا ہو۔ آپ کے والد کا خط انگریزی میں ہے۔ جس شخص نے یہ جعلی خط بنایا۔ وہ انگریزی ضرور جانتا ہے۔ کیا آپ کسی پر شبہ کر سکتی ہیں۔" شکیلہ ہیرنگٹن انگریزوں کے ذکر پر ان لوگوں کی صورتوں اور چال و چلن کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچنے لگی جن سے وہ بزمانہ بلوغ واقف ہوئی تھی۔ لیکن اُسے کوئی آدمی مشتبہ نہ معلوم ہوا۔ اور اس نے نرمی سے جواب دیا۔ "انگریزوں میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوا۔ اور جہاں تک میری یاد مدد کر سکتی ہے میں نے اپنے والد کی تحریر مسٹر رفیق احمد کے سوا کسی کو نہیں دکھلائی۔" کامران اس وقت عجب پیچ و تاب میں تھا۔ جس اصول کو پکڑے ہوئے وہ تمام گذشتہ شب اپنے شبہات کی عمارت بناتا رہا تھا۔ وہ اس وقت مسمار ہو گئی تھی۔ نئی عمارت قائم کرنے کے لئے بڑے مصالحہ کی ضرورت تھی۔ اس نے شکیلہ ہیرنگٹن سے اجازت لے کر ایک سگار سلگایا۔ اتنے میں اس کی نظر دائیں جانب دو منزلہ بارکوں پر پڑی۔ اس نے شکیلہ ہیرنگٹن سے پوچھا "یہ کیا عمارت ہے۔" شکیلہ ہیرنگٹن نے جواب دیا "یہ چھاؤنی ہے۔" پانچ منٹ کے بعد دائیں ہاتھ انگریزوں کی خوب صورت کوٹھیوں اور بنگلوں کا سلسلہ دور تک سڑک کے کنارے کنارے جاتا ہوا دکھائی دیا

بنگلوں کے باغیچوں سے پھولوں کی خوشبو سڑک پر دور تک آ رہی تھی۔ ٹرالی کی قریب آجانے پر شیشم کے اونچے اونچے درختوں کا جھنڈ بجانب غرب شہر کے کونے پر ختم ہوتا نظر آیا۔ یہ جھنڈ ایک میل کے فاصلے سے نہر کے دونوں کناروں پر چلا آ رہا تھا۔ درختوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی محکمہ کشتی رانی کی چند کشتیاں تالاب میں پڑی ہوئی ملیں۔ چند کشتیاں بڑی نہر میں اسباب بھر رہی تھیں۔ چند روانگی کے لئے لنگر اوٹھا رہی تھیں۔ پختہ پل تک بیسیوں بڑے کشتیوں کے نظر آ رہے تھے۔ گاڑی نہر کے کنارے پہونچ کر جہاں ایک زبردست شیر بنا ہوا ہے۔ رک گئی۔ اور کوچبان نے پوچھا "کیا بالٹی مور صاحب کی کوٹھی پر چلوں" شکیلہ ہنگلٹن نے زور سے چلا کر جواب دیا "نہیں اب گھر واپس چلو" مگر کامران گاڑی رکوا کر دیر تک دائیں بائیں نظر دوڑاتا رہا اس وقت بڑے گودام کا گھنٹہ آٹھ بجا رہا تھا۔ اور سینکڑوں مزدور بے تحاشہ بھاگتے ہوئے گودام میں داخل ہو رہے تھے۔ جب کوچبان نے گھوڑوں کو بجانب جنوب پھیرا۔ اور کامران اندر بیٹھ گیا۔ تو اس نے سگار کی راکھ کھڑکی کے کنارے پر جھاڑ کر پوچھا۔ ہاں جس وقت آپ نے بیل کے درخت کٹوا کر چمن لگایا۔ کیا آپ کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ کہ آپ کے والد ایک خط چھوڑ گئے ہیں۔ جس میں عجیب و غریب باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اور کیا وہ آپ کو ہدایت نہ کر گئے تھے۔ کہ اس خط کو کسی کو نہ دکھلانا" شکیلہ ہنگلٹن نے فوراً جواب دیا "لیکن جناب آپ کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ تو میری عمر صرف دس برس کی تھی۔ اور میری ہر ایک چیز کی رحمت محافظ تھی۔ میں اس خط کو بالکل بھول گئی تھی۔ میں شاید بارہ سال کی تھی کہ ایک روز مسز بالٹی مور نے مجھے چند بڑی بڑی مرچیں۔ جو کہیں سے آئی ہوئی تھیں۔ دکھائیں۔ وہ اتنی بڑی بڑی اور موٹی موٹی تھیں۔ کہ میں ان سے ڈر گئی۔ اور اس روز سے مجھے شوق ہوا۔ کہ اپنے سارے بنگلے میں جہاں جہاں

چمن نہیں تھا۔ باغیچہ لگاؤں۔ یہ باغیچہ مسز بالٹی مور کے انتظام سے لگایا گیا تھا مجھے ذرہ بھر بھی وہم و گمان نہ تھا۔ کہ میرے والد صاحب کے خط میں کہیں بھول کے درختوں کا ذکر ہے۔ میں یہ سمجھتی ہی رہی تھی۔ کہ جب سترہ سال کی ہو جاؤں گی۔ تو اس خط کے مضمون سے خود واقف ہو سکوں گی۔ دو سال گذرے جب میں مسٹر رفیق احمد سے واقف ہوئی۔ تو مجھے اپنی آئندہ زندگی کا خیال آیا۔ میں نے اپنے والد کے کاغذات جمع کرائے۔ اور اس خط کو احتیاط سے رکھنا شروع کیا۔ ایک دو دفعہ مسٹر رفیق احمد نے اس خط کو ضرور دیکھا ہے لیکن اُس وقت باغیچہ لگ چکا تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن کی اس تقریر سے کامران کی صورت پر ایسی بے رونقی چھانے لگی۔ جیسے کئی گھوڑ دوڑ ہار جانیوالے آدمی کے چہرے پر پھیل جایا کرتی ہے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا کر دیر تک سوچتا رہا۔ اور قریباً بیس منٹ تک ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ جب گاڑی آبشار آصف نگر پر پہونچی۔ تو اگرچہ کامران نے پھر ایک خوف زدہ نگاہ جھال پر ڈالی۔ مگر اس مرتبہ اُس کے دل میں آبشار آصف نگر کا ڈر نہیں تھا۔ بلکہ اپنے سراغ رس دماغ کے آگے چند ناگوار مشکلات پاتا تھا۔ اُس نے دائیں بائیں گردن پھیری۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر کہا "مس شکیلہ ہیرنگٹن۔ آپ کے باپ کا دفینہ کسی نے ضرور نکال لیا ہے۔ لیکن میں مجرم کا پتہ ضرور لگاؤں گا۔ میں آج آپ سے رخصت ہو جاؤنگا آپ کے ساتھ میرا رہنا کسی طرح درست نہیں۔ دو تین روز سے میرا ماتحت معمار کی حیثیت سے آپ کے پاس آئے گا۔ آپ اُسے میری تحریر کیمطابق باغیچہ میں ردوبدل کا کام بتا دیجئے گا۔ جس وقت مجھے یہ معلوم ہو جائیگا۔ کہ دفینہ خورد برد ہو گیا ہے۔ اُس وقت میں کوئی عملی قدم اس کام میں اٹھاؤنگا مہربانی فرما کر اپنے ملازموں میں سے کسی کو میرے ارادوں سے مطلع نہ ہونے دیجئے گا ورنہ ہمارا کام بگڑ جائے گا۔ اگر کوئی شخص میری بابت دریافت کرے۔ تو آپ

یہ کہہ سکتی ہیں۔ کہ میں آپ کے والد صاحب کا شناسا ہوں۔" جب گاڑی خوب صورت بنگلہ کے اندر داخل ہوئی۔ تو بڑے کلاک میں نو بج رہے تھے۔ گاڑی آہستہ آہستہ شرقی برآمدہ کی طرف جاکر تھمی۔ اور سکیلہ ہیرنگٹن اپنے باغیچہ پر شوق کی نظر ڈالتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

پانچواں باب

متعصب مسلمان کا وصیت نامہ

مولوی شفیق احمد کی وفات کو آج تیسرا دن تھا۔ اور مرحوم کے بے شمار احباب۔ اعزا۔ اور معتقدین کی بڑی تعداد سیوم میں شریک ہونے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ ختم فاتحہ قرآن خوانی کے بعد عالی شان کوٹھی کے گول کمرے میں معززین اور اقربا و اعزا کے لئے مکلف مسند و فرش پر چائے کا انتظام کیا گیا۔ وسیع کمرے میں اس وقت پچاس سے زاید عمائد موجود تھے جن میں سے چند صاحبان ہندو بھی نظر آتے تھے۔ ان اصحاب کے روبرو ہندوانہ طریقہ پر چائے پیش کی گئی۔ مرحوم کے چند دوست گورنمنٹ کے معزز عہدہ دار جو اس وقت دور دراز فاصلوں سے تشریف لائے۔ ان میں دو شخص قابل تذکرہ تھے۔ ایک مولوی امانت علیخاں صاحب ڈپٹی کلکٹر۔ دوسرے منشی رشید احمد صاحب انسپکٹر پولیس۔ ان صاحبوں کے علاوہ خاص روڑکی کے معززین مولوی خلیل الرحمن۔ کالے خاں صاحب سوداگر اور بابو دوارکا ناتھ وکیل بھی

موجود تھے۔ مولوی امانت علی خاں صاحب کے مقدس اور وجیہ چہرہ کے اعزاز میں سب لوگوں نے انہیں صدر مجلس کی جگہ مکلف اونی قالین پر بٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ پر بڑی شفقت سے نوجوان رفیق احمد کو جگہ دی۔ اس وقت رفیق احمد انگریزی لباس میں تھا مگر چائے کے ختم ہوتے ہی چند موجودہ علمائے تجویز کیا۔ کہ معزز متشرع باپ کی وراثت اور وصیت نامہ کے اعزاز میں نوجوان رفیق احمد کے سر پر پگڑی باندھی جائے۔ معتقدین میں بیسیوں آدمی عمدہ عمدہ تحائف اور دستار لائے تھے۔ مولوی امانت علیخاں صاحب نے ایک عمدہ پشاوری کلاہ اور مکلف عمامہ پسند کر کے رفیق احمد کے حوالہ کیا۔ اور ایک ضعیف العمر شخص نے جو مولوی صاحب مرحوم کے معتقد دوستوں میں تھا۔ کمال احتیاط اور متانت سے عمامہ نوجوان کے سر پر باندھ دیا تکمیل رفیق احمد کے بدن میں گو انگریزی لباس خوب ہی سجتا تھا۔ لیکن اسلامی عمامہ میں بھی اس وقت خاص شان ہویدا تھی۔ البتہ بجائے اسلامی مجاہد کے وہ انگریزی فوج کا نوجوان افسر معلوم ہوتا تھا جسے بجائے ملکی معاملات کے بہت سی خانہ جنگیوں سے مقابلہ کرنے کی ضرورت پڑنے والی ہو۔ گذشتہ دو روز شب میں اوسے مہمانوں کی آؤ بھگت کے سبب سے بڑی تکلیف اور زحمت اٹھانی پڑی تھی۔ باپ کی بیماری میں بھی وہ چند روز پہلے پریشان و بے خواب رہا تھا۔ پس اس کے سپید سرخی مائل چہرے پر کچھ جھلک زردی کی آگئی تھی۔ اور آنکھوں کے نیچے قدرے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ دراصل ان خانگی واقعات کے علاوہ چند دیگر مسائل بھی اس کے ناتجربہ کار دل پر تسلط کرتے رہے تھے۔ دو سال سے کیلہ ہرنگٹن کی زلف گرہ گیر میں مقید تھا۔ عرصے تک اسے امید رہی تھی۔ کہ باپ ایک عیسائی عورت سے شادی کرنے پر زیادہ ناراض نہ ہوگا۔ اور اس کی کثیر دولت بالتکلیف و زحمت اس کے ہاتھ آجائے گی مگر باپ کے خشونت آمیز رویہ سے اس کی یہ امید

کچھ عرصہ بعد قطع ہو گئی۔ اور مایوسی اُس کے دل پر تسلط کرنے لگی۔ تاہم والد کی وفات کے وقت تک سوائے شکیلہ بیگم کے شادی نہ کر سکنے کی کوئی دوسرا خطرہ اُسے پیدا نہ ہونے پایا تھا۔ اس وقت سنتے سنتے شبہات اُس کے دل میں گھر کر رہے تھے۔ کیونکہ مرتے وقت اُس کے باپ نے اپنے وصیت نامہ کا ذکر کیا تھا۔ اور چونکہ یہ ذکر رفیق احمد کی درخواست متعلقہ اجازت نکاح پر اٹھا تھا۔ اس لئے اس کا دل اس وقت سے سخت بے چین تھا۔ اور وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ شاید باپ نے اپنی دولت کے متعلق کوئی مخالص شرط قائم کر دی ہو۔ اس کے باپ کا وصیت نامہ بابو دوارکا ناتھ وکیل کے پاس تھا۔ اور مرحوم نے اس پر معلوم نہیں۔ کن گواہوں کے دستخط کرائے تھے۔ کہ اس کے والد کے اعزہ اور دوستوں میں کسی کو بھی علم اس کا نہیں تھا کہ وصیت نامہ کا کیا مضمون ہے۔ چند اشخاص نے بابو دوارکا ناتھ سے وصیت کا لب لباب معلوم کرنا چاہا۔ مگر اس شخص نے جو بابا کا رازدار اور خاموشی پسند واقع ہوا تھا۔ باشگی سب لوگوں سے کہدیا "وصیت نامہ کی ایک شرط یہ بھی ہے۔ کہ اس کا کاغذ مولوی صاحب کے سیوم کے روز مجمع عام میں پڑھا جائے۔ اس وجہ سے میں معذور ہوں۔ کہ کسی کو پہلے اس کا مضمون نہیں بتلا سکتا"۔ بہرحال اختتام چالیسے پر ان الاہجی تقسیم ہو جانے کے بعد وصیت نامہ کا وقت آیا۔ اور سینکڑوں آنکھیں یک لخت بابو دوارکا ناتھ کی طرف اٹھیں۔ نوجوان رفیق احمد کے دل میں اضطراب پیدا ہوا۔ اور اُس نے گہرا سانس لیا۔ بابو دوارکا ناتھ وکیل ایک بھاری اونی اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پہلے جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک پونچھی۔ پھر انہوں نے بائیں جیب سے ایک رومال میں لپٹے ہوئے کاغذات نکالے۔ اور کھنکار کر مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ صاحبو! میں آپ صاحبان کی اجازت سے مولوی شفیق احمد صاحب مرحوم کا وصیت نامہ پڑھتا ہوں"۔ یہ کہکر

اُس نے جھٹ پٹ رومال کھولا۔ اور اس میں سے ایک بڑا لفافہ کھینچ لیا اس لفافہ کے اندر کئی کاغذات تھے مگر انہوں نے ایک سولٹے کاغذ کا نصف تختہ باہر نکالا جسے مجمع کے چند واقف کار آدمیوں کو گواہوں کے دستخط دوسرے دکھلا دیئے۔ وکیل صاحب نے اس تختہ کاغذ کو اوپر اٹھایا۔ گویا ان کی طبیعت میں کچھ بخل تھا۔ اور وہ اُس وصیت نامہ کو ایک قسم کی قیمتی چیز سمجھ کر آسانی دوسروں کو دے دینے پر رضامند نہ تھے مگر لوگوں کا اشتیاق اضطراب کی حد تک پہونچا ہوا نظر آیا۔ تو بابو صاحب نے دوبارہ مجمع کی طرف دیکھا اور حسب ذیل عبارت ان کے منہ سے نکلی۔

"میں طبیب خاطر وصحت دماغ مندرجہ ذیل گواہاں کے سامنے وصیت کرتا ہوں۔ کہ میری صحرائی مسکنی جائداد کی آمدنی میرے انتقال کے بعد میری زوجہ عزیز خاتون کو ملے۔ اور میری نقد دولت جو ایک لاکھ بارہ ہزار روپے ہے۔ اور بینک آف بنگال آگرے میں جمع ہے۔ میرے اصلی وارث رفیق احمد کو دی جائے۔ صحرائی و مسکنی جائداد کے متعلق میری کوئی شرط جو اس سربمہر لفافہ میں جس پر میرے نام کی پانچ مہریں لگی ہوئی ہیں۔ جنکی بابت میرے گواہ مطمئن ہو گئے ہیں قلم بند کر دی گئی ہے۔ یہ وصیت نامہ میرے سیوم سے پہلے ہرگز نہ پڑھا جائے۔ وصیت نامہ کے بعد میرا سربمہر میرے فرزند رفیق احمد کو دے دیا جائے۔ پھر اُسے اختیار ہوگا۔ وہ اس خط کا مضمون اپنے واقف کاروں میں مشتہر کر دے۔ یا خفیہ رکھے۔ میں اپنے گواہ حسب ذیل تجویز کرتا ہوں۔

مولوی خلیل الرحمان صاحب۔ کالے خاں صاحب سوداگر۔ بابو دوارکا ناتھ وکیل۔

شفیق احمد بقلم خود

وصیت نامہ کے ختم ہونے پر کمرہ کے جملہ موجودین بجائے مطمئن

ہونے کے ایک قسم کی دل تنگی محسوس کرنے لگے۔ سب سے زیادہ اضطراب نوجوان رفیق احمد کو تھا۔ جس نے اپنے دل کی بے چینی کو بہت روکا۔ مگر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اس نے پُر استفہام نگاہ سے بابو دوار کا ناتھ وکیل کی طرف دیکھ کر کہا "کیا آپ وہ سربمہر لفافہ مجھے اس وقت دے سکیں گے" دوار کا ناتھ "بسر و چشم" کہہ کر لفافہ نکالا۔ اور چند مغزین کو اس کی بڑی بڑی سبز مہریں دکھلائیں۔ جن پر شفیق احمد" صاف طور سے چمک رہا تھا۔ چند آدمیوں کے منہ سے "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے" نکلا اور چند ہاتھوں سے گذر کر لفافہ رفیق احمد کے ہاتھ میں پڑا جس نے لفافہ کی مہروں کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے ایک گوشہ لفافہ کا چاک کر کے اندر سے ایک سفید موٹا کاغذ نکالا۔ اور اس کی تحریر اپنی بے چین آنکھوں کے سامنے کر دی۔ اس وقت کمرے کے جملہ ناظرین کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک منٹ تک لفافہ پر نگاہ جمائے رکھی۔ اور اس کے قریب کے آدمیوں کو بالخصوص منشی رشید احمد صاحب انسپکٹر پولیس کو اُس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوتی معلوم ہوئی۔

خط کو ختم کر کے رفیق احمد نے کسی طرف نگاہ نہ اُٹھائی۔ اور اُس کے دماغ میں اس قسم کی تاریکی و بے اعتباری سمانے لگی۔ جو کسی شخص کو اس وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔ جب وہ اپنی کوئی بڑی آرزو کسی کے پاس لے جاتا۔ اور وہاں سے ناکامیاب واپس آتا ہے۔ ایک منٹ تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا۔ اور گرم گرم سانسوں اور گلے کے بخارات کے سوا کسی چیز نے اس سکوت میں مداخلت نہ کی۔ مگر منتظرین کے دل عجیب و غریب خط کا مضمون سننے کے لئے بے تاب تھے۔ اور زیادہ دیر صبر

نہ کر سکتے تھے۔ سب سے پہلی آواز منشی رشید احمد کے منہ سے نکلی جنہوں نے بہ آہستگی کہا "صاحبزادہ صاحب کیا آپ کے والد صاحب نے ایک لاکھ روپے کے متعلق کوئی شرط قایم کردی ہے" سب لوگوں نے منشی رشید احمد کے سوال پر اپنے دلوں میں خورسندی ظاہر کی۔ اور بہت سے دلوں کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا اس خط میں کوئی بمب کا گولا بند ہے۔ جو رفیق احمد کی زبان ہلاتی رہی۔ کسی خاص معرکہ کی دھجیاں اڑا دیگا۔ رفیق احمد کا دل اس قدر مجبور اور مضطرب تھا۔ کہ اسے منشی رشید احمد کا سوال دل خراش اور لوگوں کی نگاہیں اپنی طرف انگشت نمائی کی طرح کھڑی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس کے دل میں آیا۔ کہ اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔ لیکن ہر حماقت کے پیچھے عقلمندی نازیانہ لئے کھڑی رہتی ہے پس وہ مذبذب کی حالت میں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ پھر مرے ہوئے دل سے بولا "جی ہاں میرے والد صاحب نے ایک شرط قائم کر دی ہے" اور یہ کہکر اُس نے بڑی نفرت آمیز حرکت سے لفافہ منشی رشید احمد صاحب کی طرف پھینک دیا۔ تین چار آدمی جھٹ پٹ منشی رشید احمد صاحب کے شانوں پر آ کھڑے ہوئے جن میں سے ایک خوب صورت نوجوان لڑکا "بلند اختر" قابل ذکر تھا۔ جو رفیق احمد کی پھوپھی کا بیٹا تھا۔ اور سن وسال میں رفیق احمد کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ رشید احمد کے لفافہ میں سے خط نکال کر پڑھنے سے تمام لوگوں کو معلوم ہوگیا۔ کہ اس خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"نور نظر۔ رفیق احمد میرا ایک لاکھ روپیہ بیشک تمہارے لئے ہے لیکن تم آلیور ہیرنگٹن کی لڑکی سے نکاح کرسکتے۔ اُس کے چچا پادری ہیرنگٹن نے ایک بحث میں مجھے سخت و ناملایم کلمات سے یاد کیا تھا۔ اور بعض الفاظ اس قسم کے کہے تھے۔ جن کا ناگوار اثر

میری ذات سے گذر کر ان بزرگوں تک پہونچتا تھا۔ جن کی تقلید میرے لیے اس دنیا میں موجب نجات ہے۔ اس لئے میں اس کی بھتیجی سے بحالت کفر اپنے بیٹے کو منسوب نہ ہونے دونگا۔ البتہ اگر شکیلہ ہیرنگٹن مشرف باسلام ہوجاوے۔ تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ اگر تم شکیلہ ہیرنگٹن سے باوجود اس کے مذہب عیسوی کے نکاح کرلوگے۔ تو میرا سب روپیہ مدرسہ عربیہ دیوبند کے کاموں میں صرف کیا جاویگا۔ اس کے متعلق میں نے بینک آف آگرہ کو ہدایت کردی ہے۔ میں نے دنیا میں اگر کوئی نیکی کی۔ تو وہ صرف مقدس مذہب کی خدمت ہے۔ میں نے تمہیں بڑی آرزو سے مذہبی مجاہد بنانے کے لئے پالا ہے۔ اور اگر تم میرے ارشاد کی تعمیل نہ کرو۔ تو مجھے تمہیں عاق کردینے سے گریز نہ ہوگا۔ تم نے پچھلے دو سال میں مجھ سے شکیلہ ہیرنگٹن کا اتنی مرتبہ تذکرہ کیا ہے۔ کہ میں نے تمہیں سزا دینے کے لئے یہ شرط قائم کردی۔ اگر تم اس خط کو چاک ہی کرڈالو۔ تو بنک آف بنگال تمہیں میری مرضی کے خلاف ایک پیسہ بھی نہ چھونے دے گی۔"

اس خط کے مضمون سے تمام کمرے میں ایک جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ بہت سے آدمیوں کے منہ سے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکلا۔ اور اہل مجلس کا کثیر حصہ مولوی شفیق احمد مرحوم کے جوش عقیدت مذہبی پر تحسین و آفرین کہنے لگا۔ البتہ چند مہذب آدمی مرحوم مولوی صاحب کی تنگ دلی پر متاسف بھی ہوئے۔ مگر سب سے زیادہ خوشی اس عجیب وغریب خط کے مضمون سے بلند اختر کو حاصل ہوئی۔ گو اس نے اس مسرت کے اظہار کو بہت کچھ دبائے رکھا۔ بلند اختر ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ اسے وہ تمکنت آزادی اور دولت کس طرح ہاتھ آسکتی تھی جو اب بلند بیچ رفیق احمد کے ہاتھوں سے پرواز کرنے والی

تھی ۔ اس کے خبث نفس پر ایک قسم کا اطمینان سوار ہونے لگا ۔ اور اس نے فتحیاب نظروں سے رفیق احمد کی طرف دیکھا ۔ اصلیت یہ ہے ؎

شور بختان بہ آرزو خواہند
مقبلاں را زوال نعمت وجاہ

دراصل دنیا کی زندگی ایک قسم کی قمار بازی ہے ۔ اور اس کے مشاغل شطرنج کے گھوڑے ہیں ۔ آج کی بازی میں خوب صورت رفیق احمد بری طرح سے ہار گیا تھا ۔ کاش اُسے معلوم ہوتا ۔ کہ اُس سے چار میل کے فاصلے پر اُس کی معشوقہ مسکیلہ ہیرنگٹن کے خیالات بھی اُسی طرح پریشان اور غم ناک ہو رہے ہیں ۔

چھٹا باب

دفینہ کی تلاش

کامران مسکیلہ ہیرنگٹن سے رخصت ہو کر روڑکی آیا ۔ اور ایک سرائے میں مقیم ہو گیا ۔ پھر دوسرے روز اُس نے اپنے لئے ایک چھوٹا سا مکان محلہ فانوں گویاں میں کرایہ پر لے لیا ۔ اسی اثنا میں ایک تار لاہور بھیج کر اپنے اسسٹنٹ ہدایت علی کو بھی بلا لیا ۔ اور کھانا پکانے کیلئے ایک بوڑھا باورچی بھی نوکر رکھ لیا ۔ کامران نے لاہور میں کئی ماتحت رکھ چھوڑے تھے ۔ اور ان سے مختلف مواقع پر کام لیا کرتا تھا جس شخص

ہدایت علی کو اس نے روڑکی طلب کیا۔ اور سینتیس برس کی عمر کا دبلا پتلا انگریزی وار دو خواں شخص تھا۔ اور بہت معمولی کپڑوں میں گذر کرتا تھا۔ ہدایت علی کسی قدر سیاہ فام تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں چھوٹی چھوٹی رکھتا تھا اس کی آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی اور ناک لمبی و پتلی تھی۔ گو سنجیدگی و دانشمندی اس کے چہرے سے ان لوگوں پر عیاں ہوتی تھی جو قیافہ شناسی میں کچھ دخل رکھتے ہیں۔ کامران نے اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ وہ پانچ منٹ میں سر پر دوپٹہ ٹانگوں میں دھوتی مسلمان بہادر بن کر صف نگر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس کی آمد سے پہلے کامران بذریعہ ڈاک ایک خط شکیلہ ہینگلٹن کے پاس رجسٹری کرا کر بھیج چکا تھا جس کی وجہ سے شکیلہ ہینگلٹن کامران اور ہدایت علی کے انتظار میں تھی دس بجے دن کے قریب کامران ایک بوڑھے سفید ریش ٹھیکہ دار کی صورت میں ہدایت علی کو ساتھ لے کر یکہ میں سوار ہوا۔ اور نصف گھنٹے کے بعد شکیلہ ہینگلٹن کے بنگلے پر پہونچ کر بوڑھے خدمتگار کے ذریعے سے اپنی اطلاع کرائی۔ شکیلہ ہینگلٹن نے اوسے اندر طلب کیا۔ ہدایت علی اُس کے ساتھ لگا رہا۔ کامران نے اُس وقت کلوبیگ ٹھیکہ دار کا نام اختیار کر لیا تھا۔ شکیلہ ہینگلٹن نے خط کے ذریعے اطلاع ہو جانے پر اُسے رحمت کے سامنے کلوبیگ کے نام سے مخاطب کر کے کہا یہ دیکھو تمہاری مس بالٹی مور نے تعریف کی ہے۔ ہم اپنے مشرقی باغیچہ میں کچھ ترمیم کرانا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چل کر جگہ دیکھ لو۔ اور اپنا تخمینہ کر کے بتاؤ۔ کامران نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔ حضور باہر چل کر اپنے سامنے اس شخص کو کام سمجھا دیں۔ حضور کی مرضی کے موافق بہت اچھا کام ہو جائے گا۔ اور لاگت بھی واجبی لگے گی۔ شکیلہ ہینگلٹن کو تعجب تھا۔ کہ یہ سرراغ رساں کیسی جھبلی سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور

اس نے اپنے آپ کو ایک جوان آدمی سے اتنا بوڑھا کس طرح بنا لیا ہے لیکن اُسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ کامران ضرورت کے وقت عورت کا بھیس بھی بڑی کامیابی سے بدل سکتا تھا شکیلہ ہیرنگٹن ایک بڑا کاغذ باکٹ بک۔ اور فاؤنٹین پین رحمت کے ہاتھ میں دے کر کامران کو ساتھ لئے ہوئے باغیچہ کے اندر داخل ہوئی۔ اور پختہ نالی کے اوپر کھڑی ہو کر کہنے لگی۔ میں اس جگہ ایک مستطیل حوض بنانا چاہتی ہوں جس میں آبشار سے پانی لیا جائیگا۔ اس حوض کے اندر ایک سنگین فوارہ لگے گا جس سے آناً فاناً تمام باغیچہ سیراب کیا جائیگا۔ فوارے کی تیاری میں ابھی عرصہ لگے گا۔ سردست تم صرف پختہ حوض تیار کرو۔ ہم اس میں مچھلیاں پالیں گے۔

بہت اچھا۔ بہت اچھا" کامران کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ مستعدی سے بولا" حوض کتنا چوڑا اور گہرا بنایا جائے"

شکیلہ کاغذ پر مستطیل شکل بنا کر کچھ سوچتی رہی۔ بعد ازاں کامران کے ہاتھ سے فیتہ لے کر بولی" اس مقام سے بیس گز ادھر اور بیس گز اُدھر ناپ کر دکھلاؤ" کامران اور ہدایت علی نے جھٹ پٹ زمین ناپ کر نشان لگا دیئے۔ اور کامران مسکرا کر بولا" حضور اتنے بڑے حوض میں تو خرچ زیادہ ہو گا" مگر شکیلہ باغیچہ کے لئے اس سے چھوٹا حوض کچھ کام نہیں دے سکتا لیکن مجھے ڈر ہے۔ کہ چوڑائی کے لئے بہت سا حصہ باغیچہ کا برباد کرنا پڑیگا۔ خیر یہ حوض تیس گز لمبا دس گز چوڑا۔ اور تین گز گہرا بنایا جائے۔ اب تم تخمینہ لگا کر بتلاؤ۔ کیا خرچ ہو گا" کامران نے اپنی جیب سے دو فٹہ مثلث اور پاکٹ بک وغیرہ نکال کر ہدایت علی کے ہاتھ میں دینے اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پانچ منٹ تک حساب لگا کر بولا" مس صاحب۔ آج کل اینٹ ذرا گراں ہے۔ اور اس کام میں مضبوطی کے خیال

سے چونا ہی معمول سے زیادہ خرچ ہوگا۔ پس اچھا تخمینہ ایک سو چالیس روپے کا بیٹھتا ہے لیکن میں کفایت سے ایک سو تیس روپے میں کام کر دونگا۔" شکیلہ ہیرنگٹن رحمت کو دھوکے میں رکھنے کے لئے کچھ اعداد لکھ لکھ کر جمع اور تقسیم کرتی رہی۔ پھر منہ سرخ کر کے بولی "تمہاری سفارش مس بالٹی مور نے کی تھی۔ اس وجہ سے میں تمہارے تخمینے پر بھروسہ کرتی ہوں۔ لیکن میں ایک خط آج صاحب ایگزیکٹو انجینیر محکمہ نہر کو بھیجوں گی۔ اگر مجھے معلوم ہوا۔ کہ تمہارا تخمینہ گراں ہے۔ تو میں دام کاٹ لوں گی۔" کامراں نے کئی بار سر جھکا کر کہا۔ "اگر ایک روپے کی بھی زیادتی نکلی تو حضور دس روپے جرمانہ کریں۔" شکیلہ ہیرنگٹن نے جس قدر گفتگو کامران سے کی تھی۔ وہ سب اُس خط کے موافق کی تھی۔ جو کامران نے اسے دو روز پہلے پوچھ چکا تھا۔ شکیلہ نے کامران کے تخمینہ پر اطمینان ظاہر کیا۔ اور وہ اس وقت ہدایت علی کو ساتھ لے کر محکمہ نہر کے ٹھیکہ دار کے پاس موضع تاشی پور آیا۔ جس سے گذشتہ شب کو مل کر وہ تمام امور طے کر چکا تھا۔ دو درجن مزدور کامران کے لئے صبح سے تیار تھے۔ نصف گھنٹے کے اندر ہدایت علی کی نگرانی میں شکیلہ ہیرنگٹن کے باغیچہ کے اندر داغ بیل لگ گئی۔ اور خوبصورت پودوں اور پھولوں کے سر پر پھاوڑہ چلنے لگا۔ اس اثنا میں دو گاڑیاں پختہ اینٹوں کے شرقی برآمدہ کی طرف آئیں۔ اور کہ ابھی مزدور ایک فٹ گہری زمین ہی نہ کھود چکے تھے۔ کہ کامران بھی اپنا سوقتہ پر آن پہونچا۔ کامران اور ہدایت علی کھانے سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ اور مزدوروں کو پورے دن کی اجرت دینی تھی۔ پس دونوں نے مضطرب دل اور مستعد ارادے سے تمام دن پھاوڑہ پر پھاوڑہ چلوایا۔ اس زمین میں تری اتنی زیادہ تھی کہ مٹی بڑی آسانی سے کھد سکتی تھی۔ شکیلہ ہیرنگٹن بھی [illegible]

تھی۔ اوکتنی ہی مرتبہ بار بار مڑ مڑ کر کھڑائی دیکھنے آئی۔ رحمت نے کئی بار شکیلہ سے کہا "بیٹی تو فضول حوض میں روپیہ برباد کرتی ہے لیکن شکیلہ ہیرنگٹن نے ہر مرتبہ مسکرا کر یہی جواب دیا "پیاری رحمت تمہیں اندازہ نہیں۔ میرے بنگلہ میں حوض اور فوارے سے بڑی بہار آجائے گی۔ اور گرمیوں کے دنوں میں یہ حوض اور فوارہ کیسا لطف دیگا اگر کسی طرح حوض کے گرد پردہ کھینچ سکے۔ تو گرمیوں میں نہانے دھونے کا بڑا آرام رہے گا" یہ الفاظ شکیلہ ہیرنگٹن نے دل مضبوط کر کے کئی بار ادا تو کر دیئے تھے۔ لیکن آج اس کے قلب پر ایک بوجھ پڑ گیا تھا۔ کبھی امید رہ رہ کر کہتی تھی۔ کاش آج دفینہ نکل آئے۔ اور میں اپنی ساری دولت رفیق کے قدموں میں ڈال دوں" کبھی نا امیدی کہتی تھی "کامران کا خیال بالکل درست تھا۔ اب تک زمین میں کہیں دفینہ کا نام نہیں۔ ضرور خزانہ نکل گیا" رحمت اور نوکروں کو بے حد تعجب تھا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن بار بار اس مقام پر کیوں پھر رہی ہے۔ شاید ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے نانا کی ساری عمر کی کمائی اس حصہ زمین میں دفن کی گئی تھی۔ سورج غروب ہو جانے پر جب کچھ کچھ تاریکی پھیلنے لگی۔ اور سرو مہا کے جھونکے تمام دن کے تھکے ماندے مزدوروں کو آگ اور گھر کی طرف متوجہ کرنے لگے۔ تو وہ پھاوڑے رمک روک کر کامران کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی مرتبہ رحمت بھی شکیلہ ہیرنگٹن کے ساتھ اس مقام پر آئی تھی۔ لیکن اس وقت شکیلہ اس کو کسی کام میں لگا دیتی تھی۔ تاکہ کامران سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملے۔ جب وہ غروب آفتاب اور اللہ کے کام کا خیال کر کے موقعہ پر آئی۔ تو کامران نے اسے تنہا دیکھ کر دور سے استقبال کیا۔ اور بڑی متاسف آنکھوں سے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا "معزز مس مجھے اندیشہ ہے۔ کہ کہیں میرا خیال بالکل درست

نہ نکلے۔ کیونکہ ہم اس زمین کو طول و عرض و عمق معلوم میں کم و بیش اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ اور آج تین فیٹ گہری خندق کھد چکی ہے۔ لیکن کوئی چیز دفینہ پر روشنی ڈالنے والی برآمد نہیں ہوئی۔ اگر آپ کے والد اپنا روپیہ یہاں دفن کرتے۔ تو اُس کے کچھ آثار یا علامات ضرور ہوتیں۔ اب کام بند کرنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک مزدور کا پھاوڑہ کسی سخت چیز پر پڑا تھا۔ ہم نے سمجھا۔ کہ دفینہ کا صندوق نکلے گا لیکن اس چیز کو باہر نکالنے سے معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی سنگین سروری کا ستون ہے۔ آیئے آپ بھی دیکھیئے۔" کامران کی یاس آمیز اور صاف گفتگو سے شکیلہ ہیرنگٹن کا دل کانپ اُٹھا۔ اور وہ سمجھنے لگی۔ کہ اب واقعی وہ افلاس اور احتیاج کے درجہ پر پہونچنے والی ہے۔ وہ افسردہ دلی سے خاک آلودہ ستون کے پاس آئی۔ جسے مزدور صاف کر رہے تھے۔ یہ پتھر کوئی پانچ فیٹ لمبا اور ایک فیٹ چوڑا ہوگا۔ اس پر سنگ تراش کے خوش نما بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اور ستون کے وسط میں کوئی تحریر سنسکرت زبان میں تھی۔ اس موقعہ پر کوئی سنسکرت جاننے والا موجود نہیں تھا۔ پس ستون کسی پرانے زمانہ کی بے قیمت چیز سمجھی گئی۔ مگر مزدوروں میں ایک بڑا تجربہ کار سال خوردہ تھا۔ اور وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں تعمیر سے بھی اب سے بیس سال پہلے شریک رہا تھا۔ اس نے نوجوان لڑکی کو اپنے قریب دیکھ کر مست بصری آواز میں کہا "ہم نے حضور کے باپ اور میم صاحب کو بھی دیکھا ہے حضور کی قسمت بڑی زبردست ہے۔ اس پتھر کے ستون ہر جگہ نہیں نکلا کرتے تیس سال ہوئے۔ ایسے ستون منگلور میں نکلے تھے۔ اس زمین میں کسی راجہ کی بارہ دری نکلے گی۔ بس بابا کو ہزاروں روپیہ پتھروں کے بیچنے سے مل جاویگا۔ اور کیا معلوم ہے۔ اس زمین میں منگلور کی طرح اشرفیاں بھی نکلیں" بوڑھے مزدور کی تقریر سے

سب آدمیوں کے منہ کھل گئے۔ کامران ہدایت علی اور شکیلہ ہیرنگٹن نے بڑی دلچسپی ظاہر کی شکیلہ نے چند سوالات منگلور کے دفینہ اور اور پتھروں کے متعلق کئے۔ بعدازاں ان تینوں نے پتھر کو غور سے دیکھا۔ اگرچہ اس وقت میلا اور مٹی میں بھرا ہوا تھا مگر اس کی سڈول تراش اوس کے بیش قیمت ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ اور بارہ دری کے نکلنے کی قوی امید سے یہ خیال پختہ ہوتا تھا۔ کہ یہاں کسی زمانہ میں کوئی راجہ رہتا تھا۔ پھر کیا عجب ہے۔ کہ کچھ دفینہ بھی نکل آئے۔ تاہم شکیلہ ہیرنگٹن کے نانا کی دولت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور یہ بات نوجوان حوصلہ مند لڑکی کے لئے کچھ کم مایوسی کرنے والی نہ تھی منگلور کے معاملہ کو یاد کر کے مزدوروں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اور باوجود نکان کے وہ شب کو بھی کھدائی کا کام جاری رکھنا چاہتے تھے۔ مگر کامران نے ناگوار موسم اور دن بھر کی تکان کا خیال کر کے اس تجویز کو ناقابل عمل سمجھا۔ اور اُس نے مزدوروں کو اجرت تقسیم کرنی شروع کر دی۔ اور موقعہ کی رات بھر حفاظت رکھنے کے لئے ہدایت سے مشورہ لیا۔

ہدایت علی اور بوڑھے جہاندیدہ مزدور نے مستعدی ظاہر کی لیکن ایسی ٹھٹھرانے والی سردی میں کھلے میدان کے اندر کس طرح قیام ہو سکتا تھا۔ اس وقت کو معلوم کر کے شکیلہ ہیرنگٹن نے بڑی حاضر جوابی سے کہا "میرے ہاں ایک چھول داری اور بڑا خیمہ موجود ہے۔ میرے والد اکثر شکار کو جایا کرتے تھے۔ تم لوگ چھول داری سے کام لے سکتے ہو" چھولداری کا نام سن کر کامران اچھل پڑا۔ اور اُسے ایک مشکل حل ہونے کا ذریعہ مل جانے سے کچھ مسرت ہوئی۔ ایک لالٹین اور مشعل کی مدد سے چماروں نے چھولداری کھڑی کر دی۔ ایک مسلمان

مزدور نے جھال آصف نگر کے بنیئے سے آٹا۔ دال۔ شکر وغیرہ لادی۔ مسلمان معمار اور ٹھیکہ دار کے لئے شکیلہ نے اپنے باورچی خانہ سے کچھ گوشت اور دو ٹوٹی پھوٹی نوکروں کی چارپائیاں اور چند کمبل دلا دیئے۔ اس خانہ بدوشی میں ان تینوں نے سردی میں اکڑ اکڑ کر رات کاٹی۔ اور کئی دفعہ چائے تیار کر کے پی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ دراصل جس زمین کے نیچے کے حالات کسی کو اسی طرح معلوم نہیں۔ اس طرح اسے اپنی آئندہ زندگی کا بھی کوئی علم نہیں جس طرح زمین میں پھاوڑہ مار کر کیفیت معلوم کیجاتی ہے۔ اسی طرح اُسے انسان اپنی زندگی میں ہاتھ پاؤں مار کر کچھ حاصل کرتا ہے لیکن اسے زمین کے سینہ کی طرح اپنی زندگی آخر تک ہی تاریک نظر آیا کرتی۔ اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ کل کیا پیش آنے والا ہے۔

ساتواں باب

ان دنوں جوشِ جنوں ہی تیرے دیوانے کو

مولوی شفیق احمد کے وصیت نامہ نے سویم کے بعد والے چند روز نوجوان رفیق احمد کے لئے پُر از مایوسی و رنجیدگی ثابت کیئے۔ اس کی امیدوں اور آرزؤں کا قلعہ اس کی آنکھوں کے آگے ہوا میں غائب ہونے لگا۔ اور او سے صحیح اندازہ اس بات کا ہوگیا۔ کہ وہ یا تو شکیلہ ہیرنگٹن سے مفلس بن کر شادی کرلے۔ یا اپنے والد کی دولت کا مالک بنکر اُس سے ہاتھ اوٹھالے۔ مگر شکیلہ اور والد کی دولت کا ایک ساتھ جمع ہونا ناممکن ہے۔ اس کی جوانمردی اور شرافت اس بات کی متحمل نہیں ہوتی تھی۔ کہ وہ محض ناکارہ و محتاج آدمی کی طرح شکیلہ ہیرنگٹن کے ٹکڑوں پر جا پڑے۔ اور اس کے خاندانی دنیاوی تعلقات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کہ وہ باپ کی مرضی کے خلاف عیسائی لڑکی سے نکاح کرکے اس بات کا عملی ثبوت اپنے دوستوں اور دشمنوں کے سامنے پیش کرے۔ کہ اگر باپ مذہب اسلام کا شیدائی تھا۔ تو بیٹا اس دین کو لاپرواہی کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن سب خیالات سے زیادہ مستحکم اور تکلیف دہ شکیلہ ہیرنگٹن کی یاد تھی۔ جو دو سال سے اُس کے دل میں بیٹھ کر تمام رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔ گذشتہ بارہ مہینے میں اُس نے بے حد کوشش کی۔ کہ اپنے دل کو قابو میں لاکر شکیلہ ہیرنگٹن کا خیال بھلا دے۔ اور باپ کے طعن و تشنیع سے

متاثر ہو کر اُس نے شکیلہ کو کہلا بھیجا تھا۔ کہ جب تک وہ مذہب اسلام قبول نہ کرلے۔ یہ اس کے گھر میں قدم نہ رکھیگا۔ اس خط کے بعد اپنے دل پر جبر کر کے وہ ایک سال تک نہ شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاں گیا۔ نہ کبھی اُس کی خیر لی۔ مگر اتنے عرصے کی جدائی نے اس کے دل سے محبت دور کرنے کے بدلے اس محبت میں بہت سا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر ایک سال پہلے اُس نے شکیلہ ہیرنگٹن کے اختلاف مذہب پر ناراضی ظاہر کر کے اُسے اپنے مذہب کا دشمن سمجھا تھا۔ تو بارہ ماہ کی مدت نے ان سب تفرقوں کو دھو کر اُس کے سامنے شکیلہ ہیرنگٹن کو ایک معصوم حور کی صورت میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے باپ کے بستر مرگ پر گرنے کے دنوں میں اُس نے پورا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنی حماقت پر پشیمانی ظاہر کرنے کے لئے شکیلہ ہیرنگٹن کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لے گا۔ اور اُس سے نکاح کر کے کبھی اُس کے مذہب میں مداخلت نہ کرے گا۔ لیکن اس کے والد کی وفات نے وقتاً اُس کے ارادوں کو آدبوچا۔ اور اب اُسے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ شکیلہ ہیرنگٹن سے دوستی کرنی چاہے گا۔ تو اپنے باپ کے ترکہ اور خاندانی اعزازات سے اسے دشمنی ٹھان لینی پڑے گی۔ وہ گذشتہ تین شبانہ روز سارے پہلو اپنے دل کے روبرو لا لا کر سوچتا رہا۔ کہ کیا کرے؟ لیکن ہر امر کی غور و پرداخت کے وقت اوسے شکیلہ ہیرنگٹن کی پیاری صورت سامنے نظر آئی۔ اور آخر کار اس کا دماغ شکیلہ ہیرنگٹن کی یاد سے لبریز ہو گیا۔ شکیلہ کے دل فریب چہرے کو کوئی شخص ایک دفعہ دیکھ کر نہیں بھول سکتا تھا۔ چہ جائے کہ وہ شخص جو مہینوں تک ہر روز اُس سے ملتا رہا۔ اور اُس کی تشنق خیز آنکھوں کے راز پا چکا تھا۔ اُسے فراموش کر سکے۔ اُس کے لئے اب یہ امر بالکل

ناممکن تھی۔ کہ وہ زیادہ عرصے تک شکیلہ ہرنگٹن کی مفارقت میں صبر کر سکے۔ اور سے اپنی محبت کے نشے میں شکیلہ ہرنگٹن شہید وفا معشوقہ معلوم ہونے لگی۔ اس نے اپنے دل پر کئی بار لعنت بھیجی۔ کہ وہ ایسی فرشتہ خصلت حور شمائل معشوقہ کو ایک سال تک بظاہر بھلا کر خاموش بیٹھا رہا۔ اور اس عرصے میں ایک روز بھی اُس کے ہاں نہ گیا۔ گو ایام ہجر میں کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا تھا۔ کہ وہ اور سے اپنی آنکھوں سے دور کر سکے۔ بلکہ وہ دن اور رات کی گھڑیاں گن گن کر اس وقت کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ کہ اس کے والد اُسے شکیلہ سے نکاح کرنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن اگرچہ اُس نے سینکڑوں بار اُن سے درخواست کی لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ حتےٰ کہ آخری درخواست جو موت سے چند لمحہ پہلے کی گئی تھی۔ وہ بھی ناگوار طبائع پر گزری اور باپ کی وصیت اس کام کی دشمن نکلی۔ اس وقت وہ اپنے باپ کی شاندار کوٹھی کے کتب خانہ میں بیٹھا تھا جس میں چاروں طرف شیشے کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ طوالت میں بہت زیادہ مگر چوڑائی میں صرف دس فیٹ تھا۔ اس لئے مستطیل اور قدرے تنگ معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اس میں گنجائش بہت تھی۔ رفیق احمد غرب کی طرف منہ کئے ہوئے گول میز پر بیٹھا تھا۔ میز پر خوبصورت چادر پڑی ہوئی تھی۔ اور دو تین انگریزی کتابیں اور کاغذات و لفافہ جات کا بیڈ موجود بکس رکھا تھا۔ جب وہ ان خیالات پر پہونچا۔ تو اُسے اپنے کمرے میں تاریکی سی معلوم ہوئی۔ وہ اپنے قلمدان سے قلم اُٹھا کر شکیلہ ہرنگٹن کو ایک خط لکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ اور مشرق کی جانب برآمدے میں خوب دھوپ تھی۔ اب یکایک کمرے میں تاریکی ہو جانے سے اس نے پشت کی طرف منہ پھیر کر دیکھا۔ تو اور سے دور تک دھوپ نہ دکھائی دی۔ وہ باہر آکر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت آفتاب کے اوپر

سیاہ ابر آیا ہوا تھا۔ چاروں طرف گہرے گہرے بادل جمع ہو رہے تھے۔ سردی میں صبح کے وقت دھوپ سب کو اچھی معلوم ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اس وقت کا ابر غلیظ اور یکدم آسمان اور مست کا نپتے ہوئے پرندوں کی آواز سنتے وہ دنیا تاریک سی نظر آنے لگی۔ دراصل اُس کے دل کی کیفیت اس وقت کے آسمانی تغیرات کی ہمزبان ہو رہی تھی۔ گو اوسے معلوم نہیں تھا۔ کہ آسمان کے سیاہ سیاہ ڈراونے بادل بھی بالآخر اس قدر بارش بخش ثابت نہیں ہوتے اور ان کے کناروں پر سفید نقرئی کرنوں سے امید اور بہجت کے آثار موجود رہے لیکن دل تنگی کے وقت انسان سب چیزوں کو مصیبت خیز سمجھا کرتا ہے۔ وہ پھر بہ آہستگی گول میز کے پاس آبیٹھا۔ بعد ازاں اس نے اپنے ڈسپیچ بکس کے اندر سے ایک تصویر نکالی۔ جس کے تبسم بھرے اور مست ناز آنکھوں سے وہ بے تاب ہوگیا۔ اس نے متوالی آنکھوں سے تصویر کے ہونٹوں کو بوسہ دیا۔ اس کے دل میں ایک حرارت پیدا ہوئی۔ اور اس نے جھلا کر بکس کے اندر سے اپنے باپ کا خط نکالا۔ اور جوش بھری آواز سے کہنے لگا "نہیں میں ایسے متعصب باپ کے احکام کی تعمیل ہرگز نہ کرونگا۔ میری پیاری سکینہ کاش تجھے خبر ہوتی۔ کہ میں تیرے لئے کس قدر بے تاب ہوں مجھے تو ایک لاکھ روپیہ کہیں زیادہ پیاری ہے۔ یہ کہہ کر اوس نے والد کے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مشرق کی طرف آسمان میں بجلی کوندی۔ اور کمرے میں تاریکی بڑھ گئی۔ اب یکلخت لاکھ روپیہ پر لات مار کر اُس نے دوسرے راستے پر نگاہ ڈالی۔ اور اوسے معشوقیاں گدا۔ کہ والد کے حکم سے انحراف کرنیکے بعد اُسے کوئی استحقاق حاصل نہیں تھا۔ کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں رہے یا اوس کی آمدنی میں سے کچھ اپنے اوپر خرچ کرے۔ اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور وہ آئندہ کی افلاس بھری زندگی کا خیال کر کے کانپ گیا۔ بے شک وہ سکینہ ہیرگٹن پر ایک لاکھ روپیہ قربان کرنے کیلئے تیار

تھا لیکن وہ محض بے حیا بگٹال کی طرح اوسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔
شکیلہ ہیرنگٹن بڑے امیر گھر کی بیٹی تھی۔ اور کمال ناز و نعم کے ساتھ پرورش
پانے کے بعد اس قابل نہ رہی تھی۔ کہ ایک محتاج آدمی کے ساتھ بسر کر سکے۔
پس رفیق کو دل کی طرف سے ہدایت ہوئی۔ کہ اوسے ہاتھ پاؤں ملا کر کوچ کرنا
چاہیے۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کو اپنی زوجیت میں لانے کے پہلے اپنے آپ کو
خود مختار ثابت کر دینا چاہیئے۔ اس کی محبت اور وفاداری کا وہ عرصہ دو سال
سے معترف تھا۔ یہ تو کسی طرح ممکن نہ تھا۔ کہ وہ اوسے چھوڑ کر کسی دوسرے سے
دل لگا سکے۔ ایک سال گذرا جب اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کو مذہبی اختلاف
کی وجہ سے فراموش کر دینے کی دھمکی دی تھی جس کا اُس نے بڑے تاسف
آمیز لفظوں میں یہ جواب دیا تھا۔ کہ گو دنیا میں کوئی طاقت اسے مذہب
تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ تاہم رفیق احمد کے سوا دنیا بھر میں کوئی دوسرا
آدمی اس کے دل پر کبھی حکومت نہ کر سکے گا۔ اور وہ دس دن تک صبر کیساتھ انتظار
کرے گی جب کہ وہ اپنے غصہ کو دور کر کے اُس کی طرف متوجہ ہو۔ رفیق احمد
گذشتہ واقعات کو خواب سمجھ کر تعجب کرنے لگا۔ کہ وہ ایسی ایسی باتوں کے
باوجود کس طرح شکیلہ ہیرنگٹن کے دل کو ایسی بے رحمی سے صدمہ پہونچانے پر
کمربستہ رہا۔ اس کے دل میں اب پشیمانی اور غصہ کی جگہ محبت اور ہمدردی بھر گئی
اور ساتھ ہی اوسے خیال آگیا۔ کہ جب اُس نے شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاں کی آمد و
رفت بند کی۔ ان دنوں وہ مس بالٹی مور کے ذریعے سے قرض لے کر گذارہ
کر رہی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی شکیلہ ہیرنگٹن کے باپ کا پُراسرار خط
یاد آگیا۔ اُس نے اپنے دل میں دعا کی۔ کہ غریب معصوم لڑکی کو دفینہ مل گیا
ہو۔ ساتھ ہی اوسے یہ خیال آیا۔ کہ اگر دفینہ کوئی اوسے دھوکہ دے کر نکال
لے گیا ہو۔ یا دفینہ کی جگہ محض مٹی نکلی ہو۔ تو شکیلہ ہیرنگٹن افلاس کے درجہ
پر پہونچ گئی ہوگی۔ اس آخری اندیشہ نے اسے مضطرب کر دیا۔ وہ تیار ہو گیا۔ کہ

ابھی جاکر اُس کی خبر لائے۔ اور اس کے پاؤں پر گر کر معافی مانگے۔ مگر ابھی وہ اپنے بائیسکل میں ہوا ہی بھر رہا تھا۔ کہ آسمان سے بڑی بڑی بوندیں گرنی شروع ہوئیں۔ اور ساتھ ہی دل میں بیٹھنے والی خنک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بڑے بڑے اولے برآمدے کے اندر تڑاتڑ گرنے لگے۔ اس منظر سے وہ گھبرا کر برآمدے میں آیا۔ اور ایک اولہ ہاتھ میں اوٹھا کر اُس کے وزن کا اندازہ کرنے لگا۔ اس وقت اوسے آسمان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا۔ کہ مطلع شام سے پہلے صاف ہونیوالا نہیں۔ اور شاید سات روز کی جھڑی لگی ہو۔ وہ افسوس سے گہرا ٹھنڈا سانس بھر کر لائبریری میں داخل ہوا۔ اور شرقی دروازے کی چٹخنی لگا کر بڑے ہال کے اندر ہوتا ہوا زنان خانہ میں اپنی والدہ کے پاس چلا گیا +

آٹھواں باب

کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

رات کے دس بجے ہونگے۔ مس شکیلہ ہیرنگٹن اپنے استراحت خانہ میں خواب کی تیاری کر رہی تھی۔ کمرے کے اندر گرم اور آرام دہ چیزوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور اوس کے خوبصورت بدن اور نرم آرام دہ کپڑوں اور گرم سمور کی موجودگی میں بظاہر زیادہ تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔ مگر سیر و نی تکلیفات اس کے دل کی بے چینی اور اعضا کے انتشار کو ساکت نہیں کر سکتی تھیں۔ آج تمام دن بارش کے مارے ساری دنیا سرد ہوا کیچڑ اور تری کے مصیبت خیز منظر میں ڈھکی رہی۔ کامران اور ہدایت علی خندق کے کنارے چھول داری میں پڑے ہوئے موہوم دیئے کی حفاظت کرتے رہے لیکن مزدوروں نے بالاتفاق ایسی سردی اور خوفناک بارش میں کام کرنے سے انکار کر دیا صبح کے آٹھ بجے سے دس بجے تک کچھ کھدائی ہوئی اور دس بارہ ستون نکالے گئے۔ لیکن بارش شروع ہوتے ہی سب مزدور کام چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ کامران اور ہدایت علی کو ستونوں کی برآمدگی نئے شوق اور نئی امیدوں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی رہی۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن اپنے نانا کی چمک دار اشرفیوں کے بدلے ان میلے کچیلے پتھروں سے مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے روپے کی طرف سے ہاتھ دھو کر تمام دن بیدگی اور اضطراب میں گذارا۔ بارش نے رات کے ساڑھے نو بجے تک تھمنے کا نام نہ لیا آج کی رات کرسمس کی شب تھی۔ اور جسکو عیسائی دنیا میں بڑا دن

سنایا جانے والا تھا جن لوگوں کو دنیا کے ساتھ گہرے تعلقات ہونے کے
باوجود روپے پیسے کی طرف سے اطمینان تھا۔ انہوں نے بڑے دن
کی تیاری میں دعوتوں اور جلسوں کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن جیسی
جریدہ لڑکی کے لئے جو کس مپرسی یتیمی اور قرضوں کے بوجھ سے نڈھال ہو
رہی تھی۔ بڑے دن کی آمد متوحش یادگاروں سے پُر تھی۔ وہ اپنے استراحت
خانہ میں سیاہ بلوط کی کرسی پر آ کر بیٹھی۔ توکرے کے دوکش پر خوبصورت
الارم کلاک لئے دس بجائے سنگ مرمر کی خوب صورت میز پر قیمتی
لیمپ کی تیز روشنی میں شکیلہ ہیرنگٹن کی خوبصورت نازک پیشانی
چمکی۔ اور اس نے دائیں طرف گردن موڑ کر الارم کلاک پر نظر ڈالی۔
تو اس کے موتیوں کی مانند صاف شفاف دانت چمکے۔ اُٹھے مگر باوجود
اس خداداد دلفریب خوبصورتی کے وہ اپنے دل کی تکلیف سے
بے چین تھی۔ اور اس کے نازک ابرو اٹھ گئے تھے۔ آہ۔ ٹھیک آج کے
دن ایک سال پہلے رات اوس کے لئے اس قدر رنج خیز ثابت ہوئی تھی۔ اور
ٹھیک اُسی وقت اسی کمرے میں نوجوان رفیق احمد نے اپنے باپ کے
احکامات پر قائم رہنے کا ارادہ ظاہر کر کے اوسے حسرت آلود نگاہوں سے
خدا حافظ کہا تھا۔ آج پورا ایک سال گذر گیا تھا مگر یہ غم ناک بارہ مہینہ
جس مشکل سے کٹے تھے۔ وہ غریب مصیبت زدہ معشوقہ کو صدیاں معلوم
ہو رہی تھیں۔ کرسمس کی شب جملہ یادگاروں کے ساتھ اس واقعہ کو سامنے
لائی۔ اس کا دل بھر آیا۔ کیا اس سیاہ مصیبت خیز رات کی تکلیف اور
دردمندی ساری دنیا کو چھوڑ کر محض اوسی کے دل پر مسلط ہو رہی تھی۔ کیا کل
کا بڑا دن بھی سال گذشتہ کی طرح خوشی اور شادمانی کی جگہ رنج اور بے
چینی سے کٹے گا۔ اس کے درد دل سے اپنے مطلوب کے انتظار میں زندگی
گذار دینی۔ مگر نہیں، دنیا میں کوئی خزانہ نہ تھا۔ یہ سب باتیں دنیا کے دلفریب

ڈھکوسلے تھے۔ اور ان میلے کچیلے سخت و سرد پتھروں کے سوائے جو اس خندق میں سے برآمد ہو رہے تھے۔ کوئی چیز اُس کے مفید مطلب نکلنے والی نہ تھی۔ دنیا میں جس چیز کی زیادہ آرزو ہوتی ہے۔ وہی عنقا بن جایا کرتی ہے۔ اوسے خزانہ کی ضرورت تھی۔ اُس جگہ بے رحم سرد پتھر نکل رہے تھے۔ اس سے زیادہ سنگین مذاق قسمت اور کیا کر سکتی تھی۔ یہاں غریب خوب صورت لڑکی واماندہ دل سے نانا کے دفینے کے انتظار میں اشک حسرت بہا رہی تھی۔ اور قسمت اُس کے ارادوں اور خواہش پر ناک بھوں چڑھا کر پتھر برسا رہی تھی۔ اس نے غمگین دل سے مقدس مسیح کی شبیہہ پر نظر ڈالی جنہیں لوگ صلیب پر چڑھا رہے تھے۔ آہ۔ ایک سال گذرا۔ اس نے اس تصویر کے نیچے باول مضطر اشک ہائے ندامت بہائے تھے اور آج بھی وہی منظر پیش آنے والا تھا۔ اب سے ایک سال پیشتر اسی شب اسی کمرے میں اُس نے حضرت مسیح سے مقدس مذہب پر قایم رہنے اور اپنے مطلوب کو فراموش کر دینے کے معاملہ میں مدد مانگی تھی۔ اُس کی ایک دعا قبول ہوئی تھی لیکن دوسری نے مقبول ہونے کی بجائے اولٹا اثر دکھایا تھا۔ وہ اپنے دل میں روز بروز نوجوان رفیق احمد کی محبت کی آگ بتدریج زیادہ تیزی سے جلتی پانے لگی۔ اور ایک سال کی مدت جبر بہ مصیبت کاٹ لینے کے بعد آج اوسے اس قدر رنج نانا کے دفینہ کی گم شدگی کا بھی نہ تھا جس قدر رفیق احمد کی سنگدلی ظاہر کرنے والے برتاؤ کا تھا۔ کیا مرد ایسے ہی سنگدل اور جفاکش ہوتے ہیں۔ کہ وہ اپنی وفادار معشوقہ کو محض مذہبی اختلافات پر لات مار کر چھوڑ دیتے ہیں ہائے مذہبی تفرقہ کا اندیشہ بالکل فضول تھا۔ وہ اپنے دل میں مقدس مسیح کی عزت و تکریم کو جگہ دے چکی تھی۔ مگر رفیق احمد کی محبت عزت و تکریم کے درجہ سے آگے نکلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی جان اُس کے [illegible]

کرنے اور اوس کے لئے ہر طرح کی مصیبت جھیلنے کے لئے تیار تھی کاش اوسے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مذہبی خیالات کو کبھی اوس کی محبت کے مابین مداخلت نہ کرنے دیگی۔ اور او سے اپنا شہنشاہ سرتاج سمجھ کر حضرت مسیح کی طرح اپنے دل کے تخت پر جگہ دے گی

اس میں شک نہیں۔ مذہبی اعتقادات کو اوس کے دل اور دماغ سے گہرا تعلق تھا لیکن نوجوان رئیس زادے کی محبت اس کی روح پر مسلط ہو چکی تھی جس کے قیام پر اُس کی زندگی کا دارو مدار تھا۔ مگر رفیق احمد ان باتوں سے ناواقف تھا۔ اس وقت خوب صورت لڑکی کے سر پر چھالر دار چوڑی سفید انگریزی ٹوپی تھی۔ اس کے بدن پر دبیز اونی سیاہ کوٹ تھا۔ گردن میں سفید سمور کا گلوبند لپٹا ہوا تھا۔ زیریں حصہ جسم میں سفید ریشمی سایہ تھا۔ اور پاؤں میں سیاہ ریشمی موزوں پر بادامی رنگ کا اونچا بوٹ تھا شکیلہ ہیرگھٹن کے دبلے پتلے نازک بدن اور مہتابی پتلے چہرے پر چوڑی ٹوپی اور پھولے ہوئے گلوبند سے دل فریب تراکت پیدا ہو رہی تھی۔ اور دل کے پراگندہ خیالات سے اُس کے چہرے کی نکہت سفید پڑ گئی تھی۔ اُس کی خوبصورت انگلیوں پر ہرن کے سفید ملایم دستانے تھے۔ شکیلہ نے گھٹنے پر نظر ڈال کر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ جسے سن کر پاس کے کمرے سے نوجوان خادمہ بھاگی آئی۔ نوجوان مالکہ اپنے کپڑے اوتار بستر پر لیٹنا اور رونا چاہتی تھی۔ مگر اُس نے ملازمہ سے یہ راز چھپایا۔ اور کوٹ اوتارنے میں اوس سے مدد لی۔ اوسی لمحہ میں شکیلہ ہیرگھٹن کو سڑک پر کسی گاڑی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اس نے غور سے شمال کی طرف کان لگائے۔ مگر آثار آصف نگر کی دھواں دھواں میں گاڑی کی آواز لپٹ گئی۔ دوسرے لمحہ میں گاڑی کی آواز تیزی سے بنگلہ کے قریب معلوم ہوئی۔ اس نے پھر گھنٹے کی طرف دیکھ کر خادمہ سے پوچھا۔ اس اندھیری رات میں یہاں کون آرہا ہے۔

خادمہ نے بہاری کوٹ اپنے شانہ میں ڈال کر کہا "مس صاحب شاید کوئی مہمان آرہا ہے" مسٹر شکیلہ ہیرنگٹن نے بجانب مغرب منہ کرکے گاڑی کی آواز اپنے بنگلہ کے احاطہ میں سنی۔ نصف منٹ کے بعد اوسے ایسا معلوم ہوا کہ گاڑی اُس کے استراحت خانہ کے پاس سے گذر کر مشرقی برآمدہ کی طرف گئی ہے۔ اُس کے کمرے میں سب دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ لہذا اوسے کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ کہ کس کی گاڑی ہے۔ مگر اس نے وہیر کتے دل سے نوجوان خادمہ سے کہا "جاؤ دیکھو کون آیا ہے۔ شاید مس جانسٹن میرٹھ سے آئی ہیں مگر انہوں نے مجھے اطلاع نہیں دی" نوجوان خادمہ اوور کوٹ کھونٹی پر ڈال کر باہر نکلی۔ اور بڑے کمرے کے اندر اوسے دروازے کے آئینے میں سے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اس نے اشتیاق اور تعجب سے کیرا ملکھو لے لیمپ کی روشنی چلمن کے باہر برآمدے میں نہیں نہیں بانس کے سایہ سے بھٹی ہوئی پڑی۔ اور نوجوان خادمہ نے ذرا زور کی آواز سے پوچھا "کون کس کی گاڑی ہے" مگر فوراً ہی وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ اوسے بہاری اوور کوٹ اور انگریزی ٹوپی میں نوجوان رفیق احمد کی صورت نظر آئی جس سے وہ خوب واقف تھی۔ رفیق احمد نے نادم آنکھوں سے نوجوان خادمہ کی طرف دیکھ کر جیب سے کارڈ نکالا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے ڈر ہے۔ کہ مس شکیلہ ہیرنگٹن خواب گاہ میں چل گئی ہوں۔ مگر آج تمام دن بارش ہوتی رہی۔ اور اسی وقت ذرا مطلع صاف ہوا ہے پس اگر ممکن ہو۔ میرا کارڈ اندر لے جاؤ" نوجوان خادمہ نے شکریہ کے ساتھ نوجوان رئیس زادے کا کارڈ لے لیا جس نے اوس وقت اپنے ہاتھ سے دستانہ اوتار لیا تھا۔ اور گھبرا کر نوجوان سے کہا "مس صاحب ابھی ابھی پلنگ پر گئی ہیں۔ آپ ذرا ٹھیریئے" خادمہ کارڈ لیئے ہوئے ابھی ضعف

کرے ہی ہیں تھی۔ کہ اوسے شال میں لپٹی ہوئی شکیلہ ہیرگٹن اسی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ اور اوس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس ناوقت کے ملاقاتی کا کارڈ ہاتھ میں لیا۔ وہ اُس وقت کول کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اوس کے چہرے کا عکس بڑے آئینے میں پڑا۔ اُس نے بے تابی سے کارڈ پڑھا۔ اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے فرش کی طرف دیکھکر کہا "ہماری خواب گاہ میں سلام بھیجو" یہ کہکر شکیلہ ہیرگٹن اپنے دل کو پکڑے ہوئے استراحت خانہ میں پہونچی لیکن اوسے اپنے پیچھے ولایتی بوٹ کی چرچر معلوم ہوئی۔ اور اس نے منہ پھیر کر نوجوان رفیق احمد کو مسکراتا ہوا پایا۔ جس نے اشتیاق بھری آواز میں دور سے چلاکر کہا "پیاری شکیلہ کیا تم میرے آنے سے ناراض ہو" گو اوس کے پیچھے ابھی خادمہ موجود تھی مگر اوسے خوب صورت معشوقہ کے دل فریب چہرے پر نظر پڑتے ہی کسی شرم حجاب کی احتیاط ملحوظ نہ رہی۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکلی "میں تمہارے قدموں پر گر کر معافی مانگنے آیا ہوں" نوجوان معشوقہ کے چہرے پر مسرت اور بے اختیاری کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھی۔ اور اوس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "کیا تم اپنی عیسائی معشوقہ سے ناراض نہیں ہو"

اس وقت شکیلہ ہیرگٹن بالکل نوجوان کے پاس پہونچ گئی تھی اُس نے فرط اشتیاق سے شال میں لپٹی ہوئی شکیلہ کو ہاتھ پھیلا کر سینے سے لگالیا۔ نوجوان خادمہ اس منظر سے اپنے دل میں ایک گدگدی محسوس کر کے سامنے سے ہٹ گئی۔ نوجوان مرد نے اپنی حسین معشوقہ کی پیشانی پر بوسہ دیا جس پر سنجیدہ لڑکی کی خوب صورت آنکھوں سے ایسی محبت ٹپکنے لگی۔ کہ وہ خود بھی کچھ سمجھ کر شرما سا گیا۔ پھر اس نے نرمی سے شکیلہ ہیرگٹن کو مسہری پر بٹھایا۔ اور سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا "پیاری شکیلہ میں باوجود

اختلاف مذہب تمہارا شیدائی اپنی گذشتہ حماقت پر دل سے نادم ہوں۔ اگر کہو۔ تو تمہارے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لوں" نوجوان لڑکی کے دہن نازک میں آب دار موتیوں کی تبسم سے دو لڑیاں ظاہر ہوئیں۔ اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ جن میں آنسو ڈبڈبائے معلوم ہوئے۔ وہ جھپٹ کر حضرت مسیح کی تصویر کے نیچے دو زانو بیٹھ گئی۔ اور اُس کے منہ سے یہ کلمات نکلے "مہربان خداوند تیری عنایات کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ کاش مجھے تیرے سچے مذہب میں صلیب پر چڑھ جانے کا موقعہ ملے" نوجوان رفیق احمد نے اُسے نادم مگر دھڑکتے دل کے ساتھ فرش سے اُٹھایا۔ اور اُس کے جاں بخش ہونٹوں کو بوسہ دے کر کہنے لگا۔ پیاری شکیلہ ٹھیک آج ہی کی رات میں تم سے رخصت ہوا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اس وقت میرے دل میں تمہاری محبت دوگنی ہوگئی ہے۔ پس اس جدائی سے کچھ نقصان نہیں پہونچا" شکیلہ ہیرنگٹن نے اوسے اشک آلود آنکھوں سے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر اطمینان تبسم ظاہر ہوا اس نے شوق بھرے دل سے نوجوان عاشق کی طرف دیکھ کر کہا۔ آج کرسمس کی شب ہے۔ کاش ایسی راتیں ہم دونوں کو ہزاروں نصیب ہوں مگر ایسی سردی میں تم کس طرح گھر جاؤ گے۔ تم آج میرے مہمان رہو۔ کل بڑا دن ہے" نوجوان رفیق احمد نے اسے مسہری پر بٹھا کر اوس کی گردن میں اپنا بایاں ہاتھ ڈال لیا۔ اور محبت کے جوش میں اوس کی طرف دیکھ کر کہا۔ تمہاری مہمانی تو مجھے دل وجان سے قبول ہے مگر میرے قیام سے کسی کے ناموس پر حرف آنے کا اندیشہ ہے۔ لہذا اب مجھے رخصت ہونا چاہئے۔ کل میں سارا دن تمہارے ہی ہاں گذاروں گا" پھر اُس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا "میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا" نوجوان شکیلہ ہیرنگٹن نے گھبرا کر پوچھا "کب" اور اس کلمہ کے بعد اوسے در اصل

نوجوان دوست کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ خوب صورت سکیلہ ان وحشی نشں لوگوں میں نہ تھی۔ جو اپنے دشمنوں کی موت کے خواہاں رہتے ہوں۔ بلکہ وہ ان سمجھ دار عیسائیوں کے گروہ میں سے تھی۔ جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی ہدایت ہر وقت یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوس کے سوال پر رفیق احمد نے دوسرا گھرا سانس لیکر جواب دیا "آج چھٹا دن ہے۔ اب مجھے بہت نئے ارادے قایم کرنے پڑیں گے۔ پیاری تمہارے پاس سے جانے کو دل نہیں چاہتا مگر کیا کروں بغیر جائے بھی نہیں بنتی" خوب صورت معشوقہ نے اوسے پیار سے دیکھہ کر کہا "نہ جاؤ۔ خلقت کا ہمیں کیا ڈر ہے۔ کیا سچا مسیح ہمارے دل سے واقف نہیں" مگر نوجوان رفیق احمد نے گردن ہلا کر کہا "پیاری سکیلہ تم بڑی کٹر عیسائی ہو۔ مگر ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ دنیا میں دنیا داری برتنی پڑتی ہے۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ" خوب صورت لڑکی نے مسکرا کر اوسے سینہ سے لگایا اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "دونوں جہاں کے مقدس ملائک تیرے محافظ ہوں" ایک منٹ کے بعد وہ سرد ڈراؤنی رات میں رڑکی کی سمت روانہ ہو گیا مگر اس وقت ان دونوں عاشق و معشوق کے خیالات محبت کے پیالوں سے مسرت کے شہد سے زیادہ شیریں پی رہے تھے۔ کیا پروا ہے اگر رات ٹھنڈی اور خوفناک تھی۔ دل کی محبت سب مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے +

نواں باب

شب خون

رات ایسی تیرہ وتار تھی۔ کہ گاڑی کے سوار رفیق احمد کو درختوں اور آبشار آصف نگر کی وھاں وھاں نامعلوم خفیہ پھولوں کی آواز کا دھوکہ دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کالوں میں گھسے جاتے تھے۔ آسمان پر جس طرف نظر جاتی تھی۔ تاریکی کے سوا کسی ستارہ کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بادلوں کی گرج دور دراز فاصلے پر کسی حصہ شب میں مزید بارش کا اعلان کر رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی کرایہ کی تھی۔ کوچبان کے برابر اس کا خورد سال لڑکا آٹھ دس سال کی عمر کا بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی بان کے پاس گرم بھاری رضائی ضرور تھی۔ لیکن لڑکا سر چھپیڑوں میں لپٹا ہوا بدن کی کپکپاہٹ سے جاں بلب ہو رہا تھا۔ ادنے سے اعلےٰ درجہ تک سب آقا سخت گیر ہوا کرتے ہیں۔ لڑکا خود کسی روز آقا بننے والا تھا کیا مضائقہ اگر وہ اس وقت مدرسۂ امیدواری میں سخت جان اور سنگدل بننے کے لئے سبق سیکھ رہا ہو۔ ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں۔ زیادہ تر لڑکپن کی تربیت اور ترغیب کے مطابقت میں کرتے ہیں۔ مگر اس خورد سال لڑکے کو آئندہ زندگی کا خیال نہیں تھا۔ وہ محض موجودہ زمانہ میں شکم سیری کی کشش سے نوکری کرنے اور اس کی مشکلات جھیلنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اگر غور کیا جائے۔ تو ہر شخص موجودہ وقت ہی کا خیال کرتا ہے۔ نوجوان رئیس زادہ رفیق احمد بھی اپنے موجودہ کو الف یا الفت معشوقہ سے تنگ آکر اس

اندھیری اور ہوشربا رات میں دس بجے سردی اور بارش کے جھونکوں میں چار میل آیا تھا۔ اور اب چار میل واپس جا رہا تھا ہیبت ناک شب کے خطرات کا پورا اندیشہ رفیق احمد کو اوس وقت ہوا جب کرایہ کی گاڑی کے ٹھٹکے ماندے گھوڑوں نے آبشار آصف نگر کے پل پر قدم ڈالا۔ جھال کے سینکڑوں دروازوں میں موج پانی کے اُچھلنے سے جاپوں طرف خوفناک کہرا گھرا ہوا تھا۔ منہ اور ناک میں سانس کے ذریعے سے کہرا ہی سماتی تھی اس متوحش شب میں اگر پل بیٹھ جاتا۔ تو گھوڑا گاڑی اور اس کے سواروں کو تخت الثریٰ میں پہونچ کر ہوش آتا۔ افوہ کیسی خوفناک رات اور کس قدر ہیبت ناک پل" اس خیال سے نوجوان رفیق احمد کا بدن کانپ گیا مگر نہیں وہ بزدل نہ تھا۔ اور اگر کسی وقت اوسے یہ پل ہیبت ناک بھی معلوم ہوتا۔ تو آج کی شب وہ جوانمردی کے جوہر دکھا دینے کی قابلیت رکھتا تھا۔ کیا وہ ابھی اپنی معشوقہ سے مل کر نہیں آیا تھا۔ کیا اوس معشوقہ کی خوب صورت پیشانی اور نرم شیریں لبوں کو بوسہ دے کر کوئی بزدل رہ سکتا ہرگز نہیں وہ اس پر سپہرہ لڑکی کے دل کو فتح کر کے آ رہا تھا۔ وہ دنیا کے بہادروں اور جوانمردوں میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ مگر باوجود اس حوصلہ افزا خیال کے اوس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا انسان کا دل عالم الغیب بھی ہوتا ہے۔ گاڑی کی لالٹین نے بائیں جانب آبشار کے پل پر سرخ روشنی ڈالی۔ تو نوجوان رئیس زادے نے اضطراب سے اوس مقام کو جہاں روشنی پڑی تھی۔ دیکھنا شروع کیا سیہ پل کا کونا تھا مگر اس کی نگاہ اس مقام سے ٹکرا کر ہٹنے نہ پائی تھی۔ کہ ہوا میں چٹاخ پٹاخ ایک دم دو آوازیں اس قدر زور سے پیدا ہوئیں۔ کہ اُن سے آبشار آصف نگر کی دھاں دھاں بھی لرز گئی۔ رفیق احمد کے منہ سے زخمی بھیڑیے کی سی دھاڑ نکلی۔ اور ایک دم سے گاڑی اور اُس کا خورد سال نوکر چلا اوٹھے

گاڑی کے گھوڑے چمک گئے۔ اور خوف کے مارے گاڑی بان کے ہاتھوں سے باگیں چھوٹ گئیں۔ گھوڑے الف ہو کر بے تحاشا بھاگ نکلے۔ مگر دس قدم ہی چلے ہونگے۔ کہ بائیں جانب ایک شیشم کے درخت سے گاڑی کا پہیہ بڑے زور سے ٹکرایا۔ پہیہ کے رک جانے سے گھوڑوں کے پاؤں اٹک گئے۔ بایاں پہیہ زمین سے اُٹھ گیا۔ اور گاڑی گھوڑوں سمیت دائیں پہلو پہ اُلٹ گئی۔ تجربہ کار گاڑی بان کے منہ سے چیخ نکلی۔ مگر وہ ان باتوں میں مشاق تھا۔ اوس نے معلوم نہیں کس طرح اپنے آپ کو بچا لیا۔ لیکن اوس کے خوردسال نوکر کا سر گھوڑوں کے پاؤں میں آگیا جس وقت گاڑی بان نے "دوڑیو۔ دوڑیو" کا شور مچایا۔ اوسے مطلق خبر نہ تھی۔ کہ میرزادہ اور ملازم کا کیا حشر ہوا۔ اوس کی لال مُنہ اپنے حلقہ سے نکل کر دور جا پڑی تھی۔ اور بجائے اس کے کہ تیل میں آگ لگتی۔ خود تیل نے آگ کو بجھا دیا تھا۔ گاڑی بان نے زور کی آواز میں دوبارہ "دوڑیو۔ دوڑیو" کا غل مچایا۔ اور اسی وقت آصف نگر کی کوٹھی نہر سے دو تین آدمی اوسے بھاگ کر اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ اون کے پہونچنے تک گاڑیبان نے حواس درست کر کے جیب سے دیا سلائی کا بکس نکالا۔ اور روشنی کر کے دیکھا۔ تو اوس کے گھوڑوں کے سموں میں خون ہی خون بہ رہا تھا۔ خوردسال لڑکے کا سر پھٹ گیا تھا۔ اور وہ پاس ہی بے ہوش پڑا تھا۔ گاڑی بان نے چیخ مار کر گاڑی کے اندر اپنی سواری کو دیکھنا چاہا۔ وہ نوجوان رفیق احمد کی چیخ سے سمجھ چکا تھا۔ کہ اوس کے گولی لگی۔ اور اوسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ نہ مر گیا ہو۔ اُس کی دیا سلائی گل ہو گئی۔ تو اس نے دوسری سلائی کھینچی۔ اور اس کی روشنی سے اوسے معلوم ہوا۔ کہ نوجوان کے بائیں شانہ سے بے حد خون بہ رہا ہے۔ اور وہ کھڑکی کی طرف بے ہوش اوندھا پڑا ہے۔ بھاگتے ہوئے آدمی اُس کے قریب آئے۔ تو گاڑی

نے زور سے پوچھا کیا ہے۔ کیا ہے۔ کیا ہوا؟" آواز ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی انگریز کی ہو۔ گاڑی بان نے چلا کر جواب دیا "ہڑانحون ہو گیا کسی نے اس سواری کے گولی ماردی جلدی آؤ۔ میرے گھوڑے سانس چوک جانے سے مرے جاتے ہیں۔ ان کے تنگ ڈھیلے کراؤ۔ اتنے میں گاڑی بان کو اندھیرے میں اپنے پاس ایک نوجوان انگریز کھڑا دکھائی دیا۔ اوس نے تیسری دیا سلائی کھینچی۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ننگے سر اپنی قمیض اور موزوں ہی میں بھاگ آیا ہے۔ انگریز کے پیچھے ایک ہندوستانی نوکر تھا۔ اور اب بنگلے کی طرف سے دو تین ملازم اور دوڑے آرہے تھے دیا سلائی کی روشنی میں یورپین نوجوان فوراً موقعہ کو سمجھ گیا۔ اور وہ چلا کر بولا "وہ گدھے کے بچے تیری لال ٹین کہاں ہے۔ لڑکا مرا جارہا ہے اُسے کیوں نہیں کھینچتا؟" اور یہ کہکر اوس انگریز نے لڑکے کو پڑی نرمی سے کھینچ کر نکال لیا۔ پھر اُس نے اپنے ذاتی ملازم کو چلا کر مخاطب کیا۔ جو پاس ہی کھڑا تھا "دیکھو جلدی لال ٹین لاؤ۔ میاں رحیم صاحب سے بولو ایک بوتل نمبر اسکاچ وسکی کی جلد بھیجدیں۔ لڑکا مرا جاتا ہے" نوجوان انگریز یہ فقرہ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا۔ کہ گاڑی بان نے جھنجلا کر کہا "حضور آپ کو لڑکے کی پڑی ہے۔ میری سواری کے گولی لگی ہے۔ اُس کی خبر لیجئے میرے پانچ روپے ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔" یورپین کوجو محکمہ نہر کا اسسٹنٹ انجنیر تھا۔ اور اس وقت معمولی دورہ کی حالت میں مقام اصف نگر پڑاؤ ڈالے آیا تھا۔ اس احمق گاڑی بان کی آواز پر غصہ بھی آیا۔ اور ہنسی بھی۔ صاحب بہادر اُس وقت گاڑی والے کی لال ٹین تلاش کر رہے تھے لیکن ابھی انہیں لال ٹین نہ ملی تھی۔ کہ اونھیں اپنی کوٹھی کی طرف سے دھندلی سی روشنی نظر آئی۔ ایک لال ٹین کی جگہ دو چمکدار ہنکس کی لال ٹینیں اس طرف آرہی تھیں

صاحب نے لال ٹین لانے والوں کو غور سے دیکھا۔ تو انہوں نے پیشانی پر بل ڈال لئے۔ افوہ۔ اس سرد اور خوفناک رات میں ان کی پیاری نوجوان بیوی خود ہاتھ میں شراب کی بوتل لئے بھاگی آرہی تھی۔ یہ نوجوان عورت پورے لباس میں تھی۔ البتہ اوس کا سر کھلا ہوا تھا۔ اور بھورے بالوں کی چوٹی لال ٹین کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اپنی بیوی کو دور سے دیکھ کر اس یورپین مسٹر ہیلی فاکس نے چلا کر کہا "پیاری باڈ تم اس سردی میں مت آؤ۔ ایک شخص کے گولی لگ گئی ہے۔ جاؤ تم واپس جاؤ۔

مگر نوجوان زوجہ کھلے ہوئے منہ سے ہانپتی ہوئی شوہر کے پاس آئی۔ اور فق شدہ چہرے سے اوسے دیکھ کر پوچھنے لگی یہ کیا کوئی قتل ہو گیا ہے"؟ مسٹر ہیلی فاکس نے جھٹ پٹ بیرے کے ہاتھ سے لال ٹین لے لی۔ اور گاڑی کے دروازے کو دیکھ کر جھجک گیا۔ نوجوان رفیق احمد کے چہرے پر موت چھا گئی تھی۔ بظاہر وہ مر گیا تھا۔ مسٹر ہیلی فاکس نے اُس کے اوور کوٹ میں ہاتھ دے کر دل پر ہاتھ دھرا۔ پھر زوجہ کی طرف دیکھ کر بولا "ابھی زندہ ہے۔ وسکی جلدی وسکی۔ مسٹر ہیلی فاکس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بوتل شوہر کے ہاتھ میں دی۔ مگر اُس کے کھولنے کے لئے یہاں نہ جا تھا۔ نہ پیچ کش۔ مسٹر ہیلی فاکس نے بوتل کا منہ گاڑی کے تختے پر مارا۔ اور تھوڑی سی شراب گرا کر نصف بوتل رفیق احمد کے منہ میں ٹپکا دی۔ پھر اس کا سر ایک بیرے کے ہاتھ میں دے کر صاحب موصوف خود سال چھپو کرے کی طرف لپکا۔ اور باقی ماندہ بوتل اُس کے منہ میں اُلٹ دی۔ اتنا کام صاحب بہادر نے کیا۔ اس عرصے میں نوکروں نے گھوڑوں کے تنگ توڑ تاڑ کر انہیں صحیح سلامت گاڑی کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر صاحب موصوف نے جوان رئیس زادے کو باہستگی گاڑی کی کھوہ میں کر باہر کھینچنا شروع کیا۔ اور دونوں نوکروں کی پیٹھ پر ڈال کر

بولے۔ ویل گاڑی بان تم اس آدمی کو کہاں لائے تھے؟ گاڑی بان نے بڑی مستعدی سے جواب دیا "اوس جھال والہ بنگلہ میں لایا تھا" جو ہیر نگلٹن صاحب والا بنگلہ کہاتا ہے" اوہ ہم تب سب معاملہ جانتے ہیں" مسٹر ہیلی فاکس کے منہ سے نکلا۔ اور انہوں نے اپنی زوجہ کی طرف دیکھ کر بزبان انگریزی کہا" یہ نوجوان وہ شخص معلوم ہوتا ہے جس سے مس ہیر نگلٹن شادی کرنے والی تھی۔ لیکن یہاں سے کس نے زخمی کیا سخت حیرت ہے" مسز ہیلی فاکس نے نوجوان شکیلہ ہیر نگلٹن کا نام دل چسپی اور شوق سے سنا۔ مگر وہ اس لڑکی سے ناواقف تھی۔ پھر سنجیدہ آواز میں بولی" ان دونوں کو اوسی بنگلہ پر پہنچا دو۔ تم کب تک سردی میں کھڑے رہو گے ہیں تو سردی کے مارے کانپ رہی ہوں نا واقفی اس کیچڑ میں آلودہ جگہ پر جہاں شیشم کے درختوں سے ٹپ ٹپ پانی گر رہا تھا۔ بوجہ قرب آبشار جس کی دھاں دھاں کسی وقت دم لینے والی نہ تھی۔ سردی بہت زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ مسٹر ہیلی فاکس نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس نوجوان رئیس زادہ اور ان کے نوکر کو مس ہیر نگلٹن کے ہاں لے جاؤ۔ اور اگر مس مذکور کو کوئی اعتراض کریں۔ تو ملازم مجروحین کو بہ آہستگی اوٹھا کر اُن کے گھروں پر پہونچا آئیں۔ نوکروں نے مجروحین کو بہ آہستگی اوٹھا کر شکیلہ ہیر نگلٹن کے بنگلے کا رُخ کیا۔ اور اپنے پانچ روپے کے لالچ سے گھوڑا گاڑی والا بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا لیکن صاحب بہادر ان لوگوں سے فراغت پاتے ہی مجرم یا قاتل کی طرف رجوع ہوئے۔ اس عرصے میں صاحب موصوف کے بابو۔ منشی۔ برقنداز اور سائیس وغیرہ بیسیوں آدمی موقعہ پر آگئے تھے۔ صاحب نے اپنے بابو کو اشارہ کر کے سنجیدہ آواز میں کہا "ویل بابو آج بڑا اندھیرا ہو گیا ہے۔ ہماری رائے میں جس شخص نے اس نوجوان کو زخمی کیا ہے۔ وہ اس وقت اسی مقام آصف نگر میں

ہیں ہے۔ ہمارے پاس بیسیوں آدمی ہیں۔ اور منشی لال سب لوگ سیر کے ذریعہ سے سینکڑوں مزدور ہاتھ آسکتے ہیں۔ ہماری رائے ہیں نے الفور گھنٹہ بجاکر الارم دیا جائے۔ سینکڑوں آدمی جمع ہوجاوے گا۔ اور شاید قاتل پکڑا جائے۔ ہنجاب اور منشی دونوں آدمیوں نے صاحب بہادر کی رائے کو بے حد صائب تبلایا۔ ان کے پیچھے تمام سب ڈویژن کا عملہ اور صاحب کے ذاتی ملازمین منہ کھوے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ لال ٹینیں دو ملازموں نے پکڑ رکھی تھیں۔ اور سیاہ ہیبت ناک ابر آلودہ آسمان کے نیچے بھیگی ہوئی تر زمین پر ان سب آدمیوں کے سائے ادھر اودھر ناچتے پھر رہے تھے۔ جھال آصف نگر کے پُر تلاطم پانی کی خوفناک اگرچہ اس منظر کی طرف سے بے پرواہ تھی۔ لیکن ظرف بین اصحاب حادثات زمانہ پر ضرور نگاہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ جب انہیں معلوم ہوگا۔ کہ ایسی تاریک اور ڈراونی رات میں عظیم الشان خونخوار آبشار کے اوپر یہ خوفناک قتل اور یوزمین شوہر زوجہ کی آنکھوں کے سامنے اوس لمحہ میں ہوگیا تھا جب وہ دو نین گھنٹے کے اندر حضرت مسیح کی پیدائش کی گھنٹیاں سننے والے تھے۔ اب بجائے مقدس گھنٹوں کے قتل کی خبر گھنٹیوں کے ذریعے سے خلقت کے کانوں میں پہونچانے کا کام اُن پر آپڑا۔ لیکن برطانیہ نظمے کے بہادر لوگ زیادہ مال جویا شگون پسند نہیں۔ پس مسٹر ہیلی فاکس کے آگے قدم بڑھاتے ہی سب لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ اور جس وقت صاحب موصوف اپنے مکلف قیام گاہ کے برآمدے میں پہونچے۔ انہوں نے اس برقنداز کو طلب کیا۔ جو خزانے کی محافظت کیا کرتا تھا۔ اور اُس سے کہا۔ کہ نصف گھنٹہ تک زور زور سے گھنٹی بجاتے رہو۔ اس تاریک اور دوخانی رات میں بھیگی چھولداری کے اندر سے ٹن ٹن کی آواز نے بھلکر تمام جنگل میں شور مچادیا۔ گھنٹوں تک کی آوازیں محکمہ نہر کی کچہری اور آہنی در و دیوار

سے ٹکرا ٹکرا کر گونجنے لگیں۔ اور پانچ منٹ کے اندر آصف نگر سے تاشی پور اور تاشی پور سے روڈ کی تک محکمہ نہر سے تعلق رکھنے والے لوگ ایگزیکٹو انجینئر اسسٹنٹ انجینئر۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ضلعدار۔ سب اور سیر وغیرہ جن کی صاحب چیف انجینئر بہادر کی آمد سے گڑبڑی میں بڑی جماعت موجود تھی۔ اپنی اپنی میٹھی نیندوں سے چونک چونک کر اٹھ بیٹھے۔ یوروپین اصحاب نے سمجھا کہ مقدس مسیح کے میلاد کا اعلان عیسائی دنیا کو بہجت آمیز آواز میں مبارکباد دے رہا ہے۔ ہندوستانی عہدہ داروں نے نہر کی طرف کان لگا کر سوچا شاید آصف نگر کا خوف ناک آبشار ٹوٹ گیا۔ آصف نگر کی جھال کی شکستگی کوئی بچوں کا کھیل نہ تھی۔ اس سے آس پاس کے قصبے اور دیہات آناً فاناً زیر آب ہو جاتے۔ ذمہ دار افسروں نے بذریعہ تار نہر بھیج کر اطمینان کیا۔ البتہ تاشی پور اور اوس سے ملحقہ گاؤں کے باشندے گھنٹہ کی آواز سن کر بے دم ہو گئے۔ ان لوگوں نے جلدی جلدی مشعلیں جلائیں اور نصف گھنٹے کے اندر کوٹھی آصف نگر پر پانچ چھ سو آدمی بچے بوڑھے جوان۔ عورتیں۔ اور مرد۔ ہا۔ او ہو مچاتے ہوئے جمع ہو گئے۔ نہر کے ملازمین نے بڑی مشکل سے شور کم کیا۔ آس پاس کے درختوں سے شور اور مشعلوں کے ڈر سے پرند اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ سینکڑوں آدمی مختلف سڑکوں اور راستوں پر خوفناک مجرم کے پیچھے بھگائے گئے۔ نہر کے آدمی اور مواضعات کے سینکڑوں متنفس تمام شب کیچڑ اور یخ بستہ ہواؤں میں ادھر ادھر دوڑتے رہے لیکن علے الصباح جب آنے والے دن کا درخشندہ آفتاب شرق سے کانپتا ہوا نکلا۔ تو کسی کو کوئی مشتبہ آدمی نہ ملا۔ اور سب بے نیل مرام واپس آئے ٭

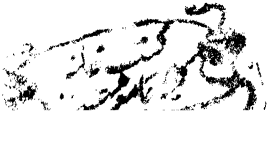

دسواں باب

منحوس رات

مشکل سے رات کے گیارہ بجے ہونگے خوب صورت شکیلہ ہیرنگٹن اپنے نوجوان مطلوب سے ہم آغوش ہوکر دین و دنیا کے تفکرات کو بھول گئی تھی وہ گذشتہ ایک سال کے عرصہ میں بہت کچھ رنج و محن دیکھ چکی تھی ہر شخص اپنے اپنے حصہ کا رنج اور تکلیف برداشت کرتا ہے۔ غریب معصوم لڑکی بھی اپنے مقدر کی تکلیف اور غم کا خوب مقابلہ کر چکی تھی۔ اور آج کی شب وہ سب کلفتیں حد پر پہونچ چکی تھیں۔ کیا اس کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ زمانہ کوئی آسکتا تھا۔ کہ وہ ہجر یار میں مہینے سے قطعی ناامید ہوکر اوسے بھلا دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور ان سب تکالیف کی سختی میں اگر کوئی کسر تھی۔ تو وہ اوس کے نانا کے دفینے کی گمشدگی نے پوری کر دی تھی۔ وہ درحقیقت اوس بہادر آدمی کی طرح اپنی مشکلات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ جو بے حد زخمی ہوکر اپنے سامنے غنیم کو کھڑا پائے۔ اور اپنے ہاتھوں سے ان ہی ہتھیاروں کو غنیم کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جن سے وہ اپنی جان بچا سکتا تھا۔ نوجوان رفیق احمد کی محبت اس پریچہرہ لڑکی کے لئے ایک قسم کے ہتھیار تھے جن سے وہ اپنی عفت اور وفاداری کی حفاظت کر سکتی تھی۔ لیکن یہ ہتھیار اب اُس کے ہاتھ سے چھن جانے والے تھے۔ آہ وہ خود کوشش کر رہی تھی۔ کہ وہ اس محبت کو نہر باد کہہ دے جس سے اوس کی روح سیراب ہو سکتی تھی لیکن ہر مصیبت

کی ایک حد ہوتی ہے۔ آج شکیلہ ہنرنگٹن کے مصائب اس درجے پر پہونچ گئے تھے۔ کہ وہ آئندہ نوجوان لڑکی سے برداشت نہ ہوسکتے چنانچہ ایک آن واحد میں ساری یاس وہراس کا قلعہ مسمار ہوگیا۔ اور اپنے دوست کو چھاتی سے لگا کر نوجوان لڑکی کو معلوم ہوگیا۔ کہ دنیا پھر بھی بڑی دلاویز جگہ ہے۔ کیا وہ اس منظر کو کسی طرح فراموش کرسکتی تھی۔ کہ نوجوان عاشق اوسے بغل میں لے اوس کی پیشانی اور منہ پر بوسے دے۔ نہیں ان واقعات کو کوئی بھول نہیں سکتا۔ اور نہ اونہیں کوئی مصور یا مصنف ٹھیک طور سے تحریر میں لاسکتا ہے۔ یہ مواقع دنیا کے ان گوناگون مناظر اور صفات میں سے ہوتے ہیں۔ جو انسانی عقل کے ادراک میں تو ہیں لیکن اوس کے قبضے سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ خواب کیطرح شیریں مگر وقت کی طرح ناپائدار ہوتے ہیں جب وہ بستر پر پڑی۔ تو اوس نے اپنے آپ کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوش نصیب عورت سمجھا نانکا دفینہ کیا پروا! اگر اب وہ ضائع بھی ہوجائے وہ اپنے نوجوان دوست کے ساتھ افلاس ہی میں گذر کرسکے گی۔ اور اوس کے سامنے مصیبت کو بھی راحت سمجھے گی۔ کیا وہ دنیا بھر کے آدمیوں سے زیادہ خوب صورت اور بہادر نہ تھا۔ اوس کی صورت شکل، محبت، برتاؤ اسکی جوانمردی کے نمونے تھے۔ نوجوان لڑکی نے اپنی آزمائش میں بڑے استقلال سے کام لیا تھا۔ اور جملہ مقاصد کا لحاظ کرکے وہ اب راحت اور اطمینان کی شاہراہ پر پہونچ گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑی۔ تو شیریں یادگاروں کے حظایظ میں اوسے اپنا بستر جنت کے لطافت میں سرشار نظر آنے لگا جنکا ذکر وہ مقدس انجیل میں بیسیوں مرتبہ پڑھا چکی تھی۔ نوجوان دوست کا ہنس مکھ چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اور وہ اوس لحظ کو یاد کرکے اپنے دل میں مسکرانے لگی۔ جب وہ دوبارہ کل صبح آئے گا! اور اوسے

کرسمس کے بہانے سے شارع گلاب کے آگے کھینچ کر اوس کا بوسہ لینا چاہیگا
اس خیال سے اوس کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ اپنے سر کو تکیئے سے رگڑکر
خوب ہنسی۔ دراصل آج کی رات اوسے بڑی نازک اور قابل یادگار معلوم دی
اور وہ سمجھنے لگی۔ کہ کل جیسا بہجت خیز بڑا دن شاید اُسے بہت کم نصیب ہوگا
اپنے حسین عاشق کو ایک سال بعد اس مسرت انگیز طریقے پر دیکھنے کے
باعث اوس کا دل شوق اور اضطراب سے اُچھل رہا تھا۔ اور اوسے باوجود
ارادہ و کوشش بسیار کے نیند نہ آتی تھی۔ اس وقت اس کے استراحت خانہ
کی دود کش میں آگ بڑی تیزی سے جل رہی تھی۔ اور مسرت آمیز خیالات سے
اوس کے دل و دماغ میں بھی حرارت پہونچا دی تھی۔ اوس نے گرمی
محسوس کر کے منہ کھول دیا۔ اور لیمپ کی دھیمی روشنی میں خوبصورت کلاک
کی طرف دیکھا۔ الارم کے آئینے پر لمپ کی چمک کچھ اس طرح پڑ رہی تھی۔ کہ بغیر
اوٹھے وہ وقت نہ دیکھ سکی۔ اس وقت گھنٹے میں ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ وہ
وقت دیکھ کر لیٹنا چاہتی تھی۔ کہ اوسے وہاں گھنٹہ کی آواز سنائی دی۔ وہ
سمجھی کہ شاید نہر کا گھنٹہ گیارہ بجا رہا ہے۔ اور باطمینان لیٹ گئی مگر اوس کے کان
میں گھنٹے کی ہلکی آواز دیر تک آتی رہی جس سے وہ گھبرا کر اوٹھ بیٹھی۔ اس کا
دل کانپنے لگا۔ وہ سمجھی شاید بارہ بج چکے۔ اور مقدس مسیح کی پیدائش کے
اعلان میں رڑکی کے گرجا گھر گھنٹیاں بجانے لگے۔ اُس نے پھر غور سے اپنے
گھنٹے کی طرف دیکھا۔ اوس کا کلاک قیمتی اور صحیح وقت دینے والا تھا۔ اور اس
میں ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ پھر یہ گھنٹے کی آواز کہاں سے آنی شروع ہوئی
وہ گھبرا کر شال اوڑھے ہوئے بستر سے اوٹھی۔ اور کرسی پر بیٹھ کر دیر
تک گھنٹے کی آواز سنتی رہی۔ اس میں ذرا بھی شک نہ تھا۔ کہ کہیں گھنٹہ
بج رہا تھا۔ سلسلہ ہیرنگٹن کی قوت سامعہ بڑی تیز تھی۔ وہ بالکل متیقن ہو کر اس
گھنٹہ کی آواز سے ڈر گئی۔ اور سوچی کہ یہ گھنٹہ حضرت مسیح کے میلاد کا اعلان ہرگز

نہیں ہو سکتا۔ اس میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر تھی۔ اور اوسے مطلق یاد نہیں تھا۔ کہ رڑکی کے گھنٹوں سے اوس نے اب تک کبھی اس طرح کی آوازیں سنی ہوں۔ یہ گھنٹہ بالکل نئی قسم کی آواز دے رہا تھا۔ اوس کا دل دھڑکنے لگا۔ ایسی ہیبت ناک اور تاریک شب میں گھنٹوں کی آواز خالی از علت نہ تھی۔ اپنے دل کی دہشت میں اُس نے سب سے پہلے اپنے دوست کی سلامتی جان کا خیال کیا۔ مگر اس نے دھڑکتے دل سے باہستگی کہا "نہیں وہ تو اس وقت روڑکی پہونچ گیا ہوگا" پھر اوسے خیال آیا۔ کہیں آصف نگر کی جھال نہ لوٹ گئی ہو۔ اوس نے آبشار کی دھاں دھاں کو غور سے سننا شروع کیا۔ اُسکا بدن کانپنے لگا۔ اور اوسے خوف و ہراس کی حالت میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ آبشار بڑی غیر معمولی طاقت سے بہ رہا ہے۔ خوفناک پانی کی طاقت اور اوس کے قرب کے اندیشے سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ گھبرا کر کرسی سے اوٹھی۔ اور اوس نے ملحقہ کمرے میں زور سے دستک دے کر پہلے رحمت اور پھر عزیزن کو کئی آوازیں دیں۔ اس کمرے میں اندر کی جانب شکیلہ میرنگٹن نے قفل لگا رکھا تھا۔ جو اُس نے میز سے کنجی اُٹھا کر کھول دیا۔ اور کواڑوں کے کھلتے ہی چھوٹے لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی اس کمرے کے دوسوتی کے فرش پر ایک لمبی چٹائی کی طرح دور تک پہونچی۔ شکیلہ میرنگٹن اندر داخل ہوئی۔ اور اس نے زور سے رحمت کو آوازہ دی۔ مگر کمرے میں شکیلہ کو اچھی طرح دکھائی نہ دیا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے میں آئی۔ اور چھوٹا لیمپ ہاتھ میں لے کر سونے والی عورتوں کے سرہانے پہونچی۔ اوسے ایک چارپائی پر لحاف خوب تنا ہوا معلوم ہوا۔ مگر دوسری چارپائی پر لحاف اوٹھا ہوا پائینتی پر پڑا تھا جیسے کوئی ابھی پلنگ سے اُٹھ کر باہر گیا ہو۔ شکیلہ سمجھی۔ کہ شاید بوڑھی رحمت یا عزیزن کی آنکھ کھلنے کی ٹن ٹن سے کھل گئی۔ اور وہ چلی گئی۔ لیکن دوسری سونے والی پر اوسے تعجب تھا۔ اوس نے جھجھلا کر اوس کے اوپر سے لحاف

وتار پھینکا۔ اور عزیزن کو دیکھ کر خفگی کی آواز میں کہا۔ ایسے نحالف، پیچ کر سوتی ہے۔ رحمت کہاں ہے۔ یہ گھنٹی کس بات کی ہے جلدی باہر نکل کر دیکھا جھال ٹوٹ گئی۔ یا کیا ہوا" عزیزن اچھل کر چارپائی کے نیچے اوتری۔ اور اپنی مالکہ کو سرہانے ٹھہلاتے دیکھ کر بڑی شرمندہ ہوئی۔ اتنے میں اوسے سامنے کے شرقی دروازے سے جو اس وقت بند معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے کے اندر رحمت آتی دکھائی دی۔ رحمت نے سر پر رضائی اوڑھ رکھی تھی۔ اور اُس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ اوس نے خوف زدہ نگاہ سے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھا اوسے سخت حیرت تھی۔ کہ نوجوان لڑکی خلاف معمول اس وقت نوکروں کے کمرے میں کیا کر رہی ہے۔ رحمت کو دور سے آتا دیکھ کر شکیلہ نے اطمینان کا لمبا سانس بھرا۔ اور گھبرا کر پوچھا "رحمت تم کہاں پھر رہی ہو۔ شاید جھال کا بند ٹوٹ گیا۔ اب کوئی دم میں ہمارے بنگلے کے اوپر پانی گذر جائے گا۔ کیا تم نے گھنٹے کی آواز نہیں سنی" رحمت آہستہ آہستہ شکیلہ ہیرنگٹن کے قریب آئی۔ اوس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اوسے بڑی تکلیف ہے۔ اوس نے کھلے ہوئے منہ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے شکیلہ ہیرنگٹن کو دیکھ کر کہا۔ مجھے آواز تو بہت دیر سے آرہی ہے مگر آپ مجھے دو تین بڑے گہرے دست آچکے ہیں۔ اس سبب سے میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔ ان عورتوں میں یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ انہیں شمالی دیوار کی جانب سے لال ٹین کی روشنی اور کچھ دھیمی پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ رحمت کے کان کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ ہیرنگٹن کا دل لرز گیا۔ اور عزیزن ڈر کر رحمت کے پاس آکھڑی ہوئی۔ چند آدمی اپنے شانوں پر کچھ بوجھ لئے جا رہے تھے۔ شکیلہ سخت حیرت میں تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ سمجھ کر کہ کہیں اس کے احاطے میں چور نہ گھس آئے ہوں۔ وہ ڈر کر اپنے کمرے میں گھسنا چاہتی تھی۔ کہ اتنے میں کسی نے باہر سے

کہا "ٹھیرو ٹھیرو یہ دروازہ کھل رہا ہے" شکیلہ ڈر کر اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ اوس کے ہاتھ سے لیمپ چھوٹ گیا۔ خیریت یہ ہوئی۔ کہ یہ لیمپ اعلےٰ درجہ کا تھا۔ فوراً گل ہوگیا۔ ورنہ ایک آن واحد میں بنگلہ پھک جاتا۔ شکیلہ دھڑکتے دل سے اپنی مسہری کے پاس ہی آئی تھی۔ کہ اوسے چند آدمیوں کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ اور اس کی سمجھ میں چند الفاظ از قسم پل گولی۔ صاحب وغیرہ آئے۔ اوس نے کانپ کر اپنا دل ہاتھوں سے دبالیا۔ اور اپنے جی کو مضبوط کرکے کسی متوحش خبر کا انتظار کرنے لگی۔ اتنے میں عزیزن بھاگی ہوئی آئی۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولی "مس صاحب کسی نے رفیق میاں کے گولی ماردی۔۔۔۔ اور" شکیلہ ہیرنگٹن کے سینے میں کوئی چیز گھستی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کے کانوں میں شاں شاں ہونے لگی۔ اوسے کچھ نہ محسوس ہوا۔ کہ نوجوان خادمہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے گھبراکر پوچھا۔ کیا۔ کیا۔ کون رفیق احمد میاں" نوجوان خادمہ نے پاس آکر کہا "وہی مرگئے" جو ابھی آپ کو دیکھنے آئے تھے" شکیلہ ہیرنگٹن کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی اوس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ اور اوسے چند منٹ تک تمام کمرہ چاروں طرف گھومتا نظر آیا۔ رحمت اور عزیزن نے تھوڑی دیر نوجوان مالکہ کے تلوے سہلائے ملے۔ اور لیونڈر کی شیشی کھول کر اُس کے ناک کے پاس رکھی۔ خوشبو کی تیزی سے شکیلہ ہیرنگٹن نے گردن ہٹائی اور گھبراکر کہا۔ "کون مرگیا۔ میں کہاں ہوں" بوڑھی رحمت نے شفقت مادری سے شکیلہ ہیرنگٹن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "کوئی نہیں مرا تمہارے مہربان رفیق احمد زخمی ہو گئے ہیں۔ کسی نے گولی ماردی۔ مگر اب انہوں نے آنکھ کھولی ہے اور تمہیں آواز دی ہے" معلوم نہیں ان الفاظ میں کیسا برقی اثر تھا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اور اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ دونوں

عورتوں نے اوسے سہارا دے کر فرش سے اُٹھایا۔ اور شکیلہ کے کانپتے ہوئے آواز میں یہ کہنے پر کہ وہ کہاں ہیں۔ مجھے جلدان کے پاس لے چلو۔" رحمت نے آہستہ سے جواب دیا "گھبراؤ نہیں۔ وہ اچھے ہیں۔ اور بالکل اچھے ہو جائیں گے۔"

ایک آدمی بڑے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیج دینا چاہئے۔" شکیلہ ہیرنگٹن اس اثنا میں اوٹھہ کھڑی ہوئی تھی۔ اور رحمت کے کمرے میں آدمیوں کی آواز سُن کر سمجھ گئی تھی۔ کہ اوس کا مجروح دوست اوس کمرے میں ہے خوشی اور رنج کی افراط انسان کو کتنا حواس باختہ کر دیتی ہے۔ اور وہ تمدنی مراسم و قواعد سے لاپرواہ ہو جاتا ہے چنانچہ شکیلہ ہیرنگٹن نے بھی کسی کے سہارے یا اشارے کی پرواہ نہ کی اور وہ دوڑ کر اماؤں کے کمرے میں گھس گئی۔ یہاں اوسے دو تین نوکر ایک پلنگ کے پاس بیٹھے دکھائی دیئے۔ اور دوسری چارپائی پر ایک لڑکا لیٹا ہوا نظر آیا جسکا سر پھٹا ہوا تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن کو ان نامحرم آدمیوں کو دیکھ کر جھجکنا اور پیچھے ہٹ آنا چاہئے تھا لیکن اوسے کوئی چیز ایسی زبردست طاقت سے کھینچ رہی تھی۔ کہ اُس نے اون اجنبی آدمیوں کی موجودگی کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور زخمی رفیق احمد کے پلنگ کے نیچے بیٹھ کر کہنے لگی میرے عزیز دوست میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔ معلوم نہیں اس آواز میں کیا کشش تھی کہ مجروح نے آنکھ کھول دی۔ اور گھبرا کر کہا۔ کون ہے کیا شکیلہ کی آواز ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کیا میری والدہ نہیں آئیں۔ جلدی جلدی۔" شکیلہ ہیرنگٹن نے اُس کا منہ لحاف سے ڈھک دیا۔ اور اُس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی شکیلہ ہیرنگٹن کے چہرے پر اس وقت بڑی بدحواسی اور اودا سی چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں ناوقت کی تکلیف اور بدخوابی سے وہ چمک

دلک باقی نہیں رہی تھی جس کی وجہ سے وہ دیگر اوقات میں قابل رشک کہلاتی تھی۔ ایک حسین کم سن لڑکی کا اپنے نوجوان زخمی عاشق یا معشوق کے پلنگ کے نیچے بیٹھ کر اشک حسرت بہانا کس قدر دل خراش نظارہ تھا مسٹر ہیلی فاکس کے نوکر مس شکیلہ ہیرنگٹن کو افسوس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور اون سب کو ان دونوں کے سانحہ گہری ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ رحمت اور عزیزن دروازے میں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھیں۔ کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ سب سے زیادہ دردانگیز بات یہ تھی۔ کہ نازک اندام لڑکی اس ہولناک منظر اور تکلیف کے دیکھنے کے قابل نہ تھی جو اب سے پیش نظر تھی۔ آہ۔ وہ کرسمس کی رات جسنے شکیلہ ہیرنگٹن اپنے لئے اس قدر مبارک و مسعود سمجھ رہی تھی۔ دراصل بڑی منحوس نکلی۔ شکیلہ ہیرنگٹن فرش پر ہاتھ رکھ کر یا ہنگی اوٹھی اور دروازے پر آکر کانپتی ہوئی آواز میں رحمت سے کہا "جلدی احمد خاں کو صاحب سول سرجن کے پاس بھیجدو۔ باہر مجھے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اگر یہ گاڑی ہے جس میں مسٹر رفیق احمد آئے تھے۔ تو اسی کو آنے جانے کے کرائے پر لے لیا جائے۔ یا ملازم میری گاڑی لے جائے۔ مگر دیر نہ لگے۔ ہاں۔ ابھی احمد خاں کو ٹھیراؤ۔ میں ایک خط مسٹر رفیق احمد کی والدہ کے نام بھیجنا چاہتی ہوں۔ اُن کا آنا بہت ضروری ہے۔ مسٹر رفیق احمد اپنی والدہ کو یاد کر رہے ہیں" رحمت قدرے خوف زدہ دل سے سہر کے ملازمین کو کن آنکھیوں سے دیکھتی ہوئی باہر نکلی شکیلہ نے بڑا لیمپ جلا کر لائبریری کا راستہ لیا۔ اور موم بتی کی روشنی میں چند سطور رفیق احمد کی والدہ کے نام لکھ دیں۔ تین چار منٹ کے اندر احمد خاں شکیلہ کا دردانگیز پیغام لئے ہوئے اوسی سڑک پر ہو لیا۔ جو پچھلے ایک گھنٹے کے اندر ایسے خوفناک جرم کی گواہ بن

چکی تھی۔

گیارھواں باب

اب کامراں کا دماغ خالی نہ رہے گا

کامران خندق کے کنارے سر بسجدگی ہوئی چھولداری میں ہدایت علی کے پاس چھوٹی سی چارپائی پر کمل اور لحاف میں سکڑا ہوا تھا۔ اوس نے آج صبح ہدایت علی کو رڑکی بھیج کر ضروری سامان برتن لحاف اور بچھونا وغیرہ منگا لیا تھا۔ مگر دن بھر کی لگاتار بارش نے اوس چھولداری کو اس قدر تر اور میلا کر دیا تھا۔ کہ نو بجے رات کے جب وہ کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹا۔ تو اوسے چولھے کے گرم دھوئیں کے مقابلے میں چھولداری کے کونے پر سے آنے والی مرطوب ہوا بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ اور وہ نزلہ کے اندیشے میں پڑ گیا۔ چھولداری کے اوپر سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ باہر گر رہے تھے۔ اور گو چھولداری اوس کے سر سے بہت اونچی تھی۔ مگر اوس کی تری اور بو کے قرب سے اوسے معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے گرم دماغ پر کسی نے بھیگی ہوئی پٹی باندھ دی ہو۔ ہدایت علی بھی موسم کی تکلیف سے آزاد نہ تھا۔ دونوں ایک سی حالت میں تھے۔ چھولداری کے شمالی کونے میں اس کا بوڑھا باورچی جو رڑکی میں نوکر رکھا گیا تھا پیال پر بستر جمائے حقہ پی رہا تھا۔ چولھے کے بائیں جانب ایک لکڑی کے اسٹول پر نئی لال لالٹین رکھی ہوئی تھی جس کی روشنی سے چھولداری کے

وسطی بالش کا عکس بوڑھے باورچی کے بستر سے گذرتا ہوا چھولداری کے شمالی کونے میں پہونچ گیا تھا۔ چولھا لال لال دہکتے ہوئے انگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اوس کے پاس دو تین برتن بڑی بے ترتیبی سے پڑے تھے کامران نے اپنے دائیں ہاتھ سے کپڑے ایک کرسی پر جو سکیلہ ہنٹنگٹن کے بنگلہ سے مستعار لے گئے تھے۔ رکھ لئے۔ اور سگار کے بکس سے ایک سگار نکال کر چاقو سے کاٹا۔ پھر دیا سلائی سے اوسے سلگا کر پیتا ہوا بستر پر لیٹ گیا بوڑھے باورچی نے ہدایت علی کے پاس حقہ رکھ دیا۔ اور خود پیال کے اوپر کونے میں بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ کامران نے گردن تک لحاف اوڑھ لیا۔ اور چمکدار آنکھوں سے ہدایت علی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا "یار یہ تو بڑی علت ہوئی۔ دیکھئے بارش سے کب گلو خلاصی ہو ابھی تو پتھر نکلنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس طرح تو شاید ایک مہینہ لگ جائیگا۔ اس چھولداری میں کیونکر گذر ہوگی" ہدایت بے ڈھنگے حقہ کے دو چار دم زور سے کھینچ کر کامران کی طرف مخاطب ہوا۔ اور بستر پر لیٹ کر کہنے لگا "بے شک یہاں بڑی تکلیف ہے۔ مجھے آپ کا زیادہ خیال ہے +

کامران نے گردن اوٹھا کر باورچی کی طرف دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ خوب اونگھ رہا ہے۔ اوس نے اوسے آواز دے کر کہا "بڑے میاں تم اب سو جاؤ" باورچی نے چونک کر کامران کی طرف دیکھا جس نے دوبارہ یہی بات کہی "تم اب سو جاؤ" بعد ازاں کامران دیر تک بیٹھا ہوا سگار پیتا رہا۔ پھر اوس نے ہدایت علی سے کہا "ذرا لال ٹین میرے پاس رکھدو مجھے چند خطوط لکھنے ہیں۔ رحمت بیگ کا خط تمہیں دکھلا ہی چکا ہوں غالباً مجھے بہت جلدی لاہور جانا پڑے گا" ہدایت علی نے مستعدی سے اوٹھ کر لال ٹین والا اسٹول کامران کے پاس رکھ دیا۔ پھر کامران نے اپنے اوور کوٹ

کی جیب سے چند پوسٹ کارڈ فاؤنٹین پین اور کاغذ نکالے۔ اوس نے غرب کی طرف پشت کر لی۔ اور ہدایت علی کی دبی ہوئی آواز کے اکثر سوالات کا جواب دیتا ہوا خط لکھتا رہا۔ خطوط ختم کر کے اوس نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا۔ پھر آہستہ سے ہدایت علی کو آواز دے کر کہا۔ کیا سو گئے اوس نے اُچک کر جواب دیا۔ "نہیں تو۔ کیا کچھ کام ہے"۔ کامران نے اوس کی چارپائی پر جھک کر آہستہ سے کہا۔ "تم جاگتے رہو۔ ابھی نہ سونا۔ میں نے یہاں شب کا رہنا اس وجہ سے پسند کیا ہے۔ کہ میں شکیلہ کے نوکروں کے رنگ ڈھنگ سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ اس وقت شاید بارش کی وجہ سے سب لوگ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں پڑے ہوں۔ میں کچھ باتیں سنکر آؤنگا یہ کہکر وہ اپنے بستر پر سیدھا بیٹھ گیا۔ اور پانچ منٹ بعد اُس نے ٹرنک سے چند کپڑے نکالے۔ اپنے چہرے سے بوڑھی ڈاڑھی اور سفید مونچھیں اور سر کے مصنوعی بال اوتار کر بستر کے نیچے رکھ دیئے۔ اور زنانہ لباس پہننا شروع کیا۔ اور بہت تھوڑی دیر میں برقعہ پوش شریف عورت بنکر چپکے چپکے باہر آیا۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی یخ بستہ ہوا کے جھونکوں سے ناک اور آنکھوں میں برف گھستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اندھیرے میں اسے باغیچہ کی روش بھی اچھی طرح نہ دکھائی دی اور وہ کیچڑ میں سنبھال سنبھال کر پاؤں رکھتا ہوا بنگلہ کے شرقی برآمدے تک پہونچا۔ وہاں ذرا سی دیر ٹھہر کر اوس نے نوکروں کی کوٹھڑیوں کی طرف دیکھا۔ نوکروں کے لئے دس بارہ پختہ کوٹھڑیاں معہ برآمدہ کے بنی ہوئی تھیں اوسے دو کوٹھڑیوں کے دروازے کھلے ہوئے نظر آئے۔ جن میں سے روشنی برآمدے تک آرہی تھی۔ وہ اس طرح کھلے ہوئے نوکروں میں گھسنا نہیں چاہتا تھا۔ پس اوس نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لئے بنگلہ کے چاروں طرف ٹہلنا شروع کیا۔ سراغ رساں لوگ ہر بات میں خواہ مخواہ اپنا

قدم ڈالنے کو کہا ہوتے ہیں چنانچہ اوس کے بے چین دماغ نے بھی اوسے
مجبور کیا۔ کہ سب دروازوں پر پھر کر دیکھے۔ کہاں کہاں
روشنی ہے۔ اور کیا ہو رہا ہے۔ اوسے شمالی برآمدے میں اندھیرا نظر آیا۔
اگرچہ یہی سب کمروں کے اندر روشنی تھی۔ لیکن اور دروازوں کے اوپر
پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اور ان کے پیچھے روشنی کی جھلک موجود تھی۔ پھر
وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کھڑکیوں سے گذرتا ہوا غربی برآمدے پر پہونچا جس
پر [illegible] اور دو اور کمرے واقع تھے جنوبی خلیج
کے متصل [illegible] بڑا کمرہ تھا جس کے اندر بالکل تاریکی
تھی۔ کیونکہ اندر کا بالکل معلوم نہ تھا۔ کہ یہ کمرہ کس کام کے لئے مخصوص ہے
وہ باہر کی کھڑکی سے چبوترے پر چڑھ کر برآمدے میں آیا۔ اور اوسنے سلسلہ
میز نگلٹن کی لائن [illegible] کے پیچھے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی شاید
سکسبی میز نگلٹن اس وقت دالان سے گذر رہی تھی۔ جب آہٹ موقوف ہوئی
تو اوس نے دبے دبے پاؤں شمال رویہ کمرے کے دروازے پر جا کر ہاتھ
پھیلایا۔ جو ایک چیز پر پڑا۔ اوس نے آہستہ سے اپنے قدم پیچھے ہٹائے۔
اوس کے پاؤں میں اس وقت روپ سول جوتہ تھا جسکی آواز پختہ فرش
پر بھی ہو سکتی تھی۔ پھر وہ آہستہ برآمدے سے نیچے اترا۔ اور اپنے دل سے
کہنے لگا "یہ کمرہ شاید سکی نوکر کے پاس ہے۔ یا اس سے توشہ خانہ کا کام
لیا جاتا ہے۔ وہ [illegible] کی آئینہ دار کھڑکیوں میں جھانکتا ہوا جنوب کیطرف
چلا گیا۔ اس کمرے میں مغرب کی سمت کھڑکی کے باہر لوہے کی سلاخیں
لگی ہوئی نہیں۔ کا۔ اس نے اندازہ کیا۔ کہ سلاخیں حفاظت کی غرض سے
ہیں۔ اور کمرہ ضرور توشہ خانہ ہے۔ اوس نے جنوبی گوشے پر جھک کر کچھ غور کرنا
شروع کیا۔ اس وقت اوسنے اپنے کپڑوں پر چند بوندیں پڑتی معلوم ہوئیں
مگر چونکہ نصف گھنٹہ سے بارش تھمی ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے آسمان

کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ چاروں طرف کالے کالے ہیبت خیز بادل گھرے ہوئے ہیں جنوبی سمت بھی شمال کی طرح ایک بڑا کمرہ تھا۔ جس میں اس وقت بالکل تاریکی تھی۔ بڑے کمرے سے ملحق دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جس میں سے ایک غربی برآمدہ کا توشہ خانہ تھا۔ بظاہر یہ کمرے غیر آباد تھے شیکسپیلر سینگین جیسی تن تنہا لڑکی کو زیادہ کمروں کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے غالباً یہ کمرے اسباب رکھنے کے کام آتے تھے۔ اوسے نوکروں کی کوٹھڑیوں کی طرف سے کیواڑ بند ہونے کی آواز آئی۔ اوس نے آنکھ اٹھا کر اُدھر دیکھا۔ تو اب اس طرف بالکل اندھیرا پایا۔ یہ موقع نوکروں کی باتیں سننے کے لئے اوسے بہت اچھا نظر آیا۔ اور دبے پیر شاگرد پیشہ مکانات کی طرف جانے لگا۔ مگر جب وہ توشہ خانہ کے کونے پر پہونچا۔ اوسے چھینک کی آواز آئی۔ جو ایسی ویسی تھی۔ کہ اوسے خیال ہوا کہ شاید نوکروں کی کوٹھڑیوں سے آئی ہے۔ بہرحال وہ آہستہ آہستہ نوکروں کے مکانات کے پاس پہنچا۔ اور ترتیب وار ہر دروازے پر تھوڑی تھوڑی دیر ٹھیر کر باتیں سنتا رہا۔ نوکر لوگ اپنے بستروں پر بیٹھے ہوئے معمولی زندگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں اوس نے کان لگا کر سُنا۔ تو ہلکی آواز میں یہ بات سنائی دی "یار کریم بخش ہم تو غریبوں کے عشق میں مرمٹے مگر وہ ہماری طرف دیکھتی ہی نہیں۔ کیا علاج کریں؟ اس کے جواب میں اوسے ہنسی کی آواز آئی جس کے ساتھ کسی نے کہا "تم دیوبند چلے جاؤ" حاجی عابد حسین صاحب کے تعویذ گنڈے بڑے زور کے ہوتے ہیں۔ غریبن تم سے شادی پر رضامند ہو جائے گی" کامران کو یہ گفتگو دلچسپ معلوم ہوئی وہ کان لگائے کھڑا سنتا رہا۔ لیکن اوسی لمحہ میں اوسے آبشار آصف نگر کی طرف سے دھاں دھاں سے لپٹی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اور اُسکا مستعد دماغ چوکنا ہو پڑا۔ اور وہ تعجب کرنے لگا۔ کہ ایسی نہ میعی اور خوفناک

رات میں اس طرف کس کی گاڑی آرہی ہے۔ اور وہ ایک کان سے نوکروں کی باتیں دوسری سے گاڑی کی کھڑکھڑ سنتا رہا لیکن اوسے دونوں آوازیں اچھی طرح سنائی نہ دیں پھر اوس نے زیادہ توجہ سے شمال کیطرف کان لگائے۔ تو گاڑی کی آواز زیادہ قریب معلوم ہونے لگی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ اور جلدی جلدی بنگلے کے آہنی پھاٹک پر پہنچا۔ اوسے دور سے گاڑی کی روشنی نظر آئی۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ گاڑی اسی بنگلہ میں آرہی ہے کیونکہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلے کے سوا کوئی دوسرا بنگلہ اوس حصہ زمین پر واقع نہ تھا کیچڑ میں گھستا ہوا بڑھا۔ اور پختہ سڑک کو طے کر کے بنگلہ کے باہر دور تک چلا گیا گاڑی کی لال ٹین بائیں جانب تھی۔ اس طرح کھیتوں میں اندھیرا ہونے سے اوسے تاریکی میں کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں اوترتی آرہی تھی مگر پھر بھی وہ اوس کے پھاٹک پر آنے سے قبل سڑک کو طے کر کے دس گز کے فاصلے پر کھیت میں پہونچ گیا تھا جس کے اندر پاؤں رکھتے ہی اوس کے روپ مول جوتے ایک فٹ دلدل میں اُتر گئے اور اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا کسی نے اوسے پایاب تالاب کے اندر پھینک دیا ہے۔ جب گاڑی اندر داخل ہو چکی۔ تو اوس نے زور سے پاؤں کھینچ کر باہر نکالے۔ اوس کے موزوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اور اس ناگوار حالت میں اوس کا جی چاہتا تھا۔ کہ جوتی اتار کر ننگے پاؤں ہو جائے۔ بارے وہ آہستہ آہستہ بنگلہ میں داخل ہوا۔ اور اوس نے گاڑی شمالی برآمدے کی طرف جاتی دیکھی۔ وہ توشہ خانہ کے پاس سے نکل کر جنوبی دیوار کی طرف بڑھا جہاں سے اُسے خیال تھا۔ کہ وہ اس گاڑی کے متعلق کچھ اطلاع پا سکے گا اوس نے دیوار کے کنارے پر کھڑے ہو کر ذرا گاڑی کیطرف دیکھا۔ اوس سے دس گز کے فاصلے پر گاڑی بان پیچھے اترا ہوا دروازے کھول رہا تھا۔ اور پیچھے کے حصے میں لال ٹین کی سرخ روشنی پھیل رہی تھی۔ اسے کچھ

معلوم نہ ہو سکا۔ کہ کون شخص آیا تھا۔ اور چونکہ وہ غیر ملت کے لباس میں اپنی قلعی بھی کھلوانی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ پیچھے ہی مڑ گیا۔ مگر جب توشہ خانے کے پاس سے گذرا۔ اوسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ کوئی دروازہ کا قفل کھول رہا ہے۔ گو اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اس کمرے میں مداخلت کرنے والے کو بھی واقف ہو مگر اوسے ڈر تھا۔ کہیں اس کا لباس جنگلہ میں شک و شبہ پیدا کر کے مشکلات نہ پیدا کر دے۔ اس لئے وہ آگے نہ بڑھا اور دور سے دروازے کی طرف نگاہ جمائی۔ اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ دروازے پر کسی نے دیا سلائی جلائی ہے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ تو چوکھٹ کے پاس کوئی شخص ضائی میں لپٹا ہوا کھڑا تھا پھر اوس کی نگاہ اوس کی ٹانگوں پر پڑی۔ تو اُن میں سرخ چھینٹ کا پاجامہ نظر آیا۔ اور اوس کے ساتھ پاؤں کی نقرئی چوڑیاں بھی دکھائی دیں۔ اور اپنے دل سے کہنے لگا۔ "میں بھی کیسا گدھا ہوں۔ ذرا سی بات کا تنگنگڑ لگا لیتا ہوں۔ شاید رحمت یا دوسری نوجوان خادمہ ہے۔ جو توشہ خانہ میں سے کوئی چیز لینے آئی ہوگی"۔ اس طرح مطمئن ہو کر وہ شاگرد پیشے کے مکانات سے گذر کر احاطہ کی بیرونی چار دیواری سے مل کر اپنی چھپر داری میں داخل ہوا۔ اور سب سے پہلے اپنے پاؤں سے بھیگے ہوئے موزے اور بوٹ جلد جلد اوتار کر چولہے کے پاس گیا جس میں ابھی تھوڑی سی حرارت باقی تھی۔ بعد ازاں اوس نے جھٹ پٹ زنانے کپڑے بھی اوتار کر ٹرنک میں ڈال دیئے۔ اور رات میں ایک گھنٹہ کامل باہر رہنے سے ذرا متاثر ہو کر اوس نے اپنے بستر پر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اوس کے دل میں اس ناوقت ملاقاتی کی آمد چکیاں لے رہی تھی۔

کبھی وہ اس اندھیری رات کے مہمان کو کیلہ ہنر نگلٹن کی شناسا میم اور کبھی اوس کا کوئی پرانا دوست یا ہمدرد جس سے شاید اوس کے

گم شدہ دفینہ کا کوئی تعلق ہو سمجھ رہا تھا۔ اور کبھی بدگمانی ہوتی تھی۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن کہیں بدچلن لڑکی تو نہیں جس کے ہاں اندھیری راتوں میں مشتبہ آدمی ہوتے ہیں۔ کامران ایک سراغ رساں تھا۔ لہذا اوس کو سب قسم کے شبہات قایم کرنے کا استحقاق حاصل تھا لیکن اُسکی بےچینی ناقابل برداشت نہ تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ جب اس شخص کی آمد کا تمھے علم ہو گیا۔ تو میں رفتہ رفتہ یہ بھی معلوم کر لونگا۔ کہ وہ کون شخص ہے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن اُسی کا شوق دریافت اسے مجبور کر رہا تھا۔ کہ اس معاملہ کے متعلق وہ زیادہ عرصہ اس تاریکی میں نہ رہے۔ بہر حال اوس نے ٹھنڈے اور کسی قدر سیلے ہوئے لحاف کو منہ پر لیا تو تھوڑی دیر تک اوس کو سارے بدن میں لرزہ محسوس ہونے لگا۔ لیکن پھر لحاف نے بدن کو گرمی پہونچانی شروع کر دی۔ اور اوس نے لالٹین گل کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر چونکہ اوس کے بھوکے دماغ کو غذا مل گئی تھی۔ اور اس ناوقت کے مہمان کی آمد کا مسئلہ اوس کے دل و دماغ کے سامنے ایک زندہ تصویر کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے باوجود تھکے ماندے ہونے کے اوس کی نیند اوچٹ گئی۔ اور سونے کی کوشش بےسود سمجھ کر اوس نے ہدایت علی کو جگانا۔ اور اس اجنبی مہمان کی خبر لانے کو بھیجنا چاہا۔ لیکن سراغرسانی کے ہر ایک کام میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اوس نے ان سب باتوں کو کل پر ملتوی رکھا۔ اور سونے کے ارادہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ اوس کی چوکیداری میں لالٹین کی روشنی تیزی سے چمک رہی تھی۔ اوس کے مقابلے میں باہر گہری تاریکی کے اندر سے گاڑی کی سرخ روشنی اوسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اوس نے کئی بار آنکھیں کھول کھول کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر سرخ روشنی کی حرکت اور پہیوں کی کھڑکھڑ سے اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ گاڑی چل

رہی ہے۔ اوس نے اطمینان کا سانس بھر کے سونے کی ٹھان لی۔ اور لالٹین گل کردی۔ اوس کی آنکھ کبھی لگنا چاہتی تھی کبھی کھل جاتی تھی۔ بدن خوب گرم ہوگیا تھا۔ اور قریب تھا۔ کہ وہ میٹھی نیند کے نشے میں سرشار ہو جائے۔ کہ اوسے ٹھاں ٹھاں کی آواز زور سے سنائی دی۔ وہ کانپ کر جاگ اٹھا۔ اور ہدایت علی کو ہلا کر کہنے لگا "ہدایت علی یہ بندوق کی آواز کیسی ہے" ہدایت علی گہری نیند میں تھا۔ اوس نے جواب دیا "تمہارا ایک اور نکالا ہے۔ ابھی آتا ہوں" کامران نے اوسے زور سے جھنجھوڑ کر کہا "ہدایت علی جاگ اٹھو۔ دیکھو کہیں بندوق چلی ہے میں خبر لینے جاتا ہوں" ہدایت علی جاگ اُٹھا۔ اور کامران نے مختصر الفاظ میں گاڑی کی آمد اور بندوق کی آواز سے اوسے مطلع کرکے بھاری اوورکوٹ پہن کر بوڑھے آدمی کا بھیس بدلنا شروع کیا۔ پھر وہ لپک کر بنگلے کے قریب آیا۔ مگر یہاں سب طرح خیریت تھی۔ چاروں طرف کے دروازے بند تھے۔ پھر وہ جلدی جلدی نوکروں کی طرف گیا وہاں بھی کوئی غیر معمولی بات نہ پائی۔ پھر اس نے سوچنا شروع کیا کہ قرب وجوار میں سوائے آبشار آصف نگر کے کہیں عمارت نہیں غالباً آواز اوس طرف سے آئی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ بنگلے سے باہر نکلا۔ اور بلند بھیگی ہوئی سڑک پر بطرف آبشار جلد جلد چڑھنے لگا۔ وہ ابھی آبشار کے پل سے پچاس گز دور تھا۔ کہ اوسے بائیں جانب کھیت میں کوئی تاریک چیز نظر آئی۔ وہ کچھ پہچان نہ سکا۔ کہ یہ کیا چیز تھی۔ وہ دوڑتا ہوا آگے بڑھا چلا گیا مگر دس بارہ قدم آگے جاکر اوسے ایسا معلوم دیا۔ کہ کوئی شخص اوس کے پیچھے بھاگا آرہا ہے۔ وہ ڈر کر مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اور جیب سے پستول نکال لیا۔ مگر اُس کا خیال غلط تھا۔ اور کوئی شخص جنوب کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ کامران نے اب سوچنا شروع کیا۔ کہ کدھر چلنے

آیا۔ اس شخص کے پیچھے پڑ کر خبر لائے۔ کہ کون تھا۔ یا آبشار کے اوپر پہونچکر بندوق کی آواز کے متعلق استفسار کرے۔ اوسے دور سے ایسی آواز آئی کہ کوئی دوڑ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے دل نے اوسے اوس شخص کی طرف متوجہ کیا۔ جو بطرف جنوب بھاگا جا رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے اوس کے پیچھے ہو لیا۔ لیکن اوس تاریک آدمی کا کامران سے بڑا فاصلہ تھا۔ اور پیشتر اس کے کہ کامران اوس کے قریب پہونچ جاوے۔ سراج رساں کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ شخص احاطہ کی مغربی دیوار پر پہونچ کر بسمت شرق مڑا ہے۔ کامران بل ڈاگ کتے کی طرح بے تحاشا بھاگا ہوا اوہر آیا۔ اوسے وہ مشتبہ آدمی مشرقی دیوار کی طرف مڑتا ہوا معلوم دیا۔ کامران سمجھ گیا۔ کہ وہ آبشار کی طرف جنگل میں چھپنا چاہتا ہے۔ کامران بھی شرقی دیوار سے لگا لگا بھاگتا رہا۔ مگر اب اوس شخص کا سایہ بھی نظر نہ آیا۔ اوس نے دیوار پھاند کر اپنی چھولداری میں قدم رکھا۔ اور سب معاملہ ہدایت علی سے کہہ کر لال ٹین روشن کی بعد ازاں اوس نے بوڑھے باورچی کو جگایا۔ پھر ان تینوں آدمیوں نے آبشار کے کنارے کا جنگل دو فنک چھان مارا۔ لیکن کچھ پتہ نہ لگا۔ ان تینوں کو اس جستجو میں نصف گھنٹہ گذرا ہوگا۔ کہ آبشار کی طرف سے شن شن کی آوازیں ہیبت ناک شب کی تاریکی میں خوفناک آبشار کی دھاں دھاں سے ٹکرا ٹکرا کر ہواؤں میں گونجنے لگیں۔ کامران اور ہدایت علی کے دل دہل گئے۔ اور وہ سمجھ گئے۔ آج کوئی خوفناک حادثہ ہوگیا" انہوں نے اندھے بادلوں کی طرح آبشار کا راستہ لیا۔ اور بھاگے بھاگے سسٹر ہیلی فاکس کے جنگلہ پر پہونچے۔ جہاں بیسیوں آدمی بڑی بیتابی سے سرگوشیاں کر رہے تھے +

بارھواں باب

شک و شبہات

کامران جس وقت کوٹھی آصف نگر پر پہنچا۔ وہ گذشتہ ایک گھنٹے کے واقعات سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ لیکن اس جیسے تجربہ کار سراغ رساں کے کان اور آنکھیں جرائم کے ارتکاب اور خوفناک رازوں سے اس قدر آشنا رہ چکے تھے۔ کہ وہ بندوق کی آواز کسی آدمی کے تاریکی میں بھاگنے۔ پھر گھنٹے کے ذریعے سے الارم دیئے جانے کو خالی از علت نہ سمجھتا تھا جب وہ سب ڈویژن کی چھوٹی لداریوں کے پاس جو کوٹھی کے وسیع احاطے میں بہ جانب مشرق نصب تھیں۔ نیچے اترا۔ تو اوس کے پاؤں نرم زمین میں دھنسنے لگے۔ اس کے پیچھے ہدایت علی اور بوڑھا باورچی تھا۔ اور موخر الذکر کے ہاتھ میں لال ٹین تھی جس قدر تعجب کامران اور اوس کے ساتھیوں کو سب ڈویژن کے گھبرائے ہوئے عملہ کی صورتوں سے تھا۔ اوسی قدر ان لوگوں کو بوڑھے کامران کی تمسخر آمیز شکل اور کابلی لباس سے تھا۔ کامران کے سر پر عمامہ کے اندر پشاوری کلاہ تھی۔ اور اس کے دبلے پتلے پستہ قد بدن پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور سفید ڈاڑھی اوسے ایک قسم کے قلندری لباس میں پیش کر رہے تھے نہروں کے بالخصوص سب ڈویژن کے منشی اور بابو لوگ اوسکی صورت سے چمکے۔ اور اوس کی طرف استفہامیہ نگاہیں ڈالنے لگے۔ کامران قریب آیا۔ اور مضطرب آواز میں آہستہ سے پوچھنے لگا "کیا ماجرا ہے۔

ہندوستانی ڈویژنل کلرک جو پستہ قد سیاہ فام چالاک آدمی تھا۔ آگے بڑھا اور خیمہ کے پاس سے لال ٹین ہاتھ میں لے کامران کا چہرہ غور سے دیکھتا ہوا بولا: ایک قتل ہو گیا ہے۔ آپ کون ہیں؟ اس اثنا میں مسٹر ہیلی فاکس بھاری اوورکوٹ اور سر پر رات کی ٹوپی پہن کر ان لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں آ کھڑے ہوئے۔ اسی عرصے میں سینکڑوں مزدور اور دہقان تدریج آنے شروع ہو گئے۔ بجائے ہندو بابو کے کامران نے انگریزی میں صاحب موصوف سے باتیں کرنی شروع کیں۔ اور گو صاحب بہادر نے بھی اوسے شبہ نگاہ سے دیکھا۔ مگر کامران نبض شناسی آدمی تھا۔ اوس نے بہت مختصر الفاظ میں صاحب موصوف کا اطمینان اس طریق سے کر دیا۔ کہ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلے میں دو روز سے حوض کھدوا رہا تھا۔ سب ڈویژن کے آدمیوں میں چند آدمی رفیق احمد اور اوس کے خاندان سے خوب واقف تھے اور اس وقت مسٹر ہیلی فاکس کو بھی اوس کے حسب و نسب سے واقفیت ہو چکی تھی۔ پس باتوں باتوں میں اوسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ سب شور و شر رفیق احمد کے متعلق تھا۔ اور اس وقت وہ سب لوگوں کی آنکھوں میں وہ شہید عشق جاناں سمجھا جا رہا تھا۔ رفیق احمد کے زخمی ہو جانے کی خبر سے تجربہ کار کامران کے توحش دماغ کو بھیر لگی۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ دل دہلنے لگا۔ اوسے فوراً خوبصورت شکیلہ ہیرنگٹن کا خیال آ گیا۔ جو اس کی محبت میں غمگین اور مستعد تھی۔ مسٹر ہیلی فاکس کامران سے بہت سے سوالات اوس کے حسب و نسب کے متعلق کرتے رہے۔ اور کامران نے بھی اس موقعہ کی نزاکت کا خیال کر کے اپنے آپ کو ناگوار شبہات کا آماجگاہ سمجھنے لگا۔ اگر مسٹر ہیلی فاکس اوس وقت اوس کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈال دیتے

تو اوسے شاید جان بچانی مشکل پڑ جاتی۔ مگر وہ سفلین نمکین اور فولادی جگر کا آدمی تھا۔ وہ سراغ جوئی کے پیشے میں پڑتے وقت اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر باہر آیا تھا۔ کیا پرواہ ہے۔ اگر اوس کام کے فرائض اوسے ہدف شبہات بھی کر دیں۔ اوس نے اپنے متعلق سپرنٹنڈنٹ کو کوئی سچی بات مسٹر ہیلی فاکس کو نہ بتائی۔ اور صرف اس بات پر تلا رہا۔ کہ اس کا نام کلیک تھا۔ اور وہ محض گھسنے کی آواز سے آ نکلا تھا۔ کامران کا دل اس وقت نہایت اضطراب میں اور کئی بار اوس کی زبان پر اس شخص کا ذکر آیا۔ جسے وہ نصف گھنٹہ قبل آبشار سے پچاس گز نیچے جانب جنوب بھاگتا دیکھ کر تعاقب میں نکلا تھا۔ مگر اوس کے سمجھدار دماغ نے ہر مرتبہ اسے روکا۔ اور اوس نے مسٹر ہیلی فاکس سے رخصت ہوتے وقت اپنے دل میں آہستہ سے کہا۔ میں کتنی بڑی حماقت کا مرتکب ہونے والا تھا۔ اگر میں اوس شخص کے متعلق لب کشائی کر دیتا۔ تو میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہتا۔ ماورائے ازیں میں خود پولیس کی ناگوار جرح قدح میں پھنستا اور سچ پوچھو۔ تو اُس کا خیال درست بھی تھا۔ کامران کو پولیس کے مقابلہ میں اکثر موقع پر خاموشی کی بدولت کامیابی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا پختہ ارادہ تو نہیں تھا۔ کہ وہ اندھیری رات کے مجرم کے سراغ میں لگ گیا تھا اس میں شک نہیں۔ اوسے چند شبہات مل گئے۔ یہ شبہات اس کے دل میں مقید تھے۔ اور وہ کسی سے ان کا ذکر نہ کرنا چاہتا تھا اسے مجرم کی تلاش میں ساتھ رکھا۔ مگر میں ان باتوں کا انتظام کر سکتا ہوں۔ پھر اوسے اپنے باورچی کی باتوں سے اطمینان ہو گیا۔ کہ وہ شخص پرلے سرے کا بیوقوف ہے۔ اور نصف گھنٹہ پیشتر کی جستجو اور مجرم کا ذکر کسی سے نہ کر سکے گا۔ دراصل کامران نے اس بوڑھے باورچی کو احمق سمجھ کر نوکر رکھا تھا۔ اسے چاہئے تھا۔ کہ نوکر کی [illegible]

لئے ہدایت علی بلایا گیا تھا۔ وہ سب ڈویژن کے آدمیوں اور سواضع کے مزدوران کو ادھر ادھر پھر کر بغور دیکھتا رہا۔ اور اُس کی لال ٹین اور ان لوگوں کی مشعلوں نے خوب کام دیا۔ وہ نصف گھنٹہ تک سب باتیں اچھی طرح دیکھ بھال کر شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ کی طرف مڑا۔ جہاں اوسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ رفیق احمد اور خورد سال لڑکا زخمی پڑے ہیں۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جب وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے استراحت خانہ کی طرف سے ہوتا ہوا شرقی برآمدے کی جانب آنے لگا۔ اوسے عورتوں کے کمرے میں آوازیں سنائی دیں۔ اور لال ٹین کی روشنی نظر آئی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازہ پر گیا۔ اور دیکھا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن برقعہ اوڑھے نوکروں کو زخمی رفیق احمد کا پلنگ اپنے استراحت خانہ میں اٹھا لانے کا اشارہ کر رہی ہے۔ وہ مس صاحب معاف کیجئے گا" کہہ کر آگے بڑھا۔ اور اپنے باورچی کے ہاتھ سے لال ٹین لے کر رفیق احمد کے چہرے اور زخم کو دیکھنے لگا۔ رفیق احمد کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اوس کا منہ چڑا ہوا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں شناخت کی قابلیت نہ تھی۔ اوس کے منہ سے گرم گرم سانس میں کراہنے کی آواز نکل رہی تھی۔ بظاہر وہ سخت تکلیف میں تھا۔ پھر کامران نے چھوٹے لڑکے کے سرہانے آکر اوس کی کیفیت دیکھی۔ لڑکے کے سر سے اس وقت خون تھم گیا تھا۔ مگر وہ بیہوش تھا۔ یا گہری نیند سو رہا تھا۔ کامران اس منظر کو دیکھ کر کانپ گیا۔ اوس نے لال ٹین نوکر کے ہاتھ میں دیکر پلنگ کے اوٹھانے میں مدد دی۔ اور جب وہ شکیلہ ہیرنگٹن کی مسہری کے قریب پہونچا دیا گیا۔ تو کامران نے صبر کیا۔ اس سے پوچھا کیا آپ نے اب تک ڈاکٹر کو نہیں بلایا؟ شکیلہ ہیرنگٹن نے نہایت دلسوز آواز سے جس میں کمزوری اور رعشہ معلوم ہوتا تھا۔ جواب دیا۔ رسول میرزا کے

پاس آدمی بھیجا ہے۔ اور خود اپنی گاڑی بھیج رہا ہے۔ امید ہے۔ کہ ڈاکٹر ایش ٹن جلدی آویں گے" کامران سے رہ ن کو ٹھنڈا پانی لانے کی ہدایت کی۔ تاکہ وہ رفیق احمد کے زخم کو دھو ڈالے۔ اور چپکے سے عزیزن کو کہا" دیکھو لڑکے کے سر کا زخم رہو کر پٹی باندھ دو" مگر وہ ابھی ان ہی باتوں میں تھا۔ کہ دور سے دو تین گاڑیوں کی کھڑکھڑ سنائی دی شکیلہ اور سب لوگ کسی قدر مطمئن ہوئے۔ اور سمجھ گئے۔ ڈاکٹر ایش ٹن اور رفیق احمد کی والدہ آپہونچیں۔ دو منٹ کے بعد ایک گاڑی سے بوڑھا تجربہ کار سول سرجن اور دوسری رفیق احمد کی بوڑھی والدہ مع ایک خادمہ اور نوکر کے اتری۔ سول سرجن نے مفرز عورت کو لال ٹین کی روشنی میں بڑی عزت سے اتارا۔ اور وہ برقعہ میں لپٹی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی شکیلہ ہیرنگٹن نے قریب جاکر کہا" آیئے اندر آجایئے پہر ڈاکٹر ایش ٹن کی طرف نہایت شکریہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی" آپ نے کس قدر تکلیف گوارا کی۔ میں شکریہ ادا نہیں کرسکتی" ڈاکٹر ایش ٹن نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا" آدمس مس ہیرنگٹن شکریہ کی ضرورت نہیں۔ آپ زخمی آدمی کو جلدی دکھایئے۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی ہے لیکن آپ جانتی ہیں۔ ایسی سردی میں بستر چھوڑ کر چار میل آنا کچھ آسان کام نہ تھا" بیشک بیشک بالکل درست ہے"

مس شکیلہ ہیرنگٹن کے منہ سے نکلا۔ اور وہ سول سرجن کو اپنے استراحت خانہ کا اشارہ کرکے رفیق احمد کی والدہ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ اندر لائی۔ رفیق احمد کی والدہ اور ڈاکٹر ایش ٹن دونوں مجروح کے چہرے جھک گئے۔ ایک محسن اپنا فرض سمجھ کر اس زخمی نوجوان کے مردنی چھائے ہوئے چہرے کو افسوس سے دیکھ رہا تھا دوسری نامعلوم آسمانی برسات کے جوش سے بے چین ہو ہو کر رنج کے آنسو بہا رہی تھی۔ ڈاکٹر

ایش ٹن کی موجودگی کا بوڑھی عورت نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور وہ نہایت پرجوش مگر تھرائی ہوئی آواز میں چلا کر بولی "ہائے میرے لاڈلے میں تجھ پر قربان۔ میں نے کہا تھا۔ کہ اس اندھیری رات میں کہیں نہ جا" یہ کہکر اوس نے مجروح کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور اوس کی پٹی کے نیچے بیٹھ کر کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب میرا بچہ کب تک اچھا ہو جائے گا" ڈاکٹر ایش ٹن نے کھانس کر جواب دیا "آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ جلدی صحت یاب ہو جائیگا" ڈاکٹر ایش ٹن کا دل بھر آیا۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کے آنسو نکل پڑے۔ پھر ڈاکٹر نے رفیق احمد کے بدن سے اوور کوٹ اتارا۔ اور پلنگ کو انگیٹھی کے پاس کھینچ کر بولے "میں اب زخم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان بی بی کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ مجھے ڈر ہے۔ انہیں غش نہ آجائے" شکیلہ ہیرنگٹن نے عزیزہ خاتون کو فرش سے اٹھانا چاہا۔ مگر اس کے پاؤں جم گئے تھے۔ اور وہ بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا ان کے سامنے چادر کھینچ دو۔ دونوں عورتوں نے چادر کھینچ لی۔ ڈاکٹر نے اپنے چرمی بیگ سے چند اوزار اور شیشیاں نکالیں۔ پھر رفیق احمد کے خون آلود قمیص اور قمیص کو بنیان اتار کر اس کا نصف بدن برہنہ کر دیا۔ اس وقت شکیلہ ہیرنگٹن بھی چادر کے نیچے ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر مذکور نے ایک لیمپ پاس منگا کر زخم کو غور سے دیکھا۔ پھر جلدی ایک سلفچی لانے کا حکم دیا۔ ازاں بعد رفیق احمد کو کاوزا فارم سونگھانا شروع کیا۔ اور جب دیکھا۔ کہ وہ بالکل بے ہوش ہو گیا ہے اوس نے بکس سے تیز نشتر نکالی۔ اور بڑی چابک دستی سے گولی کھینچ لی۔ گولی کے نکلتے ہی خون کی بڑی مقدار باہر نکل پڑی۔ اور بیہوش رفیق احمد بستر سے اچھل پڑا۔ سول سرجن نے مستعد ہاتھوں سے مجروح کا زخم دھویا۔ اور چند ادویہ ڈال کر زخم کو بھر دیا۔ یہ سب کام پانچ منٹ

کا تھا۔ مگر ڈاکٹر کے سوا کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ جب پٹی بندھ چکی۔ اور سول سرجن نے رفیق احمد کے منہ میں معقول مقدار دوا کی ٹپکا دی۔ تو اس نے آنکھ کھول دی۔ اور چلا کر بولا "میرا ہاتھ کٹا جاتا ہے۔ مجھے کیا ہوا۔ میری ماں کہاں ہے" اوس کی اماں چادر کو سامنے سے ہٹا کر اوس کے ماتھے پر جھک گئی۔ اور چلا کر بولی "میرے لاڈلے میں تیرے پاس موجود ہوں" رفیق احمد نے آنکھیں پھاڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں کچھ روشنی اور استفہام پیدا ہوا۔ اور اوس نے اشک آلودہ آنکھوں کو بند کر کے کہا "اماں میرا ہاتھ کٹا جاتا ہے۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ" مصیبت زدہ ماں اپنے بچے کے پاس بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر ایش ٹن نے زخم کی تکلیف کا خیال کر کے دوسری نیند لانے والی دوا جھٹ پٹ اضافہ کی۔ بعد ازاں خورد سال لڑکے کے زخموں کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر لڑکے کے زخم معمولی اور دو چار روز میں افاقہ پذیر ہو جانے والے معلوم ہوئے۔ اوس کے سر کو بھی ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے دھویا۔ اور مرہم پٹی کرنے کے بعد ایک دوا اوس کے لئے بھی الگ شیشی میں بنا دی گئی۔ ڈاکٹر ایش ٹن پھر رفیق احمد کے پاس آیا۔ اور اوس کی نبض پر ہاتھ رکھکر دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ اوس کے پاس بیٹھنے کے بعد اوس نے ایک شیشی میں تین خوراکیں دوا کی بنا دیں اور کہنے لگا "آج اس غریب کو ساری شب درد اور مصیبت میں گذرے گی۔ اور کوئی چارہ نہیں۔ کل علی الصباح دونوں آدمیوں کی کیفیت میرے پاس بھیجو۔ چونکہ کل بڑا دن ہے۔ میں ایک بجے سے پیشتر نہیں آسکونگا۔ لیکن علی الصباح دوا بھیجدونگا" وہ اوٹھ کر جانے کی اجازت مانگنے لگا۔ تو سکیلہ ہیسٹنگس نے دو دس دس روپے کے نوٹ ہاتھوں پر رکھکر اس کے سامنے کر دیئے مگر اوس نے شکریہ

اداکر کے بوڑھی عزیزہ خاتون کی طرف دیکھ کر کہا "مسٹر رفیق احمد ہمارے معزز دوست مولوی شفیق احمد صاحب کا بیٹا ہے۔ فیس کی کوئی جلدی نہیں۔ دیکھا جائے گا" اور چپکے چپکے سے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر کہا "انہیں رہنے دو۔ اوہ بارہ بج کر دس منٹ ہو گئے ہیں۔ ہماری نجات کے لئے مقدس مسیح پیدا ہو گئے" پھر تبسم سے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کو کرسمس مبارک ہو" خدا آپ کو مبارک کرے" شکیلہ کے منہ سے نکلا مگر اوس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ایش ٹن اور ملازمین بہر کے رخصت ہو جانے پر شکیلہ نے اپنے نرس کے ملازمین کو سو جانے کی اجازت دی۔ پھر اپنے کمرے میں چاروں طرف چٹخنیاں لگا کر بوڑھی عزیزہ خاتون کے پاس آئی۔ اور برقعہ اتار کر کہنے لگی "میرے معزز دوست کی والدہ آپ میری مسہری پر آرام کریں۔ میں مسٹر رفیق احمد کے سرہانے بیٹھی رہونگی" عزیزہ خاتون نے اپنے منہ سے برقعہ اٹھا کر خوب صورت عیسائی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور اگرچہ اس وقت کی پریشانی میں اس کا رنگ۔ وروپ نصف بھی نہ رہا تھا۔ اور لمبے لمبے بھورے بال پریشانی سے ادھر ادھر پھیل رہے تھے مگر اوس کا دل اوچھل پڑا۔ اور وہ مجروح بیٹے کے سرہانے بیٹھی ہونے پر اس پرہیزگار لڑکی کو جنت کی حور سمجھ کر مسکرا دی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "نہیں بیٹی تو ایسے کاموں کے لئے پیدا نہیں ہوئی" اور یہ کہہ کر اوس نے شکیلہ ہیرنگٹن کی بلائیں لیں۔ اور اوسے اوس کی مسہری پر بٹھا دیا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میرا مہربان زخمی پڑا ہے۔ مجھے کس طرح نیند آئے گی" لیکن عزیزہ خاتون اور اوس کی خادمہ نے بڑے اصرار سے شکیلہ ہیرنگٹن کو بستر پر لٹایا۔ اور وہ تھکی ماندی دس پندرہ منٹ کے اندر گہری نیند کے آغوش میں پہونچ گئی۔ عزیزہ

خانوں کی خادمہ بھی چند منٹ کے اندر نرم قالین پر اونگھنے لگی۔ نوجوان رفیق احمد بازو کے زخم سے تمام رات کراہتا اور اچھلتا رہا۔ اور اس کی معزز محبت کرنے والی ماں نے ایک منٹ کیواسطے اپنی آنکھیں بند نہ کیں فی الحقیقت والدین کا سایہ اولاد کے لئے ابر رحمت سے کم نہیں ہوتا۔

تیرھواں باب

پولیس کی تحقیقات

دوسرے دن چمکدار آفتاب بھیگی ہوئی زمین اور سرد ہوا کو گرم کرنے کے لئے آن بان سے نکلا۔ اندھیری رات کے سیاہ ہیبت ناک بادلوں کا نام و نشان نہ رہا تھا۔ اور نیلے آسمان کی طرف دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا آسمان منہ دھو کر آیا ہے۔ غرب کی طرف سے ہوا کے تیز جھونکے درختوں کے پتوں کو جنبش دے کر شرق کی جانب کھیلتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ ان کی چھیڑ چھاڑ سے خلقت کی جان پر کیا بن رہی ہے۔ بنی نوع انسان بالخصوص غریب لوگ سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ کوٹھی احمد نگر کے صحن میں جہاں سے نہر کی چھوٹی لہریاں نصب تھیں۔ سورج کی پاکدار کرنیں بھیگی ہوئی زمین سے پانی کھینچنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اور نرم سبز سبز گھاس کے اندر سے دھوئیں کے بخارات نکل رہے تھے

پن چکیوں کے قریب نہری کشتہ نالہ بہی آفتاب کی کشش سے متاثر ہو کر دھواں چھوڑ رہا تھا۔ آس پاس کے درختوں پر اکڑے ہوئے پرند نکلنے والے آفتاب کے استقبال میں کھوئے ہوئے کلیلیں کر رہے تھے۔ نہر کے گھنٹے نے چھولداری کے اندر رسالت بجائے اور چھولداری کے رہنے والے خوب دن نکل آنے کے ڈر سے گرم لحافوں کو چھوڑ چھوڑ کر اٹھنے لگے کوٹھی کے برآمدے میں مسٹر ہیلی فاکس کے ذاتی ملازم دیر سے جمع تھے۔ اور بڑے دن کے سبب سے آج بہت سویرے اٹھ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ صبح کا ناشتہ کر کے مسٹر ہیلی فاکس میم صاحب سمیت آفتاب کے سامنے برآمدے میں بیٹھنے کیلئے آئے۔ اور اسی وقت ان کی نگاہ ایک پولیس افسر پر پڑی۔ جو خاکی وردی پہنے اور سر پر خمجالر دار دوپٹہ باندھے چھولداریوں کے پاس مضبوط لمبے گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ گھوڑے نے بے چینی ظاہر کی۔ اور سائیس نے اوسے شاباش شاباش کہہ کر خاموش کرنا چاہا۔ نوجوان پولیس افسر سخاوت علی سب انسپکٹر قصبہ سنگلور تھا۔ جس کو شب گذشتہ مسٹر ہیلی فاکس نے بذریعہ چوکیدار پولیس واقعہ کی اطلاع بھیجی تھی۔ سب انسپکٹر دھڑکتے ہوئے دل سے بنگلہ کی طرف بڑھا۔ اور مسٹر ہیلی فاکس کے سوچ کر فوجی سلام کیا۔ صاحب بہادر نے اوسے کرسی پر جگہ دی۔ سخاوت علی لانبے قد اور دوہرے جسم کا بیس سالہ گندم گوں آدمی تھا۔ اس کی ناک لمبی تھی۔ ڈاڑھی متوسط۔ آنکھیں موزوں پیشانی بلند۔ بانہہ پاؤں مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر میم صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر ادب سے صاحب کی طرف دیکھ کر بولا "آپ کا شکریہ" زبان سے نکالا۔ پھر چھولداریوں کی طرف دیکھ کر جہاں سے نہر کے بالومشی ان کی باتیں سننے کو چلے آرہے تھے

آہستہ سے کہا "رات کے واقعہ کی آپ کو اطلاع ہو چکی ہے۔ آپ تحقیقات شروع کر دیں۔ آج بڑا دن ہے۔ میں نماز کے لئے دس بجے رڑکی جاؤنگا۔ آپ اس عرصے میں دوسرے آدمیوں سے فارغ ہو لیں میں اپنے اظہار ایک بجے لکھواؤنگا۔ کیا آپ کے ساتھ کنسٹبل نہیں آئے" اسسٹنٹ کلکٹر نے اپنے دائیں ہاتھ کشتی نالہ کی طرف دیکھ کر کہا "کانسٹبل اور ہیڈ محرر آرہے ہیں۔ وہ آئے" ایک یکہ میں تین آدمی خاکی وردی پہنے آرہے تھے مسٹر ہیلی فاکس نے "بہت اچھا۔ بہت اچھا" کہہ کر سخاوت علی کو رخصت کیا جس نے اپنے ماتحتوں کے پاس آکر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ نہر کے ملازمین ان کے پاس آکر باتیں سننے لگے۔ پھر سخاوت علی نے ان لوگوں کے چہرے کو دلی تنفر اور غصے سے دیکھ کر اپنے ماتحتوں سے کہا سب سے پہلے اوس بنگلہ پر چلنا چاہیئے۔ جہاں مجروح آدمی پڑا ہوا ہے" پھر نہر کے آدمیوں نے غربی سڑک کا راستہ لیا۔ جو شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلے پر ختم ہوتی تھی۔ وہ آبشار آصف نگر کے پل پر آئے۔ تو سب نے معمولی عیاوت کی کشش میں بھاں کی طرف نگاہ ڈالی مگر اس وقت خوف ناک آبشار کی وھاں وھاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مقام صوبہ میں کل خوب بارش ہو گئی تھی۔ چند روز کے لئے جھال اور نہر بند کر دیئے گئے تھے آبشار کے سینکڑوں پختہ دروازے سیاہ لوہے کے کیواڑوں کے آگے قوی ہیکل بے جان بھوت معلوم ہو رہے تھے۔ اور خوفناک موجوں کی جگہ گڑھوں میں سیاہ پانی اور بلند نشیبی کناروں پر کروڑوں من پتھر بیکار اور سست پڑے دکھائی دے رہے تھے۔

تین منٹ بعد یہ لوگ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں داخل ہو رہے تھے جہاں آہنی پھاٹک سے گذر کر انہوں نے ناواقف آدمیوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر ایک آدمی کو سامنے سے بلایا۔ اور حاکمانہ آواز سے کہا "دیکھو

ہمارے آنے کی خبر دے دو۔ ہم رات کے واقعہ کے متعلق تحقیقات کرنے آئے ہیں۔" اس آدمی نے جو شکیلہ ہیرنگٹن کے خدمت گاروں میں سے تھا۔ ان لوگوں کو خوف زدہ نگاہ سے دیکھ کر باہستگی کہا "اچھا آیئے۔" اور ان سب کو اپنے پیچھے لئے ہوئے وہ شرقی برآمدے کی طرف اوس دروازے پر آیا جس سے عورتوں کے کمرے میں آمد و رفت ہوئی تھی۔ یہاں اس کی نگاہ رحمت پر پڑی۔ جو پولیس والوں کی صورت دیکھ کر کانپ گئی۔ اور اُس کے چہرے پر اضطراب کے آثار ظاہر ہوئے۔ خدمت گار نے کانپتی ہوئی آواز میں رحمت سے کہا "جاؤ مس صاحب کو اطلاع کر دو۔ پولیس والے آئے ہیں"۔ رحمت گھبرائی ہوئی شکیلہ ہیرنگٹن کے استراحت خانہ میں آئی۔ جہاں اس وقت رفیق احمد کی والدہ اپنے بیٹے کا منہ سلفچی میں دھلا رہی تھی۔ اس وقت شکیلہ ہیرنگٹن یہاں موجود نہ تھی۔ رحمت نے عزیزن سے کہا۔ کیا مس صاحبہ ابھی غسل سے فارغ نہیں ہوئیں"۔ عزیزن نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں کیوں کیا بات ہے رحمت نے زبان سے جواب دینے کی بجائے کچھ اشارہ کیا۔ اور عزیزن نے ملحقہ کمرے کے کیواڑ کھول کر پولیس والوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر اون سے ڈر کر کیواڑ بند کر دیئے۔ اسی اثنا میں مس شکیلہ ہیرنگٹن اپنے بالوں کو بڑے تولئے سے خشک کرتی ہوئی آئی۔ اس نے اس وقت شاندار نیا لباس پہن رکھا تھا کیونکہ آج اوس کی ہم مذہب عیسائی دنیا میں بڑا دن تھا۔ یہ سفید ریشم کے کپڑے اوس کے گورے رنگ پر خوب بہار دیتے تھے۔ مگر اس کی صورت میں اس وقت بجائے گرشمہ و ناز کے ایک قسم کا خوف اور بے چینی تھی۔ اوس نے مسکرا کر رفیق احمد کی طرف دیکھا۔ اور پھر کہنے لگی "مجھے ڈاکٹر الیش ٹن صاحب کے پاس آدمی بھیجے بڑی دیر ہوئی۔ وہ ابھی آتا ہوگا" نوجوان رفیق احمد نے

لڑکی کی عنایت کا تبسم سے شکریہ ادا کیا۔ مگر اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ ہونٹ بالکل سیاہ پڑ گئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ اوس کا گول خوب صورت چہرہ سکڑ کر چھوٹا ہو گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف دس سال کا بے سمجھ لڑکا ہے۔ رحمت نے آہستہ سے پولیس والوں کا پیغام کہا جس کی طرف رفیق احمد اور اوس کی والدہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ رفیق احمد نے بازو کی تکلیف سے آنکھیں اور ابرو چڑھا کر گہرا سانس لیا۔ اور آہستہ سے کہا "اماں تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ سب سے پہلے پولیس والے مجھ سے سوالات کریں گے" شکیلہ ہیرنگٹن اس قسم کے واقعات اور تجربات سے نابلد تھی۔ اوس کے چہرے پر پریشانی اور تکلیف کے آثار ہویدا تھے۔ پھر اوس نے عزیزن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیگم صاحبہ کو لائبریری میں لے جاؤ۔ اور ناشتہ کراؤ۔ میں ابھی فارغ ہو کر آتی ہوں" عزیزہ خاتون اپنے چمک دار قیمتی رضائی سنبھالتی ہوئی لائبریری کی طرف چلیں۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن نے ایک کھونٹی سے اپنا برقعہ اتار کر اوڑھ لیا۔ رحمت نے بھاگ کر پولیس والوں کو بلا لیا۔ اور ان سب آدمیوں نے یکے بعد دیگرے رفیق احمد شکیلہ ہیرنگٹن۔ عزیزن رحمت اور عزیزہ خاتون کی خادمہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سب انسپکٹر ایک کرسی کھینچ کر رفیق احمد کے پاس بیٹھ گیا۔ اور معمولی سوالات پوچھ پوچھ کر قلم بند کرتا گیا۔ سب انسپکٹر نے رفیق احمد کے اظہار میں کوئی بات غیر معمولی نہ پائی لیکن اوس نے جب موخر الذکر کے اظہار کو دوبارہ پڑھا تو اوس کی پیشانی پر کچھ آثار نامعلوم تردد کے پیدا ہوئے۔ اور اوس نے استفہامیہ آواز سے آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔ آپ مس شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں ایک سال بعد آئے تھے۔ کیا آپ نے اپنی آمد کی اطلاع شکیلہ ہیرنگٹن کو بھیج دی تھی۔ رفیق احمد نے سامنے شکیلہ کی سمہری کی طرف دیکھا

اور چہرہ بنا کر کہا "نہیں میں نے اطلاع نہیں بھیجی۔ اور شکیلہ ہیرا گلشن کو یا کسی کو میرے ادھر آنے کی خبر نہ تھی۔ میں نے ایک خط دن کے بارہ بجے شکیلہ کے پاس بھیجنا چاہا تھا۔ لیکن وہ لکھا ہوا رکھا رہا۔ میں نے روانہ نہیں کیا۔" سب انسپکٹر نے چمک دار آنکھوں سے رفیق احمد کی طرف دیکھا۔ اور اوس کے چہرے پر کسی قدر سرخی چمکی۔ پھر اوس نے جلدی سے پوچھا "یہ خط لکھا ہوا رکھا۔ کیا کسی اور شخص نے دیکھ لیا۔ اور آپ کی آمد سے واقف ہو کر آپ پر اچانک حملہ کیا؟" رفیق احمد نے کچھ سوچا۔ پھر سر ہلا کر جواب دیا "میرا خط کسی نے نہیں دیکھا۔ اور نہ اوس میں میں نے کوئی وقت آمد کے متعلق مقرر کیا تھا۔ وہ خط میرا دراز میں گھر پر رکھا ہوا ہے۔ اور کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ میرے بنگلے پر کوئی شخص ایسا ہے۔ جو میرا دشمن سمجھا جائے۔"

"یہ تو کہنا مشکل ہے۔ کہ آپ کا کوئی دشمن نہیں۔ ہاں یہ بتائیے کہ خط بند تھا۔ یا کھلا ہوا۔ میں اپنے ہیڈ محرر کو آپ کے دولت خانہ پر بھیج کر دریافت کرتا ہوں۔ آیا وہ خط اس وقت وہاں ہے یا نہیں؟"

رفیق احمد نے اُس وقت بازو کی تکلیف بہت زیادہ محسوس کی۔ اوس کے دانت کھل گئے۔ اور اوس نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا خط بند تھا۔ اُس پر ٹکٹ بھی لگا ہوا ہے۔ میری لائبریری کے دراز میں ملیگا۔ میرے پاس چابی ہے۔" اور یہ کہکر اوس نے اپنی خادمہ سے اوور کوٹ مانگ کر چند کنجیاں نکالیں۔ اور سب انسپکٹر کے حوالہ کر کے کہنے لگا "لیکن میرا مکان میرے پرانے ملازم حفیظ بخش کے سامنے کھولا جائے کوئی چیز گم ہو گئی۔ تو پولیس ذمہ دار ہے۔"

انسپکٹر "آپ ان باتوں کی طرف سے مطمئن رہیئے۔ پولیس حفاظت جان و مال کے لئے ہے۔ نہ نقصان کے لئے۔" انسپکٹر نے کنجیوں کا گچھہ

تبسم کے ساتھ اپنے ہیڈ محرر عرفان علی کے ہاتھ میں دے کر کہا "ہمارے دیوان جی صاحب بڑے نیک بخت اور نیک چلن آدمی ہیں کبھی رشوت بھی نہیں لیتے" ہیڈ محرر نے بالکل سادگی اور بھولاپن سے رفیق احمد کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس کر سب انسپکٹر کے ہاتھ سے کنجیاں لے لیں در اصل عرفان علی ہیڈ محرر بڑا نیک چلن اور متشرع آدمی تھا۔ اور اوس کی طبیعت میں اس قسم کا بھولاپن تھا۔ کہ سب لوگ اوسے پولیس میں رہنے کے ناقابل سمجھتے تھے۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کہ ایمان دار اور سیدھے آدمی پولیس کی نوکری نہیں کر سکتے۔ وہ اس وقت پچیس سال کا ملازم تھا۔ اگرچہ باوجود وسیع تجربہ اور کہن سالگی کے کوئی اوس کی ترقی کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ عرفان علی کے رخصت ہو جانے پر سب انسپکٹر نے پھر رفیق احمد کو مخاطب کر کے پوچھا "کیا آپ کو کسی پر شبہ ہے۔ آپ کا کوئی دشمن ضرور ہو گا"

"مجھے کوئی شبہ نہیں" اور نہ میں خواہ مخواہ کسی آدمی کو پھنسانا چاہتا ہوں۔ شاید میرا کوئی دشمن ہو مگر در اصل میں قطعی لاعلم ہوں"

اب سب انسپکٹر شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف رجوع ہوا۔ مگر اوس کے اظہار میں اوسے کوئی بات غیر معمولی نظر نہ آئی شکیلہ کے اظہار میں رست اور اوس کے بوقت شب لوٹائے ہوئے باہر سے آنے کا ذکر آیا تھا۔ پس شکیلہ کے بعد رحمت کا نمبر آیا۔ سب انسپکٹر ہر ایک اظہار میں کسی ایسے آدمی کا نام دریافت کرتا رہا جس پر شک و شبہات پڑ سکیں۔ رحمت نے اپنے اظہار میں دو باتیں غیر معمولی بیان کیں۔ ایک تو یہ کہ رفیق احمد کا کوئی نوجوان پھوپھی زاد بھائی سہارنپور میں ہے۔ اوسے شاید رفیق احمد کی دولت پر شبہ ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ شکیلہ ہیرنگٹن نے چند روز گذرے کسی اجنبی کو دی۔ سٹر کامران کو لاہور سے بلایا تھا۔ شاید وہ کسی سبب سے

رفیق احمد کا دشمن ہو گیا ہو۔ رحمت کے اظہار پر سب انسپکٹر نے غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی۔ اور سمجھنے لگا۔ کہ یہ عورت شکیلہ ہیرنگٹن کے راز و نیاز اور خفیہ زندگی میں خوب دسترس رکھتی ہے۔ اس سے بہت کام نکلے گا۔ مگر شکیلہ ہیرنگٹن کا دل کامران کے نام سے اچھل پڑا۔ اور اوس نے برقعہ کے اندر سے دانت پیس کر رحمت کو دیکھا۔ اوسے دراصل اس وقت رحمت پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی۔ کہ اس کا سر دیوار سے دے مارے واقعی اس بے تمیز بوڑھیا کو کامران کے متعلق کوئی مشتبہ بات معلوم نہیں تھی۔ پس اس پر شبہ کرنے کی کون سی وجہ نکلی۔ مگر بہت سے آدمی محض خلقت کو محفوظ یا بے چین کرنے کے لئے ایک نیا شگوفہ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ دیدہ رحمت بجائے اس کے کہ شکیلہ یا رفیق احمد کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتی۔ وہ ان کی تکلیف کو محض بچوں کا کھیل سمجھ کر ان کے زخمی دلوں پر نمک پاشی کے لئے مستعد تھی۔ سب انسپکٹر نے پرشوق نگاہ سے شکیلہ کو دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا "مس صاحب یہ شخص کون تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ میں اس کے نام سے واقف ہوں۔ کیا آپ کچھ اوس شخص کی بابت بھی جانتی ہیں۔ جو مسٹر رفیق احمد کا پھوپھی زاد بھائی ہے"

اس وقت شکیلہ ہیرنگٹن اور رفیق احمد دونوں گفتگو کرنے لگے۔ اول الذکر کے منہ سے کامران اور موخر الذکر کے دہن سے بلند اختر نکلا۔ شکیلہ خاموش ہو گئی۔ تو رفیق احمد نے کہا "میرے پھوپھی زاد بھائی بلند اختر کا اس معاملہ سے کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے میرے والد کا وصیت نامہ سنا ہے۔ وہ خوب واقف ہیں۔ کہ بلند اختر ان کی دولت سے کسی طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔ آپ بلند اختر کا نام رحمت کے اظہار میں لکھئے خواہ مخواہ وہ غریب مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اگرچہ مجھے اوس کے ساتھ کبھی محبت نہیں رہی۔ مگر میں اوسے اپنا دشمن بھی نہیں سمجھتا۔

سب انسپکٹر نے قہقہہ لگا کر رفیق احمد کی طرف دیکھکر کہا "آپ نے بھی خوب فرمایا۔ اگر آپ کا پھوپھی زاد بھائی بلند اختر آپ کا دوست نہیں تو وہ ضرور دشمن ہے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر مجھے اپنا وصیت نامہ دکھا سکتے ہیں۔ کامران اور بلند اختر ان دونوں آدمیوں کے متعلق مجھے گہری تحقیقات کرنی پڑے گی" اس وقت شکیلہ ہیرنگٹن نے آپ کے دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں رکھکر آہستہ سے کہا "مسٹر کامران بہت معزز آدمی اور لاہور کا مشہور سراغ رساں ہے۔ وہ مجھے میری جائداد کے متعلق مشورہ دینے آیا تھا۔ اور دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ اس معاملہ سے اوس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا" سب انسپکٹر نے مسکرا کر شکیلہ کیطرف دیکھا پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے کہنے لگا "مس صاحب آپ ذرا صبر کریں۔ میں اوس شخص مسٹر کامران سے خود واقف ہوں۔ اور واقعی اوس کی شہرت اور قابلیت کے لحاظ سے کوئی شبہ کرنا ناجائز بھی ہوگا۔ مگر ذرا ٹھہریئے۔ میں اس شخص بلند اختر کے متعلق مزید حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں مسٹر رفیق احمد کیا آپ اپنے والد صاحب کے وصیت نامہ سے مجھے باخبر کر سکتے ہیں +"

نوجوان رفیق احمد کے چہرے پر غصہ کے آثار ہویدا ہوئے اور اس نے جھلا کر کہا "سب انسپکٹر صاحب آپ خواہ مخواہ معاملہ کو طوالت دے رہے ہیں۔ آپ کو میرے وصیت نامہ سے کیا تعلق ہے۔ آپ اس بنگلہ سے باہر اوس شخص کا پتہ لگائیے جس نے میرے گولی ماری۔ اور اگر آپ کو وصیت نامہ ہی کا شوق ہے۔ تو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرے والد صاحب نے ایک لاکھ بارہ ہزار روپے بنک آف بنگال آگرہ میں چھوڑا ہے۔ اور یہ روپیہ مجھے اس شرط پر مل سکتا ہے۔ کہ میں شکیلہ ہیرنگٹن سے شادی نہ کروں۔ اور اگر شادی کروں۔ تو اوسے مسلمان بنالوں۔ مگر میں ایک لاکھ روپے پر لات مار کر

شکیلہ ہیرنگٹن کے دروازے پر آ پڑا ہوں۔ شکیلہ ہیرنگٹن کا دل اچھل پڑا اور اگر اس کمرے میں یہ نامحرم لوگ نہ ہوتے۔ تو وہ خود رفیق احمد کے پاؤں پر گر پڑتی۔ نوجوان سب انسپکٹر نے کسی قدر ناوم اور پُرعتاب آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھ کر کہا "بہت اچھا میں آپ صاحبوں سے معافی مانگتا ہوں لیکن آپ لوگ ذرا رحمت کو میرے ساتھ کر دیجئے۔ میں اوس سے کچھ باتیں کر کے بلند اختر کے متعلق چند امور معلوم کروں گا۔ پھر آپ کے بنگلہ کے نوکروں کے اظہار لونگا"

شکیلہ نے رحمت عزیز اور عزیزہ خاتوں کی خادمہ کو اپنے اپنے اظہار لکھوا دینے کے لئے سب انسپکٹر کے ساتھ کر دیا۔ سب انسپکٹر معہ کانسٹبلوں کے شرقی برآمدے کے سامنے کھڑا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر چھولداری کے قریب بہت سے مزدور دیکھ کر بولا "یہ کیا ہو رہا ہے"۔ رحمت نے جواب دیا "حوض کے واسطے خندق کھُد رہی ہے"۔ سب انسپکٹر اشتیاق کے ساتھ حوض کی طرف بڑھا۔ اوس کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی اوسے سامنے سے کلو بیگ ٹھیکہ دار کی سپید ڈاڑھی دکھائی دی اور یہ نہ معلوم ہوا۔ کہ وہ لاہور کا معزز اور خوفناک سراغ رساں کامران ہے جسکے سر ان سب کامیابیوں کا سہرا بندھنے کو تھا جن کے اکتساب میں یہ جلد باز سب انسپکٹر عنقریب معذوری ظاہر کرنے والا تھا۔

چودھواں باب

راز در راز

۱

جس وقت عرفان علی ہیڈ ماسٹر حامد کالج کے پاس سے یکہ پر سوار ہو کر سر ولی شفیق احمد صاحب کے بنگلہ کو جا رہا تھا۔ کالج کے خوش نما گنبد والے شاندار گھنٹے میں نو بج رہے تھے۔ اوس نے آنکھ اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور چمک دار آفتاب نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ تین منٹ کے بعد وہ وسیع کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا جس کے بیرونی تزک و احتشام اور باغیچوں کی خوب صورتی دیکھ کر اوسے بڑی خوشی حاصل ہوئی سوا ایسے عالی شان بنگلے میں آجتک کبھی داخل نہ ہوا تھا۔ اور اس وقت اوس کے ہاتھ میں اس مکان کے متعدد کمروں کی کنجیاں تھیں وہ بڑا دیانت دار آدمی تھا لیکن پھر بھی اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ دل میں کہنے لگا "آج اگر میرے سوا کوئی دوسرا ہیڈ ماسٹر یہاں آتا تو وہ بہت سی چیزوں پر ہاتھ مار لیتا۔ مگر اس کا خیال غلط تھا۔ اس وجہ سے کہ اوسے سامنے مشرقی گوشہ پر ایک چارپائی کے اوپر دو تین نوکر بیٹھے دکھائی دیئے جن کے پاس دو عورتیں کھڑی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اور جن کی آنکھیں اس وقت انتظار میں یکہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ بظاہر یہ لوگ اپنے نوجوان آقا کی طرف سے متردد تھے۔ اور یہ سمجھ کر کہ کوئی آدمی بھال آصف مگر سے اُس کے متعلق خبر لائے گا۔ وہ صبح سے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوٹھی کے احاطہ میں جب یکہ کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی

توان سمجھوں نے اس آواز پر دروازے سے کان لگائے۔ اور جس وقت کہ ان کے قریب پہونچا۔ دو ایک مسلح وردی دار ہیڈ محرر پولیس کی صورت سے ڈر کر جھجک گئے۔ اور کھلے ہوئے منہ اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بوڑھے ملازم حفیظ بخش نے جھک کر سلام کیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "آپ نے کیوں تکلیف فرمائی"۔ ہیڈ محرر نے اپنے چہرہ کو تحکمانہ بنا کر کہا "مجھے سب انسپکٹر صاحب مگلور نے بھیجا ہے مسٹر رفیق احمد کی لائبریری کھولو مجھے دراز میں سے چند کاغذات دیکھنے ہیں"۔ بوڑھے ملازم نے اطمینان کا لمبا سانس بھر کر جواب دیا "کیا آپ بھال آصف نگر سے آرہے ہیں۔ ہماری سرکار کیسے ہیں ہمیں ساری رات رنج کے مارے نیند نہیں آئی"۔

ہیڈ محرر نے عورتوں کی طرف دیکھا۔ جن کے چہروں پر سے واقعی اضطراب اور خوف برس رہا تھا۔ پھر مشرق کی طرف منہ کر کے بولا "تمہارے سرکار اچھے ہیں۔ اب تم جلدی دروازہ کھولو۔ مجھے ابھی آصف نگر واپس جانا ہے"۔ بوڑھے ملازم نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر جواب دیا "آپ کا کہنا تو بالکل درست ہے۔ لیکن میں بغیر اپنے آقا کی اجازت کے کس طرح مکان کھول دوں"۔ عرفان علی کے چہرے پر غصہ اور حکومت کے علامات پیدا ہوئے۔ اور وہ جھلا کر بولا "بوڑھے میاں میرے پاس اندر کے کمروں اصطبل و قلی کی چابیاں ہیں۔ جو مسٹر رفیق احمد نے اس غرض سے مجھے دی ہیں۔ اگر اب بھی تم مجھ پر اعتبار نہ کرو۔ تو میں قانون کی رو سے زبردستی دروازہ کھول کر گھس جاؤنگا۔ اور یہ کلمہ ادا کر کے عرفان علی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ دراصل بہت سیدھا اور خاموش پسند آدمی تھا۔ اور کسی سے لڑنے جھگڑنے کی عادت نہ تھی۔ مگر خود کو مشتعل غصہ جانے سے اس کا دل

بے قابو ہو گیا۔ بابر کے حفیظ بخش اس کی شحکمانہ آواز سے ڈر گیا۔ اور وہ جیب سے چابی نکال کر دروازے کی طرف چلا۔ جو شرق رو اور بہت وسیع تھا۔ اوس کے آگے وسیع برآمدہ۔ پھر گاڑیوں کے لئے چھت بنی ہوئی تھی۔ اس دروازے کے کھل جانے سے ہیڈ محرر پولیس معہ یکہ بان و ملازمان کوٹھی اندر داخل ہوا۔ اور ایک بڑے مستطیل کمرے کے اندر سے گھتا ہوا بڑے ہال میں پہونچا۔ جس کی دائیں جانب جنوب رو یہ دروازہ لائبریری کا تھا۔ اس دروازے میں ایک مضبوط قفل لگا ہوا تھا۔ جسے عرفان علی نے رفیق احمد کی کنجیوں میں سے ایک کنجی نکال کر کھولا کمرے کے اندر تاریکی تھی۔ اور کھڑکیوں میں آئینے کی جگہ اسپات کی چادر کے مضبوط چوکور ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ کمرہ بظاہر چاروں طرف خوب محفوظ تھا۔ عرفان علی نے شرقی دروازہ کھلوایا۔ اور کمرے میں دھوپ کے ساتھ ساتھ روشنی داخل ہوئی۔ اس کمرے میں تینوں طرف شیشہ کی بڑی بڑی الماریوں میں پرانی کتابیں بھری ہوئی تھیں لیکن الماری اور آئینوں کے ارد گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ جس میز پر رفیق احمد بیٹھ کر لکھتا تھا۔ وہ تو ضرور صاف اور پر تکلف تھی لیکن پرانی دری پر کبھی کبھی جھاڑو نہ دے دیئے جانے کے سوائے صفائی وغیرہ کے اعتبار سے کمرہ بالکل بے ترتیبی اور بے پرواہی کی حالت میں تھا۔ عرفان علی نے اپنے کام کی ذمہ واری کا خیال کر کے ہلکے ہاتھ سے بائیں طرف کے دروازے کھولے۔ تو اوس میں اوسے چند پرانے خطوط نظر آئے۔ جن کو اُس نے بڑے خیال خوب غور سے دیکھنا شروع کیا۔ کہ ان خطوط میں ضرور کوئی خط شکیلہ ہیرنگٹن کے نام کا ہوگا۔ عرفان علی کسی قدر انگریزی جانتا تھا۔ اور خطوط کے پتے بآسانی لے لیتا تھا۔ مگر اس دراز میں اوسے کوئی خط شکیلہ ہیرنگٹن کے نام کا نہ ملا۔

اوس نے اس دراز کو کھلا چھوڑ کر دائیں سمت کے دراز کو کھولا۔ اور اوس میں اُسے ایک لفافہ دکھلائی دیا۔ موٹے لفافہ کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس پر اردو زبان میں "مولوی شفیق احمد صاحب کا وصیت نامہ" لکھا ہوا تھا۔ اوس نے شوقیہ نگاہ سے اس لفافہ کے اندر انگلیاں ڈال کر وصیت نامہ نکالنا اور اوسے پڑھنا چاہا لیکن لفافہ اندر سے خالی نظر آیا۔ اوس نے متعجب نگاہ سے کبھی دراز کو اچھی طرح دیکھا۔ لیکن اس لفافہ کے اندر یا دراز میں کوئی اور پرزہ یا خط نہیں دیا تھا۔ رفیق احمد نے شکیلہ ہیرنگٹن کے نام جو خط بتایا تھا۔ وہ بھی بظاہر اوس وقت اس دراز میں نہ تھا۔ ہیڈ محرر کا دل حیرت سے ہلنے لگا۔ اور اُس نے بوڑھے ملازم حفیظ بخش کی طرف دیکھ کر کہا۔ تمہارے آقا نے مجھے ایک خط کے لئے بھیجا تھا۔ جو شکیلہ ہیرنگٹن کے نام لکھا گیا تھا۔ لیکن اس خط کا کہیں پتہ نہیں۔ اور جس لفافہ میں مولوی شفیق احمد صاحب کا وصیت نامہ رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی خالی ہے کیا کسی نے مسٹر رفیق احمد کے چلے جانے کے بعد اس کمرے کو کھولا تھا بوڑھے ملازم کے چہرے کی رنگت فق ہوگئی۔ اور وہ گھبرا کر بولا "کیا وصیت نامہ جاتا رہا۔ ایں ایں آپ کیا کہہ رہے ہیں" اور یہ کہکر بوڑھے ملازم نے مضبوطی سے میز کا کنارہ پکڑ لیا۔ وصیت نامہ کی گم شدگی سے بیچارے کے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ اوس کے سر میں چکر آنے لگا تھا۔ اگر وہ میز نہ پکڑ لیتا تو فوراً نیچے گر پڑتا۔ عرفان علی نے اوسے سنبھال کر کہا "وصیت نامہ کی گم شدگی سے تمہارے آقا کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اوسے گواہ لوگ سُن چکے ہونگے لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ وصیت نامہ اور شکیلہ کے نام کا خط کس نے چرایا۔ کیا کل رات لوگوں میں سے کوئی اس کمرے میں آیا تھا۔ بوڑھے ملازم اور ماماؤں نے کانوں پر ہاتھ رکھکر جواب دیا۔ حاشا اگر ہم میں سے کوئی یہاں آیا ہو۔ اس کے برخلاف ہم تمام رات اس مکان کی

حفاظت کرتے رہے۔" عرفان علی نے حفیظ بخش کے کندھے سے بڑا رومال لے کر اوس میں ان دونوں درازوں کے کاغذات اور خطوط باندھ لئے۔ پھر اُس نے بغور میز کے نیچے اور اوپر بڑی تلاش سے ہر کاغذ و کتاب کو دیکھا۔ میز پر ڈسپیچ بکس۔ بلاٹنگ۔ دوات قلم اور دو تین کتابوں کے سوا کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جس کے دیکھنے میں زیادہ دیر لگتی۔ اوس نے ایک کنجی سے ڈسپیچ بکس کھول کر نیچے اوپر کے سب خانے بڑی ہوشیاری سے دیکھے۔ لیکن اوس میں بھی سوائے چند پرانے خطوط اور کاغذوں اور لفافوں کے کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ ڈسپیچ بکس کا اندرونی خانہ اوٹھانے سے اوسے دو نوٹ سو سو روپے کے نظر آئے۔ اوس نے میز کی جملہ اشیا نیچے اوتار کر دری پر رکھوادیں اور میز پوش ہٹا کر میز کو اچھی طرح دیکھا۔ لیکن اوسے کوئی چیز ایسی نہ دکھلائی دی جسے وہ رفیق احمد کے والد کا وصیت نامہ یا شکیلہ ہیرنگٹن کے نام کا خط کہہ سکتا۔ اوس نے پھر دری کے اوپر سے لوہے کا ڈسپیچ بکس اور کتابیں میز پوش کے اندر الگ رکھوادیں۔ پھر اوس نے الماریوں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ مگر الماریاں بہت اونچی تھیں۔ اور ان میں قفل لگے ہوئے تھے۔ اس قدر کتابوں میں کبھی خط یا وصیت نامہ کو تلاش کرنا ایک قسم کا خفقان تھا۔ اور دراصل رفیق احمد نے شکیلہ ہیرنگٹن کے نام کا خط صاف طور سے درازمیں بتلایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کرے اور اپنے دل کے شبہات کس سے کہے۔ اوس نے حیرت و اضطراب آمیز نظر سے حفیظ بخش کی طرف دیکھ کر کہا۔" بڑی حیرت کی بات ہے۔ ایسے مضبوط کمرے اور قفل کے اندر سے یہ کاغذات کس طرح نکل گئے۔ کیا تم لوگ کل رات کو اندھے بہرے ہو کر سوئے تھے۔ سچ بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے۔" حفیظ بخش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔" حضور ہمیں مطلق خبر نہیں۔ اگر آپ کہیں۔ تو ہم سر پر قرآن شریف رکھکر قسم کھالیں۔" یہی بات عورتوں کے منہ سے نکلی۔ یکہ والہ دروازہ

کے بازوؤں پر ہاتھ رکھکر بولا" بڑے اندھیر کی باتیں ہونے لگیں - دیوان جی اب دنیا میں ہمارے یا آپ جیسے ایمانداروں کی پوچھ نہیں بھلا دیکھو تو قفل کنڈی سب ٹھیک اور چیز ندارد - اچھا تو دیوان جی اب چلو - میں تمہیں آصف نگر پہونچا کر گھوڑے کو گرُد دونگا - آج کچھ سردی کھا گیا ہے" عرفان علی نے دونوں دروازوں کے کاغذات اور ڈسپیچ بکس اور تینوں کتابیں احتیاط سے بند کر کے یکہ والہ کے ہاتھ میں دیں - اور شرقی دروازے میں حسب معمول قفل لگا دیا - بعد ازاں حفیظ بخش کو باہر قفل ڈالنے کا حکم دیا - اور جب وہ قفل ڈال چکا - تو سید ہے سادہے ہیڈ محرر نے قفل کو خوب کھینچ کر دیکھا - اور اُس کے ہاتھ سے چابی لے کر بولا" اب تم سب لوگ باہر رہو - میں آصف نگر سے دو کنسٹبل بنگلہ کی پاسبانی کے لئے روانہ کرونگا - پھر باضابطہ سب انسپکٹر صاحب زلہ کی کو اطلاع دے کر تا انفصال معاملہ پہرہ لگا دیا جاویگا"

حفیظ بخش اور ماماؤں نے دھرکتے دل سے ہیڈ محرر کو رخصت کیا تو شمالی گوشے سے چھٹی رسانوں نے دس بارہ خطوط حفیظ بخش کے ہاتھ میں دیئے - جو سب رفیق احمد کے نام تھے حفیظ بخش نے جھپٹ کر دیوان جی کی طرف دیکھا - جو ابھی یکہ میں سوار ہو رہے تھے - اور خوف زدہ نگاہ سے دیکھ کر کہا" یہ خط بھی لیتے جایئے - سرکار کے ہیں - اور ہم سرکار کے جان و مال کے لئے دعا کر رہے ہیں - ہمارا خدا جانتا ہے - ہمیں اوس شخص کی بالکل خبر نہیں جس نے وصیت نامہ اور خط اوڑا لئے - یکہ والہ نے رفیق احمد کی ڈاک دیوان جی کے ہاتھ میں دے دی - اور چرمی باگ سے گھوڑے کو ہانک کر آصف نگر کی طرف مڑا -

پندرھواں باب

ارے یہ کون نکل پڑا

انسان دراصل بڑا ہی انقلاب پسند واقع ہوا ہے۔ عرفان علی ہیڈ محرر پولیس کو مولوی شفیق احمد صاحب کی کوٹھی سے وصیت نامہ اور رفیق احمد کا خط گم ہو جانے سے اپنے فرائض کی ذمہ داری بڑھ جانے پر تردد ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنے دل میں ایک قسم کی گدگدی محسوس کر رہا تھا۔ جو کسی شخص کو کسی غیر معمولی خوشی کی خبر آنے یا کسی عجیب و غریب چیز کا معائنہ کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

دراصل دنیا کے سب کام خواہ وہ گوناگون خطاؤں یا ہمہ تماشہ رنجوں کی یادگاروں سے لبریز ہوں۔ ایک قسم کے تماشے ہیں۔ ایک تماشے سے کسی کو رنج ہوتا ہے۔ دوسرا ہنس دیتا ہے۔ جو بات ایک شخص کے لئے شیریں معلوم ہو۔ وہ دوسرے کے واسطے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ مولوی شفیق احمد صاحب کی کوٹھی سے کاغذات مندرجہ بالا کی گم شدگی خوف ناک راز یا زبردست سازش کا پیش خیمہ یا نتیجہ تھی۔ مگر عرفان علی جیسے بوڑھے اور جہاندیدہ اہلکار پولیس کو وہ اس وقت پر کیفیت تماشہ معلوم ہو رہی تھی اور اوس کا دل اچھل رہا تھا۔ کہ وہ اپنے افسر اعلےٰ کو فی الفور اس تعجب خیز خبر سے مطلع کر دے جس وقت یکہ شکیلہ ہینگلن کے بنگلہ میں پہونچا۔ سخاوت علی سب انسپکٹر شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات کے آگے چند چارپائیاں بچھائے جرح اور قدح میں مصروف تھا۔ اور بیس تیس آدمی معہ کامران و ہدایت علی و

مزدوران خندق اوس کے گرد جمع تھے۔ یکہ کی آواز سُنکر سخاوت علی نے پشت کی طرف منہ کر کے دیکھا اور جب عرفان علی اوس کے پاس پہونچا۔ تو اوس نے کھلے ہوئے منہ اور ہانپتی ہوئی آواز میں سخاوت علی سے کہا "دونوں کاغذات ندارد"

سخاوت علی نے اوس کے مضطرب آلودہ چہرے کو حیرت سے دیکھہ کر پوچھا "کون سے کاغذات؟"

عرفان علی نے بڑی سُستعدی سے جوابدیا "وہی شکیلہ بیگم کے نام کا خط اور مولوی شفیق صاحب کا وصیت نامہ" "ایں کیا خطا گم ہوگیا تب تو مجرم پہلے سے واقف ہوچکا تھا" سخاوت علی کے منہ سے نکلا پھر وہ سوچ کرنے لگا "مسٹر رفیق احمد نے اپنے اظہار میں یہ لکھایا ہے۔ کہ اوس نے خط میں اُس طرف آنے کے متعلق کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ یہ کہہ کر سب انسپکٹر نے اپنے کاغذات کی گٹھڑی باندھکر ایک کنسٹبل کے حوالہ کی۔ اور چارپائی سے کھڑا ہوکر بولا۔

"اچھا آؤ مسٹر رفیق احمد سے پوچھیں شاید وہ کسی بات سے پتا لگا سکیں۔ کہ خط اور وصیت نامہ کون شخص چرا سکتا تھا" سب انسپکٹر یہ کہہ کر یکہ کی طرف بڑھا۔ اوس کے پیچھے عرفان علی۔ دونوں کانسٹبل۔ کوٹھی کے ملازم اور مزدور وغیرہ ہولئے۔ سُرخی برآمدے کی طرف پہونچ کر سب انسپکٹر نے پیچھے دیکھا۔ اور تحکمانہ آواز میں کہا "تم لوگ میری دُم کے پیچھے کیوں ہو چلو وہیں جاکر بیٹھو" اوس کے ساتھہ ہی کانسٹبلوں نے دو تین مرد و زن کو دھکے دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن غیر معمولی واقعات کا اشتیاق اس قدر تعجب خیز ہوتا ہے۔ کہ کسی آدمی نے سب انسپکٹر کا حکم نہ مانا۔ اور سب اُسی کھڑے رہے۔ ماماؤں کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کنڈا دستک دی۔ تو رحمت نے ہاتھی چٹخنی کھول دی۔ اوس کی سانپ کی سی آنکھوں

سے سب انسپکٹر پہلے چونک گیا۔ پھر آہستہ سے بولا "اندر اطلاع کر دو۔ ہم مسٹر رفیق احمد سے ملنا چاہتے ہیں"۔

اس وقت رفیق احمد کی والدہ اوسے ایک چھوٹی سی میز پر کھانا کھلا رہی تھی بشکیلہ ہیرنگٹن دوسرے کمرے میں عزیزہ خاتون کی ضیافت کا سامان کر رہی تھی۔ لیکن رفیق احمد نے سب انسپکٹر کی آمد سے مشوش ہو کر اوسے اُسی وقت رخصت کرنا چاہا۔ اور اپنی والدہ کو دوسرے کمرے میں چلے جانے کا اشارہ کر کے اوسے فوراً اندر بلا لیا جس کے پیچھے کامران ہدایت علی عرفان اور ہردو کنسٹیبلان بھی گھس آئے۔ مزدور بیرونی دروازے پر کھڑے رہے بنگلہ کے دو تین نوکر ماماؤں کے کمرے میں آ گئے۔ جہاں خورد سال جس کے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ روٹی کھا رہا تھا۔ لیکن بشکیلہ ہیرنگٹن کے کمرے میں کوئی نہ گھس سکا۔ اس وقت بشکیلہ ہیرنگٹن نے اس کمرے سے قالین اُٹھوا دیا تھا کیونکہ وہ پولیس والوں کے جوتوں سے اپنا کمرہ غلیظ نہ کرانا چاہتی تھی۔ عزیزہ خاتون صبح سے روڑکی واپس جانے پر مصر تھی لیکن بشکیلہ ہیرنگٹن نے کھانا کھانے کے ارادے سے بمشکل روکا تھا۔ سب انسپکٹر نے رفیق احمد کے قریب بیٹھنے کے لئے ایک کرسی کھینچ لی۔ رفیق احمد نے متردد چہرہ سے اوسے دیکھ کر کہا "آیئے کھانا کھایئے۔ آپ نے کھانے کا کیا بندوبست کیا"۔

سب انسپکٹر نے پُر تبسم آواز میں کہا "تسلیم۔ میرا باورچی منگلور سے آگیا ہے کھانا تیار ہے۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔ عرفان علی آپ کی کوٹھی سے آئے ہیں۔ کہ آپ کے والد صاحب کا وصیت نامہ اور آپ کا لکھا ہوا خط دونوں ندارد ہیں۔ رفیق احمد کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ اوس کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔ جس سے وہ بشکیلہ ہیرنگٹن کے ہاں کی کھیر کھا رہا تھا اور پیشانی پر بل ڈال کر بولا "یہ کیا کوٹھی پر نوکر نہیں تھے۔ کیا قفل ٹوٹے ہوئے ملے؟" عرفان علی نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

"برخلاف اس کے جملہ نوکر بڑی مستعدی سے موجود تھے۔ تمام نفل ٹھیک طور سے لگے ہوئے تھے۔ مگر کاغذات نہ ملے۔" آپ نے وصیت نامہ اور خط کہاں تلاش کیئے۔" رفیق احمد کے منہ سے نکلا۔ اور وہ ابھی اچھی طرح شکم سیر نہ ہوا تھا۔ کہ مشتبہ خیالات سے اوس کی بھوک سب اڑ گئی۔ اور اوسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ لوگ خود اوسے انگشت نمائی کر کے متبلا رہے تھے۔ کہ اس شخص کا گھر لٹ گیا۔ دراصل اُس کی والدہ کا ہزار ہا روپیہ کا زیور کوٹھی کے اندر تھا۔ اگر کسی نے گھر میں مداخلت کی۔ تو زیور کی خیریت کس طرح ہو سکتی تھی۔ عرفان علی نے رفیق احمد کی طرف مجتمع دل سے دیکھ کر جواب دیا۔" آپ نے دراز وں میں تلاش کیئے تھے۔ دونوں درازیں دیکھ لیں۔ دونوں کاغذات کا پتہ نہیں۔ میں جو جو کاغذات ملے۔ ساتھ لایا ہوں۔ اور یہ آپ کی ڈاک اور کنجیاں ہیں۔" معلوم نہیں روزانہ ڈاک میں کیا بھرا ہوتا ہے ہر شخص اوسے بوالہوس نگاہوں سے دیکھ کر بے چین ہو جایا کرتا ہے دراصل اس زمانہ میں نصف سے زیادہ خوشیاں اور غم ڈاک خانہ کے ذریعے سے وصول ہوتی ہیں۔ اوس نے بے چین دل سے خط اور کنجیوں کو اپنے تکیے کے پاس رکھ لیا۔ اور اون کاغذات کو دیکھتا رہا۔ جو عرفان علی اوسے رومال اور میز پوش کے اندر سے نکال نکال کر دکھلانے لگا پھر اُس نے رخصت کو اشارہ کیا۔ کہ کھانا اوٹھا لیا جائے۔ بعد ازاں سب انسپکٹر کی طرف دیکھ کر بولا۔" واقعی دونوں کاغذات کا پتہ نہیں۔ خیر وصیت نامہ کی تو مجھے اب ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن شکیلہ کے نام کا خط کس نے چرا لیا۔" سب انسپکٹر صاحب بہتر یہ ہو۔ کہ آپ آج آصف نگر سے فراغت پا کر کل مجھ سے میری کوٹھی پر ملیں۔ وہاں میں ان باتوں پر اچھی طرح سے غور کر سکوں گا۔" یہ کہکر اوس نے عرفان علی کا شکریہ ادا کر کے کہا۔" آپ نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ رہنے دیجئے۔ رہنے دیجئے۔ میں ان کاغذات کو ساتھ لے

جاؤں گا۔ ابھی نصف گھنٹے کے اندر واپس روڈ کی جاتا ہوں" مگر اس وقت اُس کے بازو میں پھر تکلیف ہونے لگی۔ اور اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ درد سے بے چین ہو کر وہ لیٹ گیا۔ اور سب انسپکٹر وغیرہ کی طرف بڑی پریشان نگاہ ڈالی۔ وہ لوگ اوس کی اندرونی تکلیف کی جھلک پاکر اُٹھ کھڑے ہو لئے۔ اور ایک منٹ کے بعد جب عزیزہ خاتون واپس آئی۔ تو رفیق احمد نے اپنے بازو کی دوا تبدیل کرائی۔ اسی اثنا میں شکیلہ میز کلاتھ اس طرف نکل آئی۔ اور موذب آواز میں عزیزہ خاتون سے کہنے لگی "کیا کھانا یہیں لگاؤں" رفیق احمد نے مسکرا کر شکیلہ کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا "ہاں یہاں میرے پاس میز لگا لو۔ مگر میری والدہ عیسائی عورت کے ساتھ کھانا نہ کھائیں گی" شکیلہ ہنس پڑی اور پوچھنے لگی "کیا واقعی" رفیق احمد نے مسکرا کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا اور نرم آواز سے کہا "اماں۔ اہل کتاب کیساتھ کھانا جائز ہے علاوہ ازیں شکیلہ کے سارے ملازم مسلمان ہیں" "نہیں نہیں مجھے کچھ عذر نہیں" عزیزہ خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور دو منٹ کے اندر دو چھوٹی چھوٹی میزیں رفیق احمد کے پاس لگا دی گئیں۔ اور ان پر سفید چادر بچھ گئی۔ دونوں خواتین آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ اور چند اقسام کے کھانے سامنے آتے رہے۔ رفیق احمد نے سیلابچی میں ہاتھ اور منہ کو صاف کر کے تولیہ سے پونچھا۔ اور بستر پر لیٹ کر سگار سلگایا۔ پھر اوس نے خطوط کو کھول کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اوس نے تیسرے لفافہ کو چاک کر کے خط اندر سے نکالا۔ اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ کہ اوس کا دل دھڑکنے لگا شکیلہ نے اُسکی طرف آنکھ اوٹھائی۔ تو رفیق احمد کی صورت اوسے ایسی بے رونق معلوم ہوئی۔ جیسے کسی شخص کی سانپ یا دیوانے کتے کو دیکھ کر ہو جاتی ہے اس نے کھانا ملتوی کر کے پوچھا "کیا ہے کس کا خط ہے" رفیق احمد خط کو

بے خبر آدمی کی طرح پڑھتا رہا۔ پھر اپنی والدہ کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر بولا "اماں کیا والد نے پہلے کبھی دوسری شادی بھی کی تھی؟"
عزیزہ خاتون کی رنگت بھی سپید ہوگئی۔ اُس کا دل دہلنے لگا سوت کے نام سے عورتیں بے چین ہو جاتی ہیں۔ اوسے خیال آگیا شاید اب کوئی عورت اوس کے زیور یا پانچ سو روپے ماہوار کی حصہ دار نکل آئی۔ بارے اُس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "تمہارے والد نے میرے سوا کسی سے شادی نہیں کی۔ کیا معاملہ ہے؟" رفیق احمد نے منہ سے سگار نکال کر سنگ مرمر کی میز پر رکھدیا۔ اور اپنی والدہ کی طرف منہ کر کے کہنے لگا "میرے پاس ایک شخص کا خط آیا ہے جس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

از نینی تال

جناب من

تسلیم۔ مجھے اخبار پایونیر سے معلوم ہوا۔ کہ آپ کے والد مولوی شفیق احمد صاحب نے اتوار گذشتہ کو انتقال کیا۔ مجھے بھی رنج ہوا۔ لیکن آپ اس خط کے مطالعہ سے بے حد ناراض ہونگے۔ جب آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ مرحوم میرے بھی والد تھے۔ میرے والد نے پچاس سال کی عمر میں ایک ماہ گذرا انتقال کیا تھا۔ اور صرف اُن کے انتقال کے وقت مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ مولوی شفیق احمد صاحب میرے والد تھے۔ مجھے اس بات کا بالکل علم نہ تھا۔ کہ میرے والد صاحب اس قدر امیر آدمی ہیں۔ اور انہوں نے ایک لاکھ روپیہ چھوڑا ہے۔ میں اب اس خط کے ذریعہ سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ آپ اُس ایک لاکھ کے کسی طرح مالک نہیں ہو سکتے۔ نصف کا حصہ دار میں ہوں۔ آپ بواپسی ڈاک اطلاع دیں۔ آپ کو میری والدہ حسنی خانم کا کبھی علم ہوا ہے یا نہیں۔ اور میرے والد نے آپ سے کبھی میری بابت گفتگو کی تھی یا نہیں۔ میری والدہ نے مرتے وقت یہ بیان کیا تھا۔ کہ مولوی

شفیق احمد صاحب بائیس تئیس سال کی عمر میں ایک دفعہ ممبئی تال آئے تھے اور اُس زمانے میں میری والدہ پر مفتون ہوکر ان سے نکاح کر لیا تھا۔ میری والدہ نہایت غریب ماں کی بیٹی تھی۔ لیکن والد صاحب موصوف اونہیں عرصے تک بیس روپے ماہوار بھیجتے رہے۔ اگلے سال والد صاحب موسم گرما میں آئے۔ تو کسی بات پر میری والدہ سے ناراض ہوگئے۔ کوئی اس قسم کا معاملہ پیش آگیا تھا۔ کہ اوس سے والد صاحب موصوف کو میری والدہ صاحبہ کی نیک چلنی کے متعلق شبہ پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس ناراضی کی علت میں والد صاحب موصوف نے میری غریب والدہ کو طلاق دیدی میری والدہ نہایت غریب کنبے کی عورت تھی۔ اور کوئی بارسوخ رشتہ دار موجود نہ تھا۔ اس وجہ سے کوئی قانونی چارہ جوئی نہ ہوسکی۔

علاوہ ازیں میری والدہ اپنے شوہر کے آخری وقت تک عاشق رہیں اور ہمیشہ اونہیں یاد کرکے رویا کرتی تھیں۔ میں جب کبھی والد کا نام و پتہ پوچھتا۔ کہہ دیتیں۔ کہ عرصہ ہوا۔ وہ انتقال کر گئے۔ اب مجھے اخبار سے معلوم ہوا۔ کہ اُنھوں نے بڑی جائداد چھوڑی ہے۔ میری عمر اس وقت چالیس سال ہے۔ اور میں گرانڈ ہوٹل میں خدمت گار ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ میری غریب ماں نے مجھے کچھ تعلیم دلا دی تھی۔ اور میں اردو انگریزی میں خط لکھ پڑھ سکنے کے قابل ہوں۔ لیکن آپ مطمئن رہیں۔ کہ پچاس ہزار روپیہ کوئی ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ اور میری والدہ نے جس قدر تکلیف آپ کے اور میرے والد کی بدولت اوٹھائی۔ اوس کے لحاظ سے انصاف اب اس بات کا مقتضی ہے۔ کہ روپیہ نصفا نصف تقسیم کیا جائے۔ میری والدہ نے نکاح ثانی کبھی نہیں کیا۔ اور شاید وہ اپنے لاپرواہ شوہر کا ذکر بھی نہ کرتیں لیکن مرتے وقت مجھے ہدایت کی تھی۔ کہ میں روڈ کی جاؤں۔ اور اُن کی طرف سے پیغام پہونچاؤں۔ کہ اوس غریب مصیبت زدہ عورت سے کبھی کوئی

بدچلنی سرزد نہیں ہوئی۔ اور وہ محض اپنے شوہر کی محبت کے باعث میدان حشر میں بھی اس کی ہرگز دامنگیر نہ ہوگی۔ میری والدہ نے والد صاحب کو معاف کر دیا ہے لیکن میں ہرگز معاف نہ کرونگا۔ اور آپ مطلع رہیں۔ میں تقریباً ایک ہفتے بعد روڑکی پہونچوں گا +

میرے پاس ایک خط ہے جس سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ میرا دعوے بالکل جائز اور صحیح ہے۔

راقم علی الدین رز ہوٹل جانسٹن صاحب

۱۳۔ دسمبر نینی تال

اس خط کو ختم کر چکنے کے بعد نوجوان رفیق احمد کو اپنے جسم میں حد درجہ کی بے چینی اور حرارت بخار محسوس ہوئی۔ بوڑھی عزیزہ خاتون دیر تک دل سے کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شکیلہ ہیرنگٹن کھانے سے ہاتھ کھینچ کر دیر تک کچھ سوچتی رہی۔ اور جب وہ کرسی سے اٹھی۔ تو سمجھ رہی تھی۔ کہ نانا کے خزانہ کی گمشدگی پر بتنا سف تھی۔ تو اس شخص علی الدین کی حالت بھی اس سے کم عبرت انگیز یا ترحم خیز نہ تھی۔ جو امیر باپ کا بیٹا ہو کر ہوٹل میں خدمتگاری کر رہا تھا +

سولھواں باب

کچھ پتہ کی باتیں

ٹھیک ایک بجے دن کے سخاوت علی اپنے ہیڈ محرر و کانسٹبلوں کو لے کر کوٹھی نہر پر مسٹر ہیلی فاکس اور ملازمین نہر کے اظہار لینے کے لئے پہونچا۔ اور کوٹھی کے برآمدے میں نوکروں سے دوچار ہوا۔ جو دہکتی ہوئی انگیٹھی پر کھانا گرم کر کے اندر پہونچا رہے تھے۔ سب انسپکٹر نے کسی قدر مشوش چہرے سے ایک بوڑھے ملازم کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے پوچھا "کیا صاحب کھانا کھا رہے ہیں" ملازم نے اپنے گھر میں کتنا ہی شیر ہوتا ہے" کو سچ ثابت کرنے کے لئے سب انسپکٹر پولیس کی طرف بڑی بے پروائی سے دیکھ کر جواب دیا "صاحب ابھی گرجا سے واپس آئے ہیں کھانا کھا کر آرام کریں گے۔ آج بڑا دن ہے۔ آپ بابو کی چھولداری میں بیٹھئے۔ لیکن پولیس والوں کی وردی کی جھلک مسٹر ہیلی فاکس نے چلمن میں سے دیکھ لی تھی۔ اور اب جو اپنے نوکر کے منہ سے انہوں نے بابو کی چھولداری کا ذکر سنا۔ تو اندر سے ایک خدمتگار کو باہر بھیجا۔ اور آہستہ سے کہا "سب انسپکٹر کو برآمدہ میں کرسی دو۔ ہم ابھی جلدی ملاقات کریں گے" بیرہ نے باہر آکر سب انسپکٹر کو متانت سے دیکھا۔ اور دو کرسیاں پیش کر دیں سخاوت علی برآمدہ کے شمالی گوشے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اور اطمینان کا سانس لے کر اوس نے عرفان علی کو قریب کی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ سب انسپکٹر انگریزوں کے اخلاق اور ہندوستانی نوکروں کی

بے مروتی و بدتہذیبی پر اپنے دل میں بحث کر کے اس نتیجہ پر پہونچ رہا تھا کہ دراصل اپنے اپنے کام میں ہر کوئی سرخلاق اور آزاد ہوتا ہے۔ اگر یہ خانساماں باورچی لوگ اُس کے نہانے میں کسی کام کو جاتے۔ تو وہ بھی شرافت اور تہذیب کے خیالات کو بالائے طاق رکھ دیتا۔ پس کچھ تعجب کی بات نہیں تھی۔ اگر بوڑھے خانساماں نے اوسے بے پرواہی سے ٹال کر چھولداری میں بھیجنا چاہا ہو۔ صاحب کے خدمتگار خانساماں ایک دری بچھائے بیٹھے تھے۔ برآمدہ سامنے کی دھوپ اور انگیٹھی کی گرمی سے آرام دہ ہو رہا تھا اگرچہ باہر کی تیز ہوا کے اندر چمکدار آفتاب کی روشنی کچھ زیادہ حرارت خیز نہ تھی۔ سب انسپکٹر دس منٹ تک اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ اور جب اندر سے برتن واپس آنے لگے۔ تو وہ سمجھ گیا۔ کہ اب صاحب بہادر باہر نکلنے والے ہیں۔ اس کا خیال غلط نہ تھا۔ اندر سے مسٹر ہیلی فاکس ننگے سر عمدہ سیاہ لباس پہنے باہر آئے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں سگار تھا۔ سب انسپکٹر معہ اپنے ماتحتوں کے استقبال کو کھڑا ہو گیا۔ نوکروں نے جھٹ پٹ برتن بڑھانے شروع کئے۔ سب انسپکٹر نے کرسی صاحب کے سامنے پیش کی۔ اور وہ شرق کی جانب منہ کر کے بیٹھ گئے۔ اور دو چار دم سگار کے کھینچ کر کہنے لگا۔ آپ میرے اظہار قلم بند کر لیں۔ ہاں آپ نے مشکیلہ ہیرنگٹن کی نوکروں کی تلاشی لی ہے یا نہیں؟"

سب انسپکٹر نے مؤدب آواز میں جواب دیا "سب شاگرد پیشہ کی تلاشی لے چکا ہوں۔ ماماؤں کی تلاشی بالکل فضول تھی۔ عورتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ کلو بیگ ٹھیکہ دار کی بھی تلاشی لے چکا ہوں۔ مگر اس کی چھولداری میں کوئی چیز مشتبہ نہیں نکلی" مسٹر ہیلی فاکس نے سگار کا دم کھینچ کر اطمینان ظاہر کیا۔ پھر اپنے اظہار من وعن لکھوا دیئے

جنہیں ختم کر کے صاحب نے کہا "اب جملہ ملازمین نہر کی تلاشی لے لیں اور جو آدمی اظہار دینے کے قابل معلوم ہوں۔ ان سے سوالات کر کے اطمینان کریں۔ میری رائے میں یہ کام نہر پر شکیلہ ہیرنگٹن کے آدمیوں میں سے کسی کا نہیں۔ کوئی شخص نوجوان رئیس زادے کا دشمن ہے۔ اور وہ اوسے ایسی اندھیری رات میں اس طرف آتا دیکھ کر اوس کے پیچھے ہولیا ہوگا۔" "حضور کا خیال بالکل درست ہے" سب انسپکٹر نے مؤدب آواز میں جواب دیا۔ پھر صاحب کو سلام کر کے چھولداریوں کے سامنے پہونچا۔ یہاں اوس نے جملہ برقندازوں اور کلرک و منشی نہر کے اظہار درج کیئے۔ اور چھولداریوں کی ایک ایک چیز ہوشیاری سے دیکھی۔

چھولداریوں سے نپٹ کر سخاوت علی شاگرد پیشہ لوگوں کی پختہ کوٹھڑیوں میں پہونچا۔ اور صاحب بہادر کے سارے نوکروں سے دل کھول کر سوالات کیئے۔ ان پختہ کوٹھڑیوں میں ایک کوٹھڑی صاحب کے اصطبل کا کام دے رہی تھی۔ دوسری کوٹھڑی میں سب ڈویژن کے منشی و بابو نے اپنے ٹٹو بندھوا رکھے تھے۔ ایک کوٹھڑی کے آگے چھپر پڑا ہوا تھا۔ اور اوس میں نہر کا داروغہ متعینہ جھال آصف نگر رہتا تھا اوس وقت وہاں مذکور جو چالیس پینتالیس سال کا ایڈیٹر شخص اشتیاق حسین نامی تھا۔ پلنگ پر بیٹھا ہوا لکھنے میں مصروف تھا۔ چارپائی کے نیچے نہری ڈاک کا ہرکارہ کمل میں لپٹا ہوا شمال کی طرف منہ کئے ہوئے اشتیاق حسین کے حقہ کی چلم پی رہا تھا۔ اشتیاق حسین اور ہرکارہ پولیس والوں کو پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اور اپنے اظہار قلم بند کرانے کے لئے تیار تھے۔ سب انسپکٹر کے قریب پہونچنے پر اشتیاق حسین چارپائی سے نیچے اتر گیا۔ اور ہرکارہ چلم کو

حقہ پر رکھکر بے خوف وہراس سب انسپکٹر کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ عدا صل دنیا کی زندگی اور مشاغل میں احساس کا مادہ صرف تعلیم اور زیادتی عقل سے پیدا ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں علم یا عقل کم ہے۔ ان میں تہذیب یا ڈر یا احساس بھی کم ہوتا ہے۔ یہ ہندو ہرکارہ ذات کا گڈریا تھا۔ اوسے اپنی بھیڑ بکریوں سے نکل کر صرف ادھر اُدھر سے ڈاک لانے کا تجربہ ہوا تھا اور اوس کے زنگ آلودہ دل پر صرف ذاتی معاملات کے احساس کچھ اثر ڈال سکتے تھے۔ دنیا کے بیرونی مشاغل کو وہ ہمیشہ زنگ آلودہ دل سے دیکھ کر کبھی زیادہ متاثر نہ ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہر کا واچ مین اور صاحب چیف انجینیر بہادر دونوں برابر تھے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ وہ ایک کو غریب دوسرے کو راجہ سمجھتا تھا۔ ایک کو "منشی جی سلام" کہتا اور دوسرے کو جھک کر سلام کرتا تھا۔ لیکن دونوں کی صورتوں سے اس کے دل پر اضطراب غالب نہ ہو سکتا تھا۔ سخاوت علی نے سب سے پہلے واچ مین کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ پھر ہرکارہ کو ٹھوکر لگا کر راستہ سے ہٹایا۔ بعد ازاں اوس نے کوٹھڑی میں گھس کر اچھی طرح تلاشی لی۔ واچ مین اوس کوٹھڑی میں کئی سال سے آباد تھا۔ اور نہر کی کٹڑی اُپلے۔ مٹی کے برتن بڑی تعداد میں جمع کر چکا تھا۔ کانسٹبلوں کو چند منٹ تلاشی میں لگے۔ جس کے بعد وہ ہاتھ جھاڑ کر باہر نکلے۔ دوسرے مکانات کی طرح یہاں بھی کوئی مشتبہ چیز نہ ملی۔ ازاں بعد سب انسپکٹر نے واچ مین کے اظہار درج کئے۔ جو بالکل دوسرے ملازمان نہر کے مطابق تھے۔ سب انسپکٹر نے آخیر میں واچ مین سے کہا "تم اس مقام پر عرصے سے ہو۔ پرسوں جب مسٹر ہیلی فاکس کا ڈیرہ یہاں آیا۔ اُس سے پہلے تم نے کسی اجنبی یا مشتبہ آدمی کو اس طرف آتے دیکھا ہو۔ تو بتاؤ۔ یا اپنا شک و شبہ کسی پر ظاہر کر سکو۔ تو اطلاع دو۔" واچ مین

سمجھ دار اور پورا دنیا دار آدمی تھا۔ وہ پولیس والوں کی ہتھکنڈیوں سے واقف تھا۔ اوس نے متین چہرہ بنا کر جواب دیا "نہیں حضور میں نے کسی اجنبی آدمی کو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے سرکاری فرائض اور ہانڈی چولھے سے فرصت نہیں ملتی" یہ سن کر سب انسپکٹر وہاں سے رخصت ہونے کے ارادے سے باہر نکلا۔ اور اس گنوار گڈریا کے اظہار کو ناقابل تحریر جان کر اور اوس کی طرف نگاہ ڈال کر دیکھنا بھی غیر ضروری سمجھا۔ اور چھپر سے دو گز باہر آگیا۔ مگر پھر اُس نے ایک سیگریٹ نکال کر واچ مین سے دیا سلائی مانگی۔ اور اوسے سلگا کر دھواں اُڑاتا ہوا قدم بڑھانے لگا تھا کہ معلوم نہیں سگریٹ کے دھوئیں سے ہرکارے کو کیا بات یاد آگئی کہ اوس نے واچ مین کی چلم سے دم کھینچ کر تھانہ دار کی طرف دیکھا۔ اور کھانس کر بولا۔ "میں ون پاچھے ایک بابو اندھیری ہوت مجھے ملا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایسا ہی سگرٹ تھا۔ میں نے اوس سے سگرٹ مانگا تو وہ میرے اوپر آنکھہ نکالت ہوت" سب انسپکٹر نے اچھل کر ہرکارے کی طرف دیکھا۔ اور چہرہ سُرخ کر کے اُس سے کہنے لگا "کون بابو تھا۔ کیا کوئی نہر کا بابو" ہرکارہ نے چلم حقہ پر رکھکر جواب دیا "ناہیں صاحب نہر کے بابو میرے کھیت پڑے ہیں۔ کوئی بڑا بابو تھا۔ صاحب لوگن کے کپڑے پہنت تھا۔ سر پر لال ٹوپی لٹکر والی لٹکن تھی" سب انسپکٹر کو اس اجنبی آدمی کے ذکر سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ جھپٹ کر واچ مین کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اوس کے اظہار لینے لگا جن کا ماحصل یہ تھا۔ کہ تین دن گذرے۔ وہ جب شام کی ڈاک روٹکی سے بطرف آصف نگر لا رہا تھا۔ اوسے اندھیرے میں سات بجے کے قریب کوئی شخص کشتی نالہ کے اوپر ملا تھا جس کے بدن پر انگریزی کپڑے اور سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ ہرکارہ یہ بات نہ بتا سکا۔ کہ اوس کے خط و

خیال یا حلیہ کیسا تھا۔ اور یہ ان باتوں کے سمجھنے کی اوس میں زیادہ قابلیت تھی لیکن یہ بات سب انسپکٹر کو معلوم ہوگئی۔ کہ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اور اوس کا منہ جانب غرب اس سڑک پر تھا جو شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ اس سے زیادہ ہرکارہ کوئی بات نہ بتلا سکا۔ سب انسپکٹر کے دماغ میں اس وقت عجیب عجیب خیالات حکوم کر رہے تھے۔ اور اس کے دل کی یہ آرزو تھی۔ کہ کاش ہرکارے کے بجائے دوسرے سمجھ دار آدمی نے اس مشتبہ آدمی کو دیکھا ہو۔ شاگرد پیشہ مکانات سے فراغت پاکر وہ نہر کی پن چکیوں پر پہنچا۔ جہاں بقال ٹھیکہ دار اور اوس کے جملہ ملازمین بھی شب گذشتہ کے ہنگامہ پر کچھ زیادہ روشنی نہ ڈال سکے۔ نہر سے فارغ ہو کر سخاوت علی تاشی پور گیا۔ اور وہاں جملہ مکانات کے مزدور گھس گھس کر ہر ایک گنوار سے بات چیت کی۔ لیکن گنوار لوگ گوجات کا تبنگڑ سنانے کی قابلیت رکھتے ہیں مگر سوائے اُن پرانی باتوں کے جو سب انسپکٹر مسیحوں زبانوں سے سُن چکا تھا اوس سے کوئی نئی بات نہ بتلا سکتے تھے۔ اوس نے ہر گھر میں بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے تلاشی لی۔ اور شام کے چھ بجے جب تاریکی پھیلنے لگی۔ اور کانسٹبل تھک کر زمین پر بیٹھنے لگے۔ تو سب انسپکٹر نے اپنے جمع کردہ اظہاروں کو باحتیاط رومال میں باندھ کر عرفان علی کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے بولا "آج کی تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اس مقام پر مجرم تین روز پیشتر آیا تھا معلوم نہیں اوس کی شکیلہ ہیرنگٹن سے واقفیت ہے یا کیا اس وقت ہم تم سب تھک گئے ہیں۔ اب منگلور واپس چلنا چاہیئے کل صبح میرا ارادہ ہے۔ کہ تم لوگوں کو ساتھ لیکر پہلے آصف نگر آؤں۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن سے ملاقات کروں۔ پھر سیدھا روڑکی جاکر رفیق احمد سے ملوں"

زاں بعد سخاوت علی بجانب شرق مڑکر کوٹھی نہر پر پہونچا۔ جہاں

اوس کے اشارے سے نصف گھنٹہ پیشتر اوس کا گھوڑا اور ایک یکہ تیار کھڑا تھا۔ تھکے ماندے اہل کاروں نے گہرے سانس بھر کر یکوں میں قدم رکھا۔ اور اپنے واماندہ دلوں کا بوجھ مجروح یکہ کے ڈنڈوں پر ڈال کر پاؤں سیدھے کئے۔ اصلیت یہ ہے۔ کہ ہر انسان کے نیک یا بد کاموں کا خمیازہ کسی نہ کسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اہلکاران پولیس کی تھکن سوائے اس کے کہ اُس وقت یکہ اور پہران کے گہر والوں پر پڑتی۔ اور کہاں جا سکتی تھی جھلائے اور تھکے ہوئے سب انسپکٹر نے رکاب میں پاؤں رکھکر گھوڑے کی کمر پر بوجھ ڈالا۔ اور دونوں پاؤں سے مہمیز لگائی۔ اُس کا جانور بہت تیز تھا ایک منٹ کے اندر کشتی نالہ کے پاس نہری پٹڑی عبور کر کے کھیتوں کے اندر بطرف منگلور فراٹے بھرنے لگا سب انسپکٹر نے دوچار جگہ باگ سنبھالی۔ اور بتدریج گھوڑے کو دُلکی چھوڑ دیا۔ اُس کے دل میں اوس وقت تمام دن کی تحقیقات کے لبریز جام میں جو چیز سب سے اوپر نظر آ رہی تھی وہ یہ تھی۔ کہ" نوجوان رفیق احمد پر قاتلانہ حملہ کرنے والا بظاہر بلند اختر تھا اور غالباً اوسی نے اوس کا خط اور وصیت نامہ چرایا تھا۔ مگر ان چیزوں میں اوس کا مفاد کیا تھا؟"

سترھواں باب

جاسوسی کا جال

جس روز سخاوت علی سب انسپکٹر شکیلہ ہیرنگٹن اور اُس کے ملازمین کو مختلف جرح و قدح اور تلاشی سے حیران و پریشان کرتا رہا۔ اوس دن چالاک کامران نے خندق کی کھدائی کو ملتوی کر کے سب انسپکٹر کے ساتھ لگا رہنا پسند کیا۔ اور جب تک تھانہ دار اس بنگلہ کی حدود میں رہا وہ سب لوگوں کے اظہار سنتا رہا۔ سب انسپکٹر کے رخصت ہو جانے پر اُس کا ارادہ تھا۔ کہ مبیرونی اشخاص کے بیانات سُنے۔ مگر اوس کے سمجھدار دماغ نے اوسے فی الفور روک دیا۔ وہ اس وقت کلو بیگ ٹھیکہ دار کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ نہ کہ سراغ رساں کے پس اس کا سب انسپکٹر کے پیچھے لگا لگا پھرنا شبہ پیدا کر سکتا تھا۔ اوس نے سب انسپکٹر کو اپنی واقفیت یا تجربہ کی کوئی بات نہ بتائی۔ بلکہ بیکار مزدوروں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر واقعات کو دیکھتا رہا۔ گو اس کی آنکھیں مزدوروں کی طرح سست اور محدود بین ہونے کے برخلاف ہر اظہار کی تہ تک پہونچ جانے کی قابلیت رکھتی تھیں۔ سب انسپکٹر کی موجودگی میں وہ اس بات پر متیقن ہو گیا تھا۔ کہ شکیلہ کے شاگرد پیشہ لوگوں میں سے کسی کو ایسے خوفناک جرم کی طاقت تو کجا جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے کئی سال کے متواتر تجربہ سراغ رسانی سے مجرموں کی صورت و شکل و حرکات و سکنات سے اتنی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کہ وہ عموماً صورت دیکھ کر بہت سے نتائج پر پہونچ جایا کرتا تھا

سب انسپکٹر کے رخصت ہو جانے پر اس نے مزدوروں کو پھر کام پر لگایا اور کھدائی شروع کرادی۔ خندق کے اندر کسی قدر پانی جمع ہو گیا تھا۔ مگر نیچے سے خشک مٹی نکلنے کا کام معمول رفتار سے ہونے لگا۔ شام کی تاریکی تک بہت سی کھدائی ہو گئی۔ اور پھیوں کے ستون نکلے۔ غرضیکہ اس زمین میں کسی وقت کسی امیر یا راجہ یا نواب نے عالیشان عمارات بنوا رکھی تھیں۔ اور پھر پہاڑہ میں اینٹ یا پتھر کی عمارتوں کا کوئی نشان نہ تھا۔ کامران کا کانی شہادت دے رہے تھے۔ چار بجے شام کے شکیلہ میڈیکل شاپ پر مصروف عمل سے اپنے دوست کو خصوصیت کر کے دیر تک اپنے کمروں میں صفائی کراتی رہی۔ مغرب کے وقت کامران نے ہدایت علی کو بھیج کر نئے ستونوں کی برآمدگی سے شکیلہ میڈیکل کو مطلع کیا۔ اور ہدایت علی نے موقع پا کر آہستہ سے یہ بھی کہدیا "مسٹر کامران آپ سے ٹھیک دس بجے شب کے ملاقات کرنی چاہتے ہیں۔ آپ اپنی ماماؤں کو کسی بہانے سے سویرے ہی سلا دیں" کامران کی ہدایت کے مطابق شکیلہ نے آج کھانے سے جلد فراغت پا کر آٹھ بجے رات کے قریب تمام عملہ کو چھٹی دے دی تھی۔ اور دس بجے رات کو وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کامران سے کہاں ملاقات کریں۔ لیکن اوسے کامران کی ہوشیاری مدد و راندیشی پر اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ اوسے انتظار میں رکھکر نا امید نہیں کر سکتی تھی۔ اوس نے پاؤں میں اونی موزے پہن کر ہلکا سلیپر پہن لیا۔ اور شال کے نیچے برقعہ اوڑھ کر غسل خانہ کے راستے سے لائبریری میں آئی۔ اوس کے استراحت خانہ میں حسب دستور چھوٹا لیمپ جل رہا تھا جس کی دھیمی روشنی غسل خانہ کے اندر ختم ہو کر لائبریری کے دروازے تک پہونچ رہی تھی۔ اس نے مضبوط اور مستحکم ہاتھوں سے ہاتھ بھی لائبریری کی اندرونی چٹخنی کھولی۔ اور غربی برآمدے کی طرف سے جدھر توشہ خانہ واقع تھا ڈرتے ڈرتے باہر نکل گئی۔ لائبریری کے اندر

بالکل تاریکی تھی۔ اور روشنی کے پاس سے آنے پر اوسے غربی برآمدے سے آہنی پھاٹک گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ لائبریری کو کھلا چھوڑ کر جنوبی دیوار سے لگی لگی شرقی برآمدے کے پاس آئی۔ اُس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور سردی کے مارے دانت بج رہے تھے۔ وہ برآمدے کے پاس پہونچنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ اوسے اپنی طرف کوئی شخص سفید چادر اوڑھے آتا دکھلائی دیا۔ وہ خوف سے کانپ گئی اور قریب تھا۔ کہ چیخ مارے۔ مگر سامنے کی چادر پوش صورت نے آہستہ سے کہا "مس شکیلہ ڈرو نہیں میں کامران ہوں" پھر کامران اوس کے قریب آگیا۔ اور شکیلہ نے اوسے تاریکی میں بغور دیکھا۔ تو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ سفید برقعہ اوڑھے عورت بنا ہوا ہے۔ شکیلہ نے دھڑکتے دل سے گھبرا کر کامران سے بآہستگی کہا "آپ اس بھیس میں کیوں ہیں؟ کامران نے اپنے منہ سے ہٹا کر بآہستگی جواب دیا "میں سب معاملہ بتا دونگا۔ بہرحال آپ یہ بتلایئے۔ کہ میں آپ سے اچھی طرح بلا خوف افشائے راز کہاں گفتگو کر سکتا ہوں" اس وقت کامران کے کھلے ہوئے منہ پر تیز اور خنک ہوا کا جھونکا تیر کی طرح لگا۔ اور اوس نے برقعہ سے منہ ڈھانپ لیا۔ شکیلہ کے حواس اس وقت اصلی حالت پر آگئے تھے۔ مگر اس کا دل پھر بھی اُچھل رہا تھا۔ اس نے کامران کی طرف جھک کر کہا "آپ میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ بڑے ہال کے سوا کوئی کمرہ موزون نہیں" کامران کے منہ سے "بہت ٹھیک چلیئے" نکلا۔ اور وہ اوس کے پیچھے پیچھے بآہستگی چلا آیا۔ جس وقت شکیلہ اپنی لائبریری میں داخل ہو گئی۔ اوس نے مڑ کر کامران سے دبی ہوئی آواز میں کہا "چٹخنی لگا دیجیئے" کامران کے چٹخنی لگا دینے پر شکیلہ نے میز سے موم بتی اُٹھائی۔ اور لائبریری کے دروازے پر پہنچ کر پردہ کھینچ دیا۔ اسلائی جلائی۔ جس کی دھیمی روشنی میں میز اور کرسی

کی چیخیں ادھر ادھر دیواروں پر ناچنے لگیں۔ روشنی ہو جانے پر شکیلہ نے دبی ہوئی آواز میں کامران سے کہا "آپ کے بھیس سے تو میں کانپ گئی تھی۔ پھر کبھی آپ روپ بدلیں۔ تو مجھے پہلے سے مطلع کر دیا کریں" میرا دل اب تک دھک دھک کر رہا ہے" کامران نے منہ سے برقعہ اتار کر جواب دیا "عورت کا بھیس میں نے اس واسطے بدلا تھا۔ کہ اگر کوئی مجھے آپ کے پاس بوڑھے ٹھیکہ دار کے لباس میں دیکھ لیتا۔ تو لوگوں کو خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے اور لوگ آپ کی عصمت کے متعلق چہ میگوئیاں کرتے۔ اب عورت کے بھیس میں اگر کوئی مجھے دیکھ بھی لیتا۔ تو بھوت پریت سمجھ کر ڈر جائیگا" پھر بجانب غرب پردے کی طرف دیکھ کر بولا "یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ کل رات اس کمرے کے پاس رحمت اوس کوٹھڑی کا قفل کھول رہی تھی۔ جو شاید توشہ خانہ ہے" رحمت اور توشہ خانہ کے ذکر سے شکیلہ اپنے دل میں بدگمان ہوئی۔ کسی آقا کو یہ بات پسند نہیں ہوتی۔ کہ کوئی خادم یا خادمہ رات کو اٹھ اٹھ کر اجناس خوردنی پر ہاتھ مارا کرے۔ پس اوس کو فوراً اس بات کا شبہ پیدا ہوا۔ کہ شاید رحمت اتنے عرصے تک بظاہر اپنی دیانت داری کی اوٹ میں اس کا گھر لوٹ لوٹ کر اپنا بھرتی رہی ہے۔ مگر اوس نے اپنے دل کی جلن کو ضبط کیا۔ اور سر دست کچھ نہ بولی۔ پھر موم کی بتی کو گل کر کے بڑے ہال کے دروازے سے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ کامران ہال کی چوکھٹ کے پاس کھڑا رہا۔ اس کمرے میں ایک دروازہ لائبریری کی طرف تھا۔ دوسرا شکیلہ ہیرنگٹن کی خوابگاہ میں ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں شرقی برآمدہ میں تھیں۔ شکیلہ نے سب دروازوں کو آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اور اوسے کسی طرف سے کوئی جھلک روشنی کی نظر نہ آئی۔ تو وہ سمجھی۔ کہ سب دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اس نے فرش پر بیٹھ کر موم بتی روشن کی۔ پھر شمعدان کو میز پر رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور خوف زدہ آنکھوں سے پردوں کی طرف دیکھنے لگی۔ کامران جھپٹ کر

آگے بڑھا۔ اور برقعہ سر سے اُتار کر اور ایک کرسی پر آہستگی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا شکیلہ نے بھی اپنے چہرے سے برقعہ اُتارنا چاہا۔ مگر وہ فوراً جھجک گئی۔ اور اپنے دل میں کہنے لگی "میں رفیق احمد کے سامنے دن بھر منہ کھولے رہنے سے اب برقعہ سے اکتائی جاتی ہوں۔ پھر شال سنبھال کر بولی "کیا آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری کام تھا" کامران نے متانت کے ساتھ جواب دیا "ضروری کام یہی تھا۔ کہ مسٹر رفیق احمد کے متعلق گفتگو کروں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کا نوجوان دوست کل رات آپ سے مصالحت کی باتیں کرنے آیا تھا؟" شکیلہ نے نرمی سے جواب دیا "اب میرا دوست میرے مذہب میں مداخلت نہ کرے گا۔ اور امید ہے۔ کہ پرانی دوستی تازہ ہو جائے گی"

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ اب مسٹر رفیق احمد کی سچی بہی خواہ ہیں۔ اس لئے شاید آپ کو مجھ سے رات کے حادثہ کے متعلق گفتگو اور تبادلہ خیالات کرنے میں اعتراض نہ ہوگا۔ میں دراصل مسٹر رفیق احمد کے معاملہ کی خفیہ خفیہ تحقیقات کرنی چاہتا ہوں"

"میرے معزز مہمان میں آپ کے کسی کام میں اعتراض نہیں کرتی اور مجھے آپ پر دو چار دن میں اس قدر بھروسہ ہو گیا ہے۔ کہ میں آپ سے اپنے پرائیویٹ معاملات کے متعلق مشورہ لینے میں بھی کچھ ہرج نہیں دیکھتی۔ مسٹر رفیق احمد کے اوپر جس بزدل بدمعاش نے حملہ کیا ہے۔ میں اوسے سب سے پہلے کیفر کردار کو پہونچتے دیکھ کر خوش ہونگی۔ آپ ضرور اس معاملہ میں ہاتھ ڈالیں۔ اور جو کچھ مجھ سے دریافت کرنا ہو۔ دریافت کریں"

"معزز مس۔ اس معاملہ میں تحقیقات اوس وقت ممکن ہے۔ کہ آپ مجھے بحیثیت ایک سرانجام کے مسٹر رفیق احمد سے اچھی طرح ملادیں۔ اور میں اُنکے سب دوست اور دشمن سے واقف ہو جاؤں" سردست آپ مہربانی فرما کر

مجھے یہ بتلا دیں۔ کہ مسٹر رفیق احمد یا پولیس کو کسی شخص پر شبہ ہے"

"مسٹر رفیق احمد کو تو کسی پر شبہ نہیں۔ لیکن میری خادمہ رحمت نے اپنے بیان میں ایک شخص پر الزام لگایا ہے۔ جو مسٹر رفیق احمد کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ اور یہ گدھی تو آپ پر بھی شبہ کرتی تھی۔ مگر میں نے اوس کی کچھ اصلاح کر دی۔ اور سب انسپکٹر پولیس خاموش ہو گیا"

اس کلمہ سے کامران گھبرا کر اُچھل پڑا۔ اور خوف زدہ آواز سے پوچھنے لگا" مجھ پر شبہ کس طرح ہوا۔ رحمت کو معلوم ہے۔ کہ میں دراصل کامران ہوں۔ اور فرضی کلو بیگ بنا ہوا ہوں۔ یہ تو غضب ہو گیا" شکیلہ بیرنگٹن کو کامران کی پریشان صورت دیکھنے سے کچھ ہنسی آگئی۔ جسے ضبط کر کے اس نے اوس طرح جواب دیا" نہیں رحمت آپ کو کلو بیگ ہی سمجھ رہی ہے۔ اور اس بھیس میں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ گو دفینہ کے بارے میں یہ بھیس سراسر بیکار ثابت ہوا۔ آپ ناراض نہ ہوں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ رحمت نے اپنے اظہار میں یہ بات بیان کی۔ کہ کوئی شخص مسٹر کامران چند روز گذرے۔ میرے پاس لاہور آیا تھا۔ شاید اُس کی رفیق احمد سے کوئی دشمنی ہو"

"شکر ہے۔ کہ رحمت مجھے کلو بیگ سمجھ رہی ہے۔ میں نے دراصل اپنے اظہار میں بھی اپنا نام کلو بیگ ہی لکھایا۔ اگر رحمت کو کامران سے دشمنی ہے یا اوسے رفیق احمد کا قاتل سمجھ رہی ہے۔ تو اوسے ایسی آزادی کے ساتھ رائے دینے کا استحقاق تو ضرور حاصل ہے۔ لیکن بہ حیثیت سراغ رساں کے میرا بھی فرض ہے۔ کہ میں معلوم کروں۔ وہ کامران کی دشمن کیوں ہو گئی ہے اوسے صرف اس بات کا علم تھا۔ کہ کامران آپ کو آپ کی جائداد کے متعلق مشورہ دینے آیا تھا۔ پھر وہ کیوں ناراض ہو گئی۔ کیا وہ اپنے سوا کسی کا آپ کی جائداد میں دخیل ہونا گوارا نہیں کر سکتی۔ کیا وہ آپ کی خیر خواہ ہے۔ کہ اوس سے آپ کو

کبھی نقصان پہونچنے کا احتمال نہیں؟"

مس مجھے معلوم نہیں۔ اس کے دل میں کیا ہے۔ اب تک اس نے مجھے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ اور میں اوسے ہر طرح ایماندار سمجھتی ہوں۔ لیکن وہ شب گذشتہ توشہ خانہ میں کیا کر رہی تھی شاید وہ میرا گھر لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرتی ہو۔

مسٹر شکیلہ عر

شرط عقل است بدگماں بودن

اگر یہ بوڑھی رحمت کا مران کو خواہ مخواہ اس معاملہ میں کھینچنا چاہتی تھی۔ تو میں وجہ ضرور دریافت کرونگا۔ کیا آپ مہربانی فرماکر مجھے بتا سکتی ہیں رفیق احمد کا پھوپھی زاد بھائی کون شخص ہے۔ اور وہ کہاں رہتا ہے کل مجھے پولیس والوں کی موجودگی میں یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ رفیق احمد کا کوئی خط اور اس کے والد کا وصیت نامہ بھی گم ہوگیا آپ کیا اس معاملہ سے واقف ہیں؟"

ہاں۔ میں مسٹر رفیق احمد کی زبانی ان کے خاندان کے متعلق وقتاً فوقتاً بہت سی باتیں معلوم کرتی رہی ہوں۔ اس کے پھوپھی زاد بھائی کا نام بلند اختر ہے۔ مجھے ایک دفعہ رفیق احمد نے بتلایا تھا۔ کہ وہ کسی قدر لاابالی طبع آدمی ہے مگر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اوس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہوں گی۔ کہ مسٹر رفیق احمد کو اپنے بھائی پر مطلق شبہ نہیں۔ اور وہ چلتے وقت اپنی والدہ سے کہہ رہے تھے۔ کہ پولیس کو اگرچہ بلند اختر پر شک ہے مگر وہ کسی طرح بلند اختر کے اوپر آنچ نہیں آنے دیں گے کیونکہ وہ ان کی رائے میں بے قصور ہے"

کامران رحمت کے شبہات اور بلند اختر کے ذکر سے معاملہ کو کسی پہلو پر سلجھانے کے لئے بے چین تھا۔ اور اس کے دماغ میں مختلف خیالات

موجیں مار رہے تھے جنہیں وہ قابو میں کر کے کسی خاص بات پر نہ لگا سکتا تھا۔ وہ اپنے سامنے اس کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں سے اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کا چہرہ سب سے اول مرتبہ بڑے آئینے میں دیکھا تھا پھر وہ پیشانی پر بل ڈال کر بولا "یہ شخص کہاں رہتا ہے۔ کیا یہاں روڈکی میں رہتا ہے"

"نہیں وہ سہارن پور رہتا ہے۔ مسٹر رفیق احمد کہتے ہیں۔ کہ وہ ان کے والد کے مرنے پر آیا تھا۔ اور ایک دو روز رہ کر چلا گیا تھا۔ جس بات نے مسٹر رفیق احمد کو بلند اختر کی بے قصوری پر جما رکھا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ بقول مسٹر موصوف ان کے والد کے وصیت نامہ میں کوئی شرط یا گنجائش ایسی نہیں جس سے خدانخواستہ درصورت انتقال مسٹر رفیق احمد۔ بلند اختر کو اس کے والد کا روپیہ مل سکے"

"کیا آپ نے وصیت نامہ دیکھا ہے۔ اور آپ مجھے اس کے ماحصل سے مطلع کر سکتی ہیں؟"

مس "کل مسٹر رفیق احمد پولیس والوں کے سامنے بیان کر رہے تھے۔ کہ مسٹر رفیق احمد بلا شرکت غیری اس روپے پر اس شرط پر سے قابض ہو سکتے ہیں۔ کہ مجھ سے شادی نہ کریں یا اگر مجھ سے شادی کریں۔ تو مجھے مسلمان کر لیں اس شرط کو سنکر کامران اُچھل پڑا۔ اور چہرہ سرخ کر کے بولا "یہ شرط تو بڑی سخت ہے۔ کیا آپ نے مشرف باسلام ہونے کا ارادہ کر لیا ہے۔

شکیلہ ہیرنگٹن نے جمائی لی۔ پھر کانپتی ہوئی آواز سے بولی "میں کبھی مسلمان نہ ہونگی۔ مسٹر رفیق احمد اس رقم کثیر سے دست بردار ہو گئے ہیں اور مجھ سے باوجود اختلاف مذہب نکاح کرنے پر رضامند ہیں"

"یہ تو بالکل صاف بات ہے۔ جب مسٹر رفیق احمد اس دولت سے ہاتھ اُٹھائیں گے۔ بلند اختر اس روپے کا حق دار سمجھا جائیگا۔ لیکن اس وقت

چند سوالات ہوتے ہیں۔ اول تو یہ آیا بلند اختر کو مسٹر رفیق احمد کے ارادے سے اطلاع ہوگئی ہے یا نہیں۔ اگر اسے اطلاع ہوگئی تھی۔ تو اسے رفیق احمد پر حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ بلند اختر کو اس بات کا پتہ کس طرح لگا۔ کہ وہ ۱۰ بجے رات کو جہاں آصف نگر سے گذرے گا"

"میں آپ کے پہلے سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ مسٹر رفیق احمد کل مجھے کہتے تھے۔ کہ ان کے والد کی دولت بلند اختر کو کسی طرح نہیں مل سکتی۔ اور وصیت نامہ کی ایک شرط کی مثابعت میں درصورت انفساخ شرائط مجوزہ سارا روپیہ مدرسہ عربی دیوبند کے نام منتقل ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اگر میں عیسائی رہی۔ رفیق احمد اپنے باپ کے ترکہ کو مدرسہ عربی دیوبند کے نام کرا دینے پر مجبور ہونگے" کامران کو ان نکات سے قطعی لاعلمی تھی۔ جو مولوی شفیق احمد کے وصیت نامہ کے متعلق اب اُسے شکیلہ کی زبانی معلوم ہوئے۔ وہ حیرت میں تھا۔ کہ اگر بلند اختر کا نام مولوی شفیق احمد کے وصیت نامہ میں مذکور نہ تھا۔ تو وہ کس طرح حصہ دار بن سکتا تھا۔ اور کس وجہ سے رفیق احمد پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا۔ زاں بعد اس طرح گویا ہوا۔ میں کل اپنی اصلی وضع میں مسٹر رفیق احمد سے ملاقات کرونگا۔ آپ مہربانی فرما کر علے الصباح ایک خط مسٹر موصوف کے نام لکھ دیجئے۔ اور اس میں مجھے بطور کامران کے پیش کیجئے۔

"بہت اچھا۔ میں کل خط لکھ دوں گی۔ لیکن آپ ہوشیار رہیے گا۔ کل مسٹر رفیق احمد نے نصب انسپکٹر پولیس مسٹر گھور کو بھی اپنی کوٹھی پہ بلایا ہے۔ کہیں آپ کی ملاقات ہیلر نہ ہو جاوے"

"میں آپ کا ممنون ہوں۔ کہ آپ نے مجھے سارے رازوں سے

آگاہ کر دیا۔ اب آپ آرام فرمایئے۔ اور اس دروازے کی چٹخنی لگا لیجئے
یہ کہہ کر کامران نے شرقی دروازے کی چٹخنی کھولی۔ اور برآمدے میں آکر
کہنے لگا "بند کر لیجئے" وہ برآمدے سے اوتر کر اپنی چھولداری کی طرف
جا رہا تھا۔ اور دو گز ہی چلا ہوگا۔ کہ اُسے جنوبی دیوار کے گوشے پر کوئی
شخص کھڑا دکھائی دیا۔ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور یہ سمجھ کر کہ شاید
رفیق احمد کا قاتل اسی بنگلہ میں چھپا ہوا ہو۔ اور اس وقت کسی دوسرے
جرم کے ارتکاب کے لئے نکلا ہو۔ اس کا بدن کانپ گیا۔ منہ خشک
ہو گیا۔ اور پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ لیکن وہ سراغ رساں تھا۔ اور
کتنے ہی مجرموں سے وقتاً فوقتاً دست و گریباں ہو چکا تھا۔ پس وہ
اپنے اوور کوٹ کی جیب سے پستول نکال کر کھڑا ہو گیا۔ اور جب اُس نے
دیکھا۔ کہ وہ مشتبہ آدمی ہی آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے اشتیاق میں
تیزی ہوئی۔ اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھا جب وہ
کونے پر پہونچا۔ تو اُسے رضائی میں بیٹھی ہوئی کوئی عورت معلوم ہوئی۔ اس
نے چار گز کے فاصلے سے اس عورت کے اوپر برقعہ کے اندر سے آنکھیں لگا
دیں جب وہ ایک گز آگے بڑھا۔ تو اوس عورت نے چیخ ماری۔ کامران
اس کے قریب پہنچا۔ تو اگرچہ شب کی تاریکی ایک دوسرے کی صورت اچھی
طرح دیکھ لینے میں مزاحم تھی۔ مگر اسے اس عورت کے قد و قامت سے معلوم
ہو گیا۔ کہ وہ رحمت تھی۔ کامران نے رحمت کی چیخ پر کچھ تعجب نہ کیا۔ اور
وہ سمجھ گیا۔ کہ اس بنگلہ میں کوئی برقعہ پوش عورت شب کی تاریکی میں
کبھی رحمت کو دکھائی نہ دی ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ اسے بھوت سمجھ کر
ڈر گئی۔ رحمت کے ڈر میں اضافہ کرنے کی نیت سے کامران نے بلی کی
آواز میں میاؤں میاؤں کرنی شروع کی۔ پھر وہ غرب کی جانب
منہ کئے ہوئے آہستہ آہستہ تک تک چلا گیا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر

کامران اپنے بائیں ہاتھ کی طرف مڑا۔ اور شاگرد پیشہ لوگوں کی بارک کے آگے سے گذرتا ہوا اگلے۔ اگلے کوٹھڑیوں میں باتیں سننے کے لئے کھڑا ہوتا گیا۔ لیکن آج تمام لوگ سویرے سے سو گئے تھے۔ سب طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شب کی ہیبت ناک تاریکی میں آسمان اور ستارے اس صفحہ ہستی سے بہت قریب معلوم ہو رہے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ غربی چہار دیواری کے کونے پر پہونچ کر بطرف مشرق مڑا۔ اور ہانپتا ہوا اپنی چھولداری میں گھس گیا۔ جہاں اس نے اپنی چارپائی پر پہنچ کر زنانہ لباس اوتارا۔ اور دائیں بائیں نگاہ ڈالی۔ اور بوڑھے ملازم کے خراٹوں پر کان لگا کر سنتا رہا۔ اس وقت اس کے دل میں تین خیالات بہت زیادہ غالب ہو رہے تھے۔ پہلا خیال یہ تھا۔ کہ یہ بوڑھی عورت تو شاید ہر روز توشہ خانہ سے اجناس نکال نکال کر کسی دوسرے شخص کو دیتی رہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ بلند اختر نے رفیق احمد کے اوپر قاتلانہ حملہ کیوں کیا۔ تیسرا یہ کہ رفیق احمد کے گھر سے اس کا خط اور اس کے والد کا وصیت نامہ کس نے چرایا+

دراصل انسانی زندگی بے حد مشکوک اور اسرار سے بھری ہوئی رہتی ہے۔ روزمرہ کے کاموں میں ذرا ذرا سی باتیں ناقابل ادراک معلوم دینے لگتی ہیں۔ انسان اگر اپنے آس پاس کے آدمیوں اور ہمسایوں کے اندرونی حالات معلوم کرنے سے بھی عاجز رہتا ہو۔ تو اس خالق کون و مکان کے عظیم الشان کاموں میں کس طرح دخیل ہو سکتا ہے۔ جو سب کائنات کو اپنے پنجہ میں جکڑے رہتی ہے۔ مگر کسی کا ہاتھ اس تک نہیں پہونچ سکتا بہرحال کامران اس وقت اس بات پر پورا آمادہ ہو گیا تھا۔ کہ اگر جرأت اسے رفیق احمد کا قاتل سمجھ رہی ہے۔ تو وہ بھی اسے اندھیری رات کی کشتی بھیجنے سے عاری نہ تھا۔ اور بلند اختر سے نمٹ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔

اٹھارھواں باب

خون کا جوش

مولوی شفیق احمد کی عظیم الشان دو منزلہ کوٹھی کے شرقی آئینوں پر سورج کی چمک دار کرنیں آن بان سے چمک رہی تھیں اور اس پاس کے در و دیوار پر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور رنگ برنگ کے خوب صورت آئینوں کی جھلک سامنے کے باغیچہ کے تر و تازہ پودوں اور پھولوں سے گلے مل کر ہنس رہی تھی۔ شرقی باغیچہ اور در و دیوار کی خوب صورتی اور چمک غربی مکانات کی موجودہ بے رونقی اور دور افتادگی کا خیال پیدا کر کر انسانی دلوں کو تکالیف اور خوشیوں کا کافی الفور اندازہ کرا دیتی تھیں۔ دراصل دنیا کی خاطر چپہ چپہ پر انسانی تغیرات کی بین مثالیں ہوتی ہیں۔ ایک گھر میں خوشی اور آزادی کے نقارے بجتے رہتے ہیں۔ اور ایک دیوار پر سے دوسرے گھر میں آہ و بکا کی دلخراش آوازیں ہواؤں میں گونج گونج کر ساری دنیا کو متنبہ کرتی ہیں۔ کہ اس چند روزہ زندگی پر اعتبار نہ کرو۔ اس کے سارے دھندے نقش برآب کی طرح ایک آن واحد میں مٹ جانے والے ہیں۔ شرقی باغیچے کے پاس دو موٹر ہوں پر دو بوڑھے ملازم دھوپ سے مستفید ہونے کے واسطے کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر آفتاب کی طرف دیکھتے تھے۔ جسے وہ اپنی زوال پذیر زندگی کے مقابلے میں لازوال طاقت اور قیام میں لڑکپن سے دیکھتے آ رہے تھے۔ بعض دفعہ انسان کو باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے اپنی زندگی کی مصائب اور تکالیف دیکھ کر بے جان چیزوں کی

آزادی اور بے فکری کا خیال آجاتا ہے۔ اور وہ جھلا کر کہہ اٹھتا ہے۔ مجھ سے اینٹ پتھر اور درخت اچھے ہیں۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ نظام عالم میں ہر چیز کسی خاص کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اگر ایک شخص آرام و آسائش کے لئے پیدا ہوا ہے۔ تو دوسرا تکلیف اور محنت کے لئے وجود میں آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو دنیا کے سب کام بند ہو جاتے اور تکلیف یا خوشی کا احساس ہی نہ رہتا۔ عالی شان کوٹھی کے شرقی حصہ میں جیسی چمک دمک اور آب و تاب موجود تھی۔ وہی مصنوعی تکلفات میں کوٹھی کے اندر دکھلائی پڑتی تھی۔

نوجوان رفیق احمد کی واپسی اور سلامتی جان کے شکریہ میں نوکروں نے آج غیر معمولی جوش و خروش سے کمرے صاف کئے تھے۔ اور جملہ مکانات کا سامان مرحوم شفیق احمد کی دولت کی پوری پوری قیمت ادا کرنے کے لئے اپنی انتہائی طاقت میں جوش و خروش سے چلا جا رہا تھا۔ ہم نوجوان صاحب زادے کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔" بڑا ہال مکلف قالینوں۔ خوب صورت کرسی دیزوں۔ چمک دار جھاڑ و فانوس اور خوب صورت لیمپوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور چاروں طرف خوب صورت پردے اپنی آب و تاب اور رنگ برنگ بہار دکھلا رہے تھے۔ نوجوان رئیس زادہ بڑے کمرے سے بہ جانب غرب اُس لانبے کمرے میں مکلف مسہری پر پڑا تھا۔ جس میں آٹھ روز پیشتر اُس کے مالدار باپ نے جان بحق تسلیم کی تھی۔ ہندوستانی عقیدت پرستی کے لحاظ سے نوجوان فرزند کا اس کمرے میں متمکن ہونا جہاں اُس کے باپ نے وفات پائی۔ ناظرین کے دلوں کو کچھ تنگ کرے گا۔ اور دراصل اس کی والدہ نے اس کمرے کو منحوس سمجھ کر اسے وہاں رہنے سے منع بھی کیا تھا۔ مگر نوجوان رئیس زادہ اول تو انگریزی تعلیم کے اثر سے ان باتوں کو خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔ دوسرے اس کا

نرلوں کسی قدر صندی بھی تھا۔ اس نے اسی کمرے کو اپنے لئے پسند کیا۔ اور اسی میں قیام کیا۔ مولوی شفیق احمد کے انتقال کے بعد یہ کمرہ انگریزی طریق ڈاکٹری ادویہ سے دھوکر صاف کر دیا گیا تھا۔ اور نئے سرے سے سفیدی ہو گئی تھی۔ اس لئے مجروح رئیس زادے کو کسی بات کا اندیشہ فضول تھا۔ جس روز وہ شکیلہ ہیر لگھن سے رخصت ہو کر آیا۔ اس کے زخم میں بے حد تکلیف رہی۔ اور وہ ساری رات کراہتا رہا۔ لیکن صبح ہونے پر اُسے نیند آگئی تھی۔ اور صبح کے ۹ بجے جب اس کی آنکھ کھلی۔ تو اُسے اپنے زخم کی تکلیف میں کسی قدر کمی معلوم دی۔ دراصل ادویہ کی تاثیر میں تو کلام نہیں لیکن سب سے زیادہ افاقہ خیز انسان کی طبیعت ہوتی ہے۔ اور گہری نیند بہت سی تکالیف کو کم کر دیتی ہے۔ جس وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے پاس کی مسہری پر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اُس وقت اپنے زنان خانہ میں گئی ہوئی تھی۔ رفیق احمد نے پاس کی میز پر سے گھنٹی بجائی۔ اور زنان خانہ سے دو ماماہیں بھاگی آئیں جنہوں نے محبت بھری نگاہ سے نوجوان کی طرف دیکھ کر پوچھا "سرکار کا مزاج کیسا ہے۔ بڑے ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ ہم نے سرکار کو سوتا دیکھ کر کہہ دیا کہ ابھی تشریف لاویں" رفیق احمد نے متردد چہرے سے ماماؤں کو دیکھا اور اس کی نگاہ انگیٹھی کے اوپر خوب صورت کلاک کی طرف گئی جس پر ۹ بجکر ۱۰ منٹ ہو گئے تھے۔ پھر اس کے منہ سے یہ کلمہ نکلا "میں اب کسی قدر اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو بلایا ہوتا۔ خیر جلدی گرم پانی لاؤ" دو منٹ بعد ایک ماما آفتابہ میں گرم پانی لائی۔ اور دونوں عورتوں نے بڑی توجہ اور مستعدی سے رفیق احمد کا ہاتھ منہ دھلایا۔ اسی اثنا میں اس کی والدہ آگئی۔ اور اس کے سرہانے کھڑی ہو کر محبت بھری نگاہ سے اُسے دیکھ کر بولی "رفیق اب طبیعت کیسی ہے۔ رات کچھ کھایا نہیں۔ میں کھانا تیار

کرا رہی تھی کس چیز کو دل چاہتا ہے" نوجوان فرزند نے بے رونق آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر جواب دیا" ابھی مطلق اشتہا نہیں۔ صرف چائے بھیجدیجئے۔ مجھے خیال ہے۔ کہ سب انسپکٹر پولیس منگلور آیا ہی چاہتا ہے" بوڑھی والدہ نے زمان سے اچھا کہا۔ اور وہ لپکی لپکی خود چائے لینے گئی۔ ابھی رفیق احمد بسکٹ اور مکھن کے ساتھ چائے ہی پی رہا تھا۔ کہ ہال کے دروازے میں کسی نوکر نے گھنٹی بجائی ایک ماما بھاگی گئی۔ اور یہ پیغام لائی۔ کہ تھانہ دار صاحب آگئے ہیں۔ رفیق احمد نے جلدی جلدی چائے ختم کر کے برتن اٹھوا دیئے۔ اور اپنی والدہ کو زنان خانہ کی طرف اشارہ کر کے ماما سے کہا۔ سب انسپکٹر صاحب کو سلام دو۔ سب انسپکٹر معہ ہیڈ محرر و کانسٹیبلان دیروزہ اندر آیا۔ اور مزاج پرسی کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ نوجوان رفیق احمد نے سب انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے جواب دیا" الحمدللہ۔ مکان کی اور کوئی چیز چوری نہیں گئی۔ سب سامان اس طرح ہے۔ جیسا میں نے چھوڑا تھا۔ لیکن میں آپ سے کچھ باتیں تخلیہ میں کرنا چاہتا ہوں" پھر رفیق احمد نے ہیڈ محرر اور کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا۔ سب انسپکٹر نے ان لوگوں کو باہر چلے جانے کو کہہ دیا۔ اور وہ کھسیانے ہو کر بڑے ہال میں چلے آئے۔ رفیق احمد نے باہمی سب انسپکٹر سے کہا۔

" آپ کرسی ادھر لے آئیے۔ سب انسپکٹر نے دونوں مسہریوں کی درمیانی کرسی رفیق احمد کی پائینتی کر لی۔ اور بڑا اشتیاق آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھنے لگا۔ تو اس نے دبی ہوئی آواز سے پوچھا" آپ اس معاملہ میں اب کیا کرنا چاہتے ہیں۔ سب انسپکٹر پیشانی چڑھا کر جواب دیا" اس معاملہ کی تحقیقات جاری رکھنے کے لئے میں سب انسپکٹر روڈکی سے مدد طلب کرونگا۔ رہی مجرم کے متعلق شہادت۔ سو اس وقت

صرف دو آدمی مشتبہ ہیں ایک آپ کا بھائی بلند اختر۔ دوسرا کامران "
رفیق احمد کے چہرے پر پریشانی ہویدا ہوئی۔ اور اس نے سب انسپکٹر کی
آنکھوں سے آنکھیں ملا کر جواب دیا "تو ذکر ہی فضول ہے
کیونکہ وہ مجھ سے قطعی ناواقف ہے۔ پس غالباً آپ بلند اختر کے
متعلق تحقیقات کریں گے" سب انسپکٹر نے فرش کی طرف نگاہ ڈال کر
ذرا دیر کچھ سوچا۔ پھر آہستہ سے جواب دیا "جی ہاں۔ کامران کو واقعی اس
معاملہ سے کچھ تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ میں اپنے روزنامچہ میں اس کا
ذکر کر چکا ہوں۔ بہرحال میں بلند اختر کو مجرم سمجھتا ہوں۔ اور اسی پر فرد
جرم قائم کروں گا" رفیق احمد کے چہرے پر سفیدی پھیلنے لگی۔ اس کا
منہ کھل گیا۔ اور دل دھڑکنے لگا۔ اس نے سامنے دیوار کی طرف دیکھ
کر جواب دیا۔ لیکن میں بلند اختر کو مجرم نہیں سمجھتا۔ اور اگر وہ مجرم بھی
ثابت ہو۔ تو میں اوسے بری کرانا چاہتا ہوں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کہ
وہ میری حقیقی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ جو ہمارے گھر پر جان نثار کر دینے کے لئے
حاضر رہی ہے" وہ غریب دو مہینہ سے ہمارے یہاں تھی۔ پرسوں صبح اپنی
دختر سمیت سہارنپور واپس گئی ہے۔ غریب بیوہ ہے۔ اور اس نے ساری عمر
رنج و غم کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ بلند اختر جیلخانہ
میں جاوے۔ اور میری شریف بوڑھی پھوپھی اس کے رنج میں سر پھوڑ کر
مر جاوے۔ رفیق احمد کے چہرے سے ایک قسم کا استقلال ٹپکتا تھا۔ اسکی
آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اور مجرم کی خوفناک سزا کا اندازہ کر کے اسے اپنی
بوڑھی پھوپھی کی اشک آلودہ آنکھیں اور غمگین چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس کلمہ
کو سنکر سب انسپکٹر بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اور کچھ سوچنے لگا۔ دو
منٹ تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا۔ پھر رفیق احمد کے منہ سے یہ بات
نکلی "بلند اختر کو آپ بچا لیجئے۔ اور درحقیقت مجھے اس پر قطعی شبہ

نہیں۔ سب انسپکٹر نے دھڑکتے دل سے اور متردد چہرے سے رفیق احمد کی طرف دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا۔ لیکن اب تو روزنامچہ مکمل ہو گیا۔ اب سوائے باقاعدہ تحقیقات اور مجرم کی گرفتاری کے چارہ نہیں رفیق احمد کے کانوں میں شاں شاں کی آوازیں نکلیں۔ اور اسے سارا کمرہ گھومتا ہوا معلوم دیا۔ پھر اس نے اپنے دل کو قابو کر کے جواب دیا "خیر اگر آپ اوسے گرفتار کریں گے۔ تو میں خود بری کرا دینے کی کوشش کرونگا اور جب میں اوسے بے قصور سمجھتا ہوں۔ تو آپ کے شبہ کرنے سے کیسے کام چلے گا۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟" اس وقت سب انسپکٹر کے چہرے پر اس قسم کا تبسم ظاہر ہوا۔ جیسے شکاری کے چہرے پر ہرن کو زخمی کر کے ہوا کرتا ہے۔ اور وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا "ثبوت بڑی آسانی سے مل جائیگا۔ ثبوت کی ہم لوگوں کو اندیشہ نہیں ہوتا۔ لیکن کیا واقعی آپ اُسے بری کرانا چاہتے ہیں؟ یا محض میری ایمانداری کا امتحان کر رہے ہیں؟" اس وقت سب انسپکٹر نے بڑے متین چہرے سے رفیق احمد کی طرف دیکھا۔ جس نے گھبرا کر جواب دیا "کیا خوب کیا مذاق کا وقت ہے۔ بخدا میں اپنی بوڑھی پھوپھی پر خود اپنی جان قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں آپ کو معاوضہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حق الخدمت دینے پر راضی ہوں"

سب انسپکٹر کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے نادم نگاہیں فرش پر ڈال لیں۔ اور دو تین منٹ تک سوائے ان دونوں کے سانس یا زنانخانہ کے آواز کے کچھ سنائی نہ دیا۔

پھر سب انسپکٹر نے اپنا سرخ چہرہ اوپر کو اٹھا کر آہستہ سے جواب دیا "روزنامچہ کی نقل ابھی روانہ نہیں ہوئی۔ لیکن پھر بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ بہرحال صاحب زادہ صاحب مگر آپ اس شخص کو بری کرانا چاہتے ہیں تو ایک

تحریری اقرار نامہ اس امر کا دیجیے کہ آپ بلند اختر کو بے قصور سمجھتے ہیں اور اگر آپ کی والدہ صاحبہ پڑھی لکھی ہوئی ہوں۔ تو ایک خط اُن کے ہاتھ سے بھی مضمون لکھا لیجئے۔ کہ جن اوقات میں آپ، جمال آصف نگر میں تھے بلند اختر آپ کے گھر میں آپ کی والدہ صاحبہ کے پاس تھا" نوجوان رفیق احمد کا دل اب غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اور اُس نے گھبرا کر کہا "لیکن اس طرح پر تو بلند اختر پر وصیت نامہ اور خط کی چوری عاید ہو جائیگی" سب انسپکٹر نے مسکرا کر جواب دیا "میں نے ابھی روزنامچہ میں وصیت نامہ اور خط کی گمشدگی کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ آپ گھبرائیں نہیں"

رفیق احمد کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار پدیدار ہوئے۔ اور اوس نے معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے لیے سوچنا شروع کیا ایک منٹ بعد وہ اس طرح گویا ہوا "لیکن اوس رات بلند اختر یہاں نہ تھا۔ وہ پرسوں اپنی والدہ کے ساتھ سہارنپور چلا گیا تھا۔ کہیں اس دروغ گوئی سے نئی مشکل پیدا نہ ہو جاوے"

سب انسپکٹر نے متین صورت بنا کر رفیق احمد کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے جواب دیا۔ آپ بھی بڑے کمزور دل کے آدمی ہیں۔ میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں۔ کہ بلند اختر پر کسی طرح آنچ نہ آوے گی۔ اور بہتر یہ ہوگا۔ کہ آپ میری کارروائی کا نتیجہ دیکھنے کے لئے ایک ماہ کی مدت مقرر کر لیں لیکن میں اس کام کے لئے پانچ ہزار روپیہ لونگا۔ آپ پانچ ہزار روپے کے نصف حصص نوٹ مجھے اس وقت دیں۔ اور بقیہ معاملہ کے رفع دفع ہو جانے پر" یہ فقرہ ادا کرنے کے بعد سب انسپکٹر کے منہ پر مکروہ ندامت کے آثار ہویدا ہوئے۔ اور اس کی پیشانی اور ناک پر پسینہ آگیا جسے اس نے جھٹ پٹ رومال سے پونچھ ڈالا۔ رفیق احمد کا دل اب نئے جذبات اور خیالات میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور وہ کچھ سوچ کر بولا "میں آپ کو پانچ ہزار دونگا

میری پھوپھی تیرے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میرا خدا میری مدد کرے۔
سب انسپکٹر صاحب آپ کل ۱۰ بجے تشریف لائیے۔ میں پانچ ہزار کے نصف
حصص نوٹ اور ہنڈی کاغذات مطلوبہ آپ کے لئے تیار رکھونگا۔ لیکن آپ میری
خاندانی عزت کا خیال کر کے مجھے کچھ تو اطمینان دلائیے۔ کہ آپ اس راز کو کسی پر
فاش نہ کریں گے۔ یہ کہہ کر رفیق احمد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں
آنسو بھر آئے۔ چالاک سب انسپکٹر کے چہرے پر موجودہ فتح یابی سے رونق آگئی
اُس نے کھڑے ہو کر نوجوان رئیس زادہ کے مجروح ہاتھ کی ہتھیلی کو بوسہ
دے کر کہا۔ میں اپنے دین و ایمان کی قسم کھا کر آپ سے حلفیہ اقرار کرتا
ہوں۔ کہ یا تو بلند اختر کو اس جرم سے بلا اشتباہ صاف بری کرا دونگا۔ یا
اُس کے ساتھ خود جیل خانہ میں جاؤنگا۔ بڑے ہال کے اندر چالاک کنسٹبل
اپنے سب انسپکٹر کی باتوں کو کان لگا کر سُن رہے تھے۔ مگر سید حاسادھا
ہیڈ محرر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اونگھ کے نشے میں سرشار تھا۔ دراصل دنیا
میں مواقعات ہر روز نہیں آیا کرتے۔ خواہ وہ جائز ہوں۔ یا ناجائز۔ جو شخص
موقعہ پر پس و پیش کرتا ہے۔ وہ ساری عمر کف افسوس ملا کرتا ہے۔ چالاک
سب انسپکٹر نے "جب لوہا سرخ ہو خوب پیٹو" کے مقولہ پر عمل کر کے اپنے
دین و ایمان کو پانچ ہزار روپے کے بدلے فروخت کر ڈالا۔

انیسواں باب

تعاقب میں

جس وقت سخاوت علی سب انسپکٹر نوجوان رفیق احمد سے بلند اختر کے معاملہ میں معاہدہ کر رہا تھا۔ اس سے دو میل کے فاصلے پر قصبہ روڑکی میں اس پختہ سڑک پر جو محلہ قانون گویاں میں شمال سے جنوب کی طرف بازار سے مل گئی ہے۔ اور جس کے شمال و مشرق کے حصے میں بکثرت رنڈیاں آباد ہیں۔ جوکا مران یکہ سے اتر کر اپنے اوس مکان کی طرف جا رہا تھا۔ جو اُس نے عارضی طور پر کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اور جو صوبہ دار والے مکان کے نام سے مشہور تھا۔ اوسنے اس پختہ رو جنوب مکان کے قفل کی طرف دو تین آنکھ سے دیکھا کہیں اوس کی غیر حاضری میں کسی نے اُس کا مختصر سا سباب تو خورد برد نہیں کیا پھر ماہیگی جیب سے کنجی نکال کر قفل کھولا۔ اسوقت مکان کے صحن میں شرقی گوشے سے سورج چمک رہا تھا۔ اور نصف حصہ صحن میں دیوار تک دھوپ پھیل رہی تھی جس سے مکان کے کیوار گرم ہو رہے تھے۔ دہلیز کے دائیں جانب شرقی جنوبی گوشے میں چند چنبیلی کے جڑے ہوئے پودوں پر غریب پھول کس پرسی کی حالت میں اپنی بہار دے رہے تھے۔ کیا مضائقہ اگر مکان کے مکین کو پھولوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی۔ کامران نے سامنے کی سہ دری میں داخل ہو کر پڑے کمرے کا قفل کھولا۔ جس میں دو تین دن بند رہنے سے ٹھنڈی دیوار ہوا نکلی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل آیا۔ اور سہ دری میں بجانب غرب مڑ کر ایک کواڑ دار دروازے کے اندر سے جنوب رویہ چھوٹے سے بادچی خانہ کے آگے آکھڑا ہوا

جس کے سرد چولہا کی راکھ اور تھوڑی سی لکڑیاں اوس سے اپنی
حالت کی طرف متوجہ کر کے بزبان حال کہہ رہی تھیں "سب ٹھاٹھ پڑا رہ
جاویگا جب لاد چلے گا بنجارہ" پھر اُس نے آنکھ اوٹھا کر اپنے بائیں ہاتھ ایک
ہرے بھرے امرود کے درخت پر نگاہ ڈالی جس کے سبز سیاہی مائل پتے
دو روز پہلے کی بارش اور موجودہ دھوپ سے خزاں وشاداں معلوم ہو رہے
تھے۔ درخت پر چند کچے سیاہی مائل امرود لگ رہے تھے۔ جن کے قریب
ایک گلہری دانت صاف کرتی کرتی کامران کی غیر متوقعہ آمد سے خوف زدہ
ہو کر دم اُبھارے ہوئے چیخ چیخ کر نے لگی۔ کامران نے لب سانس بھر
کر اپنے وطن لاہور کو یاد کیا۔ پھر وہ محراب دار دروازے کے اندر سے باری
میں اگر بڑے کمرے میں گھس گیا۔ اور ایک چارپائی کے نیچے سے اپنا ٹرنک
کھینچ کر کپڑے نکالنے لگا۔ کامران اس وقت بوڑھے کلوبیگ کے لباس
میں تھا۔ مگر اوسے نوجوان رفیق احمد سے اصلی صورت و لباس میں ملنا تھا
کیونکہ مسٹر ہیرنگٹن نے اوسے اپنے خط میں بطور مسٹر کامران بی اے
سرلغ رساں لاہور پیش کیا تھا۔ کامران نے پٹکا عمدہ کوٹ پتلون
سفید لٹھے کا پائجامہ اور چھینٹ کے سرخ قمیص نیا کالر اور نئی ترکی ٹوپی
نکال کر چارپائی پر رکھدی۔ پھر مکان کے بیرونی دروازے میں زنجیر لگا کر
باورچی خانے میں آیا۔ اور چولہے میں چند لکڑیاں اور کوئلے رکھکر تھوڑا سا
مٹی کا تیل ایک بوتل سے چھڑک کر دیاسلائی دکھلائی دی۔ امرود کے
نیچے چند کورے گھڑے پانی کے رکھے تھے۔ اوس نے ایک گھڑا چولہے
پر رکھدیا۔ اور مٹی کی رکابی سے گھڑے کا منہ ڈھک کر آگ دہکانے لگا
جب آگ خوب روشن ہو گئی۔ تو وہ بڑے کمرے میں واپس آیا۔
اور کھلے ہوئے ٹرنک سے صابون دانی اور ایک اُسترہ نکالا
صابون دانی میں تھوڑا پانی باہر سے لاکر اوس نے صابون گھولا اور

بوٹ ہے کلو بیگ کا روپ چارپائی پر پھینک کر ایک جیبی آئینہ سے اپنا منہ دیکھنے لگا۔ اس وقت اوس کے چہرے پر تھوڑی تھوڑی ڈاڑھی کے بال نکل آئے تھے۔ اوس نے چہرے پر صابون مل کر ڈاڑھی مونڈھنا شروع کیا۔ اور دو تین منٹ بعد پھر آئینہ دیکھا۔ بعد ازاں اوس نے ٹرنک کے اندر سے بڑا تولیہ نکالا۔ اور چارپائی کے نیچے سے آفتابہ نکال کر غسل خانہ میں پہونچا۔

چولہے کے اندر خشک لکڑیاں جل کر باہر نکل آئی تھیں۔ اور چاروں طرف خوب دھواں گھٹا ہوا تھا۔ اوس نے گھڑے سے رکابی اُٹھا کر پانی دیکھا جو ابھی برائے نام گرم ہوا تھا۔ مگر وہ سرد و گرم پانی یا ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ تین چار منٹ کے اندر غسل کر کے نکل آیا۔ غسلخانہ باورچی خانہ ہی کا نصف حصہ تھا۔ جس میں ایک قد آدم دیوار حائل تھی۔ وہ تولیہ سے بدن ڈھانپے باہر آیا۔ اور سرد ہوا کے جھونکے اوس کے بدن سے لگ گئے۔ اوس نے جھٹ پٹ کمرے میں آکر دم لیا۔ اور تین منٹ کے اندر معقول کپڑوں سے ملبوس ہو کر شریف صورت کا مرد بن گیا۔ اوس نے بوٹ ہے کلو بیگ کے کپڑوں کو ایک کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اور میلے اوورکوٹ کی جیب سے شکیلہ کا خط اور ایک میلی سی ڈبیہ نکال کے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ اس میلی ڈبیا سے اسے کراہت آئی۔ اور تولیہ سے ہاتھ ملنے لگا۔ پھر بیرونی دروازے کا قفل اُٹھا کر باہر آیا۔ اور قفل لگا کر بائیں ہاتھ پختہ سڑک پر چل گیا۔ جہاں اُسے ایک یکہ شمال کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اُس نے آواز دے کر یکہ والہ کو بلایا۔ اور اوسے اپنا منزل مقصود بتلا کر سوار ہو گیا کامران جس وقت مسٹر رفیق احمد کے بنگلے پر پہونچا۔ دس بج رہے تھے۔ اوسنے جھٹ پٹ یکہ والے کو رخصت کیا۔ اور ایک نوکر کو سامنے سے بلا کر پوچھا کیا مسٹر رفیق احمد تشریف رکھتے ہیں؟ جب نوکر نے اثبات میں جواب دیا تو اُس نے

شکیلہ ہیرنگٹن کا نیلے موٹے کاغذ پر لکھا ہوا خط اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا "اس کا جواب لے آؤ" نوکر اوسے باہر چھوڑ کر اندر داخل ہوا۔ دو منٹ کے بعد ملازم نے باہر آکر بڑی مستعدی سے مودب آواز میں دور سے عرض کیا "تشریف لائیے" کامران بوڑھے ملازم کے پیچھے پیچھے چند کمروں سے گذر کر رفیق احمد کے آرام دہ کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں موخر الذکر ننگے سر گردن تک شال کھینچے ہوئے چت لیٹا ہوا اخبار پایونیر کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پردہ کے پیچھے کامران اور ملازم کی آواز سُنکر رفیق احمد نے اخبار اپنی والدہ کی مسہری پر پھینک دیا۔ اور دائیں ہاتھ سے مسہری پکڑ کر اٹھ بیٹھا کامران نے اوسے پُر تبسم آنکھوں سے السلام علیکم کہا۔ جس کا جواب دے کر رفیق احمد نے اوس سے بیٹھے بیٹھے مصافحہ کیا۔ اور پاس کی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ رفیق احمد پیشانی پر بل ڈالے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کہ اوس شخص کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے مگر اوسے دراصل وہ ہو کا دیکھا تھا اوس نے کامران کو کہیں اصلی صورت میں نہیں دیکھا تھا۔ اوسے اُسوقت اوس شخص کی آنکھوں اور قد و قامت کا خیال ہو رہا تھا۔ جسے کل وہ بصورت کلو بیگ شکیلہ کے یہاں دیکھ چکا تھا۔ ابھی رفیق احمد اور کامران کے مابین کچھ بات چیت بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ زنان خانہ کے دروازے سے ایک خادمہ نے منہ نکال کر کہا "سرکار کھانا تیار ہے بیگم صاحب کہتی ہیں کہ آپ نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا" رفیق احمد نے کامران کی طرف کن آنکھوں سے دیکھ کر جواب دیا "اچھا دو آدمیوں کے لئے کھانا لگاؤ۔ مسٹر کامران ..... آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہوگا"

کھانا تو واقعی میں نے ابھی نہیں کھایا۔ لیکن میں آپ کے آرام و تنہائی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو میں بڑے ہال میں انتظار کروں"

"نہیں۔ نہیں مسٹر کامران۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ تو شکیلہ

ہیرنگٹن کے پاس سے آرہے تھے۔ میں اوس کے پیاروں ہاتھوں سے لکھے ہوئے خط کی محبت میں آپ کو بھی محبت بھرے دل سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے کہاں قیام فرمایا ہے۔ آپ میرے غریب خانہ پر آسکتے ہیں۔

"میں آپ کی عنایات کا از حد مشکور ہوں۔ میں فخر کرتا ہوں۔ کہ مجھے آپ اور شکیلہ ہیرنگٹن جیسے شریف لوگوں میں رسوخ حاصل ہے۔ آپ شاید تعجب کرینگے میں دراصل آپ سے دو گھنٹہ پیشتر مس شکیلہ ہیرنگٹن کا ٹھیکہ دار کلو بیگ تھا۔ اب دوسری صورت میں آپ کے سامنے کامران بن کر آیا ہوں۔" رفیق احمد کے چہرے پر تعجب اور حیرت کے علامات ظاہر ہوئے۔ اور وہ گھبرا کر بولا "میں بالکل نہیں سمجھا۔ پہلے آپ کلو بیگ تھے۔ اور اب کامران بن گئے؟"

کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں دراصل لاہور کا سراغ رساں کامران ہوں۔ لیکن میں آٹھ دس روز سے مس شکیلہ ہیرنگٹن کے دفینہ کے متعلق تحقیقات کرنے آیا ہوں۔ اور کلو بیگ ٹھیکہ دار کے بھیس میں کھدائی کھدا رہا ہوں۔"

"اوہ تب میں سب سمجھ گیا۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معاف کرنا۔

. . . . . ." اتنے میں دو ماماؤں ایک بڑی سینی میں نقرئی سرپوشوں میں ڈھکے ہوئے برتن لائیں۔ جن کے پیچھے ایک خورد سال لڑکا جس کا سر بندھا ہوا تھا۔ آفتابہ میں گرم پانی لا رہا تھا۔ ماماؤں نے ایک چھوٹی میز کھینچ کر رفیق احمد کے سرہانے لگا دی۔ اور تکیہ ہٹا دیا۔ کامران نے لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کیا یہ وہ لڑکا ہے۔ جو گھوڑا گاڑی سے گر کر زخمی ہوا تھا۔" رفیق احمد نے مسکرا کر جواب دیا "جی ہاں آپ کا میرے یہاں نوکر ہو گیا ہے۔"

کامران نے پھر خورد سال لڑکے کی طرف دیکھا۔ تو اوسے معلوم ہوا۔ کہ اوس وقت بجائے پرانے۔ اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے لڑکے کے بدن پر سیاہ بانات کی وردی تھی۔ سر پر چھوٹی سی کابلی کلاہ تھی جس کے اوپر سرخی ہونے کے سبب سے دیکھ نہیں بڑھ سکتا تھا۔ کامران نے چوکرے کی طرف بار دیگر دیکھکر کہا "لڑکو تمہیں

سرکار کے ہاتھ دھلاؤ۔ تمہارا کیا نام" لڑکے نے خوف زدہ آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھ کر جواب دیا "چھٹن"۔ پھر رفیق احمد کے آگے جھک کر پیتل میں ہاتھ دھلانے لگا۔ کامران گو ایشیائی تہذیب کے لحاظ سے کھانے سے انکار کر رہا تھا۔ مگر رفیق احمد نے دھرا رکھ کے اوس کے ہاتھ دھلائے۔ اور کھانے میں شامل کر لیا۔ زنانخانہ سے گرم گرم روٹیاں اور سالنوں کے پیالے اور مختلف کھانوں کی رکابیں آتی رہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں کھانے سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد ملازم گرم قہوہ لائے۔ اور کامران نے جو سردی عسل میں کھائی تھی۔ اس کا نعم البدل ہو گیا۔ کھانے سے فراغت پاکر رفیق احمد نے نہایت اعلےٰ قسم کی مصری سیگریٹوں کا ایک بکس کھول کر کامران کے آگے رکھا۔ اور ایک سیگریٹ خود نکال کر پینے لگا۔ جب ماما ئیں اور لشکا چلا گیا۔ تو کامران نے کھانس کر کہا "میں آپ سے صرف ملاقات کرنے نہ آیا تھا۔ بلکہ مجھے آپ سے اپنے فرائض کے متعلق کچھ کام ہے" رفیق احمد کے چہرے پر اضطراب پیدا ہوا اور وہ گھبرا کر بولا۔ ارشاد میں بسر و چشم حاضر ہوں" کامران نے سیگریٹ کی راکھ جھاڑ کر جواب دیا "جس سفاک اور بزدل آدمی نے آپ پر پرسوں رات کو حملہ کیا تھا۔ میں اس کا پتہ لگانا چاہتا ہوں۔ شاید سب انسپکٹر صاحب قصبہ منگلور مجھ سے پہلے کامیاب ہو جائیں ملیکن میں اون وسائل کو کام میں نہیں لیا کرتا۔ جو پولیس والے استعمال کرتے ہیں۔ میں خفیہ خفیہ تحقیقات کروں گا"

رفیق احمد کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ اور اوس نے فرش پر نگاہ ڈال کر کہا "شکیلہ ہیرنگٹن نے اس خط میں لکھا ہے۔ کہ آپ اوس کے دوست ہیں۔ دنیا میں مجھے شکیلہ ہیرنگٹن کے برابر کوئی عزیز نہیں۔ اس لحاظ سے آپ میرے بھی دوست ہیں

دریں چہ شک ۔ دریں چہ شک " کامران کے منہ سے نکلا ۔ پھر اس نے بغور رفیق احمد کی طرف دیکھ کر کہا " مس شکیلہ کی عین آرزو ہے ۔ کہ جس شخص نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا وہ کیفر کردار کو پہونچایا جاوے ۔

نوجوان رئیس زادے نے ماتھے پر شکن ڈال کر جواب دیا " یہ تو بالکل درست ہے لیکن میں اس معاملہ کو دبانا چاہتا ہوں ۔"

کامران نے بڑی نرمی سے دریافت کیا " کیوں ؟"

رفیق احمد نے مضطرب آواز میں کہا " کیونکہ تحقیقات اور اتفاقیہ واقعات سے میرے پھوپھی زاد بھائی بلند اختر کے سر الزام آپڑا ہے ۔ اور میں اسے بے قصور سمجھتا ہوں ۔"

کامران سگریٹ سگار کا بڑا دلدادہ تھا ۔ اور قیمتی سگریٹ اسے کم نصیب ہوتے تھے ۔ اس نے سگریٹ کے بکس کو کھول کر دوسرا سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر بولا " یہ بالکل درست ہے ۔ اور واقعی ایسے قریبی رشتہ داروں میں اسی قدر محبت کی ضرورت ہے لیکن آپ کے یا سب انسپکٹر کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے ۔ کہ مجرم بلند اختر ہی تھا میں کہتا ہوں ۔ بلند اختر نہیں تھا ۔

پس نتیجہ یہ نکلا ۔ کہ کافی تحقیقات کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے ۔ کہ بلند اختر تھا یا کون ۔ اسوقت بلند اختر پر کھڑے کھڑے الزام نہیں لگایا جا سکتا ۔"

کامران کی گفتگو سے رفیق احمد فکر میں پڑ گیا ۔ اور اسے اس پانچ ہزار کا خیال آگیا ۔ جو وہ کل سب انسپکٹر کو دینے پر تیار ہو گیا ۔ اس نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر آہستہ سے کہا " تو کیا آپ بلند اختر کو بے قصور سمجھتے ہیں ؟ کامران نے مسکرا کر جواب دیا " میں ایسی کوئی بات نہیں کہتا ۔ اس وقت میں اسے مجرم کہہ سکتا ہوں ۔ اور نہ بے قصور ۔ یہ بات کوئی صاحب خرد جیسے جرائم اور مجرمین کا ذرا بھی تجربہ ہو نہیں کہہ سکتا ۔ اور اس لئے میں خفیہ تحقیقات کرنے کے لئے آپ سے چند امور دریافت کرنا چاہتا ہوں ۔

آپ تحقیقات کرنے کے بعد اوس کے نتیجہ سے پولیس کو اطلاع دیں گے؟"

"جی نہیں پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں مس شکیلہ ہیرنگٹن کی خاطر اس کام میں پڑ رہا ہوں۔ اور انہی کی اجازت سے آپ کو مطلع کر سکونگا۔"

رفیق احمد کے دل میں کچھ کچھ گدگدی اٹھی۔ اور وہ سمجھا کہ شکیلہ ہیرنگٹن ہرگز اوسکی مرضی کے برخلاف کوئی بات نہ کرے گی۔ پھر اوس نے اپنا اطمینان کرنے کیلئے پوچھا "اگر مس شکیلہ ہیرنگٹن نے رائے دی کہ بلند اختر کو پولیس کے حوالہ کر دو۔ تو کیا آپ اوسے جیل خانہ بھجوا دیں گے؟" کامران کے چہرے پر تردد کے نشانات ظاہر ہوئے اور سامنے کی دیوار کی طرف دیکھکر جواب دیا۔ ہاں انصاف کا مقتضی تو یہی ہے۔"

رفیق احمد نے سر ہلا کر جواب دیا "جی نہیں تو میں مس شکیلہ ہیرنگٹن کو لکھے دیتا ہوں۔ کہ وہ تکلیف نہ فرمائیں۔ میں دراصل بلند اختر کو بالکل بے قصور سمجھتا ہوں۔ اور آج سب انسپکٹر پولیس بھی مجھ سے کہہ گیا ہے۔ کہ وہ بے قصور ہے۔ اس لئے اب معاملہ رفع دفع ہونا چاہیئے۔"

اوس جواب سے کامران کا دل اچھلنے لگا۔ اور اوس نے غور سے رفیق احمد کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں اوس وقت نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ کامران نے تیوری چڑھا کر کہا "مسٹر رفیق احمد آپ مجھ جیسے آدمی کو دھوکا نہیں دے سکتے میں سینکڑوں رازوں کو افشا کر چکا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ اپنے بھائی بلند اختر کو محض خاندانی عزت اور ناموس کے لحاظ سے بچانا چاہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے۔ تو آپ مجھے بھی رازدار بنا سکتے ہیں۔ رفیق احمد کے دل میں کچھ الجھن پیدا ہوئی۔ اور وہ ڈر گیا۔ مبادا سب انسپکٹر نے اس بلند اختر کے بارہ میں گفتگو کی ہو۔ اور سب بھانڈا پھوٹ جائے۔ اوس نے بھلا کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر کامران کی طرح منفعل نگاہوں سے دیکھکر بولا "کیا آپ آج سب انسپکٹر سے ملے تھے۔ اور انہوں نے آپ سے کہا تھا کہ میں بلند اختر کو

مجرم سمجھتا ہوں۔

کامران کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اور ندیب دل سے بولا۔ مسٹر انسپکٹر سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ پولیس والوں کو سراغ رسانوں سے للہی بغض ہوتا ہے۔ ہم لوگ بھی ان سے کچھ دوستی نہیں رکھنا چاہتے پس آپ مطمئن رہیں میری اور ان سے اس معاملہ پر کچھ بات چیت نہیں ہوئی۔ آپ اجازت دیں۔ میں مجرم کا پتہ لگانے کی تدابیر اختیار کروں۔ پھر اگر آپ اوسے پولیس والے کے حوالہ نہ کرنا چاہیں گے۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

"لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ آپ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔

"میرے معزز دوست صرف اس وجہ سے کہ ہمارا پیشہ یہی ہے۔ ہم ایک کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو اوس کے ساتھ ہی عموماً دوسرے کام نکل آتے ہیں۔ میں دراصل شکیلہ ہیرنگٹن کے پاس اس غرض سے آیا ہوا ہوں۔ کہ اوس شخص کا پتہ لگاؤں جس نے شکیلہ ہیرنگٹن کو دھوکا دے کر اوس کے نانا کا دفینہ نکال لیا ہے۔ اور اوس پُراسرار خط میں جسے بقول شکیلہ ہیرنگٹن آپ بھی دیکھ چکے ہیں۔ بجائے ببول کے پیپل کا درخت بنا دیا ہے۔ آپ کو مس موصوف کی زبانی معلوم ہوا ہوگا۔ کہ مجھے دفینہ کے متعلق اب تک بالکل ناکامیابی رہی ہے لیکن چونکہ میں نے پختہ حوض کا کام چھیڑ دیا ہے۔ اور پتھروں کی برآمدگی سے ایسا خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید سارا احاطہ کھودنا پڑے۔ اس وجہ سے ابھی ایک مہینہ اور میرا قیام آصف نگر میں رہے گا۔ اس عرصہ میں مزدوروں کے سر پر کھڑے رہنے سے مجھے کچھ فائدہ نہیں۔ اور روڑکی سے سہارنپور تک کل گھنٹہ بھر کا راستہ ہے پس میں بلند اختر کی نقل و حرکت کے درپے ہو کر یہ معلوم کر لوں گا۔ کہ آیا مجرم ہے یا نہیں۔ پھر نتیجہ سے آپ کو مطلع کر دونگا"۔

رفیق احمد کو کامران کی باتوں سے پورا اطمینان نہ ہوا لیکن پھر بھی یہ خیال کر کے کہ وہ شکیلہ ہیرنگٹن کی سفارش لایا ہے۔ اور اصل مجرم کا پتہ لگانے میں آئندہ اپنی جان کی حفاظت بھی متصور ہے۔ اوس نے اپنی عقل سے استصواب کیا۔ اور اُس میں اوسے کوئی بات قابل اعتراض نہ معلوم ہوئی۔ کہ کامران مجرم کا پتہ لگا کر اوس کا نام صرف رفیق احمد یا شکیلہ کے گوش گذار کر دے لیکن چونکہ اسمبات کی بھی کوئی طمانیت نہ تھی۔ کہ وہ مجرم کا نام پولیس کو نہ بتا دیگا۔ اس لئے اوس نے ڈرتے ڈرتے یہ بات کہی "اچھا آپ اس بات کا حلف اوٹھایئے۔ کہ اگر بلند اختر مجرم ثابت ہوا۔ تو آپ اُس کا ذکر میرے سوا کسی فرد بشر سے نہ کریں گے" کامران کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ مگر اوس نے متانت سے جواب دیا "لایئے میں کلام مجید پر حلف اوٹھا سکتا ہوں۔

رفیق احمد نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پاس کی میز پر دھری ہوئی گھنٹی بجائی۔ اور ایک ماما کے آنے پر اوسے متفعل نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "والدہ صاحبہ سے تفسیر والا کلام مجید مانگ لاؤ"

ماما ایک منٹ کے بعد نہایت مکلف جزدان میں لپٹا ہوا کلام مجید لائی جسے رفیق احمد نے کامران کے ہاتھ میں دیا۔ کامران نے ٹھنڈے دل سے حسب مرضی رفیق احمد حلف اوٹھایا۔ پھر دھڑکتے دل سے کلام مجید کو نکالنے کے لئے جزدان کھولنے لگا۔ کامران دراصل بہت سے اولڈ فیشنڈ اسلامی عقاید سے منحرف تھا۔ اور عام لوگوں کے خیال میں پکا مسلمان نہ تھا۔ لیکن وہ اس وقت کلام مجید کو اس غرض سے دیکھنا چاہتا تھا۔ آیا قرآن پاک اوس کے دلی رازوں پر کچھ روشنی ڈال سکیگا۔ یا نہیں۔ اوس نے کلام مجید کو بند کر کے پھر کھولا۔ اور دائیں جانب کے صفحہ کی پہلی سطر کو پڑھنے لگا۔ تو یکایک یہ الفاظ اوس کی آنکھوں کے سامنے آئے "تحقیق اللہ نہیں دوست رکھتا ظالموں کو"

معلوم نہیں۔ ان الفاظ کی تفسیر اوس نے کیا سمجھی۔ کہ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اور اُس نے کلام مجید کو نہایت ادب سے تہ کر کے ماما کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر اپنے دل کو قابو میں کر کے بولا "اب آپ مہربانی فرما کر کوئی تصویر بلند اختر کی اگر آپ کے پاس موجود ہو۔ تو مجھے مرحمت فرمائیں اور اگر ناگوار نہ ہو۔ تو اوس کا پتہ بھی بتا دیں۔ اور گذشتہ حالات و اذعال سے بھی مطلع کر دیں"

رفیق احمد کو بلند اختر کے گذشتہ حالات کا خیال کر کے اپنا لڑکپن یاد آگیا۔ ان دونوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں ساتھ ہی تعلیم پائی تھی اور بلند اختر کے تمام اخراجات کی مولوی شفیق احمد صاحب کفالت فرماتے تھے اور بیس روپے ماہوار برابر اپنی ہمشیرہ کو بھیجتے تھے۔ ان باتوں سے ذہن کو ہٹا کر وہ کامران کی طرف مخاطب ہوا۔ اور کہنے لگا "کہ بلند اختر کی تصویر آپ کو بڑے کمرے میں انگیٹھی کے اوپر ملے گی۔

ایک نوجوان آدمی کی تصویر آپ وسط میں پائیں گے۔ اوسے اوتار لائیے بلند اختر لڑکپن میں بڑا شریر تھا۔ اور کھیل کود شرارت کی باتوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے پڑھنے میں کبھی دل نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ انٹرنس بھی پاس نہ کر سکا۔ اب بھی اوس کا چال چلن خراب ہے۔ سنا ہے ایک سال سے کسی رنڈی پر عاشق ہے۔ مگر میں پھر بھی اوسے سمجھ دار آدمی خیال کرتا ہوں۔ وہ مجھ پر کسی طرح حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ اس کے والد عرصہ پانچ سال کا ہوا۔ کا انتقال فرما گئے۔ ان کا مکان سہارنپور کے محلہ قاضیاں میں ہے۔ مولوی اشتیاق احمد صاحب کا پتہ کافی ہے۔ انہیں سب جانتے ہیں۔ وہ مدرسہ اردو میں ہیڈ مدرس تھے" کامران نے پنسل سے یہ سب باتیں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیں۔ پھر جھپٹ کر بڑے ہال سے بلند اختر کی تصویر اوٹھا لایا۔ رفیق احمد نے چوکھٹا الگ کر کے میز پر رکھ لیا۔ اور تصویر کامران کے حوالہ کر دی۔ تصویر سے بلند اختر

رفیق احمد ہی کے جسم کا قریب قریب اور اتنی ہی عمر کا نوجوان معلوم ہوتا تھا اس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ اور انگریزی کوٹ پتلون کے اوپر وہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ بظاہر وہ خوب تندرست اور خوش مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ کے خط و خال بھی موزون تھے۔ مگر اوس کی آنکھوں سے ایک قسم کی بے چینی اور بے مروتی ٹپک رہی تھی۔ بہرحال اس کی صورت سے کامران نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ شاید وہ ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ کامران گرم جوشی کے ساتھ رفیق احمد کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا۔ اور اوس کی کوٹھی سے قصبہ روڈ کی تک اوسے پیدل آنا پڑا۔ وہ دیر تک بازار میں کسی ہوشیار مستری کا نام پوچھتا رہا۔ بالآخر اوسی محلہ قالون گویاں کے قریب ایک لوہار مل گیا جس کے پاس کھڑے ہو کر اوس نے اپنی جیب سے ڈبیہ نکالی۔ اور ایک سخت ٹکڑا موم اوس کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگا "اس ناپ کی کنجی کتنی دیر میں بنا دو گے"۔ لوہار نے آنکھ پر عینک لگا کر موم کے نشان کو بغور دیکھا۔ جو دراصل کسی قفل کے اوس حصہ کا نقشہ دکھاتا تھا۔ جس میں کنجی ڈالی جاتی ہے۔ پھر کمانس کر بولا "یہ نشان چھ لیور کے تالے کا ہے۔ چابی کل مل جائے گی"۔ کامران نے سر ہلا کر کہا "نہیں نہیں کل نہیں آج چاہیئے ایک گھنٹے کے اندر بنا دو۔ تو جتنی مزدوری کہو گے۔ دی جائے گی۔ میرے مکان کا قفل بند پڑا ہے سخت تکلیف ہے"۔ بوڑھے لوہار نے کچھ سوچ کر جواب دیا "میرا لڑکا اس وقت گودام گیا ہوا ہے۔ وہ دس منٹ میں بنا دیتا۔ میں شروع کرتا ہوں۔ ایک گھنٹے میں مل جائے گی۔ چار آنہ لونگا"۔ "چار آنہ منظور ہیں"۔ کامران کے منہ سے نکلا۔ اور وہ اپنے عارضی مکان کی طرف چل دیا۔ ✓

بیسواں باب

ایک اور نیا عقدہ

کامران جس وقت بڑھے کلو بیگ کے لباس میں شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ کے اندر یکہ سے اترا۔ اور اپنی چھولداری کے طرف چلا۔ تو اوسے بنگلہ کے اندر سے ایک بچنے کی آواز آئی۔ اس وقت کچھ مزدور ادہر ادہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ اور کچھ حقہ پی رہے تھے۔ بوڑھے ٹھیکہ دار کی صورت سے ڈر کر مزدور حقہ چلم بند کرنے لگے۔ لیکن ابھی ان کی نصف دن کی چھٹی میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ ہدایت علی دن کے کھانے سے فراغت پاکر چھولداری سے باہر چارپائی بچھائے حقہ پی رہا تھا جب کامران اوس کے پاس پہونچا۔ تو ہدایت علی نے آہستہ آہستہ بہت سے سوالات کئے۔ جن کے جوابات دے کر کامران نے یہ بتایا کہ وہ کل ۸ بجے صبح کی گاڑی سے سہارنپور جائے گا۔ اور اسی غرض سے اوس نے یکہ والے کو پیشگی کرایہ دے دیا ہے۔ کہ کہیں وقت پر دھوکا نہ دے۔ کامران کے سہارنپور کا ارادہ سنکر ہدایت علی قدرے متردد ہوا۔ اول تو اوسے مزدوروں کے سر پر دن بھر کھڑے رہنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے اُس نے یہ خیال کیا۔ کہ کامران کے چلے جانے پر اس تنگ و تاریک چھولداری میں کوئی آدمی دل بستگی کی باتیں کرنے کے لئے بھی نظر نہ آئے گا۔ بہرحال اُس نے اپنے تردد کو چھپا کر آہستہ سے کہا "اب اس کھدائی کے کام کو مس شکیلہ ہیرنگٹن کے سرڈالو

یہاں خزانہ وزانہ کچھ نہیں۔ اور بہتر یہ ہوگا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن اپنے تمام احاطہ کو کھدوا کر دیکھے۔ کہ یہاں کیا عمارت ہے" کامران نے مسکرا کر ہدایت علی کی طرف دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہا۔" آپ بھی بڑے باہمت آدمی ہیں۔ ابھی سے گھبرا گئے۔ میں سہارنپور سے دوسرے تیسرے روز واپس آتا رہوں گا۔ اور کیا معلوم ہے۔ ایک دو ہی دن کا کام ثابت ہو۔ اس بنگلہ کی ساری کھدائی اور حوض کی تکمیل میری موجودگی میں ہوگی۔ تمہارے خیال کے مطابق میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کہ سارے احاطہ میں پرانی عمارت کی اینٹ پتھر ہیں لیکن تعجب اس بات کا ہے۔ کہ بنگلہ تعمیر کی بنیادوں میں اس قسم کی چیزیں پہلے نہیں نکلیں۔ دوسرا خیال مجھے یہ ہے۔ کہ اب عنقریب ان پتھر اور ستونوں پر گورنمنٹ قبضہ کرنا چاہے گی۔ بہرحال شکیلہ ہیرنگٹن کو چوتھائی قیمت مل ہی جائے گی۔ اور اس سے کھدائی کے اخراجات نکل آویں گے اتنے میں کامران کو سامنے سے عزیزن اپنی طرف آتی معلوم ہوئی۔ جس نے اپنے بشاش اور خوبصورت چہرے کو کامران کی نظروں سے دوسری طرف کر کے کہا۔" کیا ٹھیکہ دار صاحب نہیں آئے۔ مس صاحب تین دفعہ پوچھ چکی ہیں" تین چار مزدور ایک دم سے چلا کر بولے۔ آگئے آگئے" کامران چارپائی سے اُٹھ کر آگے بڑھا۔ اور عزیزن کے بشاش اور تندرست چہرے کی طرف دیکھ کر اوسے شکیلہ ہیرنگٹن کے اون نوکروں کی باتیں یاد آگئیں جن میں سے ایک اپنے آپ کو عزیزن کا شیدا بتلا رہا تھا۔ دراصل یہ لڑکی عزیزن جس کی عمر سترہ سال کی ہوگی کسی بہشتی کی لڑکی تھی۔ جو اسے لڑکپن میں چھوڑ کر مر گیا تھا۔ اور چونکہ یہ بہشتی شکیلہ ہیرنگٹن کے باپ کا پرانا نوکر تھا۔ اس لئے اُس کے انتقال کے بعد مسٹر شفیع احمد مرحوم نے اس لڑکی کو اپنی لڑکی کی طرح پالا تھا۔ اور امیر گھر میں رہنے کے سبب سے وہ اپنی خداداد خوبصورتی کے ساتھ ناز و کرشمہ بھی سیکھ گئی تھی۔

اوس کے چہرے کی گندمی سفیدی مائل تھی - آنکھ ناک ہر طرح درست تھے جسم قدرے کشیدہ مگر سڈول تھا - عمدہ غذا - اور عمدہ مکان کے اثر سے اوس کے بدن میں ایک قسم کی نزاکت آگئی تھی - اور وہ ہمیشہ کپڑے صاف ستھرے پہنتی تھی شکیلہ ہیرنگٹن کو سینا پرونا آتا تھا - جو اوس نے عزیزن کو سکھلا دیا تھا - اور شکیلہ کے بہت سے کپڑے اوس کے بدن سے اوتر کر عزیزن کو مل جاتے تھے - جنہیں وہ ذرا تغیر و تبدل سے ہندوستانی کر لیتی تھی - اس وقت عزیزن کے سر پر گوٹہ پہار چھینٹ کی دھلائی تھی - بدن پر خوبصورت نکلا بی قمیص اور اس کے اوپر شکیلہ کا پرانا سیاہ کوٹ تھا - ٹانگوں میں چھینٹ کا پاجامہ پاؤں میں شکیلہ کے پرانے موزے - اور ایک کام دار پرانا سلیپر بظاہر اسوقت وہ ہرگز بہشتی کی لڑکی نہ معلوم ہوتی تھی - اور نہ اب بہشتی کے گھر میں پڑ کر پرانے طریقہ زندگی کی عادی بن سکتی تھی - عادت دراصل طبیعت ثانی ہو جاتی ہے - اور پھر اوس میں کسی اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی - یہ غریب لڑکی امیر لوگوں میں رہ کر عمدہ کھانوں اور آسائش کے سامانوں کی عادی ہو گئی تھی - اور اب اگر اس کی قسمت اوسے پھر بہشتیوں میں لے جائے - تو اوس کی ننھی سی جان پر ضرور مصیبت آجائے - بہرحال کامران ملازمہ کے پیچھے پیچھے برآمدے میں پہونچا - عزیزن نے اندر جا کر اطلاع کی - دو منٹ کے بعد شکیلہ ہیرنگٹن نے برقعہ اوڑھ کر اوسے اندر طلب کیا - جب وہ سامنے گیا - تو عزیزن پاس کھڑی تھی - اور شکیلہ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکتی تھی - لیکن اس سراغ رساں کی صحبت سے شکیلہ بھی عیاری کے چند سبق سیکھ گئی تھی -

اس نے اپنی دراز سے ایک خط نکال کر کامران کے ہاتھ میں دیا اور کہنے لگی "کلو بیگ میری سہیلی مس جانسٹن کو ایک ہوشیار ٹھیکہ دار

کی میرٹھ میں ضرورت ہے۔ جو ارزاں نرخ پر کام کر سکے۔ میرٹھ کے ٹھیکہ داروں کے نرخ بہت گراں ہیں۔ اگر تم میرے کام سے فارغ ہو کر میرٹھ جانا چاہو۔ تو مجھے مطلع کرنا۔ تم شاید انگریزی جانتے ہو۔ یہ خط انگریزی میں ہے۔

کامران نے اس خط کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ تو رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر تردد کے علامات پیدا ہونے لگے۔ اس نے اپنے دل کی حالت کو مشکل سے ضبط کیا۔ اس عرصے میں شکیلہ نے عزیزن کی طرف دیکھ کر کہا "اچھا ہماری چائے کا انتظام کرو۔ ہم ابھی آتے ہیں" عزیزن کے چلے جانے پر شکیلہ نے کہا۔ اس خط کا کیا مطلب ہے؟ اور کس نے بھیجا ہے؟" کامران نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور بار دیگر خط کو پڑھا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"پیاری مس شکیلہ ہیرنگٹن۔ سننے میں آیا ہے۔ کہ تمہارے دوست مسٹر رفیق احمد کے کسی نے تمہارے بنگلہ کے قریب گولی ماردی۔ اور پولیس کو بلند اختر پر شبہ ہے۔ لیکن اس خط کے ذریعہ سے تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔ کہ یہ کام کسی انگریز کا ہے۔ اور بظاہر تمہارے نانا کا دفینہ بھی اوسی انگریز کے قبضے میں ہے۔ جس کے لئے تم آج کل کھدائی کرا رہی ہو۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔ کیونکہ تم ایسے ویسے آدمیوں کو تو خاطر میں بھی نہیں لاتی۔

راقم تمہارا سچا خیر خواہ ایک "ہندوستانی"

خط کو ختم کر کے کامران نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ کہ کہیں عزیزن تو نہیں آرہی ہے۔ پھر آہستہ سے کہنے لگا "میں کل سہارنپور جاؤنگا بلند اختر کے متعلق پوری تحقیقات کر کے بتاؤنگا۔ کہ یہ خط کس نے لکھا ہے۔ اور اگر خدا کو منظور ہے۔ تو میں وہاں سے واپس آکر رحمت

کے متعلق بھی مفصل عرض کرونگا۔ مجھے نوکروں سے معلوم ہوگیا ہے۔ کہ وہ سہارنپور محلہ کھالہ پار کے رہنے والی ہے۔ مسٹر رفیق احمد سے میں نے ملاقات کی ہے۔ امید ہے۔ کہ مسٹر رفیق احمد کا قاتل پکڑا جائیگا

عزیزان کے داخل ہوتے ہی کامران نے شکیلہ کو جھک کر سلام کیا۔ اور وہ گمنام خط جیب میں ڈالے ہوئے باہر نکل آیا۔

اکیسواں باب

کامیابی کی شاہراہ

رات بھر کامران شکیلہ ہیرنگٹن کے گم شدہ دفینہ۔ رفیق احمد کے حادثہ بلند اختر کے متعلق شبہات اور گم نام خط کی آمد پر غور کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سفر سہارنپور کے فکر میں تھا۔ کہ کہاں قیام کرے گا اور کس طرح بلند اختر سے واقفیت پیدا کرنا ممکن ہوگا۔ بلند اختر تک رسائی پیدا کرنی تو اوس کے لئے چنداں دشوار نہ تھی۔ لیکن سردست سب سے زیادہ تردد اس بات کا تھا۔ کہ اب تک دفینہ کے معاملہ میں قطعی ناکامی رہی تھی۔ اور اب کوئی ذریعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ اوس آدمی کا پتہ لگایا جا سکے۔ جس نے شکیلہ کے نانا کی ساری عمر کی کمائی پر ہاتھ مار کر اوس پر اسرار خط میں بول کے درختوں کی جگہ پیپل بنا دیا تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ گمنام خط کی آمد سے اُسے اپنی تحقیقات کے لئے کچھ کچھ میدان دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اوسے

انگریز لوگوں سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ کہ اوس نے اپنے خاندانی راز کا خط کبھی کسی انگریز کو نہیں دکھایا تھا۔ وہ بارہ بجے رات تک انہی خیالات میں مستغرق رہا۔ ہدایت علی اور بوڑھا باورچی بے فکری کی نیند سو گئے۔ اور وہ چھوٹی سی چارپائی پر پڑا ہوا اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بارہ بجے شب کے اوسے کوٹھی آصف نگر کی طرف سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ اور وہ گھبرا کر دل میں کہنے لگا "اب مجھے سونا چاہیئے۔ کیونکہ سات بجے سویرے اُٹھ کر ریل پر جانا ہے" لیکن اس کے ساتھ ہی اوسے اپنے تکیہ کے نیچے اوس میلی ڈبیہ کا خیال آگیا۔ جس میں اوس روز کی بنی ہوئی کنجی تھی وہ اُچک کر بستر سے اوٹھا۔ اور کنجی کو باحتیاط صدری کی جیب میں رکھ کر اوس نے لال لالٹین کی روشنی میں چارپائی کے نیچے سے ٹرنک کھینچ کر زنانے کپڑے نکالے۔ اور بوڑھے باورچی کی طرف پشت کر کے لحاف کے اندر بیٹھے بیٹھے کپڑے تبدیل کر لئے۔ رات کی سخت سردی اوس کے جسم میں گھسی جاتی تھی۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ گرم لحاف چھوڑنے کے بعد سرد ہلکے کپڑے سوئیوں کی طرح چبھتے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اوس نے برقعہ سر پر ڈال لیا۔ اور اُس کے اوپر سرخ کمل کھینچ کر جوتی پہننے لگا۔ اوس کی آہٹ سے بوڑھا باورچی خبردار ہو کر کھانسنے لگا پھر اوس نے اکڑے ہوئے آدمی کی طرح کراہنا شروع کیا۔ مگر اوس کا سارا جسم پورا لحاف کے اندر ڈھکا ہوا تھا۔ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں بوڑھا ملازم منہ کھول کر اوسے عورت کے بھیس میں نہ دیکھ لے۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر کے لئے چارپائی پر ساکت بیٹھا رہا۔ جب بوڑھا پھر خاموش ہو گیا۔ تو اوس نے لال لالٹین گل کر کے چھولداری کے دروازے کا راستہ لیا۔ اور

آہستہ آہستہ شرقی برآمدے کے آگے سے گذرتا ہوا بنگلہ کے اوس حصہ پر آیا۔ جدہر شکیلہ ہیرنگٹن کا استراحت خانہ تھا۔ پھر بہ سمت جنوب مڑکر غربی برآمدے کے پاس آکھڑا ہوا۔ جدہر شکیلہ کی لائبریری اور شمال رویہ توشہ خانہ تھا۔ بنگلہ کے چاروں طرف اور دور سناٹا تھا۔ کہیں چراغ یا لیمپ کی روشنی نہ تھی۔ وہ روپ سول جوتوں کو اور زیادہ نرم کرکے برآمدہ میں چڑھا۔ اور آہستہ آہستہ توشہ خانہ کے پاس جاکر اور ادہر کان لگاکر سننے لگا۔ کہ کوئی ادہر آتا۔ تو نہیں جب اسے اطمینان ہوگیا۔ کہ ساری دنیا بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ تو اوس نے دھڑکتے دل سے صدری کے اندر سے کنجی نکالی اور دونوں ہاتھوں سے باہنگی قفل کو پکڑکر اوس سوراخ کو دیکھنے لگا جس میں کنجی دی جاتی ہے۔ اس وقت اوس کے دل میں یہ خیال گذرا۔ کہ اگر کسی وجہ سے کنجی نے قفل نہ کہولا۔ تو اوس کی محنت برباد جائے گی۔ اس خیال سے اوس کا دل بہت تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ باوجود اس قدر سردی کے اوس کا منہ خشک ہوگیا۔ اوس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوراخ میں کنجی ڈالی۔ جب وہ اندر چلی گئی۔ تو اوس نے لانبا سانس بھرا۔ پھر اوس نے باہنگی کنجی کو دائیں طرف پھیرا۔ کنجی اس سوراخ میں اٹکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر جب اوس نے خوب زور لگایا۔ تو لیور کھٹکا۔ اور دب کر پھر گیا۔ اور قفل کھل گیا اوس کا دل اضطراب انگیز خیالات سے اُچھلنے لگا۔ اور اُس نے قفل و کنجی کو چوکھٹ کے پاس پختہ فرش پر رکھکر دروازے سے مضبوط اپنی قبضہ باہنگی ہٹایا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کواڑوں کو ذرا پیچھے کرکے اندر گھس گیا۔ کمرے میں بالکل تاریکی تھی۔ اور اوسے اجناس کی بو کے ساتھ ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی طرف سے پیشاب یا پاخانہ کی

بو آرہی ہے۔ اوس نے برقعہ کے دامن سے ناک پونچھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور جیب سے دیا سلائی نکال کھینچی۔ جس کی روشنی میں کمرے کی چیزوں کا عکس آئینے سامنے کی دیواروں پر چڑھتا معلوم دیا۔ اوسی لمحہ میں اوسے معلوم ہوا۔ کہ ایک طرف دس بوریاں آٹے کی رکھی ہیں۔ چند بڑے بڑے دیگچوں میں کچھ اجناس ہیں۔ دائیں جانب دو چھوٹی چھوٹی الماریوں میں گھی چٹنی آچار وغیرہ کے مرتبان ہیں۔ ایک کونے میں چار کنستر مٹی کے تیل کے رکھے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز خالی پڑی ہے۔ جس پر اس وقت ایک بستر نہ ہوا پڑا ہے۔ وہ بستر کو دیکھ کر سخت حیرت میں گیا۔

اوس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بستر کھولا۔ اور اوس کی چادر اٹھا کر بغور دیکھنے لگا۔ چادر بالکل صاف اور ستھری تھی۔ اسی طرح تکیہ کا غلاف بھی صاف اور دل کش تھا۔ اوس نے دھڑکتے ہوئے دل سے تکیہ کو اوٹھایا جس کے نیچے سے ایک موڑا ہوا جیبی رومال دکھلائی دیا۔ اوس نے خوف زدہ نگاہ سے رومال اوٹھا لیا۔ اور دھڑکتے دل سے رومال کو بغور دیکھنے لگا۔ رومال سفید جاپانی ریشم کا تھا۔ اوس کے حاشئے ترپے ہوئے تھے۔ اور ایک کونے پر حرف ڈی (D) دال سرخ ریشم میں لکھا ہوا تھا۔ کامران کا دل اس حرف کو دیکھ کر اوچھل پڑا۔ اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے کہنے لگا۔ حرف دال سے کس کا نام ہو سکتا ہے۔ پھر اوس نے رومال کو سونگھ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور سر اکر کہنے لگا۔ اسمیں لیونڈر کی خوشبو ہے۔ لیکن یہ کون شخص تھا۔ کیا کوئی شکیلہ ہیگزٹن کا آشنا ہے۔ مگر نہیں۔ وہ لڑکی تو بڑی نیک چلن معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب چال بازیاں رحمت کیوجہ سے ہوئی ہیں۔ مجھے سہارنپور جاکر پتہ لگے گا۔ وہ بستر کو طے کر کے میز کے نیچے دیکھنے لگا۔ اس وقت پاخانہ کی بدبو اوسے اپنے ناک کے

قریب معلوم ہوئی۔ اوس نے دوسری دیا سلائی کھینچ کر میز کے نیچے لگا ڈالی۔ تو ایک بڑا پیتی کا پاٹ رکھا ہوا دکھائی دیا۔ کامران نے تیسری دیا سلائی جلا کر پاٹ کے قریب جا کر دیکھا۔ پاٹ غلاظت پیشاب اور پاخانہ سے بھرا ہوا تھا۔ اور غلاظت کا کچھ حصہ پختہ فرش پر پڑا تھا۔ اوس کے ناک میں بدبو اس قدر سما گئی۔ کہ اوس نے بے چین ہو کر فرش پر تھوکا۔ پھر دل میں کہنے لگا "کیا حضرت رفع حاجت کے لئے یہاں آتی تھیں۔ بالکل ناممکن۔ شاگرد پیشہ لوگوں کے لئے تو دو پختہ پاخانے اصطبل کے پاس بنے ہوئے ہیں۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ یہ کہہ کر اوس نے چوتھی دیا سلائی جلائی۔ اور چھوٹی چھوٹی الماریوں کے پیچھے جھانکنا شروع کیا۔ الماریوں کی پشت پر جالے لگے ہوئے تھے۔ مگر اوسے یہاں بہت سے ٹکڑے کاغذوں کے دکھلائی دیئے۔ الماریاں دیوار سے ملی ہوئی تھیں۔ اور اتنی جگہ نہ تھی۔ کہ وہ ہاتھ دے کر کاغذ کے پرزے کھینچ لے۔ اوس نے بہیڑیئے کی طرح اچھل کر ایک الماری کا کونہ میز کی طرف کھینچ۔ پھر گرد اور جالوں کی کچھ پرواہ نہ کر کے کاغذ کے ٹکڑے کو چننے لگا۔ جب اوسے اطمینان ہو گیا۔ کہ سب ٹکڑے اوس کے ہاتھ میں آ گئے۔ وہ دھڑکتے دل سے اٹھا۔ اوس وقت اوس کے چہرے پر پسینہ آ گیا تھا۔ اور پاخانہ کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جھپٹ کر باہر آیا۔ اور قفل کو بہ آہستگی لگا کر دبے پاؤں برآمدے سے اتر آہستہ وہ کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ اپنی چھول داری میں کس طرف سے جاوے۔ کہ اوسے شمالی دیوار کی طرف سے کسی کے جوتہ کی دبی ہوئی آہٹ معلوم دی وہ گھبرا کر چوکنا ہو گیا۔ اور اپنی پشت کے پیچھے دیکھنے لگا۔ اوسے کوئی عورت دو لائی میں لپٹی ہوئی معلوم دی جس نے کامران کو دیکھ کر چیخ ماری۔ اور کامران کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ زمین پر گر پڑی۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ یہ حضرت تھیں اوسنے

اوسے اور زیادہ ڈرانے کے لئے میاؤں میاؤں کرنا شروع کیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بنگلہ کے آہنی پھاٹک پر چلا گیا۔ اور چہار دیواری کے باہر پانی اور گڑھوں میں ٹھوکریں کھاتا کھاتا دیوار کو پھاند کر چھپو ندارہی میں داخل ہوا۔ ان کاغذات کو اوس نے بڑی احتیاط سے ایک رومال میں باندھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ اور جھٹ پٹ کپڑے اوتار کر سونے کے لئے لحاف میں گھس گیا۔ مگر آج اُس کا دماغ بے حد خشک ہو رہا تھا۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے تک پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ جب وہ بے خوابی کے مارے اپنے دماغ میں غصہ اور جنون کی تکالیف محسوس کرنے لگا۔ تو وہ جھلا کر چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ اور لالٹین روشن کر کے ان پرزہ ہائے کاغذ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک گھنٹہ کامل اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا۔ یہانتک کہ اوسے دور کے گھنٹہ سے دو بجنے کی آواز آئی اوس نے دھڑکتے ہوئے دل اور جلتی ہوئی آنکھوں سے پرزوں کو پھر رومال میں لپیٹ لیا۔ اور لالٹین کو گل کر کے اپنے دل سے کہنے لگا "یہ وہ خط ہے۔ جو رفیق احمد کی لائبریری سے وصیت نامہ کے ساتھ گم ہوا ہے۔ لیکن اوس معاملہ سے رحمت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں عجب خلجان میں پڑ گیا ہوں" یہ کہہ کر اوس نے سترنگ لحاف تان لیا۔ اوس کے دماغ میں اوس وقت تین چار الفاظ سرخ انگاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ جو اس نے اس گم شدہ خط سے جمع کئے تھے۔ اور وہ یہ تھے۔ کہ وہ شکیلہ۔ رفیق۔ دیوبند۔ ایک لاکھ۔ اب اس نے دل مضبوط کر کے اپنا سترنگیہ پیر رکھدیا۔ اور مستحکم ارادے سے نیند کو بلانے لگا۔ بہت دیر کے بعد اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اور جب علی الصباح اوسے یکہ والے نے آکر جگایا۔ تو اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ صرف دس پندرہ منٹ سویا ہے۔ اوس نے جھٹ پٹ بوڑھے کولیگ کے کپڑے پہننے شروع کئے۔ اور گھر سے منہ دھو کر جھٹ پٹ ٹرنک

اور بستر تکیہ میں رکھوا کر سہارنپور کے ارادے سے سوار ہوگیا۔ ہدایت علی اور بوڑھا ملازم جاگ گئے تھے لیکن اوس نے کسی سے بات چیت کرنے کی پرواہ نہ کی ۔

بائیسواں باب

ایک دلفریب عورت

کامران کو سہارنپور آئے ہوئے تین روز گذر رہے تھے۔ جہاں اُس نے سرائے میں قیام کر کے محلہ قاضیاں میں اس جگہ مکان لے لیا تھا۔ جہاں بلند اختر رہتا تھا۔ کامران سہارنپور میں بوڑھے کلو بیگ کے لباس میں آیا تھا۔ اور اسی صورت میں گشت لگایا کرتا تھا۔ اوس محلہ میں کوئی عمدہ مکان نہ ملا۔ اور چونکہ بلند اختر کا قرب بھی چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ دوسرے محلہ میں جا کر رہنا خلاف مصلحت سمجھا۔ خوش قسمتی سے بلند اختر کے والد کا پرانا جدی مکان بالکل اوس کے سامنے تھا۔ چونکہ ابھی کامران کھلم کھلا بلند اختر سے دوچار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے دن کا زیادہ حصہ مونڈھے پر گذارتا تھا۔ اوس کے مکان کا دروازہ ایسا کمزور اور بے ڈھنگا بنا ہوا تھا۔ کہ اوس کے سوراخوں سے سڑک کے آنے جانے والے لوگوں کو کامران اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ دروازے کے اوپر کوئی چھت نہیں تھی۔ وہ دھوپ کے نیچے بیٹھا ہوا اخبار یا کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ بلند اختر اور کامران کے مکان میں پچیس گز کا فاصلہ ہوگا اور اس مقام میں پختہ سڑک کی جگہ خام راستہ پر کثرت ریگ تھا۔ دن میں دوچار مرتبہ

کامران سودے سلف کے لئے باہر نکلتا تھا۔ تو وہ اس محلہ میں داخل ہو کر بلند اختر کی صورت دیکھنے کے لئے چوکنا بنا رہتا تھا۔ مگر تین روز تک اوسکی صورت کہیں نظر نہ پڑی۔ لیکن کامران کو اسبات کی طرف سے پورا اطمینان تھا کہ مولوی اشتیاق احمد صاحب کا مکان وہی تھا جس سے کامران کا مکان بیس پچیس گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس نے یہاں کوئی نوکر نہ رکھا۔ اور دونوں وقت نان بائی سے بُرا بھلا کھا خرید کر کھاتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ تین ہی دن میں اوس کا دل بازار کے کھانے سے اُکتا گیا۔ اور سب طرح کی تکالیف اٹھانی پڑیں۔ اوس نے ارادہ کیا۔ کہ لڑکا نوکر رکھ لے مگر یہ سمجھ کر کہ شاید لڑکا اوس کی جاسوسی میں مارج ہو۔ اوس نے اس ارادے کو سردست ملتوی رکھا۔ جب اوسے بلند اختر کے انتظار میں تین دن گذر گئے۔ اور وہ سامنے سے گذرا۔ تو اوسے خیال ہوا۔ کہ شاید وہ بہار پور میں موجود نہیں۔ اور وہ اس روز غروب آفتاب کے بعد اوس کے مکان کی کسی تدبیر سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ بلند اختر کہاں گیا ہوا ہے مگر یوسے صبر نہ ہو سکا۔ اور جس وقت محلہ کی مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اوس نے کچی سڑک پر ایک یکہ آتا دیکھا۔ اوس نے جھپٹ کر کیواڑوں کے سوراخوں سے آنکھیں لگا دیں۔ اور اسے ایک لمحہ میں یقین ہو گیا۔ کہ اس یکہ میں بلند اختر ہی تھا۔ اوس کے خوب صورت خط و خال۔ اور دل کش حلیہ کی شبیہ وہ رفیق احمد کے یہاں سے لے چکا تھا۔ جو اس وقت اوس کے ٹرنک میں رکھی تھی۔ بلند اختر مردانہ کمرے کے آگے یکہ سے اتر پڑا۔ اور ایک چرمی بیگ ہاتھ میں لے کر زنانخانہ کے اندر گھس گیا۔ جہاں سے وہ بار دیگر نکلا۔ اور اوس کے پیچھے ایک بوڑھیا ماما آئی۔ جسے بلند اختر نے اپنا بستر دے کر یکہ والے کی مزدوری ادا کی۔ کامران اپنے سب کام چھوڑ کر اس وقت اسی بیچ بن میں تھا۔ کہ بلند اختر کی نقل و حرکت کا مطالعہ کرے۔ اور جب بلند اختر دیر تک باہر نہ آیا

تو وہ سمجھ گیا شاید اب وہ کہیں نہ جلویگا۔ تاریکی پھیل جانے پر اوس نے مکان کا دروازہ کھول دیا۔ اور بدن پر بھارا اوور کوٹ پہن کر دروازے میں بیٹھا ہوا سگار پینے لگا۔ نصف گھنٹہ کے بعد اوسے سامنے کے مکان میں ایک کھڑکی سے روشنی دکھلائی دی۔ اور اوسے خیال ہوا۔ شاید بلند اختر اس کمرے میں شب باش ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنے مکان میں قفل ڈال کر باہر آیا۔ اور بلند اختر کے مکان کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر سننے لگا۔ آیا بلند اختر اکیلا تھا۔ یا کوئی اور شخص اوس کے پاس موجود تھا۔ مگر اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کمرہ میں دو آدمی باتیں کر رہے ہیں۔ اوس نے ان آدمیوں کی باتوں پر کان لگا دیئے۔ اور ایک منٹ کے بعد یہ آواز کان میں آئی "چلو جی تم گل جان کے یہاں تو روز ہی جاتے رہتے ہو۔ سنا ہے۔ تھیٹر بڑے مزے کا ہے"

"نہیں بھائی گل جان سے چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔ ابھی تو تھیٹر یہاں رہیگا۔ میں کل ضرور جاؤنگا" لیکن یہ بات ناممکن ہے۔ کہ گل جان تھیٹر میں نہ جاوے۔ تمہارا اصلی منشا یہ ہے۔ کہ تم گل جان کے سامنے مجھ سے علیحدہ رہنا چاہتے ہو" تم ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے ہو۔ اگر گل جان تھیٹر میں آئی۔ تو میں تمہیں مل جاؤنگا" تم بھی یار بڑے ضدی ہو۔ خیر ہم بھی دیکھیں گے۔ آپ آج گل جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے آئیں گے۔ یا پیچھے پیچھے" پھر کامران کو کمرے میں سے کسی کے نکلنے کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ اور وہ کھڑکی سے دور ہو کر بجانب شمال چلنے لگا جس وقت کامران مردانہ مکان کے گوشے پر پہونچا۔ جہاں اوپر چڑھنے کا زینہ تھا۔ وہ اوپر سے اوترنے والے آدمی سے دوچار ہوا۔ جس کے منہ میں سگریٹ تھا۔ اور جب اوس نے سگریٹ میں دم کھینچا۔ تو اوس کی روشنی میں کامران کو معلوم ہوا۔ کہ بلند اختر کا نوجوان دوست شکل میں اوس کے بالکل مخالف تھا۔ اس نوجوان کا چہرہ چیچک آلودہ اور سیاہ فام تھا۔ آنکھیں اچھی طرح نہ دکھلائی دیں ناک

پتلی تھی۔ مگر کسی قدر چھوٹی۔ اس شخص کا لباس سیاہ رنگ کا کوٹ پتلون معلوم ہوتا تھا۔ اور سر پر نرکی ٹوپی تھی۔ قد کسی قدر پستہ۔ نوجوان کی صورت دل کش ہونے کی بجائے کسی قدر مکروہ تھی۔ اور اوس کے بشرہ سے ناواقف آدمی خوش ہونے کی جگہ یکایک ڈر سکتا تھا۔ کامران اوس سے آگے نکل گیا۔ تو اوس نے کھڑے ہو کر اوس کی طرف منہ کر کے جھک کر دیکھا۔ پھر بطرف جنوب پھر کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کامران حیرت میں تھا کہ یہ شخص کون تھا۔ اور گل جان کون تھی۔ جس کا ذکر یہ دونوں کر رہے تھے۔ پھر اوسے یاد آگیا۔ کہ رفیق احمد نے بتلایا تھا۔ کہ بلند اختر ایک سال سے کسی رنڈی پر عاشق ہے۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ ضرور گل جان وہی رنڈی ہے۔ وہ لپکا لپکا اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اور طاق پر چراغ روشن کر کے بوڑے سے کلو بیگ کا لباس پھینک کر چند منٹ کے اندر نوجوان کامران بی اے بنگیا۔ بھورے پٹو کے سوٹ پر بھاری سیاہ اوورکوٹ پہن کر اوس نے پرانے اوورکوٹ کی جیب سے پستول نکالا۔ اور چند گولیاں اور چھرے جیب میں ڈال لئے۔ یہاں سے روانہ ہو کر وہ گلی بہ گلی گذرتا ہوا جامع مسجد کے پاس پہونچا۔ پھر بائیں ہاتھ مڑ کر اوس بازار کی طرف چلنے لگا۔ جدھر طوائف آباد ہیں۔ اس وقت بازار میں خوب رونق تھی۔ دونوں طرف آنے جانے والوں کی بہیڑ ہو رہی تھی۔ میلی غلیظ دوکانیں جو دن کو مکروہ معلوم ہوتیں۔ ٹٹکنے والے لیمپ یا مٹی کے تیل کی ڈبیہ کے نیچے بہت سی بدنمائی کو چھپائے ہوئے تھیں۔ دائیں بائیں دونوں طرف چراغوں کی روشنی کا سلسلہ دور تک دکھلائی دے رہا تھا۔ کسی جگہ بنیئے بقال ذرا ذرا سے معاملہ پر چماروں سے اُلجھ اُلجھ کر شور مچا رہے تھے۔ کسی جگہ حلوائی اپنی مٹھائیوں کو چمکدار لیمپوں کی روشنی میں زیادہ دل کش بنانے کی کوشش میں تھے۔ کسی جگہ دو تین اوباش آدمی ایک دوسرے سے مذاق یا ہنسی کی باتیں کر رہے تھے کسی جگہ

چند خورد سال لڑکے گالی گلوچ اور لڑائی دنگہ میں مصروف تھے۔ آگے بڑھکر اوسے مسلمان نان بائیوں کی دوکانوں کے آگے چمک دار برتنوں میں میٹھے اور نمکین چاول رکھے نظر آئے۔ اور جلتے ہوئے چولھے کے اوپر لوہے کے گرم گرم روٹیاں پکتی دیکھیں۔ مگر وہ ان نانبائیوں کی گندم نمائی جوفروشی کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کرکے دل میں کہہ رہا تھا "یہ روپ دار اور دل آویز چاول معدوم نہیں۔ کتنے دن سے طباق بہ طباق ہاتھ بدلتے آرہے ہیں۔ جیسا ان لوگوں کا سالن ہوتا ہے۔ ویسے ہی چاول ثابت ہونگے"۔

نانبائیوں سے گذر کر چند دوکانیں مسلمان میوہ فروشوں کی اوسے دکھلائی دیں جن پر سیب انگور سنگترے۔ نارنگیاں۔ امرود وغیرہ میوے دل فریب طریقہ میں لگے ہوئے تھے۔ ایک گلی کے کنارے پر اوسے کسی خوش الحان رنڈی کے گانے کی آواز آئی۔ گلی کے کونے پر چمک دار لال ٹین جل رہی تھی۔ سامنے سے دو یکے اور ایک فٹن تیزی سے آرہی تھی۔ وہ گلی کی طرف ہٹ گیا۔ پھر اوسے کچھ خیال آیا۔ اور اوس نے میوہ فروش کی دوکان سے ایک پٹاری انگور کی خریدی۔ اور آہستہ سے پوچھنے لگا۔ کیوں صاحب گل جان رنڈی کہاں رہتی ہے۔

نوجوان میوہ فروش نے مسکرا کر کامران کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر غور سے کامران کو دیکھ کر جواب دیا "اس بازار کی نکر پر آپ کو بائیں ہاتھ حویلی ملے گی۔ جہاں لال ٹین لگی ہوئی ہے"۔ کامران پٹاری کے دام دے کر آگے بڑھا۔ اور تنبولیوں وعطاروں کی دوکانوں کو دیکھتا ہوا سیدھا چلا گیا۔ اس بازار میں اب دوکانوں میں اور کوٹھوں پر برابر رنڈیوں کا سلسلہ تھا۔ اور قریب قریب ہر ایک بالاخانہ سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کامران وسط سڑک پر چل رہا تھا۔ کہ اوسے پیچھے سے ایک بائیسکل کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ جھٹ کر بائیں ہاتھ کو ہو گیا۔ پھر اوس نے تیز رفتار بائیسکل

والے کی طرف آنکھ اوٹھاکر دیکھا۔ تو اوس کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ نوجوان آدمی جو اوس وقت سیاہ اوورکوٹ اور انگریزی ٹوپی لگائے تھا۔ نوجوان رفیق احمد کا پھوپھی زاد بھائی بلند اختر تھا۔ جو بظاہر گل جان طوائف کے یہاں جا رہا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد کامران سڑک کے کنارے پر پہونچ گیا۔ جہاں اوسے سامنے چند کھیت نظر آئے۔ پختہ سڑک یہاں سے سیدھی چلی گئی تھی۔ لیکن ایک خام سڑک بجانب غرب جاتی تھی۔ جس کے پاس گندہ نالہ بہ رہا تھا۔ اوسے اس مکان کے محراب دار اور وسیع دروازے پر خوب صورت لالٹین جلتی دکھائی دی۔ وہ ذرا آگے بڑھا۔ تو اوس نے پختہ حویلی سے ملا ہوا ایک بڑا دروازہ کاخام احاطہ دیکھا۔ جس کے اندر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنے اوس کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی اصطبل ہے وہ ڈرتا ڈرتا اس احاطہ میں داخل ہوا۔ سامنے دو کوٹھڑیوں میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ جنوب رویہ لانبے چھپر میں اوسے دو گھوڑے دکھائی دیئے۔ جن کے بدن پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ اور جو بظاہر اوس وقت دانا کھا رہے تھے۔ اوس نے چھپر کے دروازے میں گھس کر غور سے دیکھا کہ آیا سائیس یہاں ہے یا نہیں۔ مگر اوسے اندر کوئی نہ دکھلائی دیا۔ وہ باہر نکل آیا۔ اور سامنے شرق رویہ کوٹھڑی میں اوسے چولہے کی تیز آگ دکھلائی دی۔ جہاں سے کسی نے زور سے پکار کر کہا "کون ہے؟" کامران اوہر بڑھتا چلا گیا۔ اور دروازے پر ایک سائیس چلم پیتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے قریب پہونچکر کامران نے آہستہ سے پوچھا "کیا گل جان کی یہی پختہ حویلی ہے۔ یہ اصطبل کس کا ہے؟" سائیس نے منھ سے چلم ہٹاکر کہا۔ یہ حویلی گل جان بیگم کی ماں امیر جان کی ہے۔ اصطبل بھی انہی کا ہے۔ تمہیں کیا چاہیئے؟"

کامران نے سکراکر جواب دیا "میں گل جان سے ملنا چاہتا ہوں"

سائیس نے جھلا کر جواب دیا "ملنا چاہتے ہو۔ تو حویلی پر جاؤ۔ وہاں نوکر چاکر ملیں گے"

کامران پس و پیش کرتا ہوا پختہ حویلی کے دروازے پر پہنچا۔ اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے دل میں کہا۔ یہ تو رنڈی کا گھر ہے۔ ہر شخص داخل ہو سکتا ہے۔ اُسے کھلے ہوئے دروازے میں کوئی شخص اندر سے آتا ہوا معلوم ہوا۔ جس نے کامران کو دروازے پر دیکھ کر دور سے پوچھا۔ کون ہے؟ کامران جھجک گیا۔ نوکر نے آگے بڑھ کر دروازے کی لال ٹین سے کامران کو بغور دیکھ کر کہا۔ کہئے۔ کیا اندر جائیے گا۔ کامران نے سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ ہاں۔ نوکر نے بڑے نخرے سے جواب دیا اس وقت کھانا چنا جا چکا ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔ کھانے کے بعد اطلاع ہو سکتی ہے۔ کامران کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ کس قسم کی رنڈی ہے۔ کہ اس کے یہاں قوانین و ضوابط کی اس قدر پابندی ہے۔ لیکن اُسے گل جان سے مل کر یہ دیکھنا مقصود تھا۔ کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ اور بلند اختر اُس کے گرد کیوں رہتا ہے۔ وہ مکان کے اندر داخل ہوا۔ جہاں اوسے بائیں ہاتھ کیطرف ایک سہ دری کے اندر میز کرسی فرش و فروش اور ایک چمک دار بڑا لیمپ چھت میں لٹکا ہوا تیزی سے جلتا ہوا دکھلائی دیا۔ دائیں ہاتھ ایک کچی سہ دری کے اندر باورچی خانہ تھا جس کے پیچھے باورچی کے رہنے کا کمرہ معلوم ہوتا تھا نوکر کامران کو بیٹھے ہوئے سہ دری میں آیا۔ اور ایک مکلف آرام کرسی پیش کر کے کہا۔ تشریف رکھئے۔ پھر ایک گول میز پر سے پانوں کے رقاب لا کر کامران کو پیش کئے۔ کامران نے پان لے لیا۔ اور کن آنکھوں سے اس دری کے سامان کو دیکھتا رہا۔ ہر چیز بڑے سلیقہ اور قرینے سے لگی ہوئی تھی۔ اور کل سامان بیش قیمت اور نیا معلوم ہوتا تھا۔ اوسے اپنے سامنے باورچی خانہ میں ایک خورد سال لڑکا ادھر ادھر بھاگتا دکھلائی دیا۔

جو بظاہر چولہے سے گرم گرم روٹیاں اندر پہنچا رہا تھا۔ پھر کامران کی نگاہ باورچی خانہ کے جنوبی دروازے پر گئی۔ جہاں اُسے بلند اختر کی بائیسکل رکھی دکھلائی دی۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ شاید بلند اختر اس رنڈی کا بڑا گہرا دوست ہے۔ اور اس وقت اُس کے ساتھ کھانے میں مصروف ہے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر نے ایک بڑا خوان کامران کے آگے لاکر رکھا۔ کامران نے شب کا کھانا نہیں کھایا تھا لیکن وہ اپنی تحقیقات جلد شروع کرنے اور بلند اختر اور اس رنڈی سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے اس قدر بے تاب ہو رہا تھا۔ کہ دراصل وہ گزشتہ پچھلے تین بیکار دنوں کی کسر آج ہی نکال لینے پر تلا ہوا تھا۔ نوکر تھوڑی دیر کے لئے باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اور کامران تنہا بیٹھا ہوا اس رنڈی کے تزک و احتشام پر غور کرتا رہا۔ دس منٹ کے بعد ملازم واپس آیا۔ اور مستعدی سے کہنے لگا۔ کیا نام بتلاؤں؟ کامران نے متین صورت بنا کر پوچھا۔ کیا تمہاری بیگم پڑھی لکھی ہے۔ نوکر نے ہنس کر جواب دیا پڑھی لکھی؟ ماں بیٹیاں دونوں پڑھی لکھی ہیں۔ بیٹی انگریزی بھی جانتی ہے۔ کامران یہ کلمہ سنکر کچھ مضطرب سا ہوا۔ پھر اپنی جیب سے ایک کورا کارڈ نکال کر بولا۔ اچھا دولت قلم لاؤ۔ ملازم نے دولت قلم پیش کیا۔ تو کامران نے کارڈ پر امداد علی رئیس لاہور۔ لکھ کر نوکر کے ہاتھ میں دے دیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا۔ اور کہنے لگا۔ آیئے سلام بولتی ہیں۔ آپ گل جان بیگم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ تو اس وقت ناراض ہی ہوئیں اُن کی والدہ نے فرمایا۔ کہ نہیں بلا لو۔ کامران دھڑکتے دل کیساتھ اُٹھا اُسے بڑی حیرت اس بات پر تھی۔ کہ یہ رنڈی نوابوں جیسے مزاج کیوں رکھتی ہے۔ وہ ایک بیٹھک دہلیز کے اندر داخل ہوا۔ جہاں ایک لیمپ دیوار پر جل رہا تھا دہلیز کے آگے اسے وسیع صحن دکھائی دیا۔ نوکر جھپٹ کر آگے بڑھ گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ آیئے کامران باہیں ہانہد کو بڑا۔ اور اُسے سامنے خوشبودار پھولوں

..... کے سینکڑوں گملے دکھلائی دیئے۔ جن کے پیچھے رنگ برنگ کے پردوں کے اندر سے تیز لیمپوں کی روشنی زمین پر دور رنگ سرخ اور سبز رنگوں کی بہار دکھلا رہی تھی۔ نوکر نے دروازے کا پردہ ہٹا کر کامران کو اندر داخل کیا۔ جہاں جگمگاتے ہوئے قالین اور بیش قیمت سامان کی دل فریبی سے کامران کا دل سکڑنے لگا۔ اس کمرے کی چھت میں نہایت چمکدار چالیس لائٹ کا لیمپ بہ آب و تاب جل رہا تھا۔ نوکر نے کامران کو نہایت پر تکلف کرسی پر بٹھا کر کہا۔ آپ تشریف رکھئے۔ گل جان بیگم ابھی آتی ہیں۔ کامران بے چینی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور بڑی بے چینی سے اس امیر زادی کا انتظار کرنے لگا۔ دو منٹ کے بعد ایک نوجوان نہایت خوبصورت ہنس مکھ۔ اور لانبے قد کی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی سرتک شال اوڑھے مسکراتی ہوئی کامران کے قریب آئی۔ کامران اس خوب صورت لڑکی کے حسن سے اس قدر مرعوب ہوا۔ کہ وہ کپڑا ہو گیا۔ اور اس کی دل فریب صورت کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھنے لگا۔ نوجوان لڑکی کے پاؤں میں ریشمی موزہ کے اوپر سلمہ اور موتیوں کا سلیپر تھا۔ اور ٹانگوں میں چمک دار ریشمی موزہ معلوم ہوتا تھا۔ گل جان کا بدن کسی قدر دبلا تھا لیکن صورت سے تندرستی اور خوش مزاجی متر شح تھی۔ اس کے ناک میں کوئی زیور نہ تھا۔ ایک ہاتھ اس کا کھلا ہوا تھا جس میں سنہری چوڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نوجوان عورت مسکرائی۔ کامران کو دیکھا۔ پھر فرش کی طرف آنکھیں جھکا کر بولی۔ آپ نے بڑی تکلیف کی۔ کیا آپ ابھی لاہور سے تشریف لا رہے ہیں۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی ضروری کام ہے۔ اس نوجوان دل فریب عورت نے جس وقت رنگین قالین پر نگاہ ڈالی۔ کامران کو اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں اس قدر خوب صورت معلوم ہوئیں۔ کہ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ جی ہاں۔

ابھی آرہا ہوں۔ کیا آپ جیسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معزز دل فریب خاتون سے ملاقات کرنا ہی ضروری کام نہیں ہو سکتا۔ پری چہرہ لڑکی کے دانت تبسم سے کھل گئے۔ جن کے اوپر پان کی سرخ رنگت جھلکی۔ اُس نے ذرا شرما کر اپنے بدن پر شال اچھی طرح لپیٹنے کے لئے ہاتھ باہر نکالے۔ تو لیمپ کی تیز روشنی اُس کی سنہری چوڑیوں پر پڑ کر جھلانے لگی۔ کہ اگر چوڑیوں میں کچھ نزاکت تھی۔ تو اس کے خوب صورت سفید ہاتھ اس نزاکت سے اُٹھتے تھے۔ کہ نوجوان آدمیوں کے دل سینوں میں دہل جائیں خوب صورت عورت نے کامران کو کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر آپ بھی ایک کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگی۔ اگر آپ محض میری وجہ سے تشریف لائے ہیں۔ غریب خانہ موجود ہے۔ بہتر ہے۔ آپ والدہ صاحبہ سے ہی ملاقات کر لیں۔ میرا خیال ہے۔ کہ آپ نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا آپ کا اسباب کہاں ہے۔ کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ آپ میرے قیام یا کھانے کی طرف سے بے فکر رہئے۔ آپ کی صورت ہی بہ نفس نفیس ایک دوات کے برابر ہے۔ میں سرائے میں مقیم ہوں" خوب صورت لڑکی نے مسکرا کر کامران کو دیکھا۔ پھر پاس کی میز پر گھنٹی بجائی جس کی تعمیل میں خورد سال لڑکا اندر سے بھاگا آیا۔ نوجوان گل جان نے تحکمانہ آواز میں کہا۔ دیکھو شجاعت کو بلا کر کہو۔ آپ کے لئے کھانا تیار رکھے۔ پھر متین صورت بنا کر کامران سے مخاطب ہو کر بولی۔ آپ کس سرائے میں ہیں۔ اسباب کے لئے آدمی بھیج دیا جائے۔ آیئے والدہ صاحبہ سے ملاقات کر لیجئے کامران کو اس نوجوان بازاری عورت سے ایسے مہذب اور حیا خانہ برتاؤ کی امید نہ تھی۔ اور نہ وہ اس کے یہاں قیام کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور گھبرا کر بولا۔ آپ میرے قیام کا مطلق فکر نہ کریں۔ آپ کے آرام میں خلل آئے گا۔ میں آپ کی میزبانی کے شکریہ میں کھانے سے انکار

نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف آپ کی محبت کھینچ لائی ہے۔" کل دن کو میں حاضر ہونگا۔ اس وقت نوجوان پری چہرہ لڑکی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس کے لحاظ سے کامران بھی اٹھ کھڑا ہوا اُس کے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ لڑکی نے نگاہ نیچے کر کے جواب دیا جب آپ میری محبت کی کشش میں لاہور سے آئے ہیں۔ تو آپ مجھے کس قدر ہیوفا سمجھیں گے اگر میں آپ کو اپنے یہاں نہ ٹھیراؤں۔ بہتر یہ ہی ہے۔ آپ اپنا اسباب منگا لیں۔ آیئے اندر آیئے۔ کامران اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اور ایک خوبصورت دروازے سے جس کے اوپر موتیوں کی جھالر کا سبز جالیدار پردہ پڑا تھا دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے ابھی کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ کمرے کے ایک گوشے سے بڑے پیانو کے دل کش ترانہ کی آواز آئی۔ اور اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو اپنے آپ کو ایک نہایت مکلف اور چمکدار کمرے میں پایا۔ جس کے وسط میں نہایت شاندار جھاڑ کے بیچ میں موم بتیوں کی دل آویز روشنی چاروں طرف رونق پھیلا پھیلا کر جھاڑ کے بلوری کنگروں میں قوس قزح کے سرخ سبز رنگوں کی بہار پیدا کر رہی تھی اُسے دائیں جانب جنوبی دیوار کے پاس ایک پیانو کے آگے بلند آخر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ وسط کمرے میں ایک مکلف میز کے پاس ایک چالیس سالہ خوب صورت کسی قدر فربہ عورت جنوب کی طرف منہ کئے نہایت بیش قیمت انگریزی آرام کرسی پر لیٹی تھی۔ جس کے سر کے بالوں سے کسی قدر سفیدی کی جھلک سیاہ بالوں کے اندر صاف طور سے چمک رہی تھی۔ نوجوان بیٹی نے آگے بڑھ کر آہستہ سے کہا۔ اماں امداد علی صاحب تشریف لائے ہیں۔ اس کی والدہ نے سر اُٹھا کر کامران کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بولی جناب تشریف لائیے۔ پھر کرسی پر لیٹے لیٹے کامران سے مصافحہ کرنیکے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ کامران ہاتھ ملا کر بوڑھی عورت کے سامنے کھڑا ہوا۔ اُسے

بغور دیکھ کر بولا۔ آپ صاحبوں کو میری وجہ سے ناوقت بڑی تکلیف ہوئی گل جان کی والدہ اس وقت کرسی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور جھوٹے تبسم سے کہہ رہی تھی۔ کہ حضرت کچھ تکلیف نہیں۔ آپ جیسے رئیس زادے عموماً ہر روز آتے رہتے ہیں۔ تشریف رکھئے۔ اتنے میں بلند اختر نے بائیں طرف سر کر کے کامران کو کن آنکھوں سے دیکھا۔ اور مضطرب انگلیاں جلدی جلدی پیانو پر چلائیں۔ جن کے اندر سے چالاک کامران کو یہ آواز سنائی دی۔ کہ نہ لے اپنا ٹھکانا دشمن۔ دوست نادان ہے۔ دانا دشمن" کامران کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو گل جان نے مسکرا کر بلند اختر کو دیکھا۔ اور چلا کر بولی۔ اختر ادھر آؤ۔ ایک معزز آدمی آئے ہیں۔ تم گدھوں کی طرح اپنی دھن میں مصروف ہو۔ اس فقرے سے کامران سمجھ گیا۔ کہ بلند اختر اور گل جان میں بیحد یارانہ اور بے تکلفی ہے۔ اور وہ بلند اختر کی وجیہہ صورت سے اس بات کا متوقع بھی ہو سکتا تھا۔ بلند اختر پیانو کے ران ران۔۔۔۔ کو بلا ختم کئے کرسی سے اوچھل پڑا۔ اور مصنوعی تبسم سے مسکراتا ہوا کامران کے پاس آیا جس نے مہذب صورت بنا کر اس سے مصافحہ کیا۔ اور متین آواز میں پوچھنے لگا۔ جناب کا اسم مبارک" بلند اختر نے مسکرا کر جواب دیا۔ بندہ کو بلند اختر کہتے ہیں۔ جناب کا اسم گرامی۔ کامران کے منہ سے کامران نکلا چاہتا تھا اور اس کے دانتوں سے لفظ کامران ٹکرا چکا تھا۔ کہ اُسے اس کارڈ کا خیال آگیا جس پر وہ امداد علی لکھ چکا تھا۔ اُس کا دماغ چکرا گیا۔ اور وہ گھبرا کر بولا" امداد علی" ادھیڑ عمر کی رنڈی میر جان کو کامران کے چہرے کی لوڑی ہوئی رنگت سے خیال ہوا۔ کہ شاید اُسے بزم حسیناں میں آنے کا پہلا ہی موقعہ ہے۔ یا اُسے کوئی اندرونی مرض ہے۔ مگر وہ بلند اختر کی طرف دیکھ کر بولی۔ اختر آج میں تھیٹر نہیں جانا چاہتی۔ سردی بہت ہے۔ تم اور گل جان چلے جاؤ۔ نوجوان لڑکی اپنی ماں کی بات کاٹ کر بولی۔ نہیں اماں

ہم تین ضرور لے چلیں گے شیریں اور فرہاد کا تماشہ ہے۔ امداد علی صاحب بھی چلیں گے۔ کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کمرے میں آپ کے ہوتے کسی شیریں کی ضرورت نہیں۔ ہاں آپ کے چلے جانے پر ہوگی۔ لیکن میں معافی مانگتا ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ بلند اختر نے پوشیدہ غصہ کی آنکھوں سے کامران کو دیکھا۔ اور وہ دل میں سمجھ گیا۔ وہ بھی گل جان کے غائبانہ فدائیوں میں سے ہے۔ اور اس کا حریف ثابت ہوگا۔ پھر اوس نے اپنی معشوقہ کی طرف نگاہ ڈالی۔ تو وہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے کامران سے کہہ رہی تھی حضرت آپ تو مجھے جانتے ہیں۔ میں تو آپ صاحبوں کی جوتیوں کی خاک ہوں۔ اس کلمہ سے کامران نے جھوٹے تبسم سے دانت پھاڑ دیئے۔ اور وہ دل میں سمجھ گیا۔ کہ باوجود تعلیم اور امیرانہ ٹھاٹھ کے گل جان کے دماغ سے رنڈی کے خون کی بو نہیں گئی۔ پھر اوس نے بلند اختر کی طرف دیکھ کر کہا۔ حضرت آپ تشریف رکھئے نا۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ بلند اختر ایک گہرا سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا امیر جان نے خود مختار میزبانہ کے فرائض مکمل کرنے کی غرض سے گل جان کو متین لہجہ میں کہا۔ آپ کے لئے کھانا منگاؤں۔ یا پہلے چلمچی منگائی جائے۔ اتنے میں شباہت چپکدار انگریزی سینی میں خوب صورت پیالیاں اور پرچیں لگائے ہوئے چائے لے کر داخل ہوا اور بوڑھی عورت کی طرف دیکھ کر بولا۔ حضرت کے لئے کھانا تیار ہے۔ پھر ٹھنڈا ہو جائیگا۔ گل جان نے مستعدی سے کہا۔ اچھا تم کھانا لاؤ چائے میں پلا دونگی۔ نوکر کھانے کے لئے جھپٹا ہوا باہر نکلا۔ اور چھوکرے سے کہتا گیا۔ آپ کے ہاتھ دھلا کر چھوٹی میز آگے لگا دے۔ خورد سال نوکر نے کامران کے آگے میز لگائی۔ باہر سے سلفچی لا کر پاس رکھی۔ اور بہتا گہا باورچی خانہ سے گرم پانی لا کر ہاتھ دھلانے لگا۔ اس اثنا

میں پری چہرہ لڑکی نے شال کو سر سے اتار کر ایک کرسی پر ڈال دیا جس سے اس کی خوب صورت گردن اور بھورے بالوں کی لمبی چوٹی کامران کو دکھائی دی گل جان کے بدن پر سُرخ رنگ کا اونی سوئیٹر تھا۔ اس کے کانوں میں کچھ زیور نہ تھا۔ صرف چھدی ہوئی لو کے اندر بلوری بندے تھے۔ نوجوان لڑکی کو اس قدر نزدیک پاکر جب کامران کو ہارڈ فانوس کی تیز روشنی میں اُسے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ شباب کے اثر سے اس کا خوب صورت ابھرا ہوا سینہ پھڑا پھڑا رہا تھا۔ اور جھاڑ کی روشنی کے آگے اس کے خوب صورت دانت لمبی چمکی ہوئی ناک اور سفید چمک دار سرخی مائل رخسارے بڑی بھوری آنکھیں، مژگاں ایسی خوب صورتی سے لہریں مار رہی تھیں۔ جیسی تیز رفتار پانی کے اندر سورج کی تیز روشنی کے وقت جگمگاہٹ پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ وہ اس رُخِ تاباں کے رعب سے خجل ہو کر جھک گیا اُس نے بھی بہت ہی خوب صورت عورتیں دیکھی تھیں۔ لیکن درحقیقت یہ لڑکی حسن میں بے عدیل تھی۔ اور بلند اختر اگر اسے شمع جمال سمجھ کر پروانہ کی طرح دیوانہ ہو رہا تھا۔ تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ پری چہرہ لڑکی نے خوب صورت نازک ہاتھوں کو بہ نمازہ دادا اوٹھا اوٹھا کر چائے بنائی اور اُس کے ہاتھ کی سنہری چوڑیوں پر جھاڑ کی روشنی منعکس ہو کر ہندوستانی صناعی کا خاکا اوڑانے لگی۔ گو اس کی قیمت چوڑیوں کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہ تھی۔ لیکن موخر الذکر آب و تاب میں اُن سے بدرجہا آگے نکلا ہوا تھا۔ واقعی یہ جرمن کیمیا گر مٹی کو سونے سے زیادہ دل فریب بنا دیتے ہیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ اپنے صناعی سے مٹی کے بدلے ہندوستان کے خزانے بٹور لیتے ہیں۔ گل جان نے ایک ایک پیالی اپنی ماں اور بلند اختر کو دی۔ اور ایک پیالی اپنے لئے بنائی۔ اتنے میں شجاعت گرم گرم لذیذ کھانے لے آیا۔ کوئی متشرع مسلمان رنڈی کے گھر کا کھانا مکروہ

اور ناجائز سمجھتا۔ مگر کامران بہت سے اسلامی عقاید سے منحرف تھا۔ اور دراصل اوسے اوس وقت اپنے موجودہ ارادوں کی تکمیل کی غرض سے بلا مہمان بنے چارہ نہ تھا۔

اوس نے دو چار ہی لقمے منہ سے اتارے تھے۔ کہ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ ایسے مزے دار کھانے ان کو روز روز نصیب نہیں ہو سکتے۔ اور ان کے مقابلے میں اوسے نانبائیوں کے کھانے کا خیال آگیا جس کے اوپر وہ دونو وقت اپنے دام خراب کر رہا تھا۔ اصلیت یہ ہے۔ کہ قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید۔ گل جان نے کرسی سے کمر لگا کر چائے سے فراغت پائی اور اپنی کلائی سے گھڑی دیکھ کر کہنے لگی۔ اوہو۔ نو بج گئے۔ اب تو چلنا چاہیے۔ تماشہ دس بجے شروع ہو جائیگا۔ امیر جان نے مسکرا کر نوجوان بیٹی کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے بولی۔ ابھی گاڑی تیار کرانے میں پندرہ منٹ لگیں گے۔ بسنٹ امداد علی تمہارے مہمان ہیں انہیں پیانو سنا کر خوش کر دو۔ لڑکی نے مسکرا کر کامران کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر ماں سے آہستگی سے کہنے لگی۔ اس وقت میرا دل گانے کو نہیں چاہتا۔ تم بلا سوچے سمجھے حکم دے دیتی ہو۔ مگر اوس کے ساتھ ہی وہ مستعدی سے اُٹھی۔ اور آہستہ آہستہ پیانو کے قریب جا کر کرسی پر بیٹھ گئی بلند اختر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کے منہ کی طرف متوالے عاشق کی طرح دیکھ دیکھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ بظاہر وہ اُس وقت گل جان سے پوچھ رہا تھا۔ کہ یہ امداد علی کون ہے۔ اور اس سے کیوں ملنے آیا ہے۔ مگر نا تجربہ کار گل جان کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ تم کیوں ڈرتے ہو۔ سینکڑوں آدمی آتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے تم سب سے زیادہ پیارے ہو۔ اس کلمہ سے بلند اختر کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ خوب صورت لڑکی کی گردن میں باہنہ ڈال کر

منہ چوم لے۔ مگر حیا مانع تھی۔ وہ دیوار سے کمر لگا کر گل جان کی طرف مضطرب آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جس نے گردن جھکا کر پیانو پر مستی انگلیاں چلائیں اور اُس کے اندر سے ران ران بھان بھان کی آوازیں گرنے بڑنے والی ہوا کے طریقے میں کمرے کے در و دیوار سے ٹکرانے لگیں۔ پھر گل جان کے چہرے پر سرخی پیدا ہوئی۔ اور پیانو کے اندر سے جوش دار آوازوں میں کوئی راگ نکلنا شروع ہوا۔ جسے شوڑی ویزنک تجربہ کار امیر جان کے سوا کوئی نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس کے نغمہ کے اندر ایسا کچھ اثر تھا۔ کہ کامران کا دل اچھل اچھل جاتا تھا۔ اور بلند اختر بے چین۔ [illegible] کو قابو میں رکھنے کے لئے زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ بوڑھی امیر جان آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر پڑی تھی۔ اور اپنی لاجواب دختر کی فنتیابی پر دل کو مسار کیا دے رہی تھی۔ پیانو بجانا بہت سے لوگوں کو آتا ہے مگر یہ سچمچ لڑکی اس کے بے پایاں اوتار چڑھاؤ میں تجربہ کار ملاح کی طرح ماہر تھی۔ پیانو کے نشیب و فراز سے خود اسکی روح عرش علیین اور تحت الثرے کے خوفناک گہرائی تک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں سرخی آرہی تھی۔ اور گرم گرم ہونٹ کھل گئے تھے۔ اسی لمحہ میں بتدریج بڑھنے والی آواز میں کامران کو یہ مصرعہ سنائی دیا۔

قفس میں مجھ نالاں یہ رو کے کہتی ہے

اس مصرعہ کی زیبائش اور رول کش آواز کی مکمل شیرینی اور کھینچ تان سے تمام کمرے کے چپہ چپہ میں ایک قسم کی بیداری پیدا ہوگئی۔ اور موثر پیانو کی ہم سازی سننے والوں کے دلوں پر ٹکریں کھانے لگے۔ خوب صورت لڑکی نے نہایت پر جوش لہجہ میں باقی ماندہ مصرعے ادا کئے

"کرے گا ذبح جو کرتا ہے تو اسیر مجھے"

"کباب شمع کے شعلہ پہ کیجیو صیاد"

"کہ کسی کی نظر آ و سے ہم خیر مجھے"

آخری مصرعہ کے ادا ہوتے ہی تمام کمروں میں سناٹا چھا گیا۔ اور درد بھری آواز سے سننے والوں کے دل بہل گئے۔ امیر جان نے کانپتی ہوئی آواز میں زور سے کہا۔ بس بس۔ شاباش شاباش" لڑکی جھٹ پٹ ہاتھ روک کر پیانو سے اُٹھی۔ اور گرم سرخ چہرہ کو قابو میں کرتی ہوئی ماں کے پاس آکر کامران کا منہ دیکھنے لگی۔ جس نے چمکدار آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔ واقعی صاحب آپ تو گانے میں غضب کی مہارت رکھتی ہیں۔ آپ کو شیریں فرہاد کے تماشے کی کیا ضرورت ہے۔ گل جان نے مسکرا کر بلند اختر کی طرف دیکھا۔ جو اُس وقت اُس کے پیچھے کھڑا تھا شجاعت نے بھاگ کر کہا" حضور گاڑی تیار ہے" گل جان نے دوشکر کھونٹی سے ایک اودنی کوٹ جس پر گوٹا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ اتار کر پہنا۔ اور اس کے اوپر سرخ شال اوڑھ کر ماں کو بڑے ناز سے دیکھ کر بولی۔ اماں تم اُٹھتی ہی نہیں چلو مسٹر امداد علی ہی چلیں گے۔ لیکن بوڑھی تجربہ کار عورت نے آہستہ سے کہا۔ نہیں بیٹی مسٹر امداد علی کسی ضروری کام کے لئے آئے ہیں۔ مجھے ان سے باتیں کرنی ہیں۔ تم اختر کے ساتھ جاؤ۔ خدا حافظ" خوبصورت لڑکی نے گردن جھکا کر غصہ سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر چلا کر بولی" خیر مگر تم میری مرضی بغیر کوئی بات منہ سے نہ نکالنا۔ آؤ اختر اماں بعض وقت ذرا تیزی میں آجاتی ہیں" شجاعت نے ایک ہاتھ سے پردہ اٹھایا۔ اور دونوں عاشق و معشوق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے۔ بلند اختر نے جوش میں آکر گل جان کی گردن میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ مگر اُس نے جھلا کر کہا" ہٹو جی اس واسطے تو میں اماں کو ساتھ لاتی تھی۔ اتنے میں امیر جان نے چلا کر کہا۔ شجاعت ساتھ جائیگا۔ گل جان مسکرا کر بلند اختر کی طرف دیکھ کر بولی ہم کہتے تھے اماں کھڑی ہیں۔ آؤ۔ آؤ۔ دو منٹ بعد یہ دونوں عاشق و معشوق

دھڑکتے ہوئے دل سے دو شاندار گھوڑوں کی فٹن میں سوار ہوئے۔ شجاعت جھپٹ کر کوچبان کے پاس بیٹھ گیا۔ بلند اختر نے مردہ دلی سے گل جان کو دیکھا جس نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ گدھا رونے آگیا۔ اور یہ کہہ کر اپنے خوب صورت گرم گرم ہونٹ بلند اختر کے منہ سے لگا دیئے۔ کوچبان نے گھوڑوں پر باآہستگی چابک لگایا۔ اور جاندار گھوڑے دھاپ دھاپ کرتے آگے بڑھے۔

تیئیسواں باب

خوبصورتی کی قیمت

گل جان اور بلند اختر کے روانہ ہوتے ہی متفکر کامران نے کھانے سے ہاتھ کھینچا۔ اور خورد سال لڑکے نے ہاتھ دھلا کر کھانا بڑھایا۔ ادھیڑ عمر جان نے آرام کرسی کے قریب چھوٹی میز پر پاندان منگا کر چند ٹکڑے پان کے لگائے۔ اور ایک ٹکڑا (بیڑہ) بنا کر مسکرا کر کامران کے آگے پیش کیا۔ کامران نے پان چبا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تو اوسے گول میز کے نیچے ایک بڑا اوگال دان دکھلائی دیا۔ امیر جان کے منہ سے ابھی کیا اوگال دان چابے ہی نکلا تھا۔ کہ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر اوگال دان میں پیک تھوک کر پھر اپنی جگہ لی۔ اس وقت خورد سال لڑکا برتن لے کر ہوئے باورچی خانہ جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ گو کمرے کی انگیٹھی پر خوب صورت جھومر والی [illegible] کے وسط میں پڑے کلاک کا پنڈولم (لنگر) ٹک ٹک کرتا ہوا

امیر جان نے پان اپنے منہ میں رکھ لیا۔ فرش پر نگاہ ڈال کر کچھ سوچتی رہی۔ اس وقت کامران کا دل مچل رہا تھا۔ اور وہ معاملات کا ایسا عجیب و غریب ڈھنگ دیکھ کر بے ساختہ چاہتا تھا۔ کہ یہاں سے نکل کر بھاگ جائے۔ لیکن اول تو اُسے بلند اختر کے متعلق خفیہ تحقیقات کرنی تھی۔ دوسرے اوس وقت خوب صورت گل جان کے حسن سے اس قدر مالوس ہو گیا تھا۔ کہ اوسے موخر الذکر کے گھر کی ہر ایک چیز دل فریب اور کرشمہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ امیر جان کسی زمانے میں حسن کی دیبی سمجھی جاتی ہو گی۔ اور اس کے سنجی مائل چہرے کے خط و خال اس امر کی بخوبی شہادت بھی دے رہے تھے۔ لیکن اُس کے چہرے پر اس وقت شکن مسلط ہو کر اوسے بدصورت بنا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس کے کانوں میں بھاری سنہری بالیاں ایسی بدنمائی سے لٹکی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ناک کی نتھ دوزخی مکھی کی مانند ایسی بری طرح مثبت ہو رہی تھی۔ کہ کامران کو تعجب تھا۔ کہ اس عورت کی دختر حسن و خوب صورتی کی ایسی بے مثیل مثال ہو سکتی ہے۔ اسے اس وقت اس امر کا بھی قطعی علم نہ تھا کہ امیر جان کے پاس اس قدر دولت کہاں سے آگئی۔ کہ وہ بیگمات کی طرح گذر کر رہی ہے۔ مگر اس کا بے چین دل بہت دیر تک منتظر رہنے والا نہیں تھا۔ امیر جان نے فرش سے آنکھ اوٹھائی اور اپنے جسم پر شال درست کر کے بولی۔ مسٹر امداد علی میں تھک گئی ہوں۔ اور بستر پر لیٹنا چاہتی ہوں۔ آپ کچھ باتیں کر سکتے ہیں تو تشریف لائیے۔ کامران اس بوڑھی رنڈی کے ساتھ اس خواب خانہ میں جا کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خیال تھا کہ بلند اختر اور گل جان کی گذر زندگی

کے متعلق کوئی بات معلوم ہو سکے۔ وہ بہت اچھا کہہ کر امیر جان کے پیچھے ہو گیا۔ امیر جان اپنے دائیں ہاتھ شرق رویہ کمرے کے دروازے پر گئی اور پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ اس کمرے میں ابھی کوئی لیمپ نہیں جلایا گیا تھا۔ لیکن ملحقہ کمرے کے اندر سے جھاڑ کی چمک دار روشنی دور تک دروازے میں جا رہی تھی۔ امیر جان نے ایک چھوٹی میز پر چھوٹا سا بانہہ روم لیمپ جلا دیا۔ اور کامران کو ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا کر اپنی مسہری پر بیٹھ گئی۔ کامران نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی اور اسے معلوم ہو گیا۔ کہ دیگر کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی تکلفات سے خالی نہیں۔ کمرے میں دوہٹکڑ زربفت کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جس کے اوپر شمال جنوب رُخ میں دو شاندار مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کے بستروں پر سفید چادر اور تکیوں پر بھاری بھاری لحافوں کی موجودگی میں کسی چیز کی کمی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مسہریاں دونوں یکساں تھیں۔ لیکن ایک مسہری کے جھالر دار تکیہ کے قریب چنبیلی کے تازہ پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ جو بظاہر گل جان کی مسہری تھی۔ امیر جان ذرا تبسم سے "معاف کیجئے گا" کہہ کر لیٹ گئی۔ اور کامران کی طرف دیکھ کر بولی۔ آپ اس مسہری پر قریب آجائیے۔ کامران دھڑکتے ہوئے دل سے گل جان کے نرم بستر پر بیٹھ گیا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ واقعی ایسی نازک اندام لڑکی کے لئے ایسا ہی بستر چاہئے۔ کامران اس وقت فرش پر نگاہ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور دل میں شرمندہ تھا۔ کہ اُس کے فراخ اُسے ایک جاندیدہ ادھیڑ عمر کی رنڈی کے پاس تخلیہ میں نے آئے۔ جہاں اُسے کوئی مہذب آدمی دیکھ لے۔ تو اوسے ڈوب مرنے کو بھی جگہ نہ ملے۔ لیکن اسے اس بات کا اطمینان تھا۔ کہ اوس کا دل بدچلنی اور مکروہ خیالات سے پاک تھا۔ اتنے میں خورد سال

لڑکا ملاقات کے کمرے میں آکر زور سے پوچھنے لگا۔ سرکار چائے کہاں لاؤں۔ امیر جان نے زور سے جواب دیا "اندر لے آ" لڑکے کے آنے پر امیر جان نے کامران کو چائے لے لینے کا اشارہ کیا۔ اور وہ لڑکے کو لینے موجودہ موقع میں خلل انداز سمجھ کر اطمینان سے چائے پینے لگا۔ لیکن اس کی تنہائی بہت جلد شروع ہو جانے والی تھی۔ لڑکا پرچ پیالی لے کر چلتا بنا۔ امیر جان نے لڑکے کو دوبارہ آواز دے کر کہا۔ پانوں کی تھالی یہاں دیتا جا۔ لڑکا جلدی سے تھالی امیر جان کے پاس رکھ کر چلتا بنا۔ اور کامران نے جیب سے سگار نکال کر چاقو سے اس کا کنارہ کاٹا۔ اور چھوٹے لیمپ کے پاس سے دیا سلائی لے کر دھواں اڑانے لگا۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں سناٹا رہا۔ ایک دو دفعہ کامران نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُسے کمرے کے جنوبی حصہ میں ایک پتلی سی دیوار کے پرے غسلخانہ معلوم ہوا۔ اور غربی دیوار میں دو آئینہ دار کھڑکیوں کے پیچھے لوہے کی سلاخ دکھائی دیں امیر جان کے سرہانے ایک دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے سے ملا ہوا کوئی دوسرا کمرہ من مکان کی طرف کھلتا ہے۔ امیر جان نے تھالی اوٹھا کر ایک پان خود کھایا۔ دوسرا کامران کو دیا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ تو آپ لاہور سے محض گل جان کی وجہ سے آئے لیکن اُس کا ذکر آپ سے کس نے کیا۔ کامران نے مردانگی سے امیر جان کو جواب دیا۔ حسینوں کا ہر اک عالم میں شہرہ ہو ہی جاتا ہے۔ امیر جان مسکرا کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ پھر بدن سے شال اوتار اپنے پائنتیں ڈال کر گردن تک لحاف تاننے لگی۔ پھر تپین چہرے سے کامران کو دیکھ کر بولی۔ لیکن اگر آپ کو گل جان کی محبت لاہور سے یہاں کھینچ لائی۔ آپ نے کسی سے وہ شرائط بھی سنیں۔ جو گل جان کے عاشق کو

پوری کرنی پڑیں گی۔ کامران کا دل اچھلنے لگا۔ اور وہ سمجھا شاید کوئی بات اُسے کام کی معلوم ہو سکے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ گھبرا کر بولا۔ "جی نہیں مجھے کسی شرط کا علم نہیں" امیر جان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ سمجھی۔ کہ شاید یہ شخص محض ظاہری ٹیپ ٹاپ سے اسے دھوکا دینے آیا ہے۔ وہ کمرے میں شرقی دیوار کو دیکھ کر بولی۔ گل جان اُس شخص کے نکاح میں آسکتی ہے۔ جو مجھے بیس ہزار روپے نقد دے سکے۔ اور اس بات کا یقین دلائے۔ کہ گل جان کو محبت و پیار سے رکھیگا۔ اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیگا۔ اب تک کئی رئیس زادے مجھ سے درخواست کر چکے ہیں۔ ابھی پرسوں ایک رئیس زادہ جلال آباد سے آیا تھا۔ جو ایک سال سے گل جان کا شیدا ہو رہا ہے۔ اور وہ بیس ہزار روپے بھی لایا تھا لیکن گل جان اُس سے نفرت کرتی ہے۔ پس میں زبردستی نکاح نہیں کرا سکتی" امیر جان یہ کلمہ ختم کر کے کامران کی طرف دیکھنے لگی پھر لمبا سانس بھر کر بولی" مجھے توقع نہیں۔ کہ آپ اس شرط کو پورا کر سکیں۔ علاوہ ازیں گل جان اس لڑکے بلند اختر سے اس قدر مانوس ہے۔ کہ میں خیال کرتی ہوں۔ وہ اس کے سوا کسی سے نکاح کبھی نہ کرے گی پس آپ کے لئے کوئی موقعہ نظر نہیں آتا۔

کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔ میں بیس ہزار کا انتظام کر سکونگا۔ آپ مجھے موقعہ دیجئے۔ کہ میں گل جان پر اچھی طرح اپنا عشق جتا سکوں۔ کیا اس شخص بلند اختر نے بیس ہزار روپے کا وعدہ کر لیا ہے؟ نہیں! مجھے تو امید نہیں کہ بلند اختر بیس ہزار دے سکے۔ لیکن وہ ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا۔ کہ وہ بیس ہزار کا انتظام کر کے آیا ہے۔ پندرہ بیس روز کے اندر ادا کر سکیگا کامران کا دل اس فقرے سے اچھل پڑا۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ یہ عاطفہ فرد بلند اختر

کے گذشتہ کارروائیوں پر کچھ روشنی ڈالیگا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ بلند اختر بالکل غریب باپ کا بیٹا ہے۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کے لئے مولوی شفیق احمد صاحب اب تک بیس روپے ماہوار اُس کی ماں کو دیتے رہے تھے۔ پھر وہ بیس ہزار کہاں سے پیدا کر دیگا۔ وہ سر دست اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ کل گفتگو کا سلسلہ قایم رکھنے کے لئے اس طرح گویا ہوا۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ کہ میں بھی پندرہ بیس روز گل جان کی خدمت میں رہوں۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ اگر گل جان مجھ سے نکاح کرنے پر راضی ہو گئی۔ تو میں شرط پوری کرونگا۔ مگر بیس ہزار کی رقم آپ کیوں مانگتی ہیں۔ یہ رقم گل جان کے نام سے کسی بینک میں کیوں نہ جمع کر دیجائے۔ ادھیڑ عمر امیر جان کے چہرے پر ناراضی کی علامت ہویدا ہوئیں۔ اور وہ ماتھہ اٹھا کر بولی۔ اے ہے آپ کو میرے یا گل جان کے حالات کا تجربہ نہیں۔ میں اکیس سال گذرے میں بھی گل جان کی طرح خوب صورت اور کنواری تھی۔ میرے بھی سینکڑوں دل دادہ تھے۔ اسی زمانہ میں ایک رئیس زادہ الطاف حسین مجھ سے از حد مانوس ہو گیا۔ میری ماں زندہ تھی۔ اور اُس شخص الطاف حسین سے کچھ دلی بغض رکھتی تھی۔ اُس نے لاکھ کوشش کی۔ مگر ماں نے مجھے اس سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ جب میں ماں کو چھوڑ کر اس کی مرضی کے خلاف اپنے عاشق سے شادی کر لینے پر مائل ہوئی تو میری ماں نے سر پیٹ ڈالا۔ اور مجھے سینکڑوں گالیاں اور کوسنے دے دے کر کہنے لگی۔ لونڈیا تو ایک روز دھوکا کھا کر پھر میرے دروازے پر آپڑے گی۔ اس میں تو شک نہیں۔ کہ میں فقیرنی بن کر اپنی ماں کے دروازے پر نہ آئی۔ لیکن بعد کے واقعات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ مرد بڑے بے وفا ہوتے ہیں۔ میں اس رئیس زادے کے

ساتھ ساتھ ایک ہی سال رہی تھی۔ کہ بات بات میں تکرار ہونے لگے۔ اور آخر میں اُسے چھوڑ کر چلی آئی۔ خیریت یہ ہوئی۔ کہ میں نے نکاح سے پہلے اس کا ایک گاؤں اپنے نام لکھوا لیا تھا جس کی بدولت میں اس وقت آرام سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو جاتی۔ اس عرصے میں اس نے تقریباً دس بارہ ہزار کا زیور بھی بنوا دیا تھا۔ لیکن مرد کی آنکھ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اُسی زمانے میں الطاف حسین کی شادی اس کے خاندان میں ہو گئی تھی معلوم نہیں۔ اس کی بیوی نے کیا جادو کر دیا۔ کہ وہ روز بروز مجھ سے متنفر ہوتا گیا۔ اور میں اُس سے طلاق لے کر علیحدہ ہو گئی۔ اس کے بعد سینکڑوں آدمی میرے گرد جمع رہتے تھے لیکن مجھے الطاف حسین سے گہری محبت ہو گئی تھی۔ اور جب اُس نے میرے ساتھ ایسی بے مروتی برتی۔ تو مجھے سب مردوں سے نفرت ہو گئی۔ اور کسی سے نکاح نہ کیا۔

اب گل جان کے سامنے بھی وہی حالت درپیش ہے۔ اور چونکہ وہ محض لڑکی ہے۔ میں بیس ہزار روپے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔" کامران نے امیر جان کے حالات بڑی دل چسپی کے ساتھ سنے۔ اور اس کے خاموش ہو جانے پر بولا۔ بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ لیکن کیا بلند اختر کسی امیر کا بیٹا ہے۔ امیر جان نے سر ہلا کر جواب دیا۔ لاحول ولا قوۃ بالکل غریب آدمی کا لڑکا ہے۔ ابھی کہتا تھا۔ کہ میں روڑکی گیا تھا۔ میرے بھائی نے بیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جو ایک ماہ کے اندر اندر وصول ہو جائیگا۔ میں ایک ماہ اور انتظار کرونگی میں جمال آباد والے رئیس کو سب سے بہتر سمجھتی ہوں۔ اور وہ بیس ہزار دینے پر راضی بھی ہے لیکن گل جان نہیں مانتی۔ اب اگر آپ چاہیں یہاں رہ کر دیکھیں۔ اگر آپ بیس ہزار دے سکیں۔ اور گل جان مان جائے۔ تو مجھے کچھ عذر نہیں

ہیں بلند اختر کو قطعی ناپسند کرتی ہوں۔ وہ ایک سال سے گل جان کے گرد ہے۔ مگر زبانی جمع خرچ کے سوا کبھی ایک دمڑی بھی اس نے گل جان پر خرچ نہیں کی"۔ امیر جان کے آخری فقرہ سے کامران کو اتفاق نہ تھا کیونکہ وہ گل جان کے سراہنے اور چنبیلی کا ہار بلند اختر کا ہدیہ سمجھ رہا تھا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں۔ کہ روپیہ تو روپیہ بلند اختر اپنی جان بھی گل جان کے حوالہ کر دیتا۔ لیکن بوڑھی امیر جان اپنے پرانے حسن و عشق پر خاک ڈال کر بے رحم، درشت دل عورت بن گئی تھی۔ وہ اس وقت محض اپنی دختر کے حسن کو بازار میں فروخت کرنے کے لئے بیٹھی تھی۔ دنیا کے واقعات پر سرسری نظر ڈالنے والے خوبصورتی کو متاع نہیں سمجھتے لیکن دراصل خوب صورتی متاع گراں مایہ ہے۔ کیا عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سونے اور جواہرات میں تول کر نہیں خریدا تھا۔ کیا جہاندیدہ امیر جان گل جان کی قیمت بیس ہزار نہیں بتلا رہی تھی؟ کامران ان باتوں کو سنکر گہرے فکر میں پڑ گیا۔ اُسے اس وقت گل جان کی خدمت میں رہ کر عشق جتانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ لیکن وہ اس دوشیزہ لڑکی سے کس طرح عشق کر سکتا تھا جبکہ اس کے دل میں قدرتی محبت کی کشش نہیں تھی۔ اور نہ وہ بیس ہزار روپے ادا کرنے کی قابلیت رکھتا تھا مگر وہ جس قدر عیاری اب تک استعمال کر چکا تھا اس سے زیادہ مکاری آئندہ حرکات میں درکار تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ جس طرح ممکن ہو۔ بلند اختر کا رقیب بن کر اُس کے اصلی چال و چلن اور دلی جذبات سے باخبر ہو۔ اور ساتھ کے ساتھ اس امر کا بھی تجربہ حاصل کرے۔ آیا گل جان محض سفید گوشت اور سرخ خون کے دل آویزی سے خلقت کے دل بے چین کر رہی ہے۔ یا اوس کے دل میں واقعی کوئی کشش اور قابل رشک جوہر بھی موجود ہے۔ جس کی آب و تاب امیر جان جیسی خبیث

اور بے رحم عورت کے بطن میں رہنے کے باوجود بالکل زائل نہیں ہوگئی ہے وہ ان سب باتوں کو اپنے دل میں جمع کرکے گہرا سانس لے کر بولا "میں آپ اور گل جان دونوں کی خاطر مدارات کا دل سے معترف ہوں۔ اور گل جان کو اپنی زوجیت میں لاکر اپنے آپ کو دنیا بھر کے آدمیوں سے زیادہ خوش نصیب سمجھونگا۔ اس وقت میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ کل کسی وقت حاضر ہونگا۔ کامران نے شیطان نفس امیر جان کو فراشی سلام کرکے دوسرے کمرے کا راستہ لیا۔ اور دو منٹ بعد سڑک پر پہونچ کر سوچنے لگا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا۔ دراصل انسان دنیا کے ہر کام اور مشغلہ میں ہیں دن رات سوچتا رہتا ہے۔ اُس کا بے چین دماغ کبھی اُسے ایک راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ کبھی دوسرے پر لیکن اُسے کسی راستہ پر کامیابی کا پورا یقین نہیں ہوتا صرف امید کے روشن چراغ سے ناکامیابی کی تاریک کھنڈروں میں گرتا پڑتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر جب وہ روشنی نظر سے غائب ہوجاتی ہے۔ تو اپنے آپ کو اُس جگہ پاتا ہے۔ جہاں سے چلا تھا چابک دست کامران کو کل کی بابت کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ کیا پیش آنیوالا ہے وہ محض امید کے سہارے پر منہ اوٹھائے چلا جا رہا تھا۔

چوبیواں باب

قاتل خود بول اٹھا

جس وقت کامران اپنے خستگی و تاریک خس پوش مکان میں داخل ہوا تو اُس نے طاق پر چراغ روشن کرکے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ بس

میں ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ وہ امیرجان سے رخصت ہو کر دو میل کی مسافت بڑی سردی میں طے کرکے آیا تھا۔ اور تھک کر گرم بستر اور لحاف میں گھس جانا چاہتا تھا۔ لیکن گذشتہ تین گھنٹوں کے اندر اُسے چند ایسی عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ کہ تکان کے سوا کوئی بات نیند کی طرف متوجہ کرنے والی نہ تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے خوبصورت لڑکی کا تبسم چہرہ لازوال ناز و کرشمہ کے اندر اُس سے کہہ رہا تھا۔ تو کیسا مرد ہے۔ کہ خوبصورت عورت کی اداؤں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور بلند اختر کا خوبصورت لیکن عیار چہرہ اُسے نفرت آمیز آنکھوں سے دیکھ کر قتل کی دھمکی دے رہا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات تھی۔ کہ امیرجان نے اپنی خوب صورت بیٹی کو بیس ہزار روپے کے بدلے فروخت کر ڈالنے کی نیت رکھی تھی۔ اور اس سے زیادہ ناقابل فہم یہ امر تھا۔ کہ بلند اختر باوجود اوس بے بضاعتی اور خانگی افلاس کے بیس ہزار روپے پندرہ روز کے اندر پیدا کر دینے کا وعدہ امیرجان سے کر چکا تھا۔ اس کے دل میں آیا۔ کہ وہ رات کی گاڑی سے روڑکی جاکر رفیق احمد سے ملے۔ اور اس سے دریافت کرے۔ آیا اُس نے بلند اختر کو بیس ہزار روپے دے دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن سانتہی اُسے یہ بات یاد آگئی کہ رفیق احمد کے پاس بیس ہزار ہرگز موجود نہیں۔ اس کے والد کا ترکہ بینک آف بنگال آگرہ میں جمع تھا۔ جسے وہ شکیلہ کے حسن و ضد کی قیمت سمجھ کر مدرسہ عربی دیوبند کو دے دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ یہ بات دوسری تھی۔ کہ تین دن کے عرصے میں کوئی اتفاقیہ امر ایسا پیش آگیا ہو۔ کہ رفیق احمد نے اپنا ارادہ تبدیل کر کے شکیلہ ہیگزمن کو یک لخت بھلا دینے پر کمر باندھ لی ہو۔ مگر اُسے بسبیل تذکرہ اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔ کہ رفیق احمد اور شکیلہ کی محبت اس حد پر پہونچ گئی تھی۔ جہاں سے اصلی حالت پر واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ وہ ان دونوں کی شادمانی اور زندگی کے لئے نکاح ضروری سمجھ رہا تھا۔ اور نکاح کیلئے ایک لاکھ کی رقم کثیر لازماً

رفیق احمد کے ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بلند اختر کے موجودہ پولیس کے شبہ ت اور وصیت نامہ وخط کی گم شدگی سے اس امر کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ رفیق احمد ان سب باتوں کو آناً فاناً فراموش کر کے بلند اختر کے پاؤں پڑنے کے باعث بیس ہزار روپیہ دینے پر تیار ہو جائے۔ ان سب باتوں سے زیادہ مضبوط اور عاقلانہ خیال یہ تھا۔ کہ رفیق احمد اپنے والد کے ترکہ کو سردست اپنے قبضے میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ اس کے والد کی وصیت نامہ کے متعلق ابھی گورنمنٹ ۶ ماہ تک فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ گورنمنٹ حسب منشائے قوانین اخبارات میں اشتہار دے کر اس امر کی طرف سے اطمینان کر لیتی ہے۔ آیا ترکہ میں کوئی دوسرا حصہ دار یا دعوی دار تو نہیں۔ پھر پندرہ بیس روز کے اندر بلند اختر بیس ہزار کہاں سے لا سکتا تھا۔ یہ بات کامران کو سراسر لغو و بیہودہ معلوم ہوئی۔ اور اوس کے متعلق مزید کیفیت معلوم کرنے کی اُس نے ضرورت محسوس کی۔ اُس نے چھپر کے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار کر پلنگ پر ڈال دیئے۔ اور زنانہ کپڑوں پر برقعہ اوڑھ کر باہر نکلا۔ دو تین چیزیں جو وہ اپنے پیشے کے لئے از حد ضروری سمجھتا تھا۔ کوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں ڈال لیں۔ اور انگریزی جرنہ کی جگہ ایک زنانہ پرانا جوتا پاؤں میں پہن لیا۔ اُسے انگریزی کے خیال سے موزے ضروری معلوم ہوئے۔ لیکن وہ اس وقت ایک غریب عورت کے بھیس میں نکلنا چاہتا تھا۔ اس لئے موزے اُتار نے پڑے۔ چراغ کو طاق پر رکھکر اُس نے چھپر کی طرف دیکھا اور ٹگ و پھونس کا قرب دیکھ کر فوراً پھونک ماردی۔ قفل لگا کر وہ جلدی جلدی جوتوں کو گھسیٹتا ہوا گلی گلی گذرتا جامع مسجد کے قریب پہنچا جہاں اُسے ایک کانسٹیبل نظر آیا۔ وہ کانسٹیبل سے بات کرنی نہ چاہتا تھا۔ لیکن اُسے یہ بات معلوم نہ تھی۔ کہ تھیٹر کس جگہ ہے۔ پس وہ سڑک پہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اور کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر نہایت نرم اور بے

آواز سے پوچھنے لگا۔ اے بھائی پاسبان ناٹک گھر کہاں ہے۔ میرا بچہ ضد کر کے تماشہ دیکھنے گیا ہے۔ میں اُس کے مارے کڑھ رہی ہوں۔ کہیں راستہ نہ بھول جائے۔ دس برس کا بچہ اور یہ اندھیری رات"۔

کانسٹبل عورت کی کشش سے قریب آیا۔ اور مستعدی سے بولا" تو کیا تم لڑکے کو لینے تھیٹر جاؤ گی۔ کامران کا دل اُچھل کر سینے میں پھرنے لگا۔ اُس کا غصہ خشک ہو گیا۔ اور وہ دل کو قابو میں کر کے بولا۔ ہاں بھائی سپاہی غریب بیوہ ہوں۔ ایک یہی لڑکا ساری عمر میں دیکھا ہے۔ کیا کروں ناٹک گھر جاؤں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ ذرا راستہ بتلا دو"۔ کانسٹبل نے بہ جانب جنوب سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سیدھی چلی جاؤ۔ ریل کا راستہ پوچھ لینا۔ پکی سڑک کے کنارے تھیٹر ہے۔ خدا تیری عمر دراز کرے"۔ کہہ کر کامران پختہ سڑک پر پڑ لیا۔ اور کانسٹبل سے دس بارہ گز آگے نکل کر اطمینان سے سانس لیا۔ اس وقت بازار میں زیادہ دوکانیں بند پڑی تھیں۔ ایک آدھ حلوائی یا تنبولی دو لالٹین میں سکڑا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ کامران بلڈاگ کتے کی طرح گرتا پڑتا۔ ناک کی سیدھ چلا گیا۔ اور ریلوے اسٹیشن کا راستہ اُسے بخوبی معلوم تھا۔ شہر سے باہر نکل کر کچی سرائے کے پاس جہاں گندہ نالہ کا پل ہے اُسے دور سے لیمپ اور مشعلوں کی روشنی دکھلائی دی۔ پھر انگریزی ڈھول کی آواز اس کے کان میں آئی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ اور پچاس ساٹھ گز آگے نکل کر مطمئن ہو گیا۔ کہ جہاں سے یہ روشنی اور ڈھول کی آواز آ رہی ہے وہ ہی تھیٹر تھا۔ قریب آ کر اس نے تیز روشنی کے آگے ایک بڑے تختہ پر سرخ کپڑے کے اندر موٹے موٹے سنہری حرفوں میں شیریں و فرہاد لکھا دیکھا۔ اس سے آگے ایک چھپر میں ایک نوجوان شوقین مزاج مسلمان منشی ایک میز کے آگے روپے پیسے کے بکس پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ میز پر ایک دیوار گیر دی خوب دھواں چھوڑ چھوڑ کر جل رہی تھی۔ اور لیمپ کے

اس دوسرے بکس میں بظاہر تھیٹر کے ٹکٹ تھے۔ کامران نے اپنے آگے پیچھے دیکھا۔ تو اُسے تھیٹر کے دروازے پر چند گاڑیاں اور یکے کھڑے دکھلائی دیئے۔ اس وقت تھیٹر کے اندر ایک دم سے ہائے وہو کی آوازیں آنے لگیں کامران ڈر گیا۔ کہ اس چیخ و پکار کا کیا مطلب ہے۔ پھر اُسے آگ آگ پانی پانی کی آوازیں سنائی دیں۔ اور ایک دم سے تھیٹر کے اندر سے آدمی بے تحاشہ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ تماشہ دیکھنے والے چاروں طرف کی ٹٹیاں توڑ توڑ کر باہر نکلنے لگے۔ اور ایک گوشے سے کامران کو اسٹیج کے پردوں میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن ایک دم سے اُسے سینکڑوں آدمی اپنی طرف بھاگتے نظر آئے۔ جن کے دھکوں کا کامران نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کر کے کہا "ارے بھائیو۔ تمہارا خدا بھلا کرے۔ غریب بیوہ پر اس طرح مت گرو" اس عرصے میں پولیس کے کانسٹبلوں نے زور زور سے سیٹیاں بجانی شروع کیں۔ اور پولیس کا بڑا عملہ اسٹیج پر پہنچ گیا۔ لیکن خلقت کا خوف وہراس کسی قدر قبل از وقت اور غیر ضروری تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ سامنے کے سب پردے جل کر راکھ ہو گئے اور آگ کا دھواں تیز شعلوں کے اندر لمبی لمبی بلیوں سے ٹکرانے لگا تھا۔ لیکن تھیٹر والوں کے پاس بڑی مقدار پانی کی تھی۔ وہ ایک دفعہ آگ کا پہلے بھی مقابلہ کر چکے تھے۔ پانی کے سینکڑوں گھڑے ایک دم سے موقعہ پر پہنچ گئے اور دو منٹ کے اندر تمام اسٹیج کے تختے پانی اور راکھ سے سیاہ پڑ گئے۔ تھیٹر والوں نے بھاگ بھاگ کر چاروں طرف سے تھیٹر کو گھیر لیا اور قلیوں اور پولیس کی مدد سے آگ جلدی بجھ گئی۔ لیکن خلقت کا انبوہ کثیر باہر کے صحن میں اس قدر جمع ہو گیا تھا۔ کہ ہاؤسوں کے اندر کان پڑی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اور آدمی بجائے اس کے کہ اپنے

اپنے گھروں کو جائیں۔ تماشہ کے اشتیاق اور خوف کی منظر کی کشش سے احاطہ کی زمین پر کھڑے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ سب کا منہ تھیٹر کی طرف تھا۔ آگ بجھ جانے پر پولیس والے باہر نکل آئے۔ اور خلقت کو مخاطب کر کے کہنے لگے "جاؤ اب شور مت کرو۔ آگ بجھ گئی۔ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ آج کا تماشہ موقوف۔ بہت سے شوقین مزاج محض مذاق کی خاطر بول اُٹھے۔ ہمارے دام واپس کر دو۔ اس کلمہ پر بہت سے آدمیوں نے قہقہے لگائے۔ اور بہت سے لوگوں نے زور زور سے چلا کر کہا۔ ہاں دام دام" اور اس وقت چیخ و پکار کے مارے تمام میدان گونج گیا۔ سینکڑوں آدمیوں نے خواہ مخواہ کا شور بلند کرنے کی خاطر مرغ یا گیدڑوں کی بولیاں بولنی شروع کر دیں۔ اور تھیٹر کا صحن اچھا خاصہ چڑیا خانہ ہو گیا۔ لیکن پولیس کے کانسٹبل اپنی آنکھوں کے سامنے اس قسم کی بدتہذیبی گوارا نہیں کر سکتے۔ پس ایک دم سے خلقت کے اوپر ڈنڈے بجنے شروع ہوئے۔ اور چلو چلو کی آوازیں ہوا میں گونجنے لگیں۔ اس وقت سینکڑوں آدمی ریل کی طرف سے تھیٹر کی مدد یا محض تماشے کی غرض سے ادھر آ نکلے تھے۔ اور آنے جانے والے آدمیوں کی بھیڑ میں کندھے سے کندھا چھلنے لگا تھا۔ اس تھیٹر میں بہت سی رنڈیاں اور خانگی عورتیں بھی تماشہ دیکھنے آئی تھیں۔ بدمعاشوں نے موقعہ پا کر دو چار عورتوں کو ستانا شروع کر دیا۔ اور کامران کو خانگی مگر دریدہ بدچلن عورت سمجھ کر گھیرا۔ مگر کامران دل میں ہنس ہنس کر خوب مقابلہ کرتا رہا۔ مگر وہ دوسری عورتوں کی ذلت اور پریشانی کے خیال سے ان بدانجام آدمیوں کی حرکات پر ضرور غصہ کر رہا تھا۔ اسی حالت میں کامران کو ایک طرف سے ہائے میری چنپا کلی۔ ہائے میری چنپا کلی کی آوازیں سنائی دیں۔ تمام لوگ ایک نوجوان رنڈی کے گرد جمع ہو گئے جو چلا چلا کر کہہ رہی تھی

میں لٹ گئی۔ ہائے میری سونے کی چڑیا گئی۔ خلقت کے اژدہام کو وہیں چھوڑ کر پولیس والوں نے چور کو گرفتار کرنے کے ارادے سے تعاقب شروع کیا۔ اور ایک دم سے تھیٹر والوں کے مشعلوں کے سامنے سینکڑوں آدمی اس رنڈی کی مصیبت کا تماشہ دیکھنے لگے۔ جو رو رو کر سر پیٹ رہی تھی یہ عورت ۱۹۔ بیس سال کی ہوگی۔ اس کے پیچھے اس کی نائکہ کھڑی رو رہی تھی۔ اور خلقت کو رحم آرہا تھا۔

رنڈی کچھ بری صورت کی نہ تھی۔ البتہ اس کا جسم بہت زیادہ فربہ تھا۔ اور ناک اور کان زیور سے بھرے ہوئے تھے۔ اتنے میں اس رنڈی کے ملازم دوسری جانب سے نکل آئے۔ اور اوسے تشفی و تسلی دے کر لوگوں کو ہٹانے لگے۔ لیکن اس روز یہ رنڈی خوب مشتہر ہوگئی۔ کامران بھی کھڑا ہوا تماشہ دیکھتا رہا۔ اوسے اس بھیڑ بھاڑ میں گل جان اور بلند اختر کی تلاش تھی۔ یہ مردوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور اژدہام کے آخیر میں اسے گل جان بلند اختر کا ہاتھ پکڑے گھبرائی ہوئی نظر آئی۔ بلند اختر بھی اس ہنگامہ کو منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ ایک مشعل کی روشنی گل جان کے چہرے پر اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ اور کامران کو اس کی خوبصورتی اس ہنگامہ میں دوبالا ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ دوشالہ اپنے سر تک اوڑھے ہوئے تھی۔ اور ایک ہاتھ سے دوشالہ کا کنارہ تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے بلند اختر کو مضبوط پکڑ رکھا تھا۔ بلند اختر نے گل جان کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ کامران عورتوں کی طرح جوتیوں کو گھسیٹتا ہوا ان کے پاس آیا۔ تو گل جان نے برقعہ پوش عورت کو دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ یہ کم بخت خانگی عورتیں برقعہ اوڑھے تھیٹر میں آتی ہیں بلند اختر نے مسکرا کر کامران کی طرف دیکھا۔ پھر بھیڑ بھاڑ کی طرف نگاہ پھیری۔ کامران گل جان کے دائیں ہاتھ پر آیا۔ تو اوسے بلند اختر

کے بائیں ہاتھ پر ایک نوجوان آدمی معلوم ہوا۔ بظاہر وہ بلند اختر کا وہ دوست تھا۔ جو بعد از غروب آفتاب کے مردانہ مکان میں ٹھیٹر اور گل جان کے متعلق ۔ باتیں کر رہا تھا۔ اب تھوڑی دیر کو ان کے پاس گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے اس نوجوان کو برقعہ کی جالی سے بغور دیکھنا چاہا اتنے میں اس شخص نے بلند اختر کی آستین پکڑ کر کہا۔ علیو یار تماشا کب تک دیکھو گے۔ بلند اختر نے مسکرا کر باہستگی گل جان سے پوچھا اب چلیں۔ گل جان برقعہ پوش کامران کی طرف دیکھ کر جھجک گئی۔ پھر آہستہ سے بولی چلو" جب گل جان اور بلند اختر شمال کی طرف مڑے۔ تو کامران کو اُن کے پیچھے شجاعت کا سرخ دوپٹہ نظر آیا کامران لپک کر ان کے پیچھے ہو لیا۔ اور جب یہ لوگ گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ تو اس لال ٹین کی روشنی میں بلند اختر کے ساتھی نوجوان کا چہرہ غور سے دیکھکر اطمینان کر لیا۔ کہ وہ وہی شخص تھا۔ جسے وہ اول الذکر کے مردانہ مکان میں گفتگو کرتے سن چکا تھا۔

کوچبان نے مغرب کی طرف آہستہ آہستہ گھوڑے پھیرے۔ اور بچو بھائی بچو" کہتا ہوا گاڑی ہانکنے لگا۔ کامران گاڑی کیساتھ ساتھ جا کر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ بلند اختر گل جان کو پہنچا کر اس نوجوان دوست کیساتھ کہاں جائیگا۔ اُس نے بڑے جھگڑے کرایہ پر ایک یکہ کرایہ کیا۔ اور جھٹ پٹ فٹن کے تعاقب میں ہو لیا۔ یکہ والہ کو تعجب تھا۔ کہ خانگی عورت گل جان رنڈی کے گھر کیوں جاتی ہے لیکن مثل مشہور ہے۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اوسے وہاں بدچلن مرد باسانی مل جاتے ہونگے۔ دس منٹ بعد یکہ فٹن کے پیچھے پیچھے گل جان کی حویلی کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں فٹن کے سرخ لال ٹین کامران کو دکھائی دیئے۔ اس نے حویلی

سے پچاس گز کے فاصلے پر یکہ روک لیا۔ اور روپے کے ساتھ یکے
انز کر یکہ بان کا کرایہ ادا کیا۔ یکہ والے نے ۲ر کی جگہ ۶ روصول کر کے ہنسی
خوشی واپس مڑا۔ اور کامران ڈرتے ڈرتے فٹن کی طرف چلنے لگا
اُس وقت فٹن ٹھہری ہوئی تھی۔ بظاہر تینوں آدمی گاڑی سے اُتر
رہے تھے۔ پھر کامران کو فٹن کی حرکت معلوم ہوئی جس سے اسے
خیال آیا۔ کہ وہ اصطبل جا رہی ہے۔ اور اوس لمحہ میں فٹن کی روشنی
اس کی نظر سے غائب ہوگئی۔ اس وقت وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ بلند اختر
گل جان سے رخصت ہو کر اپنی بائیسکل پر گھر جائیگا۔ اور شاید اس کا
دوست بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ کامران دروازے پر جا کر ان لوگوں کی باتیں
سننے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ پختہ حویلی سے دس گز
کے فاصلے پر ایک گلی کے اندر کھڑا ہوگیا۔ اور اضطراب کیساتھ بلند اختر
کی واپسی کا انتظار کھینچنے لگا۔ لیکن اسے بہت دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ ایک
سمت کسی اور جگہ پر پاسبان نے ڈوبتی ہوئی آواز میں چلا کر کہا۔ جاگو
بھائی جاگو۔ اور اُس وقت اُس کے کان میں قہقہہ کی آواز آئی جس سے
وہ سمجھا۔ کہ بلند اختر اور اس کا دوست اس طرف کو آ رہے ہیں۔ اس
وقت اس کا دل زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ وہ سکڑ کر نالی کے
پاس اس طریقہ سے بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی پیشاب کر رہا ہو۔ اُس نے
دائیں طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو بائیسکل کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے
اپنے دوست سے باتیں کرتا آ رہا تھا۔ یہ دونوں اپنی باتوں میں ایسے منہمک
تھے۔ کہ انہوں نے کامران کی طرف آنکھ اوٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور سیدھے
نکلے چلے گئے۔ ایک منٹ کے بعد کامران گلی سے نکلا۔ اور اسے پاسبان
کی آواز اس محلہ میں بہت قریب سنائی دی۔ وہ گھبرا کر پختہ سڑک پر آیا
اور آہستہ آہستہ دونوں نوجوانوں کو نگاہ کے سامنے رکھتا ہوا آگے

بڑھا۔ اسے خیال تھا۔ کہ شاید بلند اختر بائیسکل پر چڑھ کر اپنے دوست سے رخصت ہو جائیگا۔ مگر وہ بدستور پیدل چل رہا تھا جس سے کامران نے نتیجہ نکالا۔ کہ شاید یہ دونوں ایک ہی مقام پر جا رہے ہیں۔ گل جان کی حویلی سے سو گز جا کر دونوں نوجوان ایک گلی میں مڑ گئے۔ جدھر سے کامران اب تک نہ گذرا تھا۔ اور اس محلہ سے ناواقف تھا۔ کامران ان دونوں دوستوں سے چالیس پچاس گز پیچھے رہا۔ اور اس نے اپنی نگاہ سے ان کو اوجھل نہ ہونے دیا۔ ایک بڑے مکان کے دروازے پر جہاں میونسپلٹی کی لال ٹین لگی ہوئی تھی۔ اُسے وردی میں ڈھکا ہوا ایک کانسٹیبل ملا۔ جس نے سر پر بھاری باراں کوٹ کا دامن ڈال کر کانوں کو سردی سے بچا رکھا تھا۔ کانسٹیبل اُسے خوب غور سے دیکھ کر بولا۔ کون ہے؟ کامران نے دبکتے دل سے جواب دیا۔ یہ بلا کر لائے ہیں۔ جو آگے جا رہے ہیں۔ کانسٹیبل اُسے بدچلن عورت سمجھ کر اس کی طرف حریصانہ نظر سے دیکھنے لگا۔ مگر کامران نے کچھ پرواہ نہ کی۔ اور اپنے بے فکر دوستوں کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد یہ گلی بھی محلہ سے جا ملی۔ جہاں بلند اختر اور کامران کا گھر تھا۔ کامران گلی کے کونہ پر ٹھیر گیا۔ اور بلند اختر کے مکان پر نگہ جمائے رہا۔ دونوں آدمی شب کی تاریکی میں صاف نظر نہ آتے تھے۔ کامران کو ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ تھوڑی سی دیر بعد دونوں اس کے نظر سے غائب ہو گئے۔ وہ لپکا لپکا اپنے گھر کے دروازے پر آیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قفل کھول کر اندر گھس گیا۔ ایک منٹ بعد اسے سامنے کے مکان کی کھڑکی میں روشنی دکھائی دی۔ وہ سمجھا۔ کہ شاید بلند اختر اپنی بائیسکل گھر میں رکھنے گیا تھا اور اپنے دوست کو مردانہ مکان میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جھٹ پٹ زنانہ کپڑے اتار ڈالے۔ اور بوڑھے کلرک کا روپ بنانے کے لئے سفید

ڈاڑھی اور مونچھیں لگالیں۔ لیکن اس وقت اُسے ایک خیال آگیا۔ اُس نے طاق سے ایک پڑیا سیاہ کاجل کی اٹھائی۔ اور اپنی پیشانی اور رخساروں کو خوب سیاہ کرلیا۔ بجائے پشمینہ کی کلاہ اور صافہ کے اُس نے سر پر گنواروں کا سا دوپٹہ باندھ لیا۔ اور بجائے اوور کوٹ کے اپنے پلنگ کی چادر اوڑھ کر چھپر میں آیا۔ اور قفل ہاتھ میں لے کر باہر نکل آیا۔ اس نے قفل لگا کر سامنے کے مکان کی طرف دیکھا۔ تو اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ بلند اختر کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہوئے اوپر چڑھ رہا ہے۔ مردانہ حصہ مگر دوسری منزل میں نہ تھا لیکن وہ سطح زمین سے اتنی بلندی پر واقع تھا۔ کہ اوپر چڑھنے کے لئے پختہ زینہ بنا ہوا تھا۔ اور دریچہ کی جس کے اندر سے کامران کو روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سطح زمین سے سے پانچ فٹ بلند تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ تھوڑی دیر تک اُسے کچھ سنائی نہ دیا۔ لیکن چند لمحہ کے بعد کچھ کھانسی کی آواز آئی۔ جس کے بعد اُسے پانچ ہزار سنائی دیا اس نے کھڑکی سے سر لگا دیا۔ اور یہ آواز آئی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ ایسی ذراسی بات پر رفیق نے پانچ ہزار دیدیئے ہوں مگر یہ سچی بات ہے رفیق کی والدہ بھی یہی کہتی تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ میرا نام کس نے لے دیا۔ اس بات کا پتہ لگنا ناممکن تو نہیں۔ میری والدہ بھی یہی کہتی تھی۔ کہ پولیس کو تمہر شبہ ہے بہرحال اب معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ لیکن میں رفیق احمد کو چھوڑونگا نہیں۔ میں چار سال سے شکیلہ کے عشق میں بے تاب ہوں۔ اور جب تک رفیق احمد زندہ ہے وہ میرے قبضے میں نہیں آسکتی۔ اس جملہ کے بعد کمرے میں سناٹا ہوگیا اور کچھ آواز نہ آئی۔ لیکن کامران پانچ ہزار شکیلہ۔ رفیق احمد میری والدہ ان الفاظ سے سخت حیرت میں تھا۔ کہ متکلم کون ہے۔ کون شخص اپنی والدہ کا

ذکر کر رہا ہے۔ اور کون شکیلہ کے عشق میں چار سال سے بے تاب ہے اُس نے پھر کھڑکی پر کان لگائے۔ مگر اچھی طرح سنائی نہ دیا۔ پھر اوسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ لیکن مجھے رفیق احمد کی جان پر رحم آتا ہے۔ کوئی دوسری چال چلو"

سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔ کہ رفیق احمد کو کسی طرح آبشار میں دھکا دے دوں۔ افسوس میرا نشانہ خطا کر گیا۔ نشانہ کی جگہ اگر دل پر بیٹھتا۔ تو چٹی ہو گئی تھی۔ اور کوئی چال معلوم نہیں ہوتی۔ تم ہی بتلاؤ"

"کیا بتاؤں۔ اگر کسی طرح شکیلہ کو بھگا لاویں۔ تو کیسا ہے؟"

"کیا کہنا۔ لیکن اس کا دھوکے میں آنا۔ ممکن نہیں معلوم ہوتا"

"اچھا دیکھو کچھ فکر کریں گے۔ سردی بہت معلوم ہوتی ہے۔ چائے بنالیں"

کیا گھر میں دودھ موجود ہے"

میں جاکر دیکھتا ہوں۔ تمہارے لئے بستر بھی لیتا آؤں" ایک چارپائی برآمدے میں پڑی ہے۔

اُسی لمحہ میں کامران کو کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور آہستہ آہستہ بطرف جنوب جانے لگا۔ سامنے سے کامران کو ایک کانسٹبل اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ کانسٹبل کے مقابلے کے لئے کامران بالکل تیار نہ تھا۔ اور اس کا موجودہ بھیس ہے دراصل اس وقت ایک مکروہ چور کی صورت میں پیش کر رہا تھا۔ کانسٹبل نے دور سے دیکھ کر للکارا" کون ہے" کامران کا دل سکڑ گیا۔ اور وہ ڈر کے مارے جیب سے پستول نکالنے لگا۔ لیکن اُس نے بڑی کوشش سے اپنے حواس کو قابو میں کر کے سوچا۔ کہ شاید وہ رحمت کی طرح کانسٹبل کو بھی ڈرا سکے۔ کانسٹبل نے دوبارہ للکار کر پوچھا۔ کون ہے۔ کامران خوفناک بھیڑیئے

کی طرح اچھل کر کانسٹبل پر جھپٹا۔ اور اپنے سیاہ چہرے کے اندر سے بلی کی طرح دانت نکال کر میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ کانسٹبل ایک نوجوان ناتجربہ کار آدمی تھا۔ وہ کامران کی ہیبت ناک صورت اور پھیلے ہوئے پنجوں سے ڈر کر کانپ گیا اور بجائے اس کے کہ وہ کامران کو گرفتار کرتا۔ دم دبا کر بطرف شمال بھاگا۔

کامران نے تھوڑی دیر تک اوس کا تعاقب کیا۔ اوسی لمحہ میں اوسے بلند اختر اپنے گھر سے نکلتا ہوا دکھلائی دیا لیکن اوسے اُس وقت بلند اختر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت نہ تھی۔ وہ چھلانگیں مارتا ہوا کانسٹبل کا پیچھا کر رہا تھا جس کی زبان شاید خوف کی وجہ سے بالکل بند ہوگئی تھی۔ اور وہ اپنی جان عزیز کو لئے ہوئے بے تحاشا اڑا جا رہا تھا۔ سو گز کے فاصلہ پر جا کر کانسٹبل کسی گلی میں مڑ گیا۔ جہاں کامران نے رُک کر دم لیا۔ اور آہستہ آہستہ دھڑکتے دل سے اپنے مکان کی طرف چلا۔ وہ اس وقت اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اور اپنی موجودہ فتحیابی کو اس قدر غیر متوقع سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ زیادہ دیر کہیں کے پاس کھڑے ہو کر اپنے آپ کو نئی مشکلات میں ڈالنے کا خواہش مند نہ ہو سکتا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا اپنے مکان میں داخل ہوا۔ اور بہ آہستگی اندر قفل ڈال کر چھپر میں گھس گیا۔ پھر چراغ روشن کر کے کپڑے اُتارنے لگا۔ اس وقت اوس کے بدن اور چہرہ پر خوب پسینہ آ رہا تھا۔ اوس نے بوڑھے کلو بیگ کے کپڑے ایک کھونٹی پر لٹکا دیئے۔ اور لوٹے میں پانی لے کر پہلے پیشاب سے فراغت پائی پھر صابن مل مل کر منہ دھویا۔ اس وقت سردی اور ٹھنڈے پانی کی تیزی سے اوس کے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی بے موقعہ دوا دوش سے اوس پر تشنگی غالب ہو رہی تھی۔ اوس نے اپنی پیاس کو ضبط کیا۔ اور تولیہ سے خوب ہاتھ منہ رگڑ کر لحاف میں گھسنے لگا۔ اوس نے

بس تھوڑی بیکاری میں گذشتہ تین دن کاٹے تھے۔ اسی قدر سرعت اور تگ و پو سے آج اتنی غیر معمولی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اس وقت وہ گل جان کے خوبصورت چہرے کو اپنے سامنے ضرور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ لیکن اوس کے دماغ میں چند الفاظ "شکیلہ۔ رفیق۔ پانچ ہزار۔ میری والدہ آبشار" وغیرہ ایسے استحکام سے تسلط پذیر ہو گئے تھے۔ کہ وہ انہیں کسی طرح محو نہیں کر سکتا تھا اس وقت رات کے دو بجے ہونگے۔ اوس نے پرانے اوور کوٹ کی جیب سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ اور کرسی پر سر رکھے ہوئے دھواں کھینچتا رہا۔ سگار کے تمباکو نے اوس کی مشکل کو بتدریج کم کرنا شروع کیا۔ اور اوس کے تھکے ماندے چکنا چور بدن کو کسی قدر آرام معلوم ہوا۔ اوس کے ہاتھ اور پاؤں بالکل سرد ہو رہے تھے۔ اور سر میں خفیف سا درد محسوس ہوتا تھا۔ وہ دائیں کروٹ لیٹ کر سگار پیتا رہا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ جلد نیند آجاوے لیکن باوجود اس قدر تکان و صعوبت کے اس کے دماغ سے نیند فرار ہو گئی تھی۔ اور وہی چند الفاظ "شکیلہ۔ رفیق۔ پانچ ہزار۔ میری والدہ۔ جمال" وغیرہ اوس کے دماغ میں سوئی کی طرح چبھ رہے تھے۔ جب اوس کے دل کا انتشار کسی قدر کم ہوا۔ اور پاؤں گرم ہو گئے۔ اُسنے اپنے خیالات کو جمع کر کے ان الفاظ کا مطلب سوچنا شروع کیا۔ شکیلہ کا عاشق کون شخص ہو سکتا تھا۔ اور رفیق احمد کے قتل سے اوسے کیا مل سکتا تھا۔ یہ بات تو اظہر من الشمس تھی۔ کہ بلند اختر گل جان جیسی خوب صورت عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر شکیلہ سے ہرگز محبت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان ایک دل رکھتا ہے۔ وہ دو عورتوں کو نہیں چاہ سکتا۔ اور وہ بلند اختر و گل جان کی باتوں اور حرکات و سکنات نیز امیر جان کے بیان سے اچھی طرح معلوم کر چکا تھا۔ کہ بلند اختر کو گل جان سے گہرا عشق تھا۔ پس معاف تھا۔ کہ وہ آواز بلند اختر کی نہ تھی بلکہ اوسکے

نوجوان دوست کی تھی جس کی صورت کا مران کو ایسی نکردہ اور ڈراونی معلوم ہوئی تھی۔ اس علم سے کامران کا دل دہلنے لگا۔ اوسے یہ بات تو معلوم ہوگئی۔ کہ رفیق احمد پر حملہ کرنیوالا آدمی بلند اختر کی بجائے اس کا دوست تھا لیکن یہ بات نہ معلوم ہو سکی۔ کہ وہ شکیلہ کے عشق میں گرفتار ہو کر رفیق احمد کو کیوں مارنا چاہتا تھا۔ اور اوس کی والدہ کون تھی بہرحال اوسے آج اس قدر امور معلوم ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنی مزید تحقیقات کے لئے ان باتوں سے بہت سے نتائج پر پہونچ سکتا تھا۔ اور ابھی تو اوس کے آگے بہت بڑا کام پڑا تھا۔ اوسے سب سے زیادہ وقت طلب مرحلہ یہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اوس خوفناک آدمی کس طرح واقفیت پیدا کرے۔ وہ ایک گھنٹہ تک پڑا سوچتا رہا۔ لیکن کوئی سبیل اس مشتبہ آدمی کے حالات معلوم کرنے کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر اوسے اپنی آنکھیں بند ہوتی معلوم دیں۔ ایک دو مرتبہ اوسے نیند آئی لیکن اوس کا نصف بدن بیدار تھا۔ اوسے ایک دو بار اپنے پاؤں ہلتے ہوئے معلوم دیئے اور نیند اچاٹ ہوگئی۔ بارے پانچ منٹ کے اندر وہ گہری نیند میں پڑ کر دور دور پہونچنے لگا۔ لیکن اس وقت اوس کی آنکھوں کے سامنے نہ شکیلہ تھی نہ رفیق احمد۔ نہ بلند اختر نہ امیر جان نہ اوس کی پیاری بیوی بچے وہ لق ودق بیابان میں خوب صورت گل جان کو دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ اپنے سرتک شال اوڑھے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ وہ اوس کی خوبصورتی سے موثر ہو کر اوس کی مدد کے لئے آگے بڑھا لیکن وہ کہیں غائب ہوگئی۔ خوبصورتی واقعی دنیا کے اون بیشمار خزانوں میں سے ہے جو انسان کے قبضہ قدرت سے باہر ہیں۔ نہ کوئی انہیں اپنی خواہش سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور نہ حاصل کر کے قائم رکھ سکتا ہے۔ خوبصورتی کی قدر اور قیمت بھی ہے۔ لیکن اگر خوبصورت چہرے کی آڑ میں کسی کے پاس

مکروہ دل ہو۔ تو خوب صورت چہرے کی چمک دمک دل کی آلائش کو ہرگز نہ چھپا سکے گی۔ برخلاف اس کے ایک فیاض اور ہمدرد دل بدصورت عورت کو بھی محبت کی دیوی بنا سکتا ہے۔ مگر کس قدر تعجب کی بات ہے۔ کہ دل کا امتحان کرنے کی بہت کم لوگ تکلیف کرتے ہیں۔ اور ہنس مکھ دلربا چہرے کو دیکھ کر خلقت اس قدر بے چین ہو جاتی ہے۔

پچیسواں باب

خوبصورتی وبال جان ہے

دن کے نو بجے تھے۔ امیر جان کی خوب صورت صاف ستھری حویلی میں غربی کمروں کے آگے دھوپ تیزی سے چمک رہی تھی۔ پھولوں سے مہکے ہوئے گملوں کے پاس چھوٹی سی میز کے آگے جس پر خوبصورت جھالردار میز پوش بچھا ہوا تھا۔ پرمی چہرہ گل جان نیلی شال اوڑھے سر کھولے مکلف آرام کرسی پر لیٹی ہوئی کسی عاشقانہ ناول کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میز پر دوات قلم اور چند کاغذ لفافہ جات کے پاس کئی اردو اخبارات بند کے بند پڑے تھے۔ جن کی طرف نوجوان لڑکی کو چنداں توجہ نہ تھی۔ گل جان کے سامنے اوس کے زمانہ دیدہ ان آرام دہ کرسی پر لیٹی ہوئی پان کھا رہی تھی۔ گل جان کے چہرے پر خدا داد خوبصورتی اور عالم شباب کی شادابی سے سرخی جھلک رہی تھی۔ اور اوس کے بھورے بالوں پر چمک دار آفتاب کی کرنیں دھوپ چھاؤں کا دھوکہ دے دے کر اونہیں سنہری ابن کی طرح پیش کر رہی

تھیں لیکن رات کو زیادہ دیر گئے بستر پر جانے اور سوئی میں تھیلے جانے سے اسکی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ انسان اپنے آپ کو بقدر آرام طلب بنا لیتا ہے موسم اور وقت اسپر اسی قدر سختی سے بسرعت ہاتھ دراز کرنے لگتے ہیں۔ کوڑھی امیر جان کے سرخ شکن دار چہرہ کو سورج کی روشنی بہت صاف طور سے کریہہ خیز صورت میں ظاہر کر رہی تھی۔ اور اس کے کھچڑی نما لمبے بالوں اور سنہری مایل سے اندر سورج کی کرنیں ایسی مکدر معلوم ہوتی تھیں۔ کہ ایک نظر گل جان کو میر ہو کر دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی امیر جان کی طرف دیکھ لے۔ تو دل کی ایسی حالت ہو جاوے جیسی نہایت مزہ دار شیرینی کے بعد گڑ چکھ لینے سے ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ذرا بھر شبہ نہ تھا۔ کہ یہ زاہد فریب لڑکی اس عورت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ اب دونوں کی صورتوں میں کس قدر بین فرق ہو گیا تھا۔ دراصل ہر چیز کیلئے عروج اور زوال کا زمانہ آیا کرتا ہے۔ امیر جان اپنی زندگی کے اوج میں سے نکل کر زوال کی وادی میں گرتی پڑتی دن گذار رہی تھی۔ اور پری چہرہ لڑکی کے باغ حسن میں روز بروز نئے نئے پھول اضافہ ہوتے جاتے تھے۔ امیر جان نے ایک پان بنا کر تھالی گلجان کی طرف بڑھائی۔ اور خود سوال لڑکے نے بھاگ کر قاب گل جان کے ہاتھ میں دیدی گل جان نے قاب ہاتھ میں لے کر پان منہ میں رکھا۔ اور اس کی خوبصورتی سنہری چوڑیوں کے اندر اوس کے نازک نرم گوشت بھری انگلیوں کے حنا آلودہ ناخن بڑی دل فریبی سے چمک اٹھے۔ پھر گل جان بے تابی سے اپنے ناول کے مطالعہ میں مصروف ہوئی۔

حتی کہ وہ کسی عاشق و معشوق کی شادی کا باب پڑھ کر اور دل میں بلند آہ کو یاد کر کے لمبا سانس بھرنے پر مستعد ہو رہی تھی۔ کہ اتنے میں گل جان کو دروازہ کی دہلیز پر کسی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اوس نے معمولی بے پرواہی سے اور نظر ڈالی۔ تو خجالت آتا ہوا دکھلائی دیا جس کے ہاتھ میں ایک پرزہ کاغذ کا تھا۔ شجاعت کے قریب آجانے پر گل جان نے معمولی اضطراب سے کاغذ ہاتھ میں لیا جسپر لکھا ہوا تھا۔ فرحت علیخان از

جلال آباد"

اوس نے ناک بھوں چڑھا کر کاغذ کو ہاتھ سے مل کر گولی بنا کر زمین پر ڈال دیا۔ اور اس کی طرف غصہ سے جس نے اس کا منہ لال کر دیا دیکھ کر بولی۔ اماں جان جلال آبادی رئیس زادہ آیا ہے۔ ابھی پرسوں تو آیا ہی تھا۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔

بوڑھی امیر جان نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا۔ لڑکی پاگل ہو گئی ہے بلند اختر کے مارے برائی بھلائی میں تمیز نہیں کر سکتی۔ فرحت علیخاں کی بات مجھے دل سے پسند ہے۔ آنے دو۔ شجاعت علی جمعدی دوسری کرسی لاؤ" شجاعت علی کرسی لینے کیلئے جنوبی کمروں کی طرف جھپٹا لیکن نگجان کے دل میں اس وقت غصہ اور حیا سی عجیب و غریب قسم کا پیچ و تاب پیدا ہو رہا تھا اول تو اوسے فرحت علیخاں سے دلی نفرت تھی۔ دوسرے وہ کسی شخص کے منہ سے نکاح اور شادی کا معاملہ سن کر خوش ہونے کی جگہ شرماتی تھی وہ دراصل اس قسم کی باتیں سوا بلند اختر کے کسی سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شجاعت نے کرسی لا کر بچھا دی تو امیر جان نے منہ اٹھا کر کہا "آؤ سلام بولو" پھر لانبے ناک کو پھڑکا کر گل جان کی طرف دیکھا اور دبی آواز سے بولی۔ مجھے ہرگز امید نہیں۔ بلند اختر بیس ہزار روپیہ دیکے۔ تو اس شخص کو ہاتھ سے کبھی نہ چھپاؤ گی۔ نہایت فراخ دلی سے ملاقات کرنی چاہئے" لیکن گل جان نے آنکھ بھوں چڑھا کر سر ہلایا اور میز کو ہاتھوں سے پکڑ کر بولی "میں اس شخص سے بات تک کرنا نہیں چاہتی مجھے اس کی صورت سے دور رکھئے۔ میں بلند اختر کے ساتھ مفلسی میں بسر کرونگی مجھے کسی کی دولت نہیں چاہیے"

اس کلمہ کو سن کر امیر جان کا رنگ فق ہونے لگا۔ اوس کے ہاتھ پاؤں کانپ گئے مگر بڑی مشکل سے غضب کو قابو میں کر کے بولی۔ تو ضرور مصیبتوں میں پڑنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ کاش تو پیدا ہوتی ہی نہ ہوتی۔ یہ کہکر وہ اٹھی۔

لیکن امیر جان کو اپنا غصہ فی الفور فرو کرنا پڑا۔ کیونکہ دہلیز کے دروازے سے ایک ذریہ تراش بلند قد کا آدمی پختہ فرش پر بھاری قدم رکھتا ہوا آگے آیا۔ اور

ان ماں بیٹیوں کے قریب آکر تبسم سے بولا "آداب جناب" گل جان کا دل بھر آنے لگا۔ امیر جان مسکرا کر کرسی سے اٹھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر کہنے لگی آیئے صاحبزادہ صاحب کدھر آگئے۔ مزاج تو اچھا ہے" تو صفدر رئیس زادہ نے مسکرا کر بھاری آواز سے جواب دیا الحمد للہ مجھے ایک شہادت میں آنا تھا۔ بغیر آپ صاحبوں سے ملے کیونکر چلا جاتا" پھر مسکراتا ہوا گل جان کی طرف بڑھا جس نے تبسم سے نیچے بیٹھے ہاتھ ملا امیر جان نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے رئیس زادہ کو بٹھا لیا۔ اور نخلصانہ لہجہ میں شجاعت سے کہا۔ چائے لاؤ" پھر رئیس زادہ سے انکسار آمیز طریق سے کہا کھانا منگاؤں۔ رئیس زادہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ آپ کی عنایت سے مجھے ابھی بھوک نہیں شاید آپ کو معلوم نہیں مجھے سودا بھی کی شکایت رہتی ہے" خیر چائے منگائیے" پھر آنکھوں سے گل جان کی طرف دیکھ کر پوچھا" آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ گل جان اس وقت فربہ اندام رئیس زادہ کی بات سن کر دل میں کہہ رہی تھی کہ ایسے چکنے چپڑے موٹے آدمی کو سودا کی شکایت۔ شاید وہ مناسب سے دوحصہ زیادہ کھانا کھاتا ہوگا" پھر مسکرا کر بولی۔ مجھے فرصت نہیں ملی علاوہ ازیں میں کسی کو خط نہیں لکھتی فرحت علیخاں تیس سال کی عمر میں ہوگا۔ اس کا بدن خوب فربہ تھا۔ قد لمبا۔ آنکھیں خاک وخاکش ہونے کی جگہ کردہ تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ ناک چپٹی۔ دانت چوڑے ہونٹ سیاہی مائل اور موٹے۔ رخسار ان گول۔ چہرہ پر چیچک کے نشانات بکثرت تھے۔ رنگ گندمی کسی قدر زردی مائل۔ فرحت علیخاں کی مونچھیں خوب گھنی اور لانبی تھیں۔ ڈاڑھی وسط سے منڈی ہوئی اور ادھر ادھر بڑے بڑے بال تھے۔ اسکے کان بہت بڑے اور بے ڈھنگے تھے۔ سر پر پشاوری ٹوپی کے اوپر چمکدار صافہ تھا۔ بدن میں ترکی سیاہ کوٹ۔ ٹانگوں میں سیاہ پتلون نما پاجامہ۔ پاؤں میں سیاہ اونی موزے کے اوپر ولایتی کوٹ رنگ کا بادامی تھا۔ فرحت علیخاں کے ہاتھوں میں نقرئی موٹھ کی لاٹھی تھی۔ اور اس کی صورت شکل اور فاخرہ لباس سے تمول برستا تھا ہر چند نئی اور صاف تھی۔ اور اس شخص کی بیوی بے اولاد مری تھی۔ اور چونکہ گل جان حسین

میں لاتا تھی۔ اس نے مجرد رئیس زادہ کا اس پر مائل ہو جانا خیالات سے دور تھا یہ شخص ایک سال سے گل جان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اور ابھی تین دن گذرے اسکی ادا کو بیس ہزار روپیہ دیدینے پر رضامند ہو چکا تھا۔ مگر وہ یہ سمجھ کر کہ گلجان سر دست راضی نہیں تھی۔ اس قسم کے لینے سے انکار کر کے بنا چکی تھی کہ ابھی برس چھ مہینہ اور انتظار کرنا چاہئے پہلے الواب سے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ امیر جان اس شخص کو دل سے پسند کرتی تھی۔ امیر جان نے پانوں کی تھالی فرحت علی خاں کے آگے پیش کی۔ جو مشرق کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا اوں نے آداب کہکے پان لیا۔ اتنے میں شجاعت نے مکلف پیچوان لا رکھا۔ اور فرحت علیخاں حقہ کے شغل میں زمین پر نگاہ ڈال کر ان الفاظ کا تہیہ کرنے لگا۔ جو اسے عنقریب زبان سے ادا کرنے تھے۔ جامدیدہ امیر جان نے شجاعت کو متانت سے کہا۔ جاؤ شجاعت ابھی تمہاری ضرورت نہیں کلن کے ہاتھ چائے بھیجدو۔ شجاعت ان باتوں کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ خورد سال کلن کو لیکر فوراً دہلیز کی طرف چلدیا۔ اوس کے چلے جانیپر فرحت علیخاں نے دھڑکتے دل سے گل جان پر نظر ڈالی۔ جو اس وقت اپنی انگلیوں سے مینہ کو پکڑے ہوئے نیچے دیکھ رہی تھی پھر سر کر امیر جان کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولا۔ تو بیگم صاحب میری قسمت کا فیصلہ آج ہی ہو جانا چاہئے۔ میں بڑی امید سے آیا ہوں گل جان کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح کوئی پری اڑکر آجائے۔ اور اسے بلند اختر کیقا تھ اڑا کر لیجائے۔ لیکن جس چیز کی انسان کو بہت زیادہ خواہش ہوتی ہے۔ وہی بڑی مصیبتوں کے بعد ہاتھ آیا کرتی ہے۔ امیر جان نے لانبا سانس بھر کر کہا۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔ گل جان آپ کے سامنے موجود ہے۔ آپ خود اس سے کہہ لیں میں حتی الامکان سمجھا چکی ہوں۔ امیر جان کے ڈھارس بندھانے سے فرحت علیخاں کے دھڑکتے ہوئے دل میں استحکام پیدا ہوا۔ اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی کرسی گل جان کے پاس کھینچ کر لے گیا۔ اور پھر منت کے طریق پر کہنے لگا۔ کیوں پیاری تم مجھ سے کیوں ناراض ہو۔ میں ایک سال سے بے تاب ہوں۔ تمہاری ملازمی اور خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرونگا۔ مرا خدا جانتا ہے مجھے تم سے عشق ہے

فرحت عیناں کا چہرہ اس وقت بالکل سرخ ہو گیا تھا اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے آگئے تھے اور سینہ بے حد گرم ہو کر پسینہ سے شرابور ہو گیا تھا۔ گل جان کے چہرے کی رنگت فق ہو گئی۔ اب تک اس شخص نے ایسی جوشیلی آواز میں عشق نہ جتلایا تھا۔ اور نہ وہ اوسے منظور کرنے کے لئے تیار تھی۔ اوس کا دل غصہ اور شرم سے کانپ گیا اور اس نے سنبھال کر لیا۔ فرحت عیناں اس کی نظریں سمجھی اور زبان بند سمجھ کر خاموشی نیم رضا سمجھا۔ اور بے تاب آواز سے کہنے لگا۔ میری پیاری آج میری قسمت کا فیصلہ کر دو میں بیس ہزار سا تھہ لایا ہوں۔ اور تمہاری والدہ کو اسی وقت دلیتا ہوں۔ گلجان کے ہاتھ پاؤں کانپ گئے۔ اوس نے زمین سے نگاہ اٹھائی اور ماں کی طرف زخمی بھیڑیئے کی طرح دیکھ کر بولی۔ کیا میں کوئی زر خرید ہوں۔ جو بیس ہزار کے بدلے خریدا جاتا ہے میں کسی شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ امیر جان کا دل کانپ گیا۔ اور وہ چلا کر بولی "گل جان تیری حماقت کی حد ہو چکی ہے عقل سے کام لے" گلجان کے غضبناک دل میں امیر جان کے ملحنہ سے سوئی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ چلا کر بولی۔ اماں تمہاری زیادتی کی حد ہو چکی ہے۔ میں ان سے ہرگز شادی نہ کرونگی خواہ بیس ہزار کے بدلے بیس لاکھ تمہیں دیدیں" اور یہ کہکر کرسی سے اٹھی اور اپنے مکلف کمرہ کی طرف چلدی فرحت عیناں کا دل غصہ اور شرم سے تڑپنے لگا اور وہ اپنی بے عزتی سے بید کی طرح کانپ گیا۔ اسے اس وقت تک قطعی خیال نہ تھا۔ کہ یہ کمسن رنڈی کیسی مستقل ارادہ کی عورت ہے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ محض ناز و کرشمہ اور نخروں کے زور میں اس سے کمزانی ہے۔ اور بیس ہزار کی جگہ چالیس ہزار دیدینے پر فی الفور راضی ہو جاویگی۔ مگر اس وقت اسے اصلیت معلوم ہو گئی۔ اور وہ سمجھ گیا۔ کہ یہ مغرور لڑکی اس سے دلی بغض رکھتی ہے۔ یا اس کی صورت سے متنفر ہے لیکن اس کی صورت اوس کے قابو کی بات نہ تھی۔ اور اس نے اپنی دلی محبت کے اظہار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اور وہ اس وقت بیس ہزار کی جگہ چالیس ہزار لیکر آیا تھا۔ محض وہ اپنے حسب نسب اور جلال آبادی پٹھانوں کے خون کی بے عزتی دیکھکر کانپ گیا اسکے چہرہ پر خوفناک

سیاہی پھیلنے لگی۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ ہونٹ اور سارا بدن کانپنے لگا۔ اور اس نے بڑی مشکل سے اپنے غصہ کو روکا۔ پھر اس کے محبت پر دل میں زاہد فریب عورت کا آنسو بہا چکا آگیا۔ ایک دم غصہ کی جگہ رحم سامنے کھڑا ہوا۔ اور اس کے دل میں ایک کشش پیدا ہوئی۔ جو اسے ان کمروں کی طرف کھینچ رہی تھی جس میں گلجان تھی۔ فرحت علیخاں مغلوب ہو کر دل سے کہنے لگا ہائے عشق تیرا نداناس کرے۔ میں ہار گیا۔ میں اس لڑکی کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پریشان آنکھوں سے امیر جان کو دیکھ کر بولا۔ میں گل جان کے عشق سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ لعلہ میرے حال پر رحم کرو۔ میری مدد کرو۔ میں تمہیں اس وقت بیس ہزار کے بدلے چالیس ہزار دینے پر رضامند ہوں۔ بوڑھی عورت کے بے رحم اور طمع پر ور دل میں چالیس ہزار کی رقم نے تازیانہ لگایا وہ اچھلکر کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ اور دانت پیستے ہوئے دل سے بولی "مجھے سخت افسوس ہے۔ کہ میں توقف گلجان راضی نہیں ہو سکتی مگر آپ میرے ساتھ آئیے۔ وہ تنہائی میں ہے۔ آپ خوشامد مدد آمد سے راضی کر لیجئے۔ بعض عورتیں روپیہ سے زیادہ خوشامد کو چاہتی ہیں۔ بوڑھی عورت بالکل احمق تھی کسی شخص سے دل لگا کر عورت دوسرے کے خزانہ اور خوشامد کو کبھی کام میں نہیں لا سکتی۔ امیر جان فرحت علیخاں کو لیکر اپنے مکلف کمرہ میں داخل ہوئی جہاں شب گذشتہ کامران نے گلجان اور بلند اختر سے واقفیت پیدا کی تھی۔ اس وقت گلجان ان دونوں کمروں میں نہ تھی بلکہ خوابگاہ کے کمروں میں مسہری پر جا لیٹی تھی۔ امیر جان نے غربی کمرہ کا دروازہ کھولکے باہر کے کمرہ میں بیٹھ گئی۔ فرحت علیخاں دوڑ کر خوابگاہ میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے گلجان کو مسہری پر لیٹا دیکھا۔ جو کسی کی تصویر ہاتھ میں لئے ہوئے بوسہ دے رہی تھی۔ اپنی بے عزتی اور نامقبولیت پر اس کا دل جل گیا۔ اور وہ جوتے قہر سے "میری پیاری گلجان" کہہ کر گل جان اور امیر جان کی مسہری کے درمیان دری پر دوزانو بیٹھ گیا۔ گل جان اس خوفناک عاشق کو خوابگاہ اور تخلیہ میں دیکھ کر کانپ گئی۔ اور ایسی آنکھوں سے جیسے بہت کو دیکھ کر موجاتی ہیں۔ نوجوان کی طرف دیکھ کر پلنگ سے اٹھ بیٹھی۔ فرحت علیخاں نے ہاتھ جوڑ کر بھرے دل سے کہا "میری پیاری میری جان مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارا دل و جان

سے عشق ہوں بیس ہزار کے میں تمہارے قدموں میں چالیس ہزار ٹال سکتا ہوں" گل جان اس شخص کو اپنے چہرہ سے اس قدر قریب دیکھ کر کانپ گئی۔ اور چلا کر بولی صاحب آپ کو میری خواب گاہ میں آنے کی کس نے اجازت دی۔ اگر میرا دوست سن لیگا تو میری عزت دو کوڑی کی ہو جائیگی۔ میں آپ جیسے خوفناک بدتہذیب آدمی سے کبھی شادی نہ کرونگی اور یہ کہکر فی الفور مسہری سے کود کر باہر بھاگی۔ جہاں اس کے خوف زدہ چہرہ سے پیر جٹ ڈر کر پوچھنے لگی "بیٹی کیا ہے؟" گل جان نے رو کر جواب دیا "بیٹی کیا ہے؟ تم میری مسہری کے قریب نامحرم لوگوں کو بھیجتی ہو ہائے مجھے موت آجاتی۔ میں اس شخص سے ساری عمر شادی نہ کرونگی۔ اس وقت معزز خاندان کا رئیس زادہ اس مضروب سیدہ کتے کی طرح سر نیچا کئے ہوئے باہر جا رہا تھا۔ جب وہ کسی کے گھر سے ٹھوکھا کر نکلتا ہے

چھبیسواں باب

انسان کے اندر مقناطیسی کشش بھی ہوتی ہے

کامران شب گزشتہ کے تجربات کے بعد کسی قدر تھکا ہوا اور پریشان اٹھا۔ وہ مسلسل سے پانچ گھنٹے سویا ہوگا لیکن اس عرصہ میں اتنے خواب دیکھے۔ کہ ان میں سے کوئی ٹھیک طور پر اوسے یاد نہ رہ سکا۔ وہ خواب البتہ اس کی آنکھوں میں ہی طرح موجود تھا جس میں اس نے گل جان کو یکہ جریدہ ایک لق و دق بیابان میں روتے دیکھا تھا اسے خوب یاد تھا۔ کہ وہ خواب میں اوسے روتا دیکھکر امداد کے لئے آگے بڑھا مگر اسے پیلیاں کی زمین نگل گئی۔ درحقیقت اگر غور کیا جاوے۔ تو دنیا کی زندگی میں ہر روز کامران کے خواب کی خواب کی سچی تعبیریں مشاہدہ سے گذرتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے عزیزوں دوستوں یا واقفکاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ایک وقت سنتے ہیں کہ انہیں سے کوئی سخت بیمار یا رنج کی تکالیف میں مبتلا ہے۔ اور چونکہ ہی ہم اوس کے ساتھ ہمدردی کرنے کو نکلتے ہیں اسے سخت ٹھنڈی اور بے رحم زمین گور میں گرکر نگل جاتی ہے۔ کاش انسان

اپنی بے ثباتی پر ذرا غور کرے۔ ایک موقعہ پر ہم کسی تندرست مالدار اور دین و دنیا سے بے فکر آدمی کو کسی نہایت حسین عورت کے پہلو میں دنیا و مافیہا سے بے خوف ہو کر چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھتے ہیں۔ دوسری جگہ ہم اوسی تنومند اور شاندار آدمی کو جو دیبا و حریر کو بھی شایان شان نہ سمجھتا تھا۔ چند گز ٹھنڈے کپڑے میں لپیٹ کر تخت بستہ زمین کے اندر دبا آتے ہیں مگر پھر بھی زندگی کے مسرت آمیز مواقع ہمارے دل پر سب آنے والے نظارات کی طرف سے پردہ کھینچ دیتے ہیں۔ کامران نے بستر سے اٹھ کر معمولی کاروبار سے فراغت پائی۔ اور ایک سماوار میں چائے تیار کر کے پی لیکن علی الصباح اپنے دروازہ کے کیواڑوں میں آبیٹھا تھا۔ اور بلند اختر کی نقل و حرکت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اوسنے آٹھ بجے کے قریب دونوں آدمیوں کو مکان سے نکلتے دیکھا۔ چونکہ وہ بلند اختر کو اپنے نکالنے سے واقف کر کے شبہات پیدا کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اوس نے کسی اچھے موقعہ کے انتظار میں ان کے تعاقب سے احتراز کیا۔ اور نصف گھنٹہ بعد بہت عمدہ لباس پہنکر بصورت اصلی باہر نکلا۔ اوس وقت اسے یہ اوڑ تھا۔ کہ کہیں بلند اختر اور اس کا دوست اوسے اپنے گھر میں قفل ڈالتا نہ دیکھ لیں وہ دونوں ہٹ کتے ہوئے دل سے قفل لگا کر آگے بڑھا۔ اس وقت اس کے دل میں سب سے زیادہ کشش گلجان کے گھر کی تھی۔ جہاں ماہ وش لڑکی اور اس کی والدہ نے اسے بڑے تپاک سے مہمان رکھا تھا۔ اور وہ دل میں ارادہ کر رہا تھا۔ کہ اگر آج کل جان نے اوسے ٹھہرانے پر اصرار کیا۔ تو وہ اپنا بستر ٹھکانے نے کر اوس کے یہاں چلا جائیگا۔ اگرچہ وقت بہت بھیس بدلنے کے لئے کرایہ کا مکان حسب معمول قایم رکھنا پڑیگا۔ پری چہرہ لڑکی کی منظور صورت اوسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور اس کا دل چاہتا تھا۔ کہ اوس کے پر تبسم چہرہ کے قریب بیٹھ کر باتیں کرے۔ خوبصورت عورتوں میں کیسا غضب کا جادو ہوتا ہے کہ ذرا سی دیر میں دل کو تسخیر کر لیتی ہیں اس نوجوان لڑکی کے تبسم میں ایک قسم کی مقناطیسی رو تھی۔ جو دیکھنے والے کے دل تک پہنچ جاتی تھی۔ اور دیکھنے والے کا دل ابھرنے لگتا تھا۔ وہ گھر سے چل کر اوس محلہ کی طرف ہو گیا۔ جدھر سے کل رات بلند اختر اپنے دوست کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بلا ارادہ خیال گل جان کی حویلی کی طرف مڑ جاتا تھا۔ کہ اس کے ضمیر نے بیداری

ظاہر کی۔ اور وہ دھڑکتے دل سے سوچنے لگا۔ کہ وہ یہاں گلجان کے پہلو میں بیٹھنے نہیں آیا اور اس نے اپنی تحقیقات کے متعلق بہت سا کام کرنا ہے۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی سوچنے لگا۔ کہ بلند اختر اور اس کا دوست اس وقت کہاں گئے ہیں۔ اور کس فکر میں ہیں اس کے ساتھ ہی اسے اپنی پشت کے پیچھے گل جان کا مکان یاد آگیا۔ اور وہ سمجھا۔ کہ وہ دونوں دوست گلجان کے یہاں آئے ہونگے۔ اگر وہ فی الفور وہاں پہنچ گیا۔ تو بہت ممکن کہ وہ بلند اختر کے دوست کا نام معلوم کر سکیگا۔ وہ واپس ہونا چاہتا تھا۔ کہ اوس نے سامنے سے ایک نوجوان جوگی جس نے چہرے پر مصبوط بل رکھا تھا۔ کمبل اوڑھے اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ قریب آگیا۔ کامران نے اوسے بغور دیکھا۔ اس کا چہرہ کسی قدر دلکش تھا۔ آنکھیں قدرے سرخ تھیں۔ داڑھی مونچھ بالکل ندارد سر پر لمبے لمبے سیاہ بال جٹے لٹک رہے تھے۔ فقیر تن و توش سے مضبوط آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اوس کی جوانی کا خیال کر کے یہ بات کامران کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہ وہ اپنے نفس کو کس طرح قابو میں رکھ سکتا ہے۔ فقیر اس نے سینکڑوں دیکھے تھے لیکن اس جوگی کی تندرستی اور سڈول جسم سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ یہ جوگی لوگ عموماً چین ہوتے ہونگے۔ اور مندر تیرتھ۔ میلوں وغیرہ میں یہ عورتوں کو اپنے جال میں بڑی آسانی سے پھنسا لیتے ہونگے۔ باوجود اس کے کہ اس کے دماغ میں بیشتر سے سینکڑوں خیال آئے مگر یہ خیال جس قدر جلد پیدا ہوا۔ اسی قدر زیادہ تحقیق طلب اور اس کے پیشہ کے فرائض کا ایک حصہ دکھلائی دیا۔ اور وہ دھڑکتے ہوئے دل سے جوگی کے پیچھے ہولیا۔ جوگی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اور سر جھکائے سیدھا جا رہا تھا۔ کامران کو اس بات کا علم نہ تھا۔ کہ کس قماش کا آدمی ہے۔ اور کس طرح اپنا گزارہ کرتا ہے۔ اور عام ہندو اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے دل میں اس شخص کے چال و چلن اور طور زندگی کے متعلق تحقیقات کرنے کا شوق یکایک اس قدر غالب ہو گیا تھا۔ کہ اس نے کسی قاعدہ یا اصول کی پرواہ نہ کی۔ اور وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا جوگی اس بازار کے کنارے پر جہاں گل جان کی حویلی تھی بجانب غرب پڑا۔ اور کامران خوبصورت جوگی کو اپنے تعاقب سے آگاہ نہ کرتے ہوئے گندہ نالہ کے پل پر پڑ لیا۔ اس وقت کامران

کو گل جان کی حویلی عقب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور اس نے دور سے دیکھا۔ کہ اس حویلی کے غربی و جنوبی دیواروں سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا باغیچہ معلوم ہو رہا تھا۔ جو بظاہر امیر جان کی ملکیت تھا۔ بازار کی پشت پر دو تین مکانات اور محلوں کا سلسلہ چلا گیا تھا اور بجانب غرب ایک پختہ سڑک سے جا ملا تھا جس کے دوسری طرف شہر کے باغات اور سرو و غیرہ تھے۔ گندہ نالہ کے کنارے کنارے چوتھائی میل جانے پر گندہ نالہ کا دوسرا پختہ پل ملا۔ اور کامران کو یہ جوگی بطرف شمال۔ لب سڑک جاتا ہوا دکھلائی دیا۔ کامران پختہ سڑک پر پڑ لیا۔ اور اسے اپنے بائیں ہاتھ پر دو تین باغات اور کھیتوں کا سلسلہ نظر آیا۔ ایک فرلانگ بجانب شمال جا کر جوگی چوبی پھاٹک کے ذریعہ سے باغ میں داخل ہوا۔ جسکے دروازے پر پہنچ کر کامران کو اس ہرے بھرے خوشنما باغ کے اندر ایک مختصر سا پختہ مندر دکھلائی دیا پھاٹک کے تھوڑے فاصلہ پر سبز سبز پودوں اور ترکاریوں کی روشیں اپنے سبز اور ترو تازہ پتوں کی شادابی سے آنکھوں میں فرحت پیدا کر رہی تھیں۔ اور مندر کے چاروں طرف مختلف میوہ جات کے درخت بکثرت نظر آ رہے تھے۔ مندر کے دائیں طرف ایک کنوئیں کا پختہ ستون اور پشتی دکھلائی دے رہا تھا۔ جس راستہ سے بیل ضرورت کے وقت پانی کھینچتے ہونگے۔ نوجوان جوگی جب مندر میں داخل ہو گیا۔ تو کامران آہستہ آہستہ باغ کے احاطہ میں گھسا۔ اور ادھر سے مندر کے اندر سے ایک لمبا فربہ جوگی سیدھا کمبل اوڑھے کوئیں کیطرف جاتا دکھائی دیا۔ اس عمر رسیدہ جوگی کی سفید ڈاڑھی کامران کو دور سے نظر آ رہی تھی اور اس کی پیشانی پر سرخ سیندور لگا ہوا تھا۔ جوگی کے سر پر بڑے بڑے سفید بال تھے۔ جو اس نے سر پر اٹھا کر کے ایک جگہ باندھ لئے تھے۔ بوڑھا جوگی شمال کی طرف منہ کر کے ایک چوبی منچ پر بیٹھ گیا۔ کامران آہستہ آہستہ روشوں میں ٹہلتا رہا۔ پھر بوڑھے جوگی کے قریب آکر اس کی طرف ایک تیز چہرہ سے دیکھ کر بولا "گرو جی تسلیم" بوڑھے جوگی نے دونوں ہاتھوں سے سلام سیکر کہا۔ کہو مہاراج کہو کہو "کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ گرو جی آپ کے پاس جو کوئی آتا ہے۔ غرض ہی سے آتا ہے" بوڑھے فقیر نے مندر کے اندر سے اپنے چیلہ کو آواز دی۔ جو مہاراج کہتا ہوا باہر آیا۔ اور بوڑھے جوگی نے ایک موٹا

منگوا کر کامران کو بٹھلایا۔ کامران نے اب بوڑھے فقیر کو قریب سے دیکھا۔ وہ خوبصورت ... سال کا تندرست ساٹھ سالہ آدمی تھا۔ جو باوجود اس پیرانہ سالی کے بھی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اوس کے دانت بھی جوانوں کی طرح سے بنے ہوئے تھے۔ اور ہاتھ پاؤں یا سر پر کسی قسم کا رعشہ نہ تھا۔ اس کا بدن سفید کسی قدر سرخی مائل تھا۔ لیکن زمانہ نے اپنے دراز دست سے اس پر شکن ضرور ڈال دیئے تھے۔ سال خوردہ آدمی نے پر تبسم نگاہوں سے جن میں کسی قدر بے رونقی ضرور تھی۔ کامران کی طرف دیکھا۔ اور اس کے سفید ابرو آنکھوں پر جھکے۔ اور پھر آہستہ سے کہنے لگا "آپ مسلمان ہیں" کامران نے جواب دیا۔ جی ہاں اس وقت کمسن سال گرمنے اپنے چیلے کو اشارہ کر کے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر متین صورت بنا کر جواب دیا" آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ سمجھا۔ کہ یہ تجربہ کار گرو اس سے کوئی ایسی بات نہ پوچھنے لگے جس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ اس کے چہرہ پر کسی قدر سرخی کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن جلدی سے بہ مستعدی تمام بولا "جی میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ بوڑھے جوگی نے گردن جھکا کر اعتراف کیا۔ پھر زمین کی طرف دیکھتا بولا۔ ہاں تو آپ کیا مطلب لے کر آئے ہیں؟ کامران کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور اس کی آنکھوں میں انتشار اور خوف کی علامات ظاہر ہوئیں۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا شاید اس زود دیدہ فقیر میں دلوں کے راز پڑھنے کی طاقت ہو۔ اور وہ میری باتوں میں جھوٹ سچ علیحدہ کر دکھلائے۔ لیکن وہ اپنے مذہب کے فقرا سے بھی بے حد بدگمان تھا۔ چہ جائیکہ مذہب ہنود کے فقرا پر اعتقاد رکھتا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ اپنے دل پر قابو کر کے بولا "گرو جی مجھے آپ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن کیا کروں۔ میں سینکڑوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہوں۔ کہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں ایک نوجوان عورت پر عاشق ہوگیا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی" کامران نے یہ کلمہ ادا تو کر دیا۔ لیکن اس کے چہرہ کی رنگت سفید پڑ گئی۔ اور اس نے خوف زدہ نگاہ سے بوڑھے جوگی کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھیں اس وقت غیر معمولی طور سے چمک رہی تھیں۔ اور کامران کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا وہ آنکھوں کے ذریعہ سے اس کے دل کی طرف کھینچ

ہے۔ بوڑھے کی آنکھیں بتدریج اس کی آنکھوں پر گڑ گئیں بوڑھے فقیر نے لانبا سانس بھرا اور چلا کر بولا "بہتذیب نوجوان تو جھوٹ بولتا ہے۔ کامران کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اس کا دل اچھل کر حلق میں آنے لگا۔ اور اُسے ایسا معلوم دیا کہ اسکا سارا بدن فقیر کیطرف کھنچا جا رہا ہے۔ فقیر نے دوسری مرتبہ اسکی طرف نگاہ جما کر دیکھا اور غصہ سے بولا جلدی بتلاؤ اوس عورت کا کیا نام ہے" کامران کی زبان بند ہوگئی۔ اور وہ بہت کوشش کرتا تھا۔ کہ کسی طرح زبان ہلا کر معافی مانگے۔ لیکن زبان نہ اُٹھتی تھی تیسری مرتبہ گورو نے اوسے معمول سے زیادہ غصہ ناک نگاہوں سے دیکھا۔ کامران کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی چیز اسے جکڑ کر باندھ رہی ہے۔ کہن سال فقیر نے کمل کے اندر سے دونوں ہاتھ نکال لئے جیسے کوئی کسی سے بغل گیر ہونے کیلئے تیار ہو رہا ہو۔ کامران اپنے مونڈھے سے اُچھلکر فقیر کے پاس پہنچ گیا۔ اور زمین پر بیہوش ہو کر گر گیا۔ بوڑھے فقیر نے اپنے چیلے کو اشارہ کیا جسنے کامران کو زمین سے اٹھا کر مونڈھے پر بٹھلایا۔ سال خوردہ گرو نے اسٹول سے اُٹھ کر کامران کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بولا "ہوشیار ہو جا" کامران کو اپنے بدن میں نئے سرے سے طاقت آتی ہوئی معلوم دی۔ اور وہ دوسرے لمحہ میں آنکھیں ٹکر کر کہنے لگا "میں کہاں ہوں؟ کہن سال بزرگ نے مسکرا کر کہا۔ تو سہارنپور میں ہے۔ بتا کیا دیکھا؟ کامران کا منہ خشک ہو گیا تھا۔ اور خوف کے مارے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اس نے نہایت تعظیم کی نگاہ سے بزرگ فقیر کو دیکھا۔ اور پھر آنکھیں زمین میں گڑا کر کہنے لگا "مقدس بزرگ میں آپ کے امتحان کرنے کی غرض سے مہمل باتیں آپکے گوش گذار کرنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں جس کام کی نیت سے سہارنپور آیا ہوں۔ وہ خوفناک لمحہ بعینہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ آپ نے مجھے تیرہ و تار شب میں آبشار آصف نگر پہنچا دیا تھا جہاں میں نے گھوڑا گاڑی کے اندر رفیق احمد کو دیکھا جسپر ایک خوفناک آدمی پستول سے نشانہ کر رہا تھا۔ میں اس آدمی کو سہارنپور دیکھ چکا ہوں لیکن اس کا نام نہیں جانتا" بزرگ فقیر کے چہرہ پر مسرت کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور وہ مسکرا کر بولا "تم میرے چیلے کی تحقیقات کرنے آئے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ نوجوان آدمی خوبصورت عورتوں کے

پھندوں میں جلد پھنس جاتے ہیں لیکن تمہارے خضر راہ کی طرح ہمارے یہاں بھی زہد واتقا کے مراحل ہیں ہم لوگ بھی دوسرے بزرگوں کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہیں" کامران کی آنکھوں میں ندامت کی علامات ہویدا ہوئیں۔ اور وہ بزرگ سے بہت کہنے لگا۔ روشن ضمیر بزرگ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں امید ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے میں آپ جیسوں کے فرقہ کو بالکل جاہل اور دین فروش سمجھے ہوئے تھا مگر اب میں قائل ہو گیا۔ آپکی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ عربی فارسی سے خوب واقف ہیں" بوڑھے فقیر نے ایک گہرا سانس لیکر جواب دیا۔ میں نے کسی زمانہ میں عربی فارسی پڑھی تھی۔ میرا بیشتر عمر کا زیادہ حصہ کوہ ہمالیہ پر بسر ہوا ہے ابھی دو سال سے سہارنپور واپس آیا ہوں۔ اب تو دنیا ہی بدل گئی۔

کامران نے سر جھکا کر بزرگ کی روشن ضمیری کا دل میں اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا اگر میں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی معاملہ کی امداد میں درخواست کروں۔ تو آپ کو ناگوار تو نہ ہوگا؟ بوڑھے فقیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور وہ اچھی طرح منہ کھول کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ نہیں بچہ ہرگز نہیں۔ میں کسی قابل نہیں اور نہ میں اب دنیا کے کسی معاملہ میں رائے دے سکتا ہوں۔ یہ بھی ایک ہوا تھی۔ کہ جو تجھ کو یہاں لے آئی۔ اب جو کچھ کام تجھے کرنا ہو۔ اپنے دنیاداری کے اصول کی پابندی میں کر ہاں اگر کوئی بات میرے چیلے کے قابل ہوگی۔ تو تیری مدد کریگا لیکن میں اس بات میں قطعی معافی چاہتا ہوں اب خدا حافظ۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"بزرگ گرو جی میرا نام کامران ہے"

"بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ خدا حافظ۔ کامران نے بڑے ادب سے بزرگ کو سلام کیا۔ جس نے اسٹول سے اٹھکر ہاتھ ملایا۔ اور کامران بالکل نئے جذبات اور نئے خیالات کو ساتھ لئے ہوئے مندر اور گرو کو خیرباد کہکر سیدھا سیدھا سڑک پر پہنچ گیا۔ جہاں سے وہ اس وقت گل جان کے یہاں جانا چاہتا تھا۔

ستائیسواں باب

دنیا میں سچا دوست نہیں ملتا

دس بجے کے قریب کامران گل جان کی حویلی پر پہنچا۔ اس کے دل میں اس وقت اپنے موجودہ فرائض کے علاوہ چند نئے نئے خیالات سما گئے تھے۔ وہ سمندر سے روانہ ہو کر تمام راستہ بحر فکر میں غوطہ زن رہا۔ اور دنیا کی نامعلوم طاقتوں اور اس گمنام ہندو فقیر کی کرامات کے مقابلہ میں اپنے آپ کو نہایت کمزور اور خجل سمجھنے لگا۔ انسان اپنی غفلت اور محدود خیالات کے سبب اپنے آپ کو طاقت ور اور دوسرے آدمیوں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے لیکن جب کبھی وہ اپنے خیالات یا اپنی قابلیت کو دوسرے کی طاقت یا خیالات سے مغلوب ہتھا دیکھ لیتا ہے تو اس کا قلب سکڑنے لگتا ہے اور بشاش مغرور آدمی تھوڑی دیر کیلئے مغموم اور پریشان ہو جاتا ہے یہی کیفیت اس وقت کامران کی تھی۔ اوس کے چہرہ اور آنکھوں سے بے رونقی مترشح تھی اس کی سرخ ٹوپی پر خاک کے دھبے لگ گئے تھے۔ فی الجملہ وہ ایک قسم کی شکست کھا کر آیا تھا لیکن شکست اس کی بالکل اس توڑ دینے والی ثابت ہونے کی جگہ اس وقت ایک قسم کی طمانیت اپنے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔ مقدس مہنت نے اصے رفیق احمد کے اصلی قاتل کی صورت خوفناک آشبار کے پل پر دکھا کر اسے بلاواسطہ اپنے کام میں مستعدی سے پڑ جانے کی تحریک دلائی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو خوفناک قاتل سے اس قدر قریب پاتا تھا۔ کہ وہ اوسے بڑی آسانی سے اپنے انگوٹھے کے نیچے دبا سکتا تھا۔ گل جان کی حویلی پر پہونچتے ہی اس کے دل میں ایک قسم کی حرارت پیدا ہوئی۔ اس نے دروازہ میں کسی کو نہ پایا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہوا۔ اور جیب سے رومال نکالکر ٹوپی کی گرد جھاڑنے لگا۔ دائیں جانب باورچی خانہ میں روٹیاں پکنے کی آواز آرہی تھی مگر باورچی اس کی طرف پشت کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اندر سے چھوٹا لڑکا کفن دسترخوان لئے ہوئے روٹی لینے آیا۔ اور کامران سمجھ گیا۔ کہ مکان کا مالک کھانا کھانے میں مصروف ہے اس

نے مسکرا کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک پرزہ کاغذ کا فاؤنٹین پن کی امداد سے لکھ کر اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ ایک منٹ بعد لڑکا مسکراتا ہوا واپس آیا۔ اور کامران کو اندر جلیئے کہہ کر بچے سے روٹی لینے لگا۔ کامران نے رومال سے اپنا منہ پونچھا۔ اور ویٹر کے راستہ سے اندر داخل ہوا۔ گل جان اپنی والدہ کے ساتھ اندرونی کمرہ میں کھانا کھا رہی تھی جنوبی دیوار کی دونوں کھڑکیاں کھل جانے سے اچھی خاصی روشنی اور چہک دمک موجود تھی۔ ماں بیٹی گول میز کے قریب کرسیوں پر تھیں۔ اور بلند اختر اور اس کا دوست ذرا فاصلہ سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کامران کے اندر داخل ہونے پر سب نے اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ کامران کی سب سے پہلے بلند اختر کے دوست پر نظر پڑی جس کی ڈراؤنی آنکھوں اور بے چین ابرو سے کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ بالفاظ دیگر وہ اس وقت رفیق احمد کے حملہ آور کے سامنے کھڑا تھا لیکن اوس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اپنے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں کر کے گلبان کو مسکرا کر دیکھا جس نے آہستہ سے آیئے۔ کھانا نوش فرمایئے۔ کہا لیکن کامران کو اس وقت گل جان کی آنکھوں میں ایک قسم کی بے چینی اور تردد دکھائی دیا۔ اس کے خوبصورت بھورے بال بکھرے ہوئے شانوں پر پڑے تھے اس کے بدن میں خوشنما رنگین ریشمی قمیص تھی جس کے باریک کپڑے کے نیچے کوئی اونی بنیان معلوم ہوتا تھا۔ ٹانگوں میں نیلا ریشمی پاجامہ تھا۔ گورے گورے پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ اوس کے خوبصورت چہرہ کی شادابی سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ کامران نے ایک کھڑکی کے نیچے سے ایک کرسی کھینچ لی۔ اور آپ کچھ تکلیف نہ کریں کہکر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں نوجوانوں کی موجودگی کا تسلیم سے اعتراف کر کے اس نے تبسم کے ساتھ گل جان کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنی مضطرب اور غم آلودہ نگاہیں کامران پر ڈالیں۔ اور ہاتھ سے روٹی توڑی۔ کامران کا چہرہ بالکل سنجیدہ ہو گیا۔ اوس نے متانت کیساتھ پوچھا مزاج کیسا ہے آپ کچھ سست معلوم ہوتی ہیں۔

بلند اختر اور اس کے دوست نے مشتبہ بے اعتباری سے کامران کی طرف دیکھا پھر دونوں دوست گل جان کی طرف دیکھنے لگے جس کا چہرہ انہیں بکھرے ہوئے

بالوں کی اوٹ میں اچھی طرح نہ دکھائی دیا۔ گل جان نے لانبا سانس بھر کر جواب دیا۔ "میں تو بالکل اچھی ہوں۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کامران نے متین لہجہ میں جواب دیا "الحمدللہ۔ بالکل اچھا ہوں۔ مگر آپ کے چہرہ سے نصیب اعدا کچھ ناسازی طبع کا معاملہ ہے۔

امیر جان نے کامران کو چڑھی ہوئی پیشانی سے دیکھ کر جواب دیا یعنی نامعقول آدمی دوسرے کے دل کی پرواہ نہیں کرتے۔ آج وہ جلال آبادی رئیس زادہ آیا تھا گل جان اس سے ڈر گئی۔ آدمی تو اچھا ہے لیکن کوئی فقرہ نامعقول نکل گیا ہوگا۔ کامران نے ہمدردانہ نگاہوں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا۔ جو کھانے پر گردن جھکائے فرحت علیخاں کے بھیانک چہرہ سے اور جو شیلے الفاظ نیز اس کی ناراضی کا خیال کر کے اپنے دل کو دھڑکتا ہوا پا رہی تھی۔ پھر آہستہ سے بولا "شاید اس نے کسی بات سے انکی دل آزاری کی ہوگی واقعی لوگ حسن و عشق کے معاملہ میں اندھے ہو جاتے ہیں لیکن اصلی مردانگی اور شرافت کا مقتضا یہ ہے۔ کہ خداداد حسن کے آداب و لحاظ میں انسان اپنی معشوقہ کو پھول کی طرح بے لوث اور شاداب سمجھ کر کسی طرح کی دل شکن بات زبان پر نہ لائے"

گل جان نے کامران کو شکریہ آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ یہ سمجھی۔ کہ شاید کامران بھی عنقریب اس کے آگے نکاح کی درخواست پیش کریگا۔ لیکن وہ شاید ایسا ہی مردانہ وار اور شریف ثابت ہوگا جیسا وہ دوسروں کو بنانا چاہتا تھا۔ بلند اختر کو اپنے غصہ کی آگ میں کامران کے اس کلمہ سے زیادہ ایندھن پڑتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر اسے اس بات کے سہارے نے ضبط کرنے کی طاقت دی۔ کہ گل جان اس سے سینکڑوں دفعہ کہہ چکی تھی "مجھے تم سے زیادہ کوئی پیارا نہیں" گل جان نے کامران کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہنے لگی خلقت عورتوں کو اینٹ پتھر سمجھتی ہے۔ گویا نکاح زبردستی بھی ہو سکتا ہے۔ کامران نے گل جان کی آنکھوں میں ایک قسم کی فریاد محسوس

کی اور چونکہ یہ فقرہ محض اوسے مخاطب کر کے کہا گیا تھا۔ اوس نے جھوٹی متانت سے چہرہ کو بارعب کر کے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ" آپ ایسے لوگوں کو کیوں مکان میں آنے دیتی ہیں۔ معاف فرمایئے گا۔ میں آپ کے حسن کا گرویدہ ضرور ہوں۔ لیکن یہ مجھ سے کبھی نہ ہو سکیگا کہ آپ کے دل پر ذرا بھی میل اپنے سبب سے پیدا کر سکوں۔ اور اگر آپ کو میرا آنا جانا ناگوار معلوم ہوگا۔ تو میں ٹھنڈے دل سے صبر کر کے بیٹھ رہونگا۔ جنگلی لوگ تہذیب اور متانت کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ گل جان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ کامران کے الفاظ کسی قدر بے حجاب اور مصنوعی تو تھے۔ لیکن گلجان کو ان سے ایک قسم کی تسلی ہوئی۔ اور وہ دل میں سمجھنے لگی۔ امداد علی ضرور کسی شریف خاندان کا آدمی ہے۔ اس کی باتیں۔ برتاؤ۔ اور کھلتا ہوا چہرہ ہر چیز بذات خود ایک سفارش تھی وہ بلند اختر کی طرح چھچھورا اور زود رنج نہ تھا۔ اس کے دل میں سچی بہادری موجود تھی اور وہ بلند اختر یا دوسرے نوجوانوں سے مضبوط بھی معلوم ہوتا تھا۔ اوسے خیال ہوا کہ یہ شخص قابل اعتماد و دوستی ہے۔ اوس سے محبت تو گلجان نہیں کر سکتی تھی۔ محبت کے معاملہ میں تو اوسنے بلند اختر کو قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن کیا وہ اوس شخص کو سچی دوستی سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دے سکتی تھی۔ اوس نے شکریہ آمیز آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھا۔ جس کے اندر آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ پھر کانپتی ہوئی آواز سے بولی مسٹر امداد علی مجھے آپ سے دو گھنٹہ کے اندر محبت ہوگئی ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ دوست سمجھونگی۔ شاید اختر ناراض ہو لیکن میں جس نگاہ سے اختر کو دیکھتی ہوں۔ اوس سے کسی کو نہیں دیکھ سکتی۔ بلند اختر کا دل اچھلنے لگا۔ اور اوس کے چہرہ پر رونق کی علامات پیدا ہوئیں بلند اختر کے دوست نے دھڑکتے ہوئے دل سے خوبصورت عورت کی طرف دیکھکر سوچا۔ کاش گلجان کی جگہ مسکینہ کامل ہوتی۔ کامران نے پرتبسم چہرہ سے جواب دیا۔ محترمہ خاتون آپ اطمینان رکھیں۔ اگر آپ کو واقعی مسٹر بلند اختر سے محبت ہے۔ تو اس میں ذرا مداخلت نہ کرونگا مجھ کو بھی در اصل چند گھنٹوں کے اندر اختر سے زیادہ محبت ہوگئی ہے۔ اور میں آپ کی خدمت کرنا عین فرض سمجھونگا۔

گل جان کے دل میں ایک قسم کی نئی حرارت پیدا ہوئی۔ اور وہ آنسو بھری نگاہوں سے کامران کو دیکھکر بولی۔ مجھے آپ کی دوستی پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ گو ابھی یہ کسی کو معلوم نہیں کہ آپ بھی کسی دن فرحت علیخاں کی طرح مجھ سے دشمنی کی ٹھان لیں"۔

کامران کے دل میں جوش بھر آیا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اٹھکر خوبصورت لڑکی کا منہ چوم لے اور اسے سینہ سے لگا کر کہے" میں ہمیشہ تیرا دوست رہونگا۔ خاوند بننے کی آرزو نہ کرونگا مگر یہ بات بالکل ناممکن تھی۔ اوس نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں کوشش کرونگا۔ آپکی آنکھوں میں سچے دوست کی وقعت حاصل کرسکوں"۔ اتنے میں کھانا ختم ہوگیا۔ برتن اٹھائے جانے لگے۔ خورد سال کلن نے ان دونوں ماں بیٹیوں کے ہاتھ دھلائے۔ اور شجاعت علی نے پان وحقہ کی تیاری کی۔

کامران نے گل جان کے خوبصورت ہاتھ سے پان لیکر تسلیم کہی۔ پھر بلند اختر کی طرف دیکھکر بولا۔ آپ کے معزز دوست کا اسم مبارک" بلند اختر نے مسکراکر جواب دیا آپ کا نام دلاور علی خان ہے۔ آپ میرے بڑھے گہرے دوست ہیں۔

کامران جھوٹے تبسم کی صورت بناکر کھڑا ہوگیا۔ اور دبتے ہوئے دل سے دلاور علی سے مصافحہ کرکے بولا۔ آپ جیسے معزز اور شریف لوگوں سے نیاز حاصل ہوجانا فخر و مباہات سے کم نہیں" کاش دلاور علی کو معلوم ہوتا۔ کہ وہ عنقریب اس کی دلاوری پر خاک ڈالنے کا ارادہ کرکے آیا تھا۔ جب کامران کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو بلند اختر نے مسکراکر گلجان کیطرف دیکھا۔ اور جوش بھری آواز سے بولا۔ پیاری گل جان دلاور علی کہتے ہیں۔ کہ نماز عید کے بعد لوگ گل چلیں۔ اور وہاں خیمہ میں رات بسر کریں۔ شاید آپ کی والدہ صاحبہ اور مسٹر امداد علی بھی منظور کرلینگے۔ گل جان کے نوخیز دل میں سیر و تماشہ کے اشتیاق نے اضطراب پیدا کیا۔ اور وہ چلاکر بولی ماماں ہم تو ضرور چلیں گے۔ سنا ہے۔ وہاں دریا سے نہر نکلی ہے بڑھی عورت نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا ایسی سردی میں خیمہ میں بڑی تکلیف ہوگی کیوں مسٹر امداد علی آپکی کیا رائے ہے۔ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور نہ بلند اختر اور اس کے دوست کی دلی منشا سے واقف تھا

لیکن اوسے سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ اور وہ ان دونوں آدمیوں کے بیٹ میں گھس کر کوئی بات کام کی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اوس نے سکر کر جواب دیا مجھے گلجان نسیم کی کشش سے ضرور جانا پڑیگا۔ ابھی عید الضحیٰ میں دو روز باقی ہیں خیمہ کا انتظام کر لینا چاہئے یہ مقام گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے۔

بلند اختر نے شگفتہ دلی سے جواب دیا۔ کوئی بیس میل ہوگا۔ گل جان نے اُچھلکر کہا کچھ دور نہیں۔ ہماری فٹن جا سکتی ہے۔ بوڑھی عورت کو بھی لاجرم منظور کرنا پڑا۔ اور کامران کو گل جان کی زاہد فریب صحبت میں ایک شبانہ روز بسر کرنے کا بڑا اچھا موقعہ نظر آنے لگا۔ کامران نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ رخصت ہونے لگا۔ گلجان نے اسے محبت سے ٹھہرایا۔ اور پوچھا۔ کیا آپ بھی سکاؤ میں ہیں۔ یہاں آجایئے۔ آپ کے لئے غریب خانہ موجود ہے۔

کامران نے شکریہ ادا کر کے جواب دیا۔ میں آپ کی عنایت کا تہ دل سے شکر گذار ہوں سر دست مجھے سرائے میں تکلیف نہیں۔ اگر ضرورت ہوئی۔ تو میں یقیناً آپ کے ہاں آجاؤنگا کامران اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن گلجان نے اوسے اصرار سے دیگر بٹھلایا۔ اتنے میں چائے آگئی۔ اور سب صاحبوں کے پیش کی گئی۔

اٹھائیسواں باب

نئی حکمت عملی

دوسرے دن کامران کی آنکھ پانچ بجے صبح کھل گئی۔ اسے اپنے گھر کی پشت پر ایک نیز بلند آواز ہ راوی جاں سوز کے ساتھ ایک بارگانا چواسنائی دیا۔ کامران نے لحاف سے منہ نکال کر پیچھے گھر میں دیکھا۔ تو چاروں طرف تاریکی نظر آئی وہ چاہتا تھا کہ پھر سو جائے لیکن فقیر اس قدر زور زور سے گا رہا تھا کہ اس کی آواز کامران کے

کانوں میں گھسی جاتی تھی۔ اور جس استقلال سے فقیر لوگ قدم جما کر کھڑے ہو جاتے ہیں اس کا لحاظ کر کے کامران کو امید نہ تھی۔ کہ فقیر اس محلہ میں سے جلد رخصت ہوگا۔

کامران کے منہ سے "کمبخت" نکلا۔ اور اس نے لحاف سے نکل کر چراغ روشن کیا پھر اوور کوٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سماوار لا کر گرم پانی اور چائے کی فکر کرے۔ کہ اس کے دل میں یکایک ایک بالکل نیا خیال پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنی کوٹھڑی کی زنجیر کھولی۔ اور سر پر دولائی اوڑھے ہوئے گھر سے باہر نکلا۔ مکان کے دروازہ کھلنے سے فقیر سمجھا شاید کوئی بھیک دینے آیا ہے۔ اور جیسا کہ مشہور ہے۔

اگر نعمتے دو کس بر دوش گیرند
لئیم الطبع بپندارد کہ خوانست

فقیر جھپٹ کر اس کی طرف مخاطب ہوا۔ کامران نے اس فقیر کی جوانمردی اور محنت کشی پر تعجب کیا۔ یہ مسلمان فقیر چالیس سال کا ہوگا۔ اس کا قد ذرا لانبا مگر بدن گٹھا ہوا تھا۔ رنگت سیاہ جلیہ بھیانک چہرہ کتابی۔ مگر بحیثیت مجموعی ساری ہیئت قدرے بھیانک تھی خصوصاً اس لئے کہ سر بالکل ننگا تھا۔ اور لمبے لمبے سیاہ بال پیچھے پڑے ہوئے تھے بدن کمل سے ڈھکا ہوا تھا۔ مگر پاؤں بالکل ننگے تھے جب فقیر نے کامران کو دعا دینے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ تو کامران نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ اندر آؤ۔ تمہیں پیسہ ملیگا" فقیر جھوٹکا بھیک مانگنے والے اکثر بودے دل کے ہوتے ہیں۔ اور ہمت کی کمی ہی کی بدولت سوال کی ذلت گوارا کرتے ہیں۔ اس لئے کامران کے بلانے پر فقیر کو خطرہ گدا اور گواہی صبح کی روشنی اچھی طرح نہ پھیلی تھی۔ مگر کامران کو اس کے خوفزدہ چہرے سے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اندر نہ آئیگا۔ کامران نے پھر بڑی نرمی سے کہا۔ "یہاں زنانخانہ نہیں ہے۔ میں تم سے ایک ضروری کام لینا چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے پیشہ میں ذرا بھی ہرج نہ ہوگا اور میں تمہیں آٹھ آنہ روز دیا کرونگا۔ آٹھ آنہ روز کے نام سے فقیر کی آنکھیں چمکیں مگر وہ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔ نہیں صاحب ہم سے نوکری نہیں ہوگی۔

کامران کو غصہ آگیا۔ اور اس نے پیشانی پر بل ڈالکر آہستہ سے کہا۔ احمق

آدمی میں تجھے نوکر تو نہیں رکھتا۔ چاہتا جس طرح اب دن بھر بھیک مانگتا رہتا ہے۔ اسی طرح اپنے پیشہ میں لگا رہتا۔ مجھے جو کام تجھ سے کرانا ہے۔ وہ تیرے شغل کے ساتھ ہوتا جائیگا۔ اور میں تجھ سے اپنے گھر کا کوئی کام نہ لونگا۔ فقیر جو اس وقت خوفزدہ آنکھوں سے کامران کو دیکھ رہا تھا۔ اوس کی بات کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ اور اس نے اپنے مزید اطمینان کے لئے پوچھا۔ تم پہلے اپنا کام بتلاؤ۔ کامران نے مسکرا کر کہا۔ بھلے مانس اندر تو آؤ۔ یہاں سڑک پر کیا سے ہو کر باتیں نہیں کی جا سکتیں۔ جب فقیر کامران کے پیچھے مکان میں داخل ہو گیا۔ تو کامران نے دروازہ میں زنجیر لگا دی۔ اور فقیر کو اپنی کوٹھری میں لے گیا۔ جہاں ابھی تک چراغ جل رہا تھا۔ کامران نے ہنسکر فقیر کی طرف دیکھا۔ پھر دیوار کے پاس سے سماوار اٹھا کر کہنے لگا کام تو پیچھے بتلاؤنگا۔ پہلے تمہیں گرم گرم چائے پلاؤں چائے کے نام پر فقیر نے ہونٹ پر زبان پھیری۔ اور کل اچھی طرح اوڑھ کر کہنے لگا اچھا بابا خدا تمہیں اس کا اجر دیگا" اور یہ کہکر فقیر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کامران نے سماوار میں کوئلے رکھکر دس منٹ میں چائے تیار کر لی۔ اور طاق سے پیالی اٹھا کر فقیر کیلئے ایک پیالی بنائی۔ ابھی کامران نے ہاتھ منہ بھی نہ دھویا تھا۔ اوس نے فقیر کو پیالی دیکر کہا۔ تم بیٹھے رہو۔ میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں" پھر لوٹا لیکر باہر آیا۔ اور اپنے مکان کے دروازہ میں قفل ڈال کر قضائے حاجت سے فراغت پائی۔ پھر منہ دھویا اور تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر اندر داخل ہوا۔ فقیر خیالات کے ہجوم میں کامران اس فقیر کو بسکٹ دینا بھول گیا تھا۔ اب اس نے دو بسکٹ طاق سے نکال کر ایک فقیر کو دیا جس نے الحمد للہ کہکر بسکٹ کھانا شروع کیا۔ کامران نے پلنگ پر بیٹھ کر چائے پی۔ پھر سگار سلگا کر بولا۔ دیکھو تمہیں مفت میں آٹھ آنہ روز کا کام مل گیا" یہکر کامران نے اپنے اوورکوٹ سے پستول نکال کر دیکھا۔ اور مسکرا کر فقیر سے کہنے لگا:

میں دراصل خفیہ جاسوس ہوں۔ جاسوس کے معنی سمجھتے ہو۔ میں بدمعاش لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ اور پتہ لگاتا ہوں۔ چور اور بدمعاش کیا کرتے پھرتے ہیں۔ سمجھے کامران کے چہرہ پر تفکر سے رونق آرہی تھی۔ اور پستول کی صورت سے غریب فقیر کی

روح لرز رہی تھی۔ وہ گھبرا کر بولا۔ تو کیا تم مجھے مارنے کو لائے ہو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے
کامران نے ہنس کر کہا "لاحول ولا قوۃ میں تمہیں دوست بنانے والا ہوں" "ڈرو مت"
یہ کہکر پستول اپنے تکیہ کے نیچے رکھدیا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ایک شخص اس شہر میں بڑا خون
کر کے آیا ہے۔ وہ رہنے والا اسی شہر کا ہے۔ اور اکثر اس شخص کے مکان پر آیا کرتا تھا۔
جس کا مکان میرے گھر کے سامنے ہے تم سمجھے" فقیر نے کہلے ہوئے منہ کو بند کر کے آنکھوں
سے اشارتاً بتلایا۔ کہ وہ سمجھ گیا۔ پھر کامران بولا۔ اچھا تو میں اس شخص کو گرفتار کرانے سے پہلے
یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ شخص جو خون کر کے آیا ہے۔ سہارنپور میں کس کس کا دوست
ہے۔ اور کہاں کہاں آتا جاتا ہے نیز کس محلہ میں رہتا ہے۔ زیادہ باتیں تو میں خود معلوم
کرلونگا۔ میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ تم اپنا زیادہ وقت اسی محلہ میں صرف کرو۔ اور شور مچانے کی
جگہ خاموش پھرتے رہا کرو۔ جب اس مکان میں سے نوجوان بلند اختر باہر نکلے تم فاصلہ دیکر
پیچھے پیچھا کرو۔ اوس کے ساتھ عموماً اس کا دوست بھی ہوتا ہے۔ جہاں جہاں یہ لوگ
جائیں۔ تم مجھے وقتاً فوقتاً اپنے پیچھے بھیجکر بتلا دینا۔ بس اتنا کام ہے۔ اور کچھ نہیں اس
محنت کے لئے تمہیں ایک ہفتہ کے لئے آٹھ آنہ روز دینا منظور کرتا ہوں لیکن ایک شرط یہ
ہے۔ کہ تم کسی سے اس معاملہ کا ذکر نہ کرو۔ اپنے بیوی سے بھی نہ کہنا۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہیں
ان بدمعاشوں کیساتھ تم الٹے نہ پھنس جاؤ۔ تمہیں یہ کام منظور ہے یا نہیں۔ فقیر نے
پیشانی پر بل ڈال لئے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک زمین کی طرف
دیکھتا رہا۔ اس اثنا میں کامران نے چراغ گل کر دیا۔ اور فقیر سر اٹھا کر بولا۔ کام تو منظور
ہے۔ لیکن اگر مجھے کسی نے پکڑ لیا۔ اور یہ کہکر خوفزدہ آنکھوں سے کامران کیطرف دیکھنے لگا
کامران نے ہنس کر کہا۔ بھلا تمہیں بلاوجہ کون پکڑ سکتا ہے۔ میں تمہارا ساتھ دونگا
اور تم یہ سمجھ لو۔ کہ آٹھ آنہ روز مفت میں عیش گے۔ فقیر کے دل میں اس وقت الجھے ہوئے
خیالات پیدا ہو رہے تھے سلجھانے کی غریب میں قابلیت نہیں تھی۔ وہ گھبرا کر بولا۔
بہت اچھا منظور ہے"
کامران نے مسکرا کر اوس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ

سے کہنے لگا۔ شاباش۔ شاباش۔ فقیر لوگ بڑے دور لوک ہوتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی۔ کہ تم نے اس کام کو منظور کر لیا۔ اب آٹھ آنہ روز آرام سے کما سکو گے اب تم باہر جاؤ۔ اور اس محلہ کے اندر ہی اندر پھرتے رہو۔ اس سامنے والے مکان کے گرد گشت رہنا آٹھ آنہ روز کے علاوہ میں تمہیں ایک وقت دن کا کھانا بھی کھلا دیا کرونگا گویا تم میرے کام میں صبح چھ بجے سے آٹھ بجے شام تک لگے رہا کرو گے اور آٹھ بجے شام کو سب کیفیت کہکر اپنے گھر جایا کرو گے۔ یہ بہت اچھا منظور ہے۔ فقیر کے منہ سے نکلا۔ کامران نے اوسے دروازہ پر لاکر قفل کھول دیا۔ اور کیواڑوں میں جھانک کر اسے باہر نکال دیا۔ اس وقت محلہ میں سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی بوڑھا مسجد سے نماز پڑھ کر آرہا تھا۔ کامران نے دن بھر کے مشاغل کے لئے پروگرام بنایا۔ اور آج علی الصباح کی کارروائی پر بیحد خوش ہوا۔ اور اصل دنیا کے ہزارہا کام سختی اور حکمت عملی سے نکلتے ہیں۔ کامران کو کنگال لوگوں کی طرف بڑی بدگمانی تھی۔ اور اسے قطعی امید نہ تھی۔ کہ یہ فقیر اس کے کام کا بیڑا اٹھا سکیگا۔ اسی واسطے وہ پستول نکال لایا تھا۔ کہ اوسے ڈرا دھمکا کر اپنے قبضہ میں کریگا دنیا کی زندگی دراصل زبردست طاقتوں یا اجسام کی حکومت ہے۔ طاقتور آدمی کمزور کی بے دست و پائی سے فائدہ اٹھایا کرتا ہے۔ دنیا کے لاکھوں کروڑپتی غریب نادار لوگوں کو دو چار آنے روز پر رکھ کر خوب محنت کراتے ہیں۔ اور ان کی محنت کا پھل خود سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے اوپر کچھ منحصر نہیں۔ بڑے جاندار درخت بھی اپنے نیچے گیاہ اور سبزہ کو چوس چوس کر تیار کر دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ طاقتور کا ہمیشہ بول بالا چلا آیا ہے

انتیسواں باب

جوانی دیوانی

رات حسب معمول سرد اور طویل تھی۔ گلجان کی حویلی کے دروازہ پر آٹھوں

تاریخ کا چاند فرحت خیز روشنی پھیلا رہا تھا۔ کامران اس وقت اپنے گھر سے آ رہا تھا۔ جہاں اس کے اجنبی دوست فقیر نے بلند اختر کی نقل و حرکت کو تاڑ کر اپنے غیر معمولی آتا کیلئے مفصل رپورٹ کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ فقیر اس شہر میں عرصہ دراز سے تھا۔ لیکن اسے جن گھروں سے بھیک ملتی تھی۔ وہ ان کے مکانوں سے قریب ہی قریب ناواقف تھا۔ بلند اختر اور اس کے دوست نے اس دن زیادہ مقامات کی سیر نہیں کی تھی۔ وہ کئی گھنٹے تو گلجان کے ہاں رہے تھے۔ پھر دونوں نے بلند اختر کے مکان پر کھانا کھایا تھا۔ دو بجے دن کے قریب دونوں آدمی ایک ہندو مہاجن کے گھر پر گئے تھے جسکا نام فقیر کو معلوم نہیں تھا۔ چار بجے دونوں علیحدہ ہو گئے تھے۔ فقیر نے بلند اختر کے پیچھے رہ کر یہ معلوم کیا تھا۔ کہ وہ گھر سے کپڑے بدل کر اور سفید فلالین کا سوٹ اور انگریزی ٹوپی پہن کر ریلوے سٹیشن پر چلا گیا تھا۔ جہاں فقیر کو بلند اختر کا دوست دلاور علی بھی نظر آیا۔ موخر الذکر بھی انگریزی لباس میں تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس ریل کے انگریزی اور یورپین ملازموں کا ٹینس کلب تھا جس میں مردوں کے علاوہ چند نوجوان لڑکیاں بھی شریک تھیں۔ دونوں دوست شام تک ٹینس کھیلتے رہے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد دونوں گل جان کے ہاں واپس آئے فقیر ان دونوں کو گل جان کی حویلی پر چھوڑ کر دن بھر کی رپورٹ کامران کے آگے پیش کرنے گیا تھا۔ اور کامران نے سب باتیں نوٹ کر کے اور فقیر کے ہاتھ میں دو چونیاں دیکر کہدیا۔ کہ کل علی الصباح آنا اور ہندو مہاجن کا مکان مجھے بتانا اس کے بعد کامران انگریزی لباس زیب تن کر کے جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا گل جان کی حویلی پر پہنچا۔ جہاں اسے شاندار جگمگاتے ہوئے کمرے میں دونوں دوست اور ماں بیٹیاں شطرنج پر مصروف دیکھیں۔ دونوں دوست سفید فلالین کے سوٹ ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے گلے ایک سے پٹکے تھے۔ دونوں کی ٹوپیاں کرسیوں پر لٹک رہی تھیں۔ کامران کو دیکھ کر دونوں نے پرتپاک الفاظ میں کہا۔ چاروں فوراً شطرنج میں لگ گئے۔ گلجان نے سر بدن سے ملگجا آنارے بدن پر مغربی اون سوئٹر پہنے

بڑی گرم جوشی سے شطرنج کھیل رہی تھی۔ اور چاروں میں وہی سب سے زیادہ مسرور معلوم ہوتی تھی۔ کامران سند کھڑکی کے نیچے بیٹھا کھیل کا تماشہ دیکھتا رہا۔ گل جان نے بار مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر کلن کو پس پشت آواز دے کر جلدی سے کہا "آپ تیسرے چائے لاؤ۔ حقہ پان پیش کرو" یہ کہکر پھر مضطرب ہاتھوں کو شطرنج میں لگا دیا۔ نصف گھنٹہ کے اندر جب کامران عمدہ مزہ دار چائے کے بعد سگار پیتا پیتا تھک گیا تھا۔ ان چاروں نے شطرنج کی بساط لپیٹی۔ اور گل جان نے گرم خساروں اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے بلند اختر کو دیکھ کر زور کی آواز سے کہا "شطرنج میں مرد۔ عورتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر تبسم آنکھوں سے کامران کو دیکھ کر بولی "مسٹر امداد علی آپ کو بڑی تکلیف ہوئی فرمایئے آپ آج کہاں کہاں رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ دن بھر کیا کرتے ہیں۔ کیا سرائے میں کسی بھٹیاری سے دل لگا لیا" اس فقرہ پر سب نے ایک فرمائشی قہقہہ مارا۔ خود کامران کو بھی ہنسی آگئی۔ اور وہ گرم جوشی سے بولا "معاف کیجیے گا۔ آپ کو دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی شخص بھٹیاری پر جان دیتے گا۔ تو اس کی حماقت میں کیا کلام ہے" گل جان نے شرما کر بلند اختر کی طرف دیکھا۔ جو کامران کے جواب سے خوش نہ تھا۔ اتنے میں شجاعت نے کھانے کا اعلان کیا۔ اور وہاں بیٹھیوں کے ہاتھ دھلا تینوں بیکار مردوں سے بھی تواضع کے طور پر شریک طعام ہونے کے لئے اصرار کیا گیا۔ مگر یہ اصرار پرجوش زبان سے نہیں تھا۔ بہرحال کوئی شریک نہ ہوا۔ اور تینوں آدمی الگ الگ بیٹھ کر حقہ اور پان اڑانے اور ادھر ادھر کی باتیں گھڑنے لگے۔ یہاں بیٹیاں ابھی کھانے میں مصروف تھیں۔ کہ خورد سال لڑکا روٹیوں کی ایک بند خط لایا۔ جو گل جان بیگم کے نام تھا۔ گل جان نے بائیں ہاتھ سے بامضطراب نام خط کھولا۔ اور جلدی جلدی اس کے مضمون کو پڑھنے لگی۔ جب وہ خط ختم کر چکی۔ تو لڑکے سے پوچھا کون لایا ہے۔ لڑکے نے بستہ سی جواب دیا "ایک آدمی لایا ہے۔ سرخ دوپٹہ اور چپراس باندھے بیٹھا ہے" جواب مانگتا تھا۔ سب لوگوں کو اس خط کے مضمون کا اشتیاق ہوا۔ امیر جان نے متبسم لہجہ میں پوچھا "کس کا خط ہے؟"

گل جان نے پر تبسم دل سے جوش میں آکر کہانے سے تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور ماں کی طرف دیکھ کر بولی کسی رئیس کا خط ہے۔ یہ مضمون ہے۔

معزز بیگم ہم نے آپ کے گانے بجانے کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اور ہمیں رقص و سرود کا بڑا شوق ہے۔ آج ہمارے خورد سال لڑکے کی بسم اللہ تھی جس کی خوشی میں ہم نے جشن کیا ہے۔ کہ عید الفطر کے اگلے دن ایک جلسہ رقص و سرود کا منعقد کیا جاوے پنجاب اودھ اور بمبئی و کلکتہ کی مشہور طوائفاں کو تار دیکر بلایا ہے۔ اور بیس پچیس معزز آدمی مدعو کئے گئے ہیں۔ ایک رئیس زادہ نے آپ کے گلے اور کمال موسیقی کی اس قدر تعریف کی ہے۔ کہ ہم حد سے زیادہ مشتاق ہو گئے ہیں۔ اور صرف ایک گھنٹہ کے مجرے کی تکلیف کے عوض میں ایک ہزار روپیہ آپ کو دے سکیں گے۔ اور آپ کے جملہ اخراجات آمد و رفت خود برداشت کریں گے۔ گیارہویں ذوالحجہ کو بوقت آٹھ بجے شب معززین کی دعوت ہے جس میں آپ بھی شریک ہوں۔ نو بجے شب سے صبح تک گانا بجانا رہیگا۔ سب مہمان کے قیام کا انتظام کوٹھی رام لال کی کوٹھی میں انتظام کر دیا گیا ہے۔ اور وہیں جلسہ قرار پایا ہے اگر آپ اس جلسہ کی شرکت پر راضی ہوں۔ تو بذریعہ حامل پرچہ ہذا مطلع فرمائیں۔ چونکہ ہمارے ذوجہ کو ہی سال گذرے انتقال کر گئی اس لئے ہم آپ کا گانا سننے کے علاوہ آپ سے دوستانہ پیدا کرنے کے بھی شائق ہیں۔ جواب کو خود تشریف لانے سے معلوم ہو جائیگا۔ اور محض اپنے دلی اشتیاق کے سبب سے ہم آپ کو خود لینے آئینگے۔ اگر آپ تنہا تشریف لاویں تو بہتر ورنہ گیارہ بجے دن سے پہلے مہمان پہلے سے تشریف آوری کی اطلاع بھیج چکے ہیں۔ لیکن اگر آپ تنہا نہ آنا چاہیں۔ تو دو چار احباب کو ساتھ لا سکتی ہیں۔ میں گیارہویں تاریخ دس بجے اپنی موٹر کار لے کر آؤنگا۔ اگر آپ کے ساتھ دو چار آدمی آنیوالے ہوں۔ تو اطلاع دیں تاکہ دو موٹر کاریاں لیتا آؤں۔ جواب فی الفور بھیجئے گا۔ بہت سا انتظام درپیش ہے۔

آپ کا غلام

اسرائیل خاں رئیس محلہ حال مقیم مظفر نگر کوٹھی لالہ گھاسی رام

اس خط کے مضمون سے گل جان کے دل پر رقص و سرود کے جلسے کی امنگ

نے اس قدر غلبہ پا لیا تھا۔ کہ اس وقت اس کا دماغ اور کان چکر میں آ گئے تھے۔ اور اسے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ اسی وقت کھانا چھوڑ کر جلسہ میں جانیوالی ہے۔ اور سے کھانے کی طرف بھی چنداں رغبت نہ رہی۔ اور رخساروں کو سرخ کر کے بولی "اماں جلدی بتاؤ کیا جواب لکھوں۔ آدمی بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ ہاں اسے کھانا بھی تو کھلانا چاہیئے"۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں اور گھبرائے ہوئے چہرے سے بلند اختر کی طرف دیکھ کر بولی "اختر تمہاری گاؤں والی تو تجویز سر دست ملتوی کرنی پڑیگی۔ میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہونگی۔ میں ایک گھنٹہ کے لئے ایک ہزار کی رقم ہاتھ سے نہیں دیسکتی۔ لاؤ خط پڑھو۔ اور جھٹ پٹ رائے قایم کرو۔ بلند اختر نے دبے کچلے دل سے خط لیا۔ اور اسی وقت ایک نامعلوم اندیشہ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ کہیں گل جان کسی ایسے رئیس کے یہاں نہ پہنچ جائے۔ جو اس کا دل فی الفور اپنی مٹھی میں کرلے۔ اور وہ دیکھتا رہجائے اس نے لمبا سانس بھر کر خط پڑھنا شروع کیا جس پر اس کا دوست دلاور علی بھی جھک گیا۔ خط نہایت عمدہ فیمتی کاغذ پر لکھا ہوا تھا جس پر بیل بوٹوں کے اندر کچھ جدید جلغرا انگریزی میں لکھے ہوئے تھے لیکن ان کے معانی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

بلند اختر نے دو منٹ میں ختم کر کے جواب دیا "مجھے یہ جلسہ پسند نہیں"۔ اور ناک بھوں چڑھا کر خط کو گل جان کے ہاتھ میں دیا۔ پھر گل جان نے یہ خط کامران کے ہاتھ میں دیکر کہا۔ مسٹر امداد علی آپ تجربہ کار اور ہوشیار آدمی ہیں۔ خط کو بغور دیکھکر بتلایئے کہ اس میں کوئی بات دھوکے کی تو نہیں۔ کہیں میں ایک گھنٹہ تک مفت میں دماغ تھکاؤں۔ اور کچھ ہاتھ نہ لگے۔

کامران نے خط بغور پڑھنا شروع کیا۔ اور گل جان نے مضطرب آواز میں اپنی والدہ سے کہا۔ اماں تم بعض وقت ایسی سست پڑجاتی ہو۔ کہ بات ہی نہیں کرنی چاہیئں۔ تم نے ہزاروں جلسے تماشے دیکھے ہونگے جلدی بتاؤ۔ کیا جواب لکھوں۔ ہاں شجاعت اس چیز اسی کو کھانا کھلاؤ"۔ امیر جان نے اپنے دماغ کو فی الفور سیدھا کیا۔ اور لحاف میں بھر کر بولی "بی نوجان تیرا کام لبکن میں تجھے تنہا نہیں بھیجنا چاہتی" "تنہا کون جاتا ہے

میں آخر تم کو ساتھ لیجاؤنگی۔ شاید مسز امداد علی بھی چلیں لیکن اماں میں ضرور جاؤنگی۔ اور تمہارا ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔ اتنے بڑے جلسے میں میں گھبرا جاؤنگی۔ کامران نے خط کو ختم کرکے لفافہ میں رکھا۔ اور پھر باہر سے لفافہ کا طغرا دیکھ کر بولا۔ اس معزز آدمی کے خط سے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ وہ روپیہ نہ دیگا۔ لیکن دنیا کی کوئی بات قابل اعتبار نہیں۔ بہرحال آپ چپراسی کو اندر تو بلایئے۔ میں اس سے چند سوالات کرونگا۔ گلجان نے آواز دیکر شجاعت کو واپس بلایا۔ جو چپراسی کو کھانا کھلانے جا رہا تھا۔ اور پرجوش آواز میں کہا چپراسی کو اندر بھیجدو۔ کھانا یہیں لے آؤ۔ باہر فرش پر کھائیگا۔ ایک منٹ کے بعد نایک بوڑھا پچاس سالہ چپراسی اندر آیا جس نے جھک کر سب کو سلام کیا۔ کامران نے اس کو بغور دیکھا۔ وہ دبلے پتلے بدن کا آدمی تھا چہرہ سفید اور پتلا داڑھی اور سر کے بال حنا سے سرخ رنگے ہوئے۔ ناک اونچی تھی۔ آنکھیں چھوٹی اور بے رونق چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بدن پر سیاہ بانات کی پرانی اچکن تھی۔ سر پر سرخ دوپٹہ۔ انگلیوں میں سفید کوبل رین کا پاجامہ پاؤں میں پرانا سیاہ موزہ تھا کامران نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "تم کس کے چپراسی ہو؟" چپراسی نے خوفزدہ آنکھوں سے کامران کو دیکھ کر کہا۔ حضور اسرائیل خانصاحب کا۔ اسرائیل خاں صاحب تسہ کے رئیس بڑے زمیندار تعلقدار ہیں۔

کامران نے اس کی چپراس کی طرف دیکھا جس پر کوئی عبارت تحریر نہ تھی۔ صرف بخط طغرا حروف بنے ہوئے تھے۔ جو خط کے کاغذ اور لفافہ پر بنے ہوئے تھے۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ تم کب آئے اور کہاں سے آئے ہو؟ چپراسی نے کھانس کر جواب دیا۔ ابھی ۹ بجے کی گاڑی سے آیا تھا بڑی مشکل سے یہ حویلی ملی۔ اب مجھے جلدی جواب دیجئے میں آج رات کو انبالہ جاؤنگا۔ وہاں بھی ایک ضروری کام ہے۔ کامران اب کرسی پر بیٹھے کر گل جان سے کہنے لگا۔ اچھا اتنے میں یہ چپراسی کھانا کھائے آپ جواب لکھدیں شجاعت بولا ہے چپراسی کو دوسرے کمرے میں لیگیا۔ گلجان نے ایک میز سے کاغذ اور لفافہ نکالا۔ اور کامران سے کہنے لگی مسٹر امداد علی میری رائے میں یہ بات آتی ہے۔ کہ ہم ناچوں [illegible] اور وہ موٹر لاریاں منگالیں بڑا سفر رہیگا میں بہت کار کرد دل سے پسند کرتی

ہوں" کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں دراصل مظفر نگر جانے کیلئے تیار نہیں ہوں نماز عید الضحیٰ لاہور میں پڑھنا چاہتا ہوں لیکن میری رائے یہ ہے کہ آپ تنہا نہ جاویں۔ اپنی والدہ اور ان دونوں معزز دوستوں کو لیجائیں۔

گلجان نے بڑے افسوس سے کامران کی طرف دیکھا۔ اور دھڑکتے دل سے بولی "کیا آپ اب واپس نہ آئیں گے؟ درحقیقت اس کے دل میں کامران کے بتاؤنے جگہ پیدا کرلی تھی کامران نے ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا۔ نہیں آپ کی محبت مجھے ضرور سہارنپور لائیگی اور میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھونگا۔ گل جان کے نوخیز ناتجربہ کار دل پر کامران کے ناوقت رخصت ہونے سے قلق ہوا۔ مگر اسے مظفر نگر کی دعوت اور جلسہ رقص و سرود کا جوش اپنی طرف کھینچ رہا تھا علاوہ ازیں وہ سمجھ رہی تھی۔ کہ اس اجنبی امداد علی سے اوسے کیا حاصل وہ تھوڑی دیر بعد بلند اختر سے باتیں کرتے وقت اس کی خوبصورت آنکھوں اور چہرہ کی کشش سے سب باتیں بھول گئیں اس نے خط لکھنا شروع کیا۔ اور دل سے کہنے لگی "کاش ایک وقت ایسا ہو۔ کہ اس کمرہ میں پیارے اختر کے سوا کوئی نہ ہو۔ اور میں اسے چھاتی سے لگا سکوں۔ دو منٹ میں خط ختم ہوگیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا

جناب سن آپ کی دعوت منظور ہے۔ میں اپنی والدہ اور دو دوستوں کے ساتھ آؤنگی۔ ایک نوکر بھی ساتھ ہوگا۔ موٹر کار ضرور لایئے گا۔ کیونکہ مجھے موٹر کا شوق بہت ہے

رقیمہ نیاز گل جان سہارنپور

تیسواں باب

مشتبہ آدمیوں کا مشتبہ دوست

دوسرے دن دس بجے کے قریب کامران اس مہاجن کے مکان پر پہنچا۔

جس کا پتہ اوس کا ہمراز فقیر علی الصباح بتا گیا تھا یہ مکان خود تو نہایت عالیشان اور پختہ تھا مگر ایک تنگ اور غلیظ گلی میں واقع تھا۔ اس کے آہنی پھاٹک پر پختہ ستون کے اوپر سیاہ رنگ کی بورڈ لگا ہوا تھا جس میں سنہرے حروف میں "لالہ کاشی رام" لکھا ہوا تھا۔ پھاٹک کے سامنے کامران کو ایک سفید ریش دربان دکھلائی دے رہی تھی۔ اور پھاٹک کے قریب مکان کے احاطہ میں مختصر سا کنواں تھا۔ کامران آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا۔ اور سبزی کے پیچھے لمبے وسیع کمرہ میں دو معمر لوگ بہی کھاتہ میں مصروف دکھائی دیئے۔ ایک تختہ کے اوپر تین چار گنوار آدمی بیٹھے تھے جن کے بے رونق چہرہ اور پریشان آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ نامعلوم تفکرات کے آزار میں گرفتار ہیں۔ اور بظاہر اس امیر مہاجن سے روپیہ قرض مانگنے آئے ہیں۔ کامران اس وقت کلرکنگ ٹھیکیدار کے لباس میں تھا جس کی سفید ڈاڑھی اور کالی لباس سے دونوں منیب چونکے اور گھبرا کر پوچھنے لگے۔ کہئے خانصاحب کیا کام ہے؟ کامران نے اپنی سفید مونچھوں کو درست کر کے کہا۔ کیا لالہ کاشی رام صاحب تشریف رکھتے ہیں؟ ایک منیب نے اپنی بہی پر گردن جھکا لی۔ دوسرے نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ لالہ کاشی رام وہ تو ایک برس گذرا سرگ کو سدھارے۔ کیا آپ کو انہی سے ملنا تھا؟

کامران سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ کسی بوڑھے سیٹھ سے ملاقی ہوگا۔ اب یہ سنکر کہ اس کے کاروبار کا مالک تو انتقال ہو گیا۔ کوئی اور دوسرا شخص اس کا وارث ہوا ہوگا۔ کامران کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر اپنے دل کی بے ترتیبی کو چھپانے کے لیے کہنے لگا۔ نہیں مجھے لالہ کاشی رام سے کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اب ان کی جگہ ان کے کاروبار کا کون مالک ہے؟

دونوں منیبوں نے چونک کر کامران کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور اضطراب سے پوچھنے لگے صاحب آپ کو کیا چاہئے۔ کیا آپ کا بڑے لالہ جی پر کچھ قرضہ تھا؟ اب ان کا صاحبزادہ موتی رام موجود ہے۔ کامران نے اپنے آپ کو بیوقوف بنتا ہوا دیکھ کر تبسم سے جواب دیا۔ نہیں ابھی ہم غریب آدمیوں کا قرضہ تمہارے لالہ جی پر کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہم تو خود روپیہ کی فکر میں آئے ہیں۔ کیا لالہ موتی رام موجود ہیں؟

دونوں شیخوں نے مہربان ہو کر کہا "آپ اندر آجایئے۔ لالہ جی ابھی آتے ہونگے کھانا کھا رہے ہیں۔ کامران آگے بڑھا۔ کمرہ کی شرقی دیوار کے وسط میں ایک تکلف ادنی قالین بچھا ہوا تھا۔ اور سارے کمرے میں عمدہ دری کا فرش تھا۔ دونوں شیخ شمالی دیوار کی طرف سر بزانو گاؤ تکیہ پر کام کر رہے تھے۔ کمرہ کے مغربی و جنوبی حصہ میں لوہے کا مضبوط خاصہ صندوق زمین کے اندر نصب تھا۔ اس کمرہ کی پشت پر دو کھڑکیاں تھیں۔ جن پر مضبوط آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرہ کے اندر آنے کیلئے صرف ایک دروازہ تھا جسمیں کواڑ کی جگہ لوہے کی چادر لٹک رہی تھی۔ کامران نے اس کمرہ کو سرسری نگاہ سے جس طرح دیکھا اور شمال کی جانب منہ کر کے اپنی قالین پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اسی سمت سے "لالہ جی بندگی" کی آواز سنائی دی۔ اور اسی وقت ایک خوبصورت نوجوان جس کی عمر چوبیس سال کی ہوگی کامران کو پیٹھ ہی ہوئی پیشانی سے دیکھتا ہوا اندر گھس آیا۔ کامران نے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ اور اٹھ کر بے عرض کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ نوجوان نے کامران کا سلام لے کر متانت سے کہا "تشریف رکھئے" پھر بلا تکلف اپنی قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نوجوان کے خط و خال موزون تھے۔ ناک لانبی اور دبی ہوئی پیشانی چوڑی اور کشادہ۔ آنکھیں چھوٹی مگر خوبصورت اور عیار۔ مونچھیں چھوٹی چھوٹی اور ابھی نئی نئی تھیں۔ بدن پر سیاہ رنگ کا کوٹ اور سر پر سیاہ رنگ کی کشتی نما ٹوپی تھی۔ ٹوپی کے گرد باریک کشمیرہ کا دھاری دار پٹکا تھا۔ پاؤں میں سیاہ دانی موزے۔ نوجوان کے منہ میں پان تھا جس کی سرخی اس کے پتلے ہونٹوں تک آگئی تھی۔ گردن میں عمامہ کی رنگ کا گلوبند تھا۔ نوجوان نے عمیق نظر سے کامران کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے پوچھنے لگا۔ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" کامران نے مسکرا کر جواب دیا "میں انبالہ سے آیا ہوں۔ شہر کے محکمہ میں ٹھیکیداری کرتا ہوں۔ مجھے یکلخت روپیہ کی ضرورت آپڑی مہاجن کی تلاش تھی۔ سنا آپ کا پتہ لگ گیا۔ نوجوان موتی رام نے مسکرا کر کامران کی طرف دیکھا جس کے فقیرانہ رنگ روپ سے خوش نہیں تھا۔ پھر اپنے سیدوں کی طرف دیکھ کر بولا "دیکھو آپ کو جملہ شرائط سنا دو" ایک منیب نے کامران کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور ایک رجسٹر کھول کر سنا دیا۔ آپس میں کچھ مقالمہ نہیں کیا۔ آپ کو امرتسر کے موافق ایک خاندانی کھاتہ پر سی کھاتہ

ہوگی۔ رجسٹر ہندی میں تھا۔ کامران نے جھوٹے تبسم سے منیب کیطرف دیکھ کر کہا "میں ہندی نہیں جانتا۔ آپ خود پڑھ دیجئے۔ منیب نے جملہ شرائط پڑھ کر سنا دیں جنکی تکمیل ہر شخص کے لئے آسان تھی۔ آخری شرط یہ تھی۔ کہ کسی شخص کی تحریری ضمانت یا کوئی کفالت نامہ پیش کیا جاوے۔ ان الفاظ پر کامران چونکا۔ اور لالہ موتی رام کیطرف دیکھکر کہنے لگا "لالہ صاحب میں ضمانت یا کفالت نامہ کسی قسم کا پیش نہیں کر سکتا۔ نوجوان سیٹھ نے جیب سے پاؤں کی ڈیسہ نکالی۔ اور پیشانی پر بل ڈالکر ایک ٹکڑا کامران کے ہاتھ میں دیتا ہوا بولا "اگر آپ ضمانت یا کفالت نامہ پیش نہیں کر سکتے۔ روپیہ کس طرح مل سکتا ہے۔ آپ کو کس قدر روپیہ درکار ہے؟"

کامران نے پان لیکر تسلیم کہا۔ پھر کن آنکھوں سے سیٹھ صاحب کی آنکھوں کیطرف دیکھ کر بولا۔ مجھے ایک ہزار روپیہ چاہیئے"۔ نوجوان سیٹھ نے سیٹی بجائی۔ اور ہنسکر کہنے لگا "میاں صاحب ایک ہزار بغیر کچھ ضمانت یا رہن بالعوض ہرگز نہیں مل سکتا۔ میرے یہاں داد و ستد کا کام پشت بہ پشت سے چلا آتا ہے۔ اور ہم لوگوں نے تجربہ کثیر کے بعد ضروری قواعد مرتب کر لئے ہیں۔ ہم سے سب طرح کے لوگ قرض لیتے ہیں۔ ادنےٰ۔ اعلےٰ لیکن یہ شرائط ہر ایک کے لئے ہیں۔ آپ کو اگر کوئی معزز آدمی یہاں جانتا ہو اور بانضابطہ تمسک پر ضامن بنجاوے تو ہم روپیہ دیدیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

کامران نے جھوٹی ندامت سے سر نیچا کر لیا۔ اور مصنوعی تبسم سے بولا "مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا۔ انبالہ سے آیا ہوں۔ اگر آپ محض میرے رقعہ پر ہزار یا پانچسو دے سکیں۔ تو میں معقول سود دینے کو راضی ہوں"۔

نوجوان سیٹھ نے مسکرا کر اپنے منیبوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر کامران کو بے پرواہی سے دیکھکر بولا "جی نہیں یہ بات بالکل ناممکن ہے۔ کامران نے پیشانی پر بل ڈالکر مدافعت بھری آنکھوں سے نوجوان کو دیکھا۔ پھر لمبا سانس بھر کر اٹھنے لگا۔ اور تسلیم کہکر چلتا بنا اوسے اس سیٹھ سے صرف اس وجہ سے ملنا تھا۔ کہ کسی طرح معلوم ہو جاوے۔ کہ بلند اختر اور اس کا دوست یہاں کیوں آیا تھا۔ اور اس وقت کی ملاقات سے اسے صاف طور پر معلوم ہو گیا تھا۔ کہ جب ایک ہزار کی رقم بھی بغیر ضمانت یا کفالت کے نہیں مل سکتی۔ تو

بلند اختر یا اس کا دوست یا تو اپنے گھر بار کی آڑ کر کے کوئی قرض لینے کی فکر میں تھے۔ یا امیر بیٹھ کو دام تزویر میں پھانس کر کوئی رقم اس سے اٹھینا چاہتے تھے۔ یا ان تینوں کی دوستی تھی۔ اور محض خوش طبعی کے لئے تینوں جمع ہوتے ہونگے۔ بہرحال یہ تینوں خیالات درست تھے۔ ان محدود خیالات کے اندر بلند اختر اور اس کے دوست کی حرکات و سکنات مقفل تھیں کامران کو بلند اختر کی کہنہ کی سے یہ آواز تا چی طرح سنائی دیگئی تھی۔ کہ دلاور علی رفیق احمد پر قاتلانہ حملہ کر چکا تھا۔ اور آئندہ اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بلند اختر اور دلاور علی کی گہری دوستی اور رازداری کو مدنظر رکھکر اس بات کی طرف سے مطمئن ہوا تھا۔ کہ اگر ان میں سے ایک قاتل ہے۔ تو دوسرا اس کا مددگار ہے۔ یا اگر ایک کا چال چلن مشتبہ ہے۔ تو دوسرا اس کا معاون ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے محل کی طرف آیا۔ جہاں اس نے ایک گلی میں اپنے دوست فقیر سے دوچار ہو کر پوچھا۔ کیا بلند اختر گھر پر ہے؟ اور جب فقیر نے آہستہ سے بتلایا۔ کہ وہ دونوں کھانا کھا کر ابھی دوسرے گلی میں جا رہے ہیں۔ اور فقیر انکے تعاقب میں ہے۔ تو وہ اس مستقل فراش بھیک مانگنے کی کارروائی سے نہایت محظوظ ہوا۔ اور ہلکے دل سے اپنے مکان کا قفل کھول کر اندر داخل ہوا۔ کامران آج کھانے سے علی الصباح فارغ ہو چکا تھا۔ اور اس کے پاس چند خطوط پوسٹ ماسٹر صاحب سہارنپور کی معرفت رفیق احمد اور شمیلہ اور ہدایت علی نے اس کے خطوں کے جواب میں بھیجے تھے۔ جو اس وقت اس کی جیب میں موجود تھے۔ وہ اپنی کوٹھری کی زنجیر کھول کر اندر داخل ہوا۔ اور بستر پر بیٹھ کر خطوں کو دوبارہ پڑھنے لگا۔ رفیق احمد کے خط سے اسے معلوم ہوا۔ کہ اب اس کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ اور اس کی صحت روبہ افاقہ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی رفیق احمد نے نہایت اضطراب سے لکھا تھا۔ کہ اس کا دعویدار سوتیلا بھائی علی الدین تیسرے تال سے آگرہ روڈ کی میں مقیم تھا۔ اور رفیق احمد نے کامران سے مشورہ طلب کیا تھا۔ شمیلہ کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ اس کے احاطہ میں بڑی مقدار اینٹ اور پتھر اور پتھروں کی نکلی جن کے تخمینہ کے لئے گورنمنٹ نے محکمہ شرک کے اوورسیر کو مامور کر دیا تھا۔ شمیلہ میرنگٹن نے بھی رفیق احمد کی طرف سے اضطراب ظاہر کیا تھا۔ ہدایت علی نے لکھا تھا

اب سب کھدائی ختم ہو چکی ہے حوض کی تعمیر بھی قریب الاختتام ہے آج نظر محمد شرک کارا دو پہر اس منبہ کے متعلق تخمینہ کر رہا ہے۔ اس بات کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ ایک ہوشیار مستری کے ذریعہ سے اس ٹانکہ کی اصلی قیمت معلوم کیجاوے۔ تاکہ تشکیلہ کو چونہائی حصہ میں کچھ نقصان نہ رہے۔ اور کھدائی کے اخراجات پورے ہو جاویں۔

کامران نے تینوں خطوط پر اچھی طرح غور کر کے ہر ایک کاتب کو علیحدہ علیحدہ جواب دیا رفیق احمد کو اس نے ہدایت کی۔ کہ اس کی واپسی تک کسی معقول کیسل یا بیرسٹر سے مشورہ کیا جاوے۔ اور اپنی خاص تحقیقات کے متعلق آخر میں ایک سطر بدیں مضمون لکھدی مجھے کامیابی نظر آتی ہے تشکیلہ ہیرگیٹن کو اس نے احاطہ کی کھدائی کے متعلق مفید مشورہ دیا۔ بتایا کہ اگر خدا کو منظور ہوا۔ تو وہ اس کے نانکے دفینہ کا جامہ پتہ لگا سکیگا۔ ہدایت علی کو اس نے اجازت دی۔ کہ کوئی ہشیار معمار روڑکی سے طلب کر کے بطور خود علیحدہ تخمینہ کرائے اور آخر میں لکھدیا۔ کہ مجھے کس قدر کامیابی ہوئی ہے بعد پانچ روز بعد مغرب کے وہ نگا عید الضحیٰ کی نماز لاہور میں ادا کرونگا اس خط کا جواب اگر بھیجو۔ تو لاہور روانہ کرنا لیکن وہاں میں شبانہ روز سے زیادہ نہیں رہونگا۔

ان خطوں کو ختم کر کے اس نے ایک سگار سلگایا اور نصف گھنٹہ بعد اپنا اصلی لباس پہن کر باہر نکلا۔ وہ اگلے دن صبح کی گاڑی میں سوار ہو کر لاہور روانہ ہو گیا۔ لاہور جانے کا دن بھی اسے آج کا دن پھر سوار ہونے پر مجبور کیا۔ وہ صرف اتنا تھا کہ کسی قدر شب کی تنہائی میں وہ بلند اختر کے مردانہ مکان سے قفل کے منہ پر موم لگا کر لاہور لیتا جاوے اور دیکھے سے چابی لا کر معلوم کرے۔ کہ بلند اختر کے کمرے میں کیا کیا چیزیں نہیں اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ کہ کل جان بلند اختر اور دلاور علی سمیت عید الضحیٰ کے اگلے دن منظفر نگر جاوے گی۔ اور ایک شبانہ روز وہاں مقیم رہے گی۔ پس اسے اس سے بہتر موقعہ بلند اختر کے مکان پر چھاپہ مارنے کا کسی طرح نہیں مل سکتا۔ اور محض اس وجہ سے اس نے منظفر نگر کے جلسہ رقص و سرود سے معذوری ظاہر کی تھی۔ فرنیکہ کامران کی زندگی اس وقت دورنگی بلکہ سہ رنگی تھی۔ ایک وقت اسے مرزا کلو بیگ بننا پڑتا تھا۔ دوسرے وقت کامران تیسرے وقت

وقت ادا و علی اگر غور کیا جائے۔ تو انسان روزمرہ کی زندگی میں بھی کئی طرح کے روپ بدلتا رہتا ہے۔ ایک وقت وہ اپنے سے زیادہ قابل اور ذی رتبہ لوگوں کے آگے بھیگی بلی بنجاتا ہے۔ دوسری جگہ اپنے بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر وہ مزاحی اور ظرافت کی باتیں کرتا ہے تیسری جگہ وہ اپنے سے کمتر لوگوں کو عقل مندی اور وجاہت سے متاثر کرنا چاہتا ہے۔ چوتھے وقت اپنی بیوی اور بچوں میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ پانچویں جگہ اپنے ملازموں یا رعایا پر حکومت اور رعب کا سکہ بٹھلانا چاہتا ہے۔ جب معمولی زندگی میں انسان تو اس قدر تغیرات سے سابقہ پڑتا ہے۔ تو کیا عجوبہ کہ ضرورت کے وقت انسان کسی کا فرضی یا مصنوعی دوست بن سکتا ہے۔ غرضیکہ جس طرح انسانی زندگی ناقابل اعتبار ہے اسی طرح انسان کا دماغ تغیر پسند واقع ہوا ہے۔

اکتیسواں باب

ہائے دل ظالم تیرا برا ہو۔

مسلمانوں کا مقدس تاریخی تہوار عید الضحیٰ ایک روز پیشتر ختم ہو چکا تھا۔ اسلامی گھروں میں توڑے بہت آثار کل کی دعوت ضیافت اور ساز و سامان کے موجود تھے۔ ہر چہرہ گل جہاں اگرچہ عام مذہبی خیال سے معرا تھی۔ اور اسلام سے باہر نہ تھی۔ لیکن غریب لڑکی کی صورت شکل لباس و تراش نیز کمروں کی صفائی اور ترتیب سے صاف ظاہر تھا۔ کہ بیچاری پھر بھی مسلمانوں کا دامن پکڑے ہوئے تھی۔ اور عید بقر عید جیسے تہواروں کو آرزو بھرے دل سے مناتی تھی۔ اس وقت اس کے خوبصورت ہاتھ حنا سے رنگ سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ خوبصورت بھوری آنکھوں میں سرمہ کی سیاہی اس کے لانبے ترگاں کے پردہ میں سحر خیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ریشم جیسے نرم سنہرے بالوں کی مانگ پر سنہری جھومر اس کے گلابی رخساروں کے مقابلہ میں کمخواب سنہری کوٹ کر دہکا دے رہا

رہا تھا۔ اس کے خوبصورت موزوں جسم پر گوٹے ٹھپے سے لدا ہوا انگریزی وضع کا ریشمی کوٹ تھا۔ ٹانگوں میں اس کی سفید رنگت کی موزونیت سے گلبدن کا سکدار پائجامہ سیب کے گرد سبز گھاس کی طرح جھلک مار رہا تھا۔ اس کی خوبصورت گردن میں سنہری بادنگی جھلک دلوں کو بے چین کئے ڈالتی تھی۔ اس کے خوبصورت پاؤں میں سرخ ریشمی موزوں کے اوپر نقرئی پازیب عشاق کو پابزنجیر کر دینے کے لئے مستعد کھڑی تھی۔ دن کے دو بجے وہ اپنے مکلف کمرہ کی کھڑکیاں کھولے بے چین بیٹھی تھی۔ اس کی والدہ بھی نیا لباس زیب تن کئے کچھ نکھری ہوئی معلوم دیتی تھی۔ گل جان کے دائیں ہاتھ کھڑکی کے نیچے بلند اختر اور دلاور علی نئے کپڑے زیب تن کئے ننگے سر بیٹھے تھے۔ ان کے سروں کی ٹوپیاں کھونٹیوں پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ اس وقت ان لوگوں کے سامنے شجاعت علی اور خورد سال روکا چاء رکھ رہے تھے۔ گل جان نے پیالی ہاتھ میں لی۔ اور ایک گھونٹ پی کر بولی۔ بس تو آج اسرائیل خاں صاحب آنے والے نہیں معلوم ہوتے۔ یہ کلمہ ادا کرنے سے گلجان کے دل سے افسوس کا سانس نکلا۔ اور وہ سمجھی۔ کہ شاید جلسہ رقص و سرود جس میں شامل ہونیکی اسے بڑی آرزو تھی کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا۔ کیونکہ اسرائیل خاں نے اپنے نیوتا میں دس بجے دن کا وقت لکھا تھا۔ اور اس وقت دو بج چکے تھے۔ ایسا خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید جلسہ ملتوی ہو گیا۔ بلند اختر کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے میز کے قریب گل جان اور اس کی والدہ کے بیٹھنے بند ہے ہوئے دیکھے اپنی معشوقہ کے شوق کی ناکامی سے اسے بھی دلی افسوس تھا۔ گلجان کی بات بات سے نامیدی اور افسوس مترشح ہو رہا تھا۔ اور بلند اختر اس کے دل گیر انداز سے اسے روتی ہوئی سمجھ کر اسے بچوں کی طرح پیار و دلگیری دینا چاہتا تھا۔ اتنے میں باورچی ہاتھ میں ایک تار لئے اندر داخل ہوا۔ جو گل جان کے نام تھا۔ تار کی آمد سے ان سب آدمیوں کے دل میں خیال ہوا۔ کہ شاید جلسہ رقص و سرود کے متعلق کوئی خبر آئی ہے۔ کیونکہ گلجان نام کسی دوسرے شخص کے پاس سے تار آنے کا بظاہر احتمال نہیں تھا۔

گل جان نے دوڑ کر تار لے لیا۔ جس کے مطالعہ سے ناتجربہ کار شوقین لڑکی کے چہرہ پر رونق آگئی۔ اس نے پرجوش آواز میں اسے چلا کر کہا۔ اسرائیل خاں صاحب

آرہے ہیں تاریں لکھا ہے۔ دیر ہوگئی۔ چار بجے شام کو سہارنپور پہونچونگا۔ بلند اختر وغیرہ نے طمانیت ظاہر کی۔ اور گل جان نے تار کی رسید باورچی کے حوالہ کردی۔ یہ سب لوگ وقت کاٹنے کے لئے باہر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ اور دنیا بھر کی باتیں ہانکتے رہے۔ گلجان نے اپنی کلائی پر دسویں بار گھڑی دیکھی۔ کب چار بجیں گے۔ چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ بلند اختر کو موٹر کار کی پوں پوں سڑک پر سنائی دی۔ اس نے مسکرا کر گلجان کی طرف دیکھا جس کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اور آہستہ سے بولا۔ شاید اسرائیل خاں آگیا۔ گلجان نے شجاعت کو اشارہ کیا۔ کہ باہر جاکر خبر لاوے۔ واقعی اسرائیل خاں معہ دو موٹر گاڑیوں کے آپہنچا۔ بیشمار اس کا کارواں لئے ہوئے اندر آیا۔ اور ایک منٹ کے بعد ان چاروں نے ایک دبلے لانبے قد کے ہنس مکھ آدمی سے ملاقات کی جس کی عمر تیس بتیس سال کی ہوگی۔ نوجوان کچھ خوبصورت آدمی نہ تھا۔ اس کی ناک کوے کی چونچ کی طرح لانبی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بیچین چہرہ پر چیچک کے داغ تھے۔ رنگت گندمی چہرہ لمبا اور پتلا تھا۔ اس کے سر پر بھاگلپوری صافہ تھا۔ بدن میں سیاہ ٹرکی کوٹ ٹانگوں میں سیاہ رنگ کی پتلون۔ پاؤں میں موزے اونی موزے کے اوپر سیاہ رنگ کا بوٹ تھا۔ اسرائیل کے چہرہ پر ڈاڑھی خشخاشی تراش کی تھی۔ مونچھیں لانبی لانبی تھیں۔ اور وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ اس کا لانبا قد دبلا بدن اور چیچک بھرا چہرہ ایسی موثر باتیں تھیں۔ کہ کوئی شخص ایک دفعہ دیکھ لے۔ تو جلدی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔

گلجان اسے دور سے آتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ گئی۔ اس وقت اس نے اپنے سر پر سرخ کامدانی کا دوپٹہ ڈال لیا تھا۔ جو اس کے سرخ سپید دل آویز رخساروں کے مقابلہ میں گل انار جیسا معلوم ہورہا تھا۔

اسرائیل خاں نے سب کو اکر سب لوگوں کو تسلیم کہا۔ اور سب سے پہلے اس سے گل جان نے پر تبسم آنکھوں سے دیکھ کر مصافحہ کیا۔ یہ شخص اسرائیل خاں حسن پرست اور نظر حوبصورتی میں مہارت تامہ رکھنے والا تھا۔ اس نے گلجان کا نرم صاف شفاف ہاتھ اپنے پیلے سیاہ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا۔ کہ اس کی خوبصورت آنکھوں اور چہرہ کی شادابی سے بس کے

دل میں ایک قسم کی حرارت پیدا ہوئی جس سے دل سینہ میں پھڑکنے لگا۔ اوس نے فوراً اپنے دل میں کہا "ایسی خوبصورت عورت میں نے آجتک نہیں دیکھی" ماں بیٹیوں نے پرتپاک الفاظ میں اسرائیل خاں کو بلند اختر اور دلاور علی سے ملایا۔ اور پرتکلف کرسی پر جگہ دیکر چائے کا حکم دیا۔ چند منٹ کے اندر اس اجنبی مہمان کو چائے پیش کی گئی۔ اس کے بعد پان اور حقہ حاضر کیا گیا۔ اسرائیل خاں ہوشیار اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اس کے ہر کلمہ سے خلق اور انکساری ٹپکتی تھی۔ اوپری کو خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ وہ اتنا شاطر ہے۔ کہ دو موٹر گاڑیوں کا مالک ہوسکتا ہے۔ مگر اسرائیل خاں ایسی متانت اور اخلاق سے باتیں کیں۔ کہ گل جان تھوڑی ہی دیر میں اسے نہایت شریف آدمی سمجھنے لگی۔ اور اس کی آنکھ پر چشمہ ایسا سجتا تھا۔ کہ محض سطح پر نظر ڈالنے والا اسے فی الفور بڑا عالم سمجھنے لگتا۔ اسرائیل خاں نے حقہ کے چند دم لگا کر تسلیم سے گلجان کے خوبصورت چہرہ پر نظر ڈالی۔ اور آہستہ سے کہا "واقعی ہمارا علاقہ رقص و سرود کا آپ بغیر (سورا) تھا۔ میں نے آپ کے حسن کا تذکرہ سنا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوگیا۔ واقعی آپ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں"

گلجان کا چہرہ حیا کے مارے سرخ ہوگیا۔ اس نے شرم سے گردن جھکالی۔ اور زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ بلند اختر کے دل پر اسرائیل خاں کے جوشیلے الفاظ سے سانپ سا لوٹ گیا۔ وہ ڈر گیا۔ شاید یہ رئیس فرحت علی خاں سے بھی زیادہ خوفناک نکلے گلجان سے اوسے کی محبت اور بے تکلفی سے ایک قسم کا اطمینان تھا۔ گو یہ بات اکثر اس کے دماغ میں چٹکیاں لیا کرتی تھی۔ کہ گل جان جیسی خوبصورت عورت باوفا نہیں ہوسکتی۔ شاید اسے دھوکہ دے کر کسی دوسرے سے دل لگالے اور جب "عشق است ہزار بدگمانی" پر نظر ڈالی جائے۔ تو بلند اختر کے تو ہمات غیر واجبی نہ کہے جاسکتے تھے جاندیدہ امیر جان نے اسرائیل خاں کے پرتپاک الفاظ پر شکریہ ادا کرکے کہا۔ عزیز دستو یہ سب خدا کی مہربانی ہے۔ ہم لوگ کس قابل ہیں۔ ہاں آپ لوگوں کی مدح سرائی سے گل جان مغرور ہوئی جاتی ہے۔ ماں کی سچی دل لگتی ہوئی بات پر گل جان کے دلمیں

غصہ پیدا ہوا مگر وہ بھولے پن سے اسرائیل خاں کی طرف دیکھ کر بولی "تو مظفر نگر آج چلیئے گا؟ یا رات کو آرام کیجیئے گا" بلند اختر اور اس کے دوست نے جواب سننے کے لئے اشتیاق سے اسرائیل خاں کی طرف دیکھا جس نے جلدی سے جواب دیا "نہیں جناب آرام کا موقعہ کہاں ہے۔ دو سو مہمانوں کی آؤ بھگت کرنی ہے انتظام اور معمولی کیریٹر سے نے ہی تو مجھے یہاں جلدی آنے سے روکا ہے۔ دس بجے کی جگہ چار بجے سہارنپور پہنچا۔ آٹھ بجے شب کو دعوت ہے۔ اگر اس وقت فوراً روانہ ہو جائیں۔ تو کہیں سات بجے مظفر نگر ہو سکتے آپ کے ساتھ کچھ اسباب تو نہیں۔ موٹر کار دونوں بہت مختصر سی ہیں"

گلفشاں نے نرد سے ماں کی طرف دیکھ کر اور مسکرا کر جواب دیا۔ "اسباب تو بیشک ہے۔ دو بستر ہے ایک ٹرنک"

اسرائیل خاں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور وہ آہستہ سے بولا "اسباب کی بڑی دقت رہی۔ دو بستر اور ایک ٹرنک موٹروں میں نہیں جا سکتے۔ آپ نے لکھا تھا۔ کہ کوئی نوکر ساتھ جا رہیگا۔ بہتر ہے۔ کہ آپ اسباب اس نوکر کے ساتھ بذریعہ ریل روانہ کر دیں پانچ بجے ایک گاڑی مظفر نگر روانہ ہوگی۔ نوکر ٹھیک سات بجے مظفر نگر پہنچ جاویگا"

سب کے منہ سے بہت ٹھیک بہت ٹھیک نکلا۔ پھر اسرائیل خاں نے مسکرا کر کہا۔ اب تیاری کیجیئے" سب لوگ یہاں سے اٹھ گئے۔ ماں بیٹیوں نے اندر جا کر اونی شالیں اوڑھ لیں۔ دونوں نوجوانوں نے بھاری اوورکوٹ پہن لئے۔ سر پر انگریزی ٹوپیاں اوڑھ لیں۔ اور گردن میں سفید اونی مفلر لگا لئے۔ اس وقت شجاعت کو ہر دو بستر اور ٹرنک نے کر ریل پر چلے جانیکا حکم دیا گیا۔ امیر جان نے کرایہ ریل کے لئے اوسے ایک روپیہ دیدیا۔

خورد سالی لڑکا کلمن بے حد بے چین تھا۔ اور سرخ منہ کئے ہوئے گل جان کے گلے گر رہا تھا اوسکی ریں ریں سرکار میں بھی۔ گل جان نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار کر کہا۔ میری جان کھا گیا۔ تو نہیں۔ غریب بے بس لڑکا زور زور سے رونے لگا

تو اسرائیل خاں نے اسے خاموش کر کے کہا۔ اچھا تمہیں بھی لے چلتے ہیں۔ رونا بند کرو۔ گل جان نے سر ہلا کر کہا۔ اس پاجی کو کیا کریں گے۔ آپ کہتے ہیں موٹر گاڑیاں چھوٹی ہیں جگہ کہاں ملیگی"

اسرائیل خاں نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ نہیں ایک بچے کے لئے جگہ نکل آویگی۔ سب لوگ پراشتیاق دل سے باہر نکلے۔ امیر جان نے زور کی آواز میں کلن سے کہا" پاجی لحاف اوڑھ لے۔ سردی میں مر جاویگا"

پھر اسرائیل خاں کی طرف دیکھ کر بولی" آسمان کا رنگ بے طرح ہے۔ کچھ ابر معلوم ہوتا ہے لیکن بارش شاید ایسی جلدی نہیں ہو سکتی۔ بارش کا ابھی کیا ذکر ابھی دس روز گذرے بیتیرے پانی پڑ چکے ہیں۔ اسرائیل خاں نے جواب میں کہا۔ اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ واقعی اس وقت ہوا کے تیز جھونکوں میں سفید سفید ٹکڑے بادلوں کے جمع ہو رہے ہیں۔ چند نامعلوم خیالات سے اسرائیل خاں کا دل دھڑکا۔ اتنے میں یہ لوگ پختہ سڑک پر باہر آ گئے۔ جہاں دونوں موٹر گاڑیوں کے گرد سینکڑوں تماشائی جمع ہو گئے تھے۔ گل جان نے دھڑکتے دل سے گاڑیوں کو بغور دیکھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگی۔ اماں کیسی اچھی گاڑی ہے۔ ہم بھی ایک خریدیں گے۔ اسرائیل خاں نے دھڑکتے دل سے کہا سواپسی پر ایک آپ کی نذر ہے۔ بلند اختر اس اجنبی رئیس کی فیاضی سے بڑا بے چین ہوا۔ اور دل میں ڈرنے لگا۔ کہ اگر یہی ڈھنگ رہا تو کہیں گل جان کا دل پھسل جاوے۔ دونوں موٹر گاڑیاں ہلکی سی تھیں۔ دو آدمیوں سے زیادہ جگہ نہ رکھتی تھیں۔ دونوں گاڑیوں پر دو ملازم سرخ دوپٹے باندھے بیٹھے تھے۔ اور گاڑیوں کی پھن پھن سے سڑک پر شور مچ رہا تھا۔ اسرائیل خاں نے ایک سُرخ گاڑی کے پرزوں کو دیکھ کر گل جان سے کہا۔ آپ ماں بیٹیاں اس میں آجاویں" پھر بلند اختر اور دلاور علی آمنے سامنے بٹھا دیئے تھے۔ اور اگرچہ تیسرے آدمی کی جگہ نہ تھی۔ لیکن خورد سال کلن بھی ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ دوسری گاڑی میں ایک طرف امیر جان تھی۔ لیکن امیر جان کے فربہ جسم کے لئے اتنی جگہ

گھیر لی۔ کہ اسرائیل خاں کو سوائے اس کے چارہ نہ تھا۔ کہ گلجان کے نرم نازک ہلکے پھلکے جسم سے لگ کر بیٹھے۔ اسرائیل خاں خود بھی دبلا پتلا تھا۔ گل جان کو اس کے بیٹھ جانے سے کچھ تکلیف نہ ہوئی۔ مگر اتنی تنگی ضرور تھی۔ کہ گل جان دونوں ہاتھوں سے شال کو مضبوط پکڑے خوب چست بیٹھی تھی۔ امیر جان نے بوڑھے باورچی کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ اور گھر کے چوکیدار سے تحکمانہ آواز سے کہا۔ چوکنا رہنا چاہیئے۔ ساری ذمہ داری تیرے اوپر ہے۔ بوڑھے باورچی نے جسے ایک شبانہ روز آرام کرنے اور گھر کا مالک بننے کا موقعہ ملا تھا۔ بڑے ادب سے جواب دیا۔ سرکار بے فکر ہیں۔ ایک رات کی تو بات ہے۔ دوسرے لمحہ میں ہانکنے والے ملازموں نے گاڑیوں پر ہاتھ جھکا دیئے۔ اور گاڑیاں سڑک پر پوں پوں کرتی ہوئی آہستہ آہستہ بطرف جنوب جانے لگیں۔ تمام بازار میں سینکڑوں تماشائی گاڑیوں کے پیچھے بھاگے چلے آئے۔ پانچ منٹ کے بعد گاڑیاں ریلوے اسٹیشن کے قریب پہونچکر شرقی سڑک پر مڑکر فراٹے مارنے لگیں۔ اور سہارنپور کے تماشائی دم بدم پیچھے ہٹنے لگے۔ دو تین منٹ کے بعد سب تماشائی نظروں سے غائب ہوگئے۔ اور ریلوے پل سے نکل کر گاڑیاں بسرعت تمام جنوبی سڑک پر پڑیں۔ نصف میل کی مسافت طے کرکے گاڑیوں نے شرقی کا راستہ لیا اور پختہ صاف و ہموار سڑک پر چھن چھن کرتی ہوئی ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔ ہوا تیز تھی۔ آسمان پر بادل تھا۔ گاڑیوں کی تیز رفتاری سے مسافروں کی آنکھ اور ناک سے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے لگنے لگے۔ گل جان نے جوش بھرے دل سے کانوں کو ڈھک کر اسرائیل خاں کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر کہا۔ سڑک کے آس و پاس گیہوں کے کھیت کیسے بھلے معلوم دیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ہر روز اس سڑک پر گذرا کروں۔ اسرائیل خاں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ میں آپ کو ایک موٹر کار دونگا اور اگر آپ نے مجھے اپنی خدمت کے لائق سمجھا۔ ہر روز اس سڑک پر ہوا خوری کے لئے لایا کرونگا۔

گل جان مسکرا کر سڑک کے دونوں طرف دیکھنے لگی۔ اور لمبا سانس بھر کر دل سے

کہنے لگی ہم ہی موٹر کار خرید لینگے اختر کو ساتھ لایا کریں گے۔ یہ سوا ذرا سی دیر میں عاشق بنا چاہتا ہے۔ گویا بچوں کا کھیل ہے اختر اس سے ہزار درجہ خوبصورت ہے" پھر اس نے آنکھ اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ جوان کی گاڑی سے دس گز پیچھے چین چین کرتی آ رہی تھی۔ بلند اختر کی نگاہ گل جان سے لڑی۔ اور اس نے تبسم سے دیکھ کر انگلی ہلائی۔ لیکن پھر اس کے دل میں ایک وہم کی سی پیدا ہوئی۔ اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کیسی اچھی سواری ہے اور اس سڑک کا منظر کس قدر دلکش ہے۔ کاش میرے پاس ایک موٹر کار ہوتی۔ اور میں کسی روز کو گل جان کو اس سڑک پر لاکر چھاتی سے لگا لیتا" مگر ان ہی خیالات کیساتھ اس کے دل میں ایک قسم کا خوف پیدا ہوا۔ اور اس نے دھڑکتے دل سے دلاور علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگر موٹر کار کسی چھکڑے سے ٹکرا جاوے۔ تو بڑا غضب ہو" سامنے سے ایک چھکڑا ادوئی سے لدا ہوا اس طرف آ رہا تھا جس کے قریب آنے سے بلند اختر کو بڑا ڈر لگا۔ لیکن ملازموں نے بڑی ہوشیاری سے گاڑیاں بچا لیں۔ اور میدان پاکر گاڑیوں کو خوفناک رفتار میں چھوڑ دیا۔ اسرائیل خاں کی بات بالکل درست تھی جس کہنہ اور بدشکل گاڑی میں بلند اختر اور دلاور علی سوار تھے۔ وہ پرکالہ آتش ثابت ہوئی۔ اور چشم زدن میں اسرائیل خاں والی گاڑی کے پاس سے شاں شاں کرتی ہوئی آگے نکل گئی گاڑیوں کی تیز رفتاری اور خطرہ تصادم سے گل جان کا دل دہل گیا۔ اور وہ اپنی ماں کو دیکھکر کہنے لگی اے ہے میرا تو دل کانپ گیا" نصف گھنٹہ تک دونوں گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے چلتی رہیں کبھی اسرائیل خاں کی گاڑی آگے نکل جاتی تھی کبھی بلند اختر والی سڑک کے دونوں جانب کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ سبز سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا نظر آ رہا تھا جن کے اندر وہ بنے آفتاب اور شام کی سرد ہواؤں میں زرد سرسوں کے پھول آنکھوں میں فرحت دل میں ولولہ پیدا کرتے تھے۔ غروب آفتاب کے قریب دونوں گاڑیاں کالی ندی کے بائیں درہ پل پر پہونچیں۔ گل جان نے یہ پل کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور شام کی دھندلی روشنی تیز ندی کے کنارے پر لانبے لانبے جھنڈ ایسا منظر تھا۔ کہ نوخیز تعلیم یافتہ لڑکی اس کی طرف ضرور نظر ڈالتی۔

گل جان نے مسکرا کر اسرائیل خاں کی طرف دیکھا۔ اور چلا کر کہنے لگی۔ کیسا اچھا موقعہ ہے۔ اگر یہاں ایک دو روز خیمہ ڈال کر قیام کیا جاوے۔ تو بڑا لطف رہے۔ شکار میں مزہ ہوتی۔ اور اس مقام پر شکار کھیلتی۔ امیر جان نے گل جان کے وسوسہ خیز بات پر آنکھیں نکالیں۔ اور ندی کے وسیع پل کی طرف دیکھ کر کہنے لگی کیسی بیوقوف لڑکی ہے مرد بننا چاہتی ہے۔ اس پر اسرائیل خاں نے قہقہہ لگا کر گل جان کی طرف دیکھا۔ اور دل ہی دل سے کہنے لگا "معزز خاتون اگر تم مرد ہوتیں تو ہم لوگ آپ جیسی خوبصورت مہ جبیں کو کہاں ڈھونڈنے جاتے"

اس خیال سے اسرائیل خاں کے دل میں ایک قسم کی گدگدی محسوس ہوئی اور وہ مادم ہو کر امیر جان کی طرف دیکھنے لگا۔ گل جان کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ پھر وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولی "اماں ہم تو اس پل کو اتر کر دیکھنا چاہتے ہیں" اسرائیل کے خیالات دور پہنچ رہے تھے اس نے فی الفور اپنی موٹر ٹھہرائی۔ گل جان نے زور سے چلا کر اختر کہا۔ جس نے پیچھے گردن پھیر کر گل جان کی طرف دیکھا۔ اور پچھلی گاڑی کو مقیم دیکھ کر اپنی گاڑی بھی ٹھہرا دی۔ امیر جان نے گاڑی سے پاؤں آنا حماقت سمجھا۔ اور گل جان تینوں مردوں کیساتھ نیچے اتر کر پل دیکھتی رہی۔ اسوقت ندی خشک پڑی تھی۔ اگرچہ دس یوم پیشتر کی بارش نے پل کے نیچے تھوڑا تھوڑا پانی کنڈھوں میں جمع کر رکھا تھا۔ ندی کے کنارے پر گل جان کو جھاڑیوں پر سرخ بیر دکھلائی دیئے۔ وہ جھٹ کنڈے گئے بڑھی۔ اور اختر کو اشارہ سے بلا کر بیر توڑنے لگی۔ بلند اختر نے اس کیلئے جلدی جلدی بہت بیر توڑ دیئے۔ اور ہنسکر کہنے لگا "تم ہٹ جاؤ۔ ہاتھ میں کانٹا لگ جاویگا لیکن گل جان نے ایک نہ سنی اور منہ سرخ کئے بیر توڑتی رہی۔ اس اثنا میں اسرائیل خاں نے جیب سے چمکدار ٹین کا سگریٹ کیس نکالا۔ اور ایک سگریٹ دلاور علی کو دیا پھر اپنا سگریٹ سلگا کر امیرانہ آواز میں کہنے لگا "مسٹر بلند اختر کیا آپ بھی سگریٹ لیں گے بلند اختر نے مسکرا کر جواب دیا تسلیم تسلیم" اسرائیل خاں نے جھاڑیوں کے پاس جا کر بلند اختر کو سگریٹ دیا۔ جسے بلند اختر نے اسرائیل خاں کے سگریٹ سے سلگایا۔ لاچار اسرائیل خاں

منہ سے سگریٹ نکال کر ہونٹ چاٹے۔ اور پری چہرہ نوجوان لڑکی کے ہنس مکھ آزاد چہرے کو دیکھ کر بولا "معزز خاتون تم اس جنگل میں کوہ قاف کی پری معلوم ہوتی ہو۔ اگر کوئی شخص تمہیں تنہا دیکھ لے۔ تو بے اختیار یہ سمجھے۔ کہ آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہے۔"

گل جان کے خوبصورت رخساروں پر شرم کے مارے سرخی آگئی اور وہ مسکرا کر ہنسنے لگی۔ ایسا منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کاش مجھے تصویر بنانی آتی اور میں اس پل کا فوٹو لے سکتی۔ اس وقت غروب کی جانب پھٹے پھٹے بادلوں میں سرخی جھلک رہی تھی اور شرق کی جانب خوب تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ دور کے درختوں اور جھاڑیوں میں خاصا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ادھر ادھر جنگل میں سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی دیہاتی آدمی ادھر ادھر دور کے فاصلہ سے نظر آجاتا تھا۔ تیز ہواؤں کی شاں شاں درختوں کے پتوں میں چھم چھم کرتی گذر رہی تھی۔ اور پروا ہوا کے ساتھ شرق کے گہرے سفیدی مائل بادل اُمڈتے آرہے تھے۔ ان لوگوں کا اس مقام سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بلند خترا و گل جان جھاڑی کے پاس کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ دلاور اپنی انگریزی پتلون کی بہار دکھلانے کو بھاری قدم ریگ پر ڈالتا ہوا اسرائیل خاں کیساتھ ٹہلتا ہوا پھر رہا تھا۔ اور دونوں کے منہ سے سفید سفید دھواں سگریٹوں کا نکل رہا تھا۔ پختہ سڑک پر دو لاریاں موٹر گاڑیاں چلی جارہی تھیں۔ امیر جان نے پاندان کھول کر چند ٹکڑے پان کے بنائے اور اپنی دختر کو آواز دیکر ایک ایک ٹکڑا سب ساتھیوں کو دیا۔ جب سڑک کے سامنے کچھ تاریکی معلوم ہونے لگی۔ تو موٹر کار کے ملازموں نے لالٹینیں روشن کرلیں جن کی روشنی سامان کا عکس سڑک پر دور تک پڑنے لگا۔ امیر جان نے چلا کر کہا۔ اب چلنا چاہیے بالکل اندھیرا ہوگیا۔ بوڑھی عورت کے اشارہ کی تعمیل میں تینوں مرد گل جان کے پیچھے پیچھے موٹر گاڑیوں کی طرف آئے۔ اور جھٹ پٹ سوار ہوگئے۔ ایک منٹ کے اندر گاڑیاں تیزی کیساتھ مشرق کی جانب دوڑنے لگیں۔ پانچ سات منٹ تک سب لوگ خاموش رہے اور تاریکی بتدریج بڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے تیز رفتار موٹر گاڑیوں کے دوش پر ٹکرا رہے تھے۔ اور ان مسافروں کے بدن میں گھسے جاتے تھے۔

اسرائیل خاں نے پشت پھیر کر اپنے ڈرائیور موٹر بان کی طرف دیکھا۔ پھر بلند اختر کی طرف اندھیرے میں دیکھ کر بولا۔ اچھا اب یہاں سے نظر نگر تک دوڑ ہو جاوے تو دیکھیں کون سی گاڑی زد و تر پہنچتی ہے۔ بلند اختر کی موٹر کار ہانکنے والا بڑی مستعدی سے بولا۔ بہت اچھا سرکار لیکن اگر میں نکل گیا۔ تو انعام پاؤں گا۔ اسرائیل خاں نے اسکے الفاظ کی طرف چنداں پرواہ نہ کی اسے بلند اختر اور ولاور علی کے منہ میں سگریٹ کی روشنی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ اسرائیل خاں نے پھر اپنے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا چلو جی اب تیز چلو۔ چھ بج چکے ہیں۔ اسرائیل خاں کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی ہونگے۔ کہ دونوں ملازموں نے گاڑیوں کو بے تحاشا چھوڑ دیا۔ اور بیٹھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ ہوا میں اڑے جا رہے ہیں۔ گل جان اور میر جان کے دل دھڑکنے لگے۔ اسرائیل خاں بھی اس تیز رفتاری سے تشویش میں آ گیا لیکن بلند اختر اور ولاور علی مزہ سے کمر لگائے بے فکر بیٹھے تھے اگرچہ وقتاً فوقتاً اپنی گرہن میں سفر یا سر پر ٹوپی درست کرنے لگتے تھے اس اندھیری سڑک نے ایسی ڈراؤنی اور تاریک رات میں ایسی تیز رفتار گاڑیاں کبھی نہ دیکھی ہونگی۔ زمین کی طنابیں کھنچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور بعض بعض جگہ سڑک کے نشیب و فراز کے سبب گاڑیاں اچھل اچھل کر پڑتی تھیں۔ گل جان کا دل لرز رہا تھا۔ اور اس نے اپنی کمر کو خوب مضبوط طریقے سے گاڑی سے لگا کر موٹر کار کا پہلو پکڑ رکھا تھا۔ گل جان کو اپنے پر ایک قطرہ بارش کا گرتا ہوا معلوم دیا۔ وہ گھبرا کر بولی "بارش" لیکن ایک لفظ کے ادا کرتے ہی اسے دور سے ایسی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی شیشہ کا برتن گر کر ٹوٹا ہے۔ اس نے اسرائیل خاں کی طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔ یہ آواز کیسی" اسرائیل خاں نے سامنے کی گاڑی کی طرف دیکھ کر کہا "معلوم نہیں چلے چلو۔ ہمیں ڈر ہے۔ کہ کہیں پرانا موٹر کار ہم سے آگے نہ نکل جائے" گل جان بلند اختر کی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس کی روشنی نظروں سے غائب ہو گئی۔ گل جان نے گھبرا کر پوچھا مسٹر اسرائیل خاں ہماری گاڑی کہاں رہ گئی اسرائیل خاں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ شاید

کا ڈھیلی بیٹھ گئی۔ اب وہ ہمیں کسی طرح نہیں پکڑ سکتی۔ ہم پہلے پہونچیں گے گلجان کا دل دھڑکنے لگا اور اسے بلند خرکا خیال آگیا۔ کہ کہیں اس کے چوٹ پھوٹ نہ آگئی ہو اس نے خوف زدہ دل سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ کیا آپ ٹھہر کر نہیں دیکھیں گے۔ کہ گاڑی کہاں رہ گئی۔ اسرائیل خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ معزز خاتون تم کیوں ڈرتی ہو ما اکثر اوقات ایسا ہوا کرتا ہے۔ وہ لوگ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے اندر صحیح سلامت آجاویں گے اس موٹر والا آدمی ہمارے یہاں عرصہ سے موٹر ہانکتا ہے اور بڑا تجربہ کار ہے۔ آپ میں نہیں گلجان خاموش ہو رہی لیکن اس کا دل برابر دھڑکتا رہا۔ امیر جان نے پاندان کے اندر سے پانوں کا کپڑا نکالا جس میں لگے ہوئے بیڑے رکھے تھے۔ اور اندھیرے میں ایک ایک ٹکڑا اسرائیل خاں اور گلجان کو دیا۔ اسرائیل خاں نے شکریہ کے ساتھ پان لے لیا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ کیسی اندھیری رات ہے۔ اگر کوئی چور اچکا ہاتھ مار لے تو مشکل ہے میں حماقت سے پستول بھی ساتھ لانا بھول گیا۔ چور راہزن کے نام سے غریب عورتوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بگڑ کر گل جان دل کو قابو کر کے بولی۔ مجھے ہمپی گاڑی کی طرف سے بڑا فکر ہے میں خیال کرتی ہوں۔ کہ وہ گاڑی ٹوٹ گئی۔ اور وہ لوگ رات بھر سڑک پر پڑے رہیں گے۔

اس کلمہ کی آواز نکلی پر گل جان کا دل بھر آیا۔ بوڑھی امیر جان کا بدن خوف سے لرز گیا۔ اور اس نے سوچا۔ کہ اگر کوئی اس سردی میں اسے سڑک پر چھوڑ دے تو وہ صبح کو مردہ ملے۔ اسرائیل خاں نے سگریٹ سلگا کر جواب دیا۔ آپ گھبراویں نہیں ما بھی سب لوگ آپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہونگے۔ اس وقت موٹر کار ایک چوکی ریل کو پار کر کے دوسری طرف جانا چاہتی تھی۔ لیکن پھاٹک بند تھا۔ موٹر کار بڑے زور سے پھاٹک پر پہونچی لیکن ملازم ہوشیار تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے گاڑی روک لی ورنہ ان چاروں کا قصہ ہی قلع ہو جاتا۔ موٹر کار یکایک رک جانے پر سب کے دل دھڑکنے لگے اور اسرائیل خاں نے خوف زدہ نگاہ سے ملازم کو دیکھ کر پوچھا۔ کیا ہے؟ لوکھڑاتے کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا۔ حضور بڑی خیریت ہو گئی۔ اندھیرے میں ہمیں پھاٹک دکھلائی نہیں دیا تھا۔ گاڑی ٹکرا جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ اسرائیل خاں کا دل

زور سے دھکے دینے لگا۔ اور دوڑتا ہوا گاڑی سے الگ ہو کر پھر یہ کہہ کر گاڑی میں کوئی فتنہ نہیں آیا تنہا پھاٹک پر آیا۔ اور چوکیدار کو آواز دے کر کہا۔ جلدی پھاٹک کھولو۔ کیا پڑے سوتے ہو؟ سامنے چوکیدار کی کوٹھڑی میں چولہے کی آگ کی روشنی دکھلائی دی۔ اور اس نے زور سے چلا کر کہا ابھی پھاٹک نہ کھولنا۔ مال گاڑی آوت ہے"۔ اور اسی لمحہ میں اسرائیل خاں کو نصف میل کے فاصلہ پر انجن کی سُرخ لال ٹین سرخ دھبہ کی طرح ادھر ادھر ہلتی ہوئی دکھلائی دی۔ ایک منٹ بعد یہ روشنی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک بڑی لمبی گاڑی کا انجن دھواں دھواں کرتا ہوا پھاٹک سے گذرا۔ اور تین منٹ تک گاڑیوں کا سلسلہ لگا رہا۔ مال گاڑی نکل جانے پر پھاٹک والے نے دروازہ کھولا۔ اور اسرائیل خاں کے موٹر پر سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کو آہستہ سے لائن سے باہر نکالا۔ پھر متعدد پیشتر جیسی رفتار پر چھوڑ دیا۔ اس وقت یہ لوگ تاریک اور ڈراؤنے جنگل سے گذر رہے تھے۔ آسمان پر ابر کے اندر چاند موجود تھا لیکن اس کی روشنی سے سڑک پر چاندنی مطلق نہ تھی جنگلوں کی تازہ ہوا گیدڑوں کی چاں چیں کے سوا کوئی چیز نہ سنائی دیتی۔

گل جان پچھلے پون گھنٹہ سے بیحد بیقرار تھی۔ اور پچھلی گاڑی کے رُک جانے سے اس کے دل میں خوفناک خیالات کا انبار جمع ہونے لگا تھا جنہیں وہ کسی طرح زبان پر نہیں لا سکتی تھی جب سے بلند اختر اس کی نظروں سے غائب ہوا گل جان سب چوکڑی بھول کر بت کی طرح خاموش بیٹھی تھی جب اسے دل بستگی کی کوئی چیز نظر نہ آئی اس نے گھبرا کر پوچھا۔ اب مظفر نگر کتنی دور ہے" ڈرائیور نے مستعدی سے جواب دیا "اب صاحب مظفر نگر آگیا۔ وہ ریل کی چوکی پر لال ٹین دکھلائی دے رہی ہے۔ ایک منٹ بعد موٹر کار فراٹے بھرتی ہوئی ریلوے لائن سے دوبارہ پار ہوئی۔ اور سامنے بائیں ہاتھ پر ریلوے اسٹیشن کے لیمپوں اور لال ٹینوں کی روشنی مختلف رنگوں میں دکھلائی دی۔ سبھوں نے معمولی دلچسپی سے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ پھر گل جان نے لانبا سانس بھر کر کہا" مجھے پچھلی گاڑی کی طرف سے بڑا ڈر ہے میرا دل کانپ رہا ہے۔ اگر گاڑی لوٹ گئی۔ اور وہ لوگ تمام شب سڑک پر پڑے رہے تو معلوم نہیں

کیا حادثہ پیش آ دے۔ امیر جان کے دل میں بھی دھڑکن پیدا ہوئی۔ اور وہ بہاری بولی ہوئی آواز سے کہنے لگی "اندیشہ تو واقعی مجھے بھی ہے۔ مگر اسرائیل خاں صاحب فرماتے ہیں۔ کہ کوئی ڈر کی بات نہیں۔ خدا خیریت رکھے۔

پھاٹک سے نکل کر ان لوگوں کو انگریزی جنگلوں میں ادھر ادھر روشنی دکھلائی دی۔ گل جان اور اس کی والدہ پہلے کبھی مظفر نگر نہیں آئی تھیں۔ انہیں ان محلوں کا مطلق علم نہ تھا۔ موٹر کار تیز رفتاری سے جہاں چہاں کرتی ہوئی بجانب غرب اٹھی چلی جاتی تھی۔ اور اس کوٹھی سے جو چوہدری گھاسی رام کے نام سے مشہور تھی ملی ہوئی ڈاکخانہ کی طرف اڑی چلی آئی۔ اس وقت جا بجا میونسپلٹی کی لالٹینیں روشن تھیں۔ اور وہ اندر موٹر کار کو دیکھنے کے لئے رک جاتے تھے۔ نگلہ منڈی بازار کے اندر سے سیدھی نکل کچہری چلی گئی۔ اور ایک میل کی مسافت طے کر کے ایک عمارت پر ادھر پڑی جہاں صدر ہاسپٹل واقع ہے۔ اس خاص سڑک پر چوتھائی میل کا فاصلہ طے ہو جانے پر امیر جان کو شب کی تاریکی میں ایک بڑی سی عمارت دکھلائی دی جس کے اندر ایک طرف دروازوں سے روشنی آ رہی تھی۔ اور ایک منٹ کے اندر گاڑی اس بنگلہ کے سامنے ٹھہر گئی۔ اسرائیل خاں مستعدی سے نیچے اترا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا۔ یہ میری کوٹھی ہے جب میں مظفر نگر آیا کرتا ہوں۔ اس میں قیام کرتا ہوں۔ آپ اندر تشریف رکھیں میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔ اور بندہ زادہ کو لیتا آؤں۔ اتنے میں امیر جان کو کوٹھی کا دروازہ کھلتا نظر آیا۔ جس کے اندر سے ایک نوکر نے سر نکال کر پوچھا "کیا آ گئے"۔ موٹر بان نے زور سے آواز دی "ہاں آ گئے اطلاع کر دو"۔ نوکر نے برآمدہ میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں لال ٹین تھی۔ اسرائیل خاں نے اس ملازم کو مخاطب کر کے کہا "میری مہمان معزز عورتوں کو گول کمرہ میں بٹھلاؤ۔ چائے پلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ امیر جان اور اس کی دختر نوکر کے پیچھے سامنے کے دروازہ سے گذر کر ایک اچھے خوش نما کمرہ میں داخل ہوئیں جہاں سے ملازم انہیں ایک جنوبی کمرہ میں لیگیا۔ اس کے غربی دروازہ میں پختہ سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ جہاں پہونچکر ملازم نے زور سے ایک میز پر گھنٹی بجائی۔ پھر لال ٹین ہاتھ سے رکھکر شمالی

دروازہ کی چٹخنی لگا دی۔ یہ ایک منٹ سے کم کی بات تھی۔ کہ سیڑھیوں کے اوپر سے ایک آدمی اس کمرہ میں جلدی جلدی چڑھتا ہوا نظر آیا۔ کمرہ میں جب نوکر نے چٹخنی لگائی اور غربی دروازہ پر گھنٹی بجائی۔ تو امیر جان کے تجربہ کار دل پر کوئی بات کھٹکی تھی لیکن ابھی اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا تھا۔ کہ اسے زینہ کے اوپر چڑھتا ہوا آدمی دکھلائی دیا گل جان بھی دروازہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں نے ٹھہر کر دل سے آنے والے کی طرف دیکھا جس نے دروازہ پر قدم رکھتے ہی گل جان کا ہاتھ زور سے پکڑ کر زینہ کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اسی لمحہ میں گل جان نے چیخ ماری۔ امیر جان کے منہ سے بھی چیخ نکلی۔ ملازم نے امیر جان کو زور سے دھکا دیکر گرا دیا۔ جو اس وقت گل جان کو رہائی دلانے کے لئے بھاگی تھی۔ بوڑھی عورت کمرہ کے پختہ فرش پر "ہائے مرگئی" کہہ کر گر پڑی۔ اور اس کے سر میں بڑی ضرب آئی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بیہوش ہوگئی پھر اسے ملازم نے نفرت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کمرہ کے دوسری جانب کھینچا۔ اور ایک مضبوط کمرہ میں دھکیل کر قفل لگا دیا۔ بعد ازاں وہ غربی دروازہ کے زینہ پر پہنچا جہاں اسے چھوڑ دو لڈو چھوڑ دو کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے غربی زینہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور لال ٹین ہاتھ میں لے کر دوسرے کمرہ میں گھومتا ہوا باہر نکلا۔ جہاں اسے اسرائیل خاں ملا جس نے خونی مجرم کی طرح آنکھیں پھاڑ کر پوچھا "سب ٹھیک زنجیر قفل لگا دیئے" جی ہاں سب ٹھیک" نوکر کے منہ سے نکلا۔

پھر اسرائیل خاں نے گھبرا کر کہا۔ مجھے جلدی کھانا دو۔ اب میں موٹر کار میرٹھ پہنچانے جاؤنگا علی رضا دوسری گاڑی لاوے۔ تو فی الفور میرٹھ روانہ کر دینا۔ دیر نہ لگے۔ ورنہ غضب ہو جاویگا۔ ان عورتوں کے دوست اور پیچھا کریں گے۔ اور کسی وقت کل مظفر نگر پہنچیں گے میں بھی ایک ہفتہ میرٹھ رہونگا۔ جب تک معاملہ رفع دفع ہو۔

بتیسواں باب

خوبصورتی کی سزا

"چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو" یہ الفاظ خوبصورت مضطرب گل جان کے منہ سے نکلے جو اس وقت بکھرے ہوئے بال پریشان آنکھوں سے ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر آدمی کے ہاتھوں زنیہ کے زیریں تہ خانہ میں ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی گل جان کے جسم سے اونی شال اتر کر نیچے گر گئی تھی۔ اور اسی کے ساتھ خوبصورت ہلکا دوپٹہ نیچے آرہا تھا اس کے جسم پر اونی گوٹے ٹپے دار کوٹ تھا۔ خوبصورت بالوں کی بھوری چوٹی پریشان اور بکھری ہوئی صورت میں ادھر ادھر ہل رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل سفید تھا۔ اور ایک ہی منٹ کے اندر تمام جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں خوبصورت ریشمی موزہ تھا۔ بیکن موتی جڑا ہوا سلیپر چند سیڑھیوں کی کشمکش میں ادھر ادھر رہ گیا تھا اس تہ خانہ میں ایک طرف ایک مکلف مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے اوپر نرم بستر اور گرم لحاف نظر آرہے تھے مسہری سے دس قدم کے فاصلہ پر ایک میز کے اوپر ڈٹمار کا نیا خرد ہیمپ بڑی تیزی سے جل رہا تھا۔ اس کمرہ میں کسی طرف کوئی کھڑکی یا دروازہ بجز زینہ کے نہ تھا جس کے اندر سے گل جان کھینچ کر لائی گئی تھی۔ کمرہ صاف اور ستھرا معلوم ہوتا تھا۔ پختہ مضبوط اور ڈاٹ نما تھی۔ تمام کمرہ میں کھجور کی چٹائی کے اوپر دری کا فرش تھا۔ ایک الماری میں جو دیوار کے اندر لگی ہوئی تھی۔ دو تین برتن رکھے ہوئے دکھلائی دیتے تھے بظاہر کمرہ ابھی نئی طور ترتیب دیا گیا تھا۔ اگرچہ تعمیر تیس چالیس برس پہلے کی تھی یہ بھاری تنومند آدمی جس نے گل جان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ جلال آبادی پٹھان فرحت علیخاں تھا اسکا سر ننگا تھا۔ بدن پر سفید سوئیٹر تھا گلوں میں سفید لٹھے کا پاجامہ۔ پاؤں میں سیاہ اونی موزے اس نے خونخوار آنکھوں سے گل جان کیطرف دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا "تم

مجھے اپنی مہری کے پاس دیکھ کر ڈر گئی نہیں۔ بیس ہزار جتی کہ چالیس ہزار سے تم راضی نہ ہوئیں۔ اب میں تم سے زبردستی نکاح کرونگا۔ اگر تم راضی نہ ہوئیں۔ تو زبردستی بلا نکاح لبھی اپنی بیوی کرلونگا۔"

گل جان کے دل پر ان الفاظ سے ایسا صدمہ گذرا۔ کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اس کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی۔ اس نے زور سے ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا۔ اور چلا کر بولی۔ میں تم سے کبھی شادی نہ کروں گی۔"

گل جان کے ہاتھ چھوڑا لینے سے فرحت علی خاں گرنے سے بچ گیا۔ اس نے بھیڑیئے کی طرح اچھل کر گل جان کا تعاقب کیا۔ جو اماں اماں چلاتی ہوئی زینہ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ فرحت علی خاں نے اس کا کوٹ پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر زور سے اس کا ہاتھ پکڑ کر مہری کی طرف کھینچنے لگا۔ فرحت علی خاں کچھ مضبوط آدمی نہ تھا لیکن نوجوان گل جان اپنے آپ کو مفید سمجھ کر بے دست و پا ہوگئی تھی۔ فرحت علی خاں نے اسے کھینچ کر مہری پر ڈال دیا۔ مگر ابھی اس کی پشت مہری سے نہ لگی تھی۔ کہ اس نے جلدی سے اٹھ کر ایک طمانچہ فرحت علی خاں کے منہ پر نہایت زور سے مارا جس سے اس کی آنکھ تھوڑی دیر کے لئے بند ہوگئی۔ وہ دانت پیس کر گل جان کی طرف جھپٹا۔ اور اسے نہایت زور سے مہری پر دھکا دیکر لیٹ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ کر چومنے لگا۔ نوخیز گل جان کے دل میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس نے زور سے دو تھپڑ اسے رسید کئے کہ فرحت علی خاں فرش پر جا گرا۔ مگر اس وقت جلاد کی طرح سخت اور بیرحم ہو رہا تھا اس نے اپنے آپ کو جھٹ پٹ کھڑا کر لیا۔ اور دو تھپڑ نہایت زور سے گل جان کے منہ پر مارے جس سے اس کا چہرا نیلا ہوگیا۔ پھر زبردستی سے اس کی گردن میں لپٹ کر کہنے لگا۔ "اس ہاتھا پائی سے کیا مطلب قاضی موجود ہے۔ نکاح پڑھا لو۔ گل جان نے تھپڑ کے درد سے "ہائے مرگئی" کہہ کر ایک دولتی فرحت علی خاں کے ایسی رسید کی۔ کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے درد سے بے چین ہوگیا۔ لیکن پھر اس نے دو تین تھپڑ اس کے سر میں نہایت زور سے مارے۔ جس سے گل جان کا تمام دماغ چکرا گیا۔ اور درد کے

کہنے لگی۔ رحم کرو۔ چھوڑو۔ لعد چھوڑو۔ مجھے۔

مگر فرحت علی خاں پر بہیودگی کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ وہ زبردستی گل جان کو لپٹنے لگا اور ہانپتا ہوا بولا "چھوڑونگا نہیں۔ قاضی تیار ہے۔ اب یہی مان جاؤ"!

اس وقت فرحت علی خاں کے بھاری بدن کو گل جان نے اپنے سینہ سے چمٹا ہوا پایا۔ اور وہ سمجھ گئی۔ کہ یہ خوفناک آدمی اس کی عصمت دری پر تلا ہوا ہے۔ اور گھبرا کر چیخ مارتی ہوئی فرش پر کود پڑی۔ اور اماں اماں پکارتی ہوئی زینہ کی طرف دوڑی۔ فرحت علی ہیبت ناک جن کی طرح اس کے پیچھے دوڑا۔ اور زور سے اسے فرش پر دھکا دے کر کہنے لگا "بھاگنے سے کیا حاصل دروازہ پر قفل ہے یا تو مجھ سے نکاح کرلو۔ یا میں زبردستی تمہیں زوجہ بنائے لیتا ہوں"۔

گل جان اس وقت پسینہ سے شرابور ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ فرحت علی خاں نے اسے فرش پر دھکا دیا۔ تو اس کا سر زور سے فرش پر لگا جس سے اس کا دماغ ہل گیا۔ سانس اس کا اکھڑ گیا تھا۔ زبان تالو سے لگ گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ سے کہا "میری میری اماں اماں"۔ فرحت علی خاں اس خوفناک نظر سے گھبرا گیا۔ وہ سمجھا کہ یہ نوجوان لڑکی کہیں مر نہ جائے۔ اور اس کی تمام خواہش کا قلع قمع نہ ہوجاوے۔ اس وقت گل جان وائیں کروٹ پر پڑی تھی۔ اس کا منہ جنوب کی طرف تھا۔ اس کی خوبصورت چوٹی کھلکر بکھر گئی تھی۔ چہرہ پر تمام کو رونق نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ مگر ان میں ایسا خوف چمک رہا تھا۔ جیسا کہ بکرے کی آنکھوں میں اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس کے گلے سے نصف چھرا گذر جاتا ہے۔ فرحت علی خاں نے اس کے سر پر جھک کر دیکھا۔ تو گل جان بالکل بیہوش ہوگئی تھی۔ اس نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ جس کے اندر سے دھڑک دھڑک کی زور زور سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

گل جان کو اس خوفناک حالت میں دیکھ کر اس کی روح لرز گئی اور وہ سمجھا۔ کہ بس اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ اس نے اسے بڑی نرمی کیساتھ فرش سے اٹھایا۔ اور سہری پر بآرام تمام سیدھا لٹا کر نصف بدن پر اس کی شال ڈال دی۔ پھر آہستہ آہستہ

اس کے سر کو دبانے لگا۔ واقعی سب سے زیادہ ضرب اس کے سر ہی میں آئی تھی۔ وہ نصف گھنٹہ تک گل جان کے سرہانے بیٹھا رہا۔ دو تین مرتبہ گلجان کے منہ سے آواز نکلی "ہائے آہ" کے سوا کوئی ذومعنی بات نہ تھی۔ نصف گھنٹہ کے بعد گل جان کے چہرہ پر سرخ رنگت پھیلتی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے اپنے آپ کو اس کے خوبصورت ٹکڑے کے اس قدر قریب پاکر اوس کے منہ سے منہ ملا دیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا "غریب لڑکی میں نے تجھ پر بڑا ظلم کیا"۔ اس آواز سے گل جان کی آنکھوں میں کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ اور وہ آہستہ سے بولی "میری میری یا سر پھٹا" "ہائے اماں" فرحت علی خاں کو اس کی دماغی تکلیف سے بڑا صدمہ گذرا اسے خیال گذرا کہ ڈاکٹر کو بلا کر دکھلا دے لیکن ڈاکٹر یا اجنبی آدمی کا یہاں آنا اس کے لئے جیل خانہ کی ہتھکڑیوں سے کم نہ تھا۔ وہ اچھل کر مسہری سے نیچے آیا۔ اور الماری سے ایک بوتل شراب کی نکالی جس کا کارک ایک چاقو سے کھولا شراب نکال کر اس نے چمچہ کے ذریعہ سے اس کے منہ میں شراب اتارنی شروع کی۔ پانچ منٹ کے اندر اس نے نصف بوتل گل جان کے منہ سے اتار دی جس کے کچھ دیر بعد ایسا معلوم ہوا۔ کہ گل جان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور سانس اس طرح نکلنے لگا۔ جیسے کوئی سو رہا ہے۔ اوس نے اس کے بدن سے آہستہ سے شال اتار دی۔ اور بہاری لحاف گردن تک کھینچکر اس کے پژمردہ چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسکے گرم رخساروں اور خوبصورت ہونٹوں پر بوسہ دیکر بولا "پیاری میں تجھ سے اب زبردستی نہیں کرونگا۔ لیکن تجھ بن زندگی کیسے کٹے گی۔ وہ اس کے سر تک لحاف کھینچ کر زینہ پر چڑھا۔ اور دروازہ پر دستک دی۔ ملازم نے باآواز فقل کھولا۔ اور پُر اشتیاق آنکھوں سے فرحت علی خاں کو دیکھنے لگا۔ "یہ بوڑھا ملازم سمجھ رہا تھا۔ کہ فرحت علی خاں کسی عورت کے پاس سے آرہا ہے"۔ فرحت علی خاں نے آہستہ سے کہا۔ اس مسہری کے پاس دوسرا پلنگ بستر لاکر بچھاؤ۔ اور اس کی ماں کو کھانا کھلاؤ۔ لیکن ہوشیار رہنا۔ بدذات نکل نہ جاوے پانچ منٹ کے اندر ملازم نے دوسرا پلنگ بچھا دیا۔ ازاں بعد فرحت علیخاں نے گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ اور نہ خانہ میں میز پر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ دراصل انسانی زندگی اختیار اور بے اختیاری

سے بہری ہوئی ہے۔ اس دفینہ پرور عیاش آدمی فرحت علی خاں نے گل جان کو بڑے حیلہ بہانے سے مظفر نگر بلایا تھا۔ اسرائیل خاں جس نے اپنے آپ کو تسہ کارٹیس متلاشی کر گلجان تک رسائی کی۔ کوئی رئیس نہ تھا۔ اور نہ اس نام کا کوئی جلال آباد یا تسہ میں موجود تھا۔ وہ دراصل فرحت علیخاں کا کارندہ تھا۔ جسے فرحت علیخاں نے یار غار اور محرم راز سمجھ کر اس خوفناک مشن کے اوپر نچوڑ کیا تھا۔ فرحت علیخاں سمجھ رہا تھا۔ کہ گلجان اسکے گھر پر آکر نرمی یا سختی سے قابو میں آجاویگی۔ اور اس بھروسہ پر اس نے میرٹھ کے کسی مالدار سوداگر سے پانچہزار روپیہ بطور ضمانت اوا کر کے دو موٹر گاڑیاں یک شبانہ روز کے لئے دوسو روپیہ کرایہ پر لی تھیں۔ اسے اپنے ارادہ کی تکمیل میں اعتبار اور بے اعتباری دونوں باتیں اکسا اور ڈرا رہی تھیں۔ ایک طرف وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ گل جان کسی طرح اس کے دندانہ تلک آگئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے تھانہ میں لاکر زوجہ بنا لیگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال ہوتا تھا۔ کہ شاید ساری تدبیر اکارت جاوے۔ اور گل جان اس کے مشیر اسرائیل خاں کے ساتھ آنے سے عین وقت پر انکار کر دے۔ اس میں تو کلام ہی نہیں۔ کہ اس کی تدبیر نصف سے زیادہ کامیاب ہوئی تھی لیکن عین اس وقت کہ گل جان پر دست درازی کر کے اسے ساری عمر کے لئے عفت و عصمت کے پردہ سے نامحرم بنانا چاہتا تھا۔ وہ غش کھا کر گر گئی۔ اور اس کی ہلاکت سے خوف کھا کر اس نے اپنی سفاکی کے شعلہ پر انسانیت اور ترحم کے پانی سے چھینٹے دے کر اسے بستر علالت پر لٹا دیا۔ وہ اس وقت تہ خانہ میں میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اور اس کے خیالات دور دور تو پہنچ رہے تھے۔ ایک خیال یہ تھا۔ کہ گل جان اگلے دن اس کے ارادوں کو کامیاب کرنے میں کچھ مدد دے سکیگی یا نہیں۔ دوسرا خیال یہ تھا۔ کہ کہیں گل جان کے دوست احباب اس کے گم شدگی کی خبر پاکر اس کا تعاقب کریں اور پولیس والے ملائے بے درماں کی طرح اس پر آپڑیں۔ تیسرا ڈر یہ تھا۔ کہ کہیں اس کا دوست اسرائیل خاں عین وقت پر دھوکا باز نہ ثابت ہو جاوے۔ اس وقت اس کے قبضہ میں ایک نئی موٹر کار تھی۔ اور وہ اوسے پرانی موٹر کار سمیت صحیح و سالم میرٹھ پہنچا

کر پانچ ہزار روپیہ وصول کر کے چمپت ہو جاوے۔ تو بڑی مشکل پڑے گی۔ پانچ ہزار روپیہ کی بربادی کے پیچھے ایک خیال اگر طمانیت بخش تھا۔ تو یہ کہ اس کے گھر میں گل جان آگئی تھی جس کے اوپر وہ بیس بلکہ چالیس ہزار روپیہ قربان کر دینے کو تیار تھا لیکن ابھی چند منٹ کے واقعات بتلا چکے تھے۔ کہ گل جان اس کی صورت سے بیزار تھی۔ اور کسی طرح اسکے قبضہ میں آنے والی نہ معلوم ہوتی تھی۔ ان خیالات پر غور کر کے اس کا دل کچھ بے چین ہوا مگر اس نے دانت پیکر دل میں کہا "کچھ ہو۔ میں اس عورت کو اب ہاتھ سے نہ جانے دونگا۔ اور اگر اس کی عصمت جاتی رہی۔ تو یہ خواہ مخواہ میرے گھر میں پڑ رہیگی۔ پھر مجھے ایک کوڑی خرچ نہ کرنا پڑیگی"۔ وہ اس پیچ و تاب میں تھا۔ کہ اس کے بوڑھے ملازم دربار علی نے امیر جان کے قید خانے کا قفل کھولا۔ بوڑھی امیر جان نچتہ فرش پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے چیخ مار کر کہا "میری گلجان کہاں ہے؟ اور اٹھ کر اس کمرہ کی طرف بھاگی جس میں گل جان بند تھی۔ لیکن نوکر نے اسے زور سے دھکا دیکر کہا "تیری گل جان نے خاوند کیساتھ گلچھرے اڑا رہی ہے۔ پیچھے ہٹ"۔ امیر جان نے شور مچا کر کہا "لوگو دوڑو۔ دوڑو۔ میں لٹ گئی"۔

مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ بنگلہ نچتہ سڑک اور آبادی سے دو فرلانگ پر واقع تھا جس کے آس پاس کوئی بنگلہ یا مکان نہ تھا۔ بوڑھے ملازم نے دانت پیس کر امیر جان کے منہ پر ایک گھونسہ جڑ کر کہا "احمق گدھی ان باتوں سے کیا حاصل۔ اگر اب زبان ہلائی۔ تو اس تلوار سے تیرا سر چیر دونگا"۔ اس کلمہ کے ساتھ ہی اس نے دیوار پر ایک تلوار کی طرف اشارہ کیا۔ جو ایک کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ بوڑھی امیر جان کو گھونسہ کی مرتب اور تلوار کے نام سے غش آگیا۔ وہ دھڑام سے نچتہ فرش پر گری۔ جہاں سے دربار علی نے اس کی چوٹی پکڑ کر دوسرے کمرہ میں کھینچنا شروع کیا۔ بوڑھی عورت نے ہائے مری کی آوازوں سے مرد کو سر پر اٹھا لیا۔ مگر وہ بدذات ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے اسے کمرہ میں کھینچ کر کہا۔ چپ چاپ پڑی رہ۔ میں تیرے واسطے کھانا لاتا ہوں۔ تیری لڑکی کی بھی عزت ہے۔ وہ ہماری سرکار کی بغل میں سو رہی ہے۔ ڈر کی کوئی بات نہیں

کل اچھی طرح نکاح ہو جاویگا۔ آج بلا نکاح سہی۔ رنڈیوں کیواسطے نکاح کی کیا ضرورت ہے۔

امیر جان نے بجلی کی طرح اٹھ کر اس کمرہ کی طرف دوڑنا چاہا جس میں گل جان بند تھی۔ مگر دربار علی نے ایک زور سے طمانچہ رسید کر کے کہا "بدذات مانتی ہی نہیں اب بھاگنے دوڑنے سے کیا فائدہ اب تو جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔ تیری لڑکی کی عزت جاتی رہی چپ چاپ بیٹھی رہ کہا مانا لاتا ہوں" بے رحم اور سنگدل دربار علی اوس کے دروازہ میں قفل ڈال کر باہر نکلا۔ اور کمبخت امیر جان نے دیوار میں سر مار مار کر رونا اور چیخنا شروع کیا۔ ایک غضب شدید لگی۔ وہ بالکل بیہوش ہو گئی پیشانی سے خون بہ نکلا۔

تینتیسواں باب

بدمعاشوں کی چالاکی سڑک پر رہ گئی

جس وقت گل جان کو بلند اختر والی موٹر کار کے اندر سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ دراصل ایک شراب کی بوتل کی آواز آئی تھی۔ جسے موٹر کار کے ڈرائیور نے شب کی تاریکی میں موٹر کار کے کسی پرزہ پر دے مارا تھا اس کے ساتھ ہی موٹر کار بھاں بھاں کر کے رک گیا تھا۔ موٹر بان نے حیرہ کیا ہو گیا" کہہ کر نعلیں جھانکیں۔ بلند اختر اور دلاور علی کے چہرے فق ہو گئے۔ دونوں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا ہوا" ملازم نے بھاری بھرکم دلی عناصر سے کہا" یارو پانچ ہزار کی گاڑی بگڑ گئی سرکار آگے چلیے ہیئے۔ مجھے اس کے کل پرزوں کی بھی خبر نہیں۔ اب کیا کروں۔ بلند اختر اور دلاور علی کے چھکے چھوٹ گئے۔ بستی تاریک اور ڈراونی رات سر پر بادل اور ہیبت ناک آسمان۔ سردی کا یہ عالم اور موٹر کی شکستگی دونوں کے دل ٹوٹنے لگے۔ اور وہ گھبرا کر نیچے اترے خورد سال کلن اس معاملہ کو محض تماشہ سمجھ کر" کیا ہوا سرکار۔ کیا ہوا سرکار" کہتا ہوا سڑک پر آیا۔ گاڑی بان نے آہستہ آہستہ

پہلے تو اپنا دوپٹہ درست کیا۔ پھر خوفزدہ آنکھوں سے دونوں نوجوانوں کی طرف دیکھ کر پوچھا: "تم دونوں تو بڑے صاحب بہادر ہو۔ کیا گاڑی درست کرنا نہیں جانتے؟"

دونوں دوستوں نے سر ہلا کر جواب دیا "ہم بالکل نہیں جانتے۔ کسی طرح اسرائیل خاں کو روکو۔ وہ ضرور جانتے ہونگے۔ نوکر نے مسکرا کر کہا۔ اسرائیل خاں کو اب کہاں سے بلاؤں وہ پہونچے ایک کوس آگے" پھر اپنے دل میں ہنس کر اس نے آہستہ سے موٹر کی لال ٹین اتاری۔ اور دونوں دوستوں کے چہرے اچھی طرح دیکھ کر کہنے لگا "مجھے اس کے کل پرزوں کی خبر نہیں۔ خیر دیکھتا ہوں" کیا بگاڑ ہوگیا ہے"

پھر ایک ہاتھ میں لال ٹین لے کر اس نے گاڑی کے پہیوں کو اندھوں کی طرح ٹٹولنا شروع کیا۔ بعد ازاں اس مقام کو دیکھا جہاں سے تیل ڈالتے ہیں پھر ہینڈل اور گھنٹی کو دبا دبا کر پوں پوں کرنے لگا۔ بظاہر گاڑی کا کوئی پرزہ خراب نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان نوجوان دوستوں کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ کیا بگاڑ ہوگیا ہے۔ اتنے میں بلند اختر پیشاب کرنے کے لئے الگ ہوگیا۔ اور دلاور علی نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس وقت موٹر بان اس کے ہینڈل کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ دلاور علی اس سے پانچ فٹ کے فاصلہ پر تھا۔ اس نے لال ٹین کو اس کی جگہ پر لٹکا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے گاڑی کو کھینچ کر سڑک پر لایا پھر دلاور علی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "صاحب اب گاڑی تو بگڑ گئی۔ ایک سگریٹ مجھے بھی دو میں بھی عجب آفت میں پھنس گیا" دلاور علی منہ میں سگریٹ دبائے اس کے لئے سگریٹ نکالنے لگا۔ خورد سال کلن رضائی اوڑھے دلاور علی کے منہ کو تک رہا تھا۔ اس وقت موٹر کا ملازم بندر کی طرح چھلانگ مار کر سوار ہوگیا۔ اور دلاور کو گاڑی حرکت کرتی ہوئی دکھلائی دی۔ اس نے منہ سے سگار نکال کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر زور کی آواز میں بولا۔ کیا چلنے لگی؟ گاڑی کی چھاں چھاں کے ساتھ دلاور علی کو یہ آواز آئی "اور چلنے تو لگی۔ مگر تم اب ساری رات سڑک پر اولے کھاؤ" پھر ایک قہقہہ کی آواز

آئی۔ اور گاڑی ابر کی طرح پھدک کر آگے بڑھی۔ دلاور علی خونی چور کی طرح اچھل کر گاڑی کے پیچھے پڑا۔ اور "ٹھہرو ٹھہرو" چلاتا ہوا پیچھے بھاگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بلند اختر اپنے پیچھے بھاگتا ہوا سنائی دیا۔ مگر موٹر کار ان لوگوں کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ ان دونوں کے پیچھے خورد سال کلن چلا رہا تھا "میں رہ گیا۔ میں رہ گیا" مگر کون سنتا تھا۔ دلاور علی اور بلند اختر مجروح اور دیوانے کتے کی طرح دوڑے جا رہے تھے۔ اور ایک جگہ دلاور علی کا ہاتھ موٹر کار سے لگ بھی گیا تھا۔ مگر دوسرے لحظہ میں اسے موٹر کار اپنے سے دس گز کے فاصلہ پر دکھلائی دی۔ وہ سنبھل کر پھر لنگور کی طرح آگے بڑھا لیکن موٹر کار اس وقت پوری رفتار پر چڑھ چکی تھی۔ دونوں محبوں نوجوان غصہ اور فکر سے سر پیٹتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ اور "پاجی ٹھہر۔ بدمعاش ٹھہر" ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔ اس کش مکش میں خورد سال کلن ایک میل پیچھے رہ گیا۔ جہاں سے وہ روتا ہوا بھاگا ہوا چلاتا آ رہا تھا "میں رہ گیا۔ میں رہ گیا"۔

ایک میل تک بڑی جان توڑ دوڑ کے بعد دلاور علی کو پسینہ آ گیا۔ اور وہ ہانپ کر کہنے لگا۔ اب گاڑی ہاتھ میں نہیں آ سکتی۔ اختر یہ تو پاجی نے بڑی چال چلی۔ نگاس سے کیا مطلب۔ بلند اختر بلی کتے کی طرح آنکھیں نکال کر ہانپتا ہوا بولا "مطلب کیا ایسا معلوم ہوتا ہے" پہلی چال پہلے سے تجویز ہو چکی تھی۔ اور کوئی آفت گل جان کے اوپر آنے والی ہے۔ دلاور علی نے دل ہاتھوں سے تھام کر جواب دیا "میں تو اس قدر تیز بھاگا۔ کہ شاید میرے پھیپھڑے میں کوئی خرابی آ گئی۔ میرا دل نکلا جاتا ہے۔ اور یہ کہکر اس نے بلند اختر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کیونکہ وہ نقاہت کے سبب گرا جاتا تھا۔ بلند اختر بھی کچھ کم تھکا ماندہ نہ تھا۔ اس کے منہ سے بھی زبان نکلی جاتی تھی۔

دونوں نوجوان ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سڑک پر بیٹھ گئے۔ اور لانبے لانبے سانس بھر کر کہنے لگے "اب کیا کریں"۔ دلاور علی کے سر میں چکر آ گیا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ مگر بلند اختر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "اس سردی اور تاریک رات میں مرجانے کا مجھے ڈر نہیں۔ کیا مصیبت آنے والی ہے۔ اگر کسی نے

میری سپاہی پر انگلی اٹھائی، یا اس کی شہامت جاتی رہی۔ تو میں جان دیدونگا چلو پیارے دلاور بھاگے بھاگے مظفر نگر چلیں۔ دس بارہ میل کی بات ہے۔ دلاور علی نے اپنا سینہ پکڑ کر جواب دیا "یہ خوش مجھ میں بھاگنے کی جان نہیں۔ میں اس قدر تیز بہا گا ہوں۔ کہ شاید میری کوئی رگ کھل گئی جگر مالش کر رہا ہے۔ اب مجھ میں بھاگنے کی تاب نہیں۔ تم اکیلے دیوبند جاؤ۔ اور کوئی یکہ کرایہ کر کے لے آؤ"۔

لاحول ولا قوۃ۔ تم بڑے دلاور تھے۔ ایک میل کی دوڑ سے تھک گئے۔ میں اکیلا دیوبند نہیں جا سکتا۔ آؤ تم بھی ساتھ آؤ۔ بھاگے بھاگے دیوبند چلو۔ وہاں کوئی ریل جاویگی۔ اور ہم ان بدمعاشوں کو گرفتار کر کے گل جان کو چھڑا لاویں گے۔ بلند اختر نے دلاور علی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔ پھر اس سے کہا "تم پیشاب کر لو۔ شاید تکان کم ہو جاوے"۔ دلاور علی نے سڑک کے کنارے پر پیشاب کیا۔ اور دو تین منٹ تک بیٹھا رہا۔ بعد ازاں کپڑے جھاڑ کر بولا "واقعی پیشاب کرنے سے بڑا آرام معلوم ہوا۔ اب میں بھاگنے کے قابل معلوم ہوتا ہوں"۔ بلند اختر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر جواب دیا "پیارے دوست آؤ۔ دوڑ کر جلدی دیوبند چلو معلوم نہیں۔ میری پیاری معشوقہ کی جان پر کیا گذری ہوگی اور یہ کہکر دونوں دوست آہستہ آہستہ بجانب شمال بھاگنے لگے۔ نصف میل کے فاصلہ پر انہیں کلن رونا ہوا ملا۔ جو بہاگا بہاگا آرہا تھا۔ اور جس کی دردناک آواز سے سننے والے یہ سمجھتے تھے۔ کہ اس کا عزیز یا قریبی مرگیا ہے۔ بلند اختر اور دلاور علی کو دیکھ کر خورد سال لڑکے کی جان میں جان آئی۔ اور وہ زور سے رو کر بولا۔ تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ میں سرکار سے کہونگا" بلند اختر سرکار کے نام سے اپنی پیاری معشوقہ کے چہرے کو روتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے دلاسا دیکر کلن کو آہستہ ساتھ کر لیا۔ اور یہ تینوں لپکے لپکے دیوبند کی طرف جانے لگے۔ نو بجے کے قریب بالکل تھکے ماندے گرتے پڑتے دیوبند پہونچے۔ جہاں انہیں ریلوے اسٹیشن پر معلوم ہوا۔ کہ دس بجے کے قریب ایک گاڑی مظفر نگر جاوے گی۔ انہوں نے چند مسافروں سے اپنی برائی کا ذکر کیا۔ مگر یہ لوگ پرانی قسم کے شیخ زادے تھے۔ وہ ان کے انگریز

اور گل جان رنڈی زادی کے ذکر سے چیں بہ جبیں ہوئے۔ اور ان لوگوں کو شراب کے نشہ میں متوالے سمجھ کر دلوں میں ہنسنے لگے۔ دلاور علی کی جیب میں دو روپے تھے انہوں نے اسٹیشن پر کچھ کھانا خریدا جس سے تینوں آدمیوں کے معطل اعضا میں کچھ جان آئی پھر یہ تینوں گاڑی کے انتظار میں اسٹیشن کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور دونوں دوستوں نے سگریٹ پینے شروع کئے۔ تاریک اور سرد سڑک پر ایسی تیز رفتاری سے بھاگ کر آنے نیز اسٹیشن کا ٹھنڈا پانی پینے سے ان کے بدن میں سردی کے مارے لرزہ شروع ہو گیا تھا۔ اور ان لوگوں کو اپنے گھروں کے گرم اور بند مکانات یاد آرہے تھے لیکن انہیں اس بات کا علم نہ تھا۔ کہ ابھی بہت سی مصیبت جھیلنی ہے۔ گیارہ بجے شب کے وہ مظفر نگر پہونچے۔ اور بھاگے بھاگے چودھری گھاسی رام کی کوٹھی پر پہنچ گئے لیکن اس وقت تمام کوٹھی خاموش اور ویران سی پڑی تھی۔ انہوں نے نیچے اوپر کے سب دروازوں پر آوازیں دینا شروع کیں۔ کوٹھی کا پھاٹک بند تھا۔ انہیں خیال تھا۔ کہ کوٹھی کے اندر خوب زور شور سے گانا بجانا ہو رہا ہوگا۔ اور مہمانوں کے قیام سے ہر کمرہ میں روشنی اور چہل پہل ہوگی لیکن اس کوٹھی میں چاروں طرف سناٹا دیکھ کر ان کے ہوش و حواس اڑنے لگے۔ اور وہ سمجھ گئے۔ کہ ضرور بدمعاش لوگ گل جان کو کسی خوفناک ارادہ سے اڑا کر لائے ہیں۔ مگر وہ چودھری گھاسی رام کی کوٹھی پر بڑے بھروسہ سے آئے تھے۔ اور انہیں خیال تھا۔ کہ یہاں کچھ پتہ ضرور ملیگا۔ شاید آج کی شب جلسہ رقص و سرود کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا ہو۔ انہوں نے بڑے چوبی پھاٹک پر زور زور سے دستک دینی شروع کی۔ اور ان کے شور سے اوپر کی منزل پر کسی شخص کی آنکھ کھل گئی جس نے بڑے غصہ سے کمرے کی کھڑکی کھول کر پوچھا "کون ہے"۔ بلند آواز سے انسان کی آواز سنکر کچھ ڈھارس پائی۔ اور وہ زور سے بولا۔ کیا یہاں اسرائیل خانصاحب ٹھہر رہے ہیں۔ اجنبی زبان سے چلا کر جواب دیا۔ اسرائیل خان کو ہم نہیں جانتے۔ دربان سے پوچھو۔ اس جواب سے تو وہ دوست ناامید ہو گئے لیکن انہوں نے زور زور سے کیواڑوں پر ہاتھ مارنا [illegible] دیکھا سیاہ پوش کا دربان کو [illegible] میں [illegible] وہ ناوقت

مزاحموں کی چیخ پکار سے جھلا کر اٹھا۔ اور بڑبڑا کر کیواڑ کھولنے لگا اس وقت دروازہ میں بالکل تاریکی تھی۔ اور آسمان پر گھرے ابر سے بارش کی آمد آمد ہو رہی تھی نہ تو دربان نے ان لوگوں کو پہچانا۔ اور نہ ان دونوں نے اس کی صورت اچھی طرح دیکھی۔ دربان کا سب سے پہلا سوال یہ تھا۔ کون ہو گیا کام ہے؟"

دونوں دوستوں نے کانپتی ہوئی آواز میں ہم زبان ہو کر جواب دیا۔ ہم اسرائیل خاں صاحب رئیس تسہ کی تلاش میں ہیں۔ سنا تھا۔ کہ اس کوٹھی میں کوئی جلسہ ناچ رنگ کا ہونیوالا ہے"۔ دربان نے اپنے منہ کو ہوا سے بچا کر جواب دیا۔ یہاں اسرائیل خاں نہیں ہے۔ تسہ یہاں سے بارہ میل ہے۔ وہاں جاؤ۔ ناچ وانچ یہاں نہیں ہوا کرتا۔ اوپر دو شریف آدمی ٹھہرے ہیں جن میں سے ایک بیمار ہے۔ ڈاکٹری علاج کرانے آیا ہے۔ دونوں نوجوان اس جواب سے سخت بے چین ہوئے۔ سردی کے مارے ان کا بدن کانپ رہا تھا۔ دربان چاہتا تھا کہ فوراً دروازہ بند کر کے اپنی کوٹھری میں جا گھسے وہ کہ بلند اختر نے دلاور علی سے نہایت ناامید آواز میں کہا۔ اب کیا کریں؟ دلاور علی نے دہڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا" جو لوگ اوپر ٹھہر رہے ہیں۔ ان سے کچھ حالات کہو۔ شاید کسی کو اسرائیل خاں کا پتہ معلوم ہو"۔ پھر بلند اختر نے دربان سے پوچھا بھائی کیا تم ہمیں اوپر کے مہمانوں سے ملا دو گے"۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں"۔ دربان نے جھلا کر جواب دیا۔ اوپر کے آدمیوں میں اسرائیل خاں کوئی نہیں۔ ایک ہندو بابو نتھا سنگھ ہے۔ دوسرا کوئی عیسائی ہے"۔

یہ کہہ کر دربان نے زور سے پھاٹک بند کر دیا۔ اور یہ دونوں کئی منٹ تک کھڑے سوچتے رہے۔ کہ کیا کریں۔ ان کے دل پر اس وقت عجب حالت گذر رہی تھی سردی کے مارے پاؤں اکڑ کر بیکار ہو رہے تھے۔ دلاور علی کو تو محض تکان اور خواہ مخواہ کی مصیبت سی تکلیف تھی لیکن بلند اختر کو ان مصائب کے سوا ایک قسم کا درد دل محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اسرائیل خاں کی لانبی بہ ہیئت شکل دکھائی دے رہی تھی۔ اور وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اس وقت اس کی پیاری معشوقہ پر کوئی ستم ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے تاریک

آنکھوں سے دلاور علی کی طرف دیکھ کر بڑی مصیبت زدہ آواز سے کہا۔ بتاؤ اب کیا کریں۔ اسرائیل کو تو یہاں کوئی نہیں جانتا۔"

دلاور علی نے خوف زدہ نگاہ بلند اختر کے چہرے پر ڈالی۔ جو اسے اچھی طرح دکھائی نہ دیا۔ اور تھراتی ہوئی آواز سے جواب دیا۔ "میں کیا بتلاؤں۔ میں محض تمہارے ساتھ لگا پھرتا ہوں۔ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ سردی کے مارے بیدم ہو گیا ہوں۔ اب رات کو کسی سرائے میں چلو صبح کو دیکھا جاویگا۔" اس جواب سے بلند اختر کا دل بیٹھنے لگا اس لیے زور سے زمین پر پاؤں مار کر کہا۔ واہ گلجان کی عصمت برباد ہو جاویگی میں اپنی جان دے دونگا۔ اگر تم ایسے آڑے وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دینا پسند کرتے ہو۔ تو جاؤ۔" دلاور علی نے سنکر جواب دیا۔ میں تمہارا ساتھ تو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن اس وقت مجھے قطعی امید نہیں کہ اسرائیل خاں کا پتہ لگا سکو۔ خدا جانے وہ کون شخص ہے۔ اور کہاں رہتا ہے جہاں تم چلو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" یہ دونوں بدحواس مگر پریشان دوست ابھی اسی فکر میں تھے۔ کہ کہاں جاویں۔ کہ اتنے میں انہیں ایک آدمی جلدی جلدی سڑک پر بجانب غرب جاتا ہوا معلوم ہوا۔ دھندلکے کو سناٹا کا سہارا کافی ہوتا ہے بلند اختر جھپٹ کر سڑک پر آیا۔ اور اوسنے اپنے سامنے ایک پولیس کا کانسٹبل پایا۔ جو سیاہ باران کوٹ پہنے لپکا جارہا تھا بلند اختر کو کانسٹبل کی صورت سے کچھ ہمت ہوئی۔ اور اس نے چلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ صاحب آپ کو کچھ معلوم ہے۔ اسرائیل خاں رئیس قصبہ مظفر نگر کہاں ملیں گے؟"

کانسٹبل سڑک پر رک گیا۔ اور بلند اختر کو دیکھنے کی کوشش کر کے بولا۔ "آپ کون ہیں اسرائیل خاں رئیس قصبہ یہ نام میں نے کبھی نہیں سنا۔ میں بیس سال سے مظفر نگر کی پولیس میں ہوں۔ سید امیر حسن خاں رئیس قصبہ تو مشہور ہیں۔ کل ہی میرٹھ گئے ہیں اس جواب سے بلند اختر سہم گیا۔ اور گھبرا کر کہنے لگا۔ "صاحب ہم عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ایک شخص اسرائیل خاں نے سہارنپور کی ایک عالی خاندان رنڈی زادی گلجان کو جلسہ ناچ ورنگ میں شریک کرنے کے لئے مظفر نگر طلب کیا تھا۔ اور خود دو موٹر کار لے کر سہارنپور گیا تھا۔ ایک موٹر کار میں گل جان اور اسرائیل خاں تھا۔ اور دوسری میں ہم دونوں

اور یہ خوبرو سال لڑکا ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے ہوکہ دیکر ہمیں سڑک پر اتار دیا۔ اور خود گاڑی لے کر چمپت ہوگیا۔ اسرائیل خاں کی موٹر کار ہم سے آگے نکل گئی تھی۔ ہم بڑی مصیبت اٹھا کر دیوبند گئے۔ اور وہاں سے بسواری ریل یہاں تک آئے۔ اب اسرائیل خاں کا پتہ ہے نہ کل جان اور نہ اس کی ماندہ کا۔ کانسٹبل نے بلند اختر اور دلاور علی نیز خورد سال لڑکے کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر منہ بچا کر بولا "خوب یہ تو بڑا سنگین معاملہ ہے کیا اس لڑکی کے پاس بہت سا زیور تھا؟" بلند اختر نے زمین پر پاؤں مار کر جواب دیا۔ بھائی صاحب زیور تو کچھ برائے نام تھا مگر وہ بیچاری لڑکی سولہ سترہ سال کی ہے اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہوگئی ہے۔ خدا جانے کون بہکا لے گیا۔ اب آپ بتلائیے۔ ہم کیا کریں۔ کانسٹبل اپنے کانوں کو ہوا سے بچانے کے لئے اوور کوٹ منہ تک کھینچ لیا۔ پھر بھاری آواز نکالتے ہوئے بولا "دن دیہاڑے ایسا اندھیر! اچھا آپ لوگ میرے ساتھ کوتوالی آیئے تاکہ کچھ تحقیقات کی جاوے" بلند اختر اور اس کے ساتھی بیحد تھک گئے تھے لیکن کانسٹبل کی باتوں سے نہیں اپنی ٹانگوں میں کچھ جان معلوم ہوئی۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اصلیت یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ہر انسان کے دل و دماغ پر صدمہ پہنچنے سے تمام اعضا ظاہری باطنی ڈگمگا سکرڈ جاتے ہیں۔ پھر اگر کوئی بھی ہمدردی یا مدد پہنچاتا ہے۔ تو اعضا اپنی اصلی حالت پر آنے لگتے ہیں۔ کوتوالی اس مقام سے نصف میل کے فاصلہ پر تھی۔ کانسٹبل نے بلند اختر سے راستہ میں سب حالات معلوم کر لئے۔ اور کوتوالی کے دروازہ پر پہونچکر پوچھا "تمہیں کوئی بات مجھ سے چھپانی تو نہیں؟" بلند اختر نے خوف زدہ چہرہ سے دلاور علی کیطرف دیکھکر جواب دیا "اس واقعہ میں کونسی بات چھپانے کی تھی؟" پختہ کوتوالی کا بڑا پھاٹک کہلا ہوا تھا۔ اور دروازہ کے باہر ایک لال پین دیوار پر لگی ہوئی تھی پھاٹک کے اندر ایک مسلح کانسٹبل سنگین لئے ٹہل رہا تھا جس نے ان لوگوں کو کانسٹبل کیساتھ دیکھکر اپنے ساتھی سے پوچھا "خیریت" اس نے جواب دیا "ہاں خیریت تو ہے مگر ایک بڑا سنگین معاملہ پیش آگیا ہے۔ کیا انسپکٹر صاحب روزنامچہ کو چھپتے ہیں؟" پہرہ دار کانسٹبل نے ان لوگوں کی طرف دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھکر جواب دیا "نہیں ابھی نہیں گئے" مگر باہر آگئے ہیں" کانسٹبل

لپکا لپکا انسپکٹر کے احاطے میں پہنچا۔ جو کوتوالی کے سامنے واقع تھی۔ اور جس کے کمرہ میں ہنگس کی چمکدار لال ٹین جل رہی تھی۔ لال ٹین کے پاس دو کانسٹبل مسلح کھڑے تھے برآمدہ کے پیچھے کمرہ میں روشنی تھی لیکن کیواڑ ہنوز بند تھے۔ کانسٹیبل نے دوسرے کانسٹیبلوں سے سرگوشی میں باتیں کیں۔ پھر آہستگی کیواڑ کھول کر اندر گھسا۔ بلند اختر سعید اور علی وکلن دم بخود دل سے انتظار کرتے رہے۔ یہ دونوں دوست اگرچہ بذات خاص بڑے پھٹے ہوئے بدمعاش تھے لیکن پولیس کے حدود میں آنے سے انہیں ایک نامعلوم سا خوف دل پر مسلط ہوتا ہوا معلوم دیا۔ دلاور علی کے دل پر لرزہ چھانے لگا اور وہ چاہتا تھا۔ یہاں سے نکلکر بھاگ جائے مگر بلند اختر اس خوف و ہراس کے اندر بھی گل جان کے خوبصورت چہرہ کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور وہی ایک کشش تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس کوتوالی میں کھینچ لایا۔ کانسٹبل اندر گھسا۔ تو اسے ایک بڑے آئینہ کے سامنے جو ایک مستطیل میز پر رکھا تھا۔ "انسپکٹر وردی پہنتا ہوا معلوم دیا کیواڑ کھلنے سے کمرہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا داخل ہوئی۔ جو انسپکٹر کی گردن سے ٹکرائی۔ انسپکٹر نے گردن اٹھا کر پس پشت دیکھا۔ اور کانسٹبل نے فوجی سلام کر کے عرض کیا "حضور دو آدمی اور ایک لڑکا سہارنپور سے آئے ہیں۔ ان کی کوئی آشنا ہنڈی نہیں جسے کوئی اسرائیل خاں رئیس تھانہ بن کر بھگا لایا ہے" انسپکٹر نے جلدی سے دوپٹہ سر پر رکھ لیا۔ اور گھبرا کر بولا "کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے" اور یہ کہہ کر وہ پھر برآمدہ میں آیا جہاں اس نے بلند اختر اور اس کے دوست کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔ آپ لوگ تشریف رکھیے۔ دیکھو اندر سے دو کرسیاں لا کر ڈال دو۔ انسپکٹر پھر اندر گھس گیا۔ اور امجد علی کو آواز دی۔ امجد علی اس شخص کا نام تھا۔ جو ریلوے اسٹیشن سے آتا ہوا بلند اختر سے دوچار ہو کر اسے کوتوالی تک لایا تھا۔ امجد علی بھاگ کر اندر گیا۔ اور ایک لمحہ بعد بلند اختر دلاور علی اور کلن کو اندر لے گیا۔ اس عرصہ میں امجد علی نے دوسرا کانسٹبل ہیڈ کانسٹبل انسپکٹر ماتحت اور ہیڈ محرر کو بیدار کر دینے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ انسپکٹر نے کمرہ کی دیوار گیری ذرا تیز کر کے ان دونوں نوجوانوں کو خوب غور سے دیکھا۔ پھر کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ خورد سال کلن ان کے پیچھے کھڑا رہا۔ یہ کمرہ

وسیع اور مربع تھا۔ اس میں نہ در نگ بھرا ہوا تھا۔ فرش پر عمدہ سُرخ دری بچھی ہوئی تھی۔ تین چار الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ جانب شرق اس کمرہ کے دروازہ پر پردہ پڑا تھا جو بظاہر انسپکٹر کے استراحت خانہ کا راستہ تھا۔ کمرہ کے وسط میں ایک بڑی سی میز بچھی ہوئی تھی جس پر سبز بانات کا پرانا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ میز کے آس پاس پانچ سات کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بلند اختر اور دلاور علی کے بیٹھ جانے پر انسپکٹر نے سب سے پہلا سوال یہ کیا "صاحب! مجھے تعجب ہے۔ کہ آپ دونوں نوجوان رنڈی کے گرد پھر رہے ہیں۔ رنڈی کون ہے۔ مجھے مفصل حالات سنایئے" بلند اختر نے ڈرتے ڈرتے نہایت لوٹے پھوٹے الفاظ میں گل جان کی اصلیت بیان کر دی "جسے سُنکر انسپکٹر مُسکرایا پھر کہنے لگا۔ اچھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ یہ رنڈی زادی آپ کی معشوقہ ہے اب میں سمجھ گیا مجھے یہ خیال تھا۔ کہ ایک رنڈی کے پیچھے دو فضول نوجوانوں کی وہی مثل ہو جاتی ہے "دو سلاطین در اقلیمے نہ گنجند" انسپکٹر جوان خوبرو اور مضبوط آدمی کوئی بتیس سال کی عمر کا تھا جو عالی خاندان اور بی اے پاس ہونے کی وجہ سے ابھی ایک سال گذرا سب انسپکٹری سے ترقی پاکر انسپکٹری پر آیا تھا۔ اس کا رنگ گندمی سفیدی مائل ناک لمبی۔ چہرہ لمبا پیشانی بلند تھی۔ اور بظاہر وہ ہنس مکھ آدمی تھا۔ اس نے چند باتیں جلدی جلدی نوٹ کر کے سامنے دیکھا۔ اور اسے ایک سب انسپکٹر ماتحت ایک دولائی میں لپٹا ہوا سامنے دکھلائی دیا۔ سب انسپکٹر پورانے فیشن کا مرٹھا تازہ بوڑھا آدمی تھا۔ قد کسی قدر پستہ۔ بدن مضبوط۔ رنگت سیاہی مائل چیچک آلودہ۔ ڈاڑھی چوڑی بحضاب سے سیاہ شدہ۔

انسپکٹر نے تعظیم سے بوڑھے سب انسپکٹر کی طرف دیکھ کر اسے کرسی دی۔ اور نرم آواز سے کہا۔ سب انسپکٹر صاحب ان دونوں صاحبوں کے اظہارات لکھ کر انہیں کسی سرائے میں بھجوا دیجئے۔ تاکہ آرام کریں۔ میں نے سب باتیں نوٹ کر لی ہیں گشت سے آکر اس معاملہ پر غور کرونگا۔ اور یہ کہکر نوجوانوں کی طرف کن آنکھوں سے دیکھتا ہوا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ انسان دراصل اپنے آپ کو بڑا چالاک ہوشیار سمجھا کرتا ہے لیکن یہ محض

دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ پولیس کی صدر میں یہ دونوں نوجوان اپنے سید ہے اور کم گو معلوم ہو رہے تھے۔ کہ لنگر گمی کو معلوم ہو جاتا۔ کہ ان میں سے ایک پرکامران کو رفیق احمد کے قتل اور دوسرے پر سرقہ وصیت نامہ کا شبہ ہے۔ تو کوئی یقین نہ کرتا۔ کہ بہر حال ایک وقت انسان غالب اور دوسرے وقت مغلوب ہو سکتا ہے اور اسے دنیا میں طاف گزاف کا ہرگز جائز موقعہ حاصل نہیں"

چونتیسواں باب

کامران کی تاک جھاک

جس وقت بلند اختر اور دلاور علی کو تو الی مظفر نگر میں پریشان و مضطرب بیٹھے ہوئے اظہارات قلم بند کرا رہے تھے ایک شخص ان کے اصلی حالات کے درپے ہو کر اول الذکر کے مردانہ مکان میں قفل کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ شخص مکار اور جالا کامران تھا۔ جو عید الفطر کی نماز ادا کر کے اسی شب لاہور سے چل کر اگلے دن بوقت شام سہارنپور آگیا تھا اپنے گل جان کی حویلی پر جا کر اچھی طرح معلوم کر لیا تھا۔ کہ وہ اپنی والدہ اور بلند اختر و دلاور علی سمیت مظفر نگر چلی گئی ہے۔ اور اس سے زیادہ خوشی شاید اسے کسی دوسری بات سے اس وقت نہیں ہو سکتی تھی۔ بلند اختر کی موجودگی میں کامران اس کے مکان میں قفل کھول کر اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ اب چونکہ وہ مظفر نگر چلا گیا تھا۔ وہ گیارہ بجے رات تک جاگتا رہا پھر اپنے مکان کے دروازہ پر اچھی طرح دائیں بائیں دیکھ کر بلند اختر کے زینہ کی طرف لپکا۔ باہر کے قفل کی چابی وہ لاہور سے بنوا کر لایا تھا اس نے باسانی قفل میں چابی ڈالی۔ اور وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس نے اوپر چڑھ کر اندر کی زنجیر لگا لی اور آہستہ آہستہ طے کر کے کمرہ کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس نے دیا سلائی جلائی۔ اور اس دروازہ میں بھی ایک آہنی مضبوط قفل لگا پایا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے ہیڈ کوارٹر

لاہور سے آرہا تھا۔ اور اب قفل کا مسئلہ اس کے ملی میں تین چار روز سے گشت کر رہا تھا وہ اس معاملہ پر اچھی طرح غور کر کے آیا تھا۔ اس وقت اس کے جیب میں دو تین اوزار اور بیس پچیس مختلف نمونوں کی چابیاں پڑی تھیں۔ وہ اس وقت مرزا نکلو بیگ کے لباس میں تھا جس میں اس کی شکل خواہ مخواہ ذرا ڈنی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے جیب سے ایک لالٹین نما شے نکالا۔ اور اسے روشن کر کے ایک طاق میں رکھ دیا۔ جو قفل سے دو فٹ کے فاصلہ بائیں حصہ دیوار پر بنا ہوا تھا۔ پھر اس نے قفل کا منہ ہاتھ میں پکڑ کر اپنی کنجی لگا کر امتحان کرنا شروع کیا۔ وہ ایک درجن چابیاں ادھر ادھر پھراتا رہا۔ لیکن کوئی چابی نہ لگی۔ ایک چابی قفل کے اندر پھنس گئی۔ اور وہ سمجھا کہ شاید قفل بالآخر توڑنا پڑے وہ اس کنجی کو زور سے ادھر ادھر گھما کر نکالنے میں مصروف تھا۔ کہ اسے مکان کے نیچے سے کنسٹیبل کی آواز زور سے سنائی دی۔ جو کہہ رہا تھا۔ جاگو جاگو بھائی جاگو۔ وہ گھبرا کر دم بخود رہ گیا اور قفل سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے آہستہ سے موم بتی گل کر دی۔ کانسٹیبل کو بلند اختر کے مکان میں کوئی بات غیر معمولی نہ دکھلائی دی۔ اور نہ در اصل محلوں کے کانسٹیبل مکانات کے قفل ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی لاٹھی سے دیوار کھٹکھٹاتا ہوا آگے نکل گیا۔ کامران خاموش کھڑا رہا۔ وہ کنسٹیبل کی آواز سے اس قدر ڈر گیا تھا۔ کہ زور سے سانس لینا بھی خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ بارے جب کانسٹیبل دور نکل گیا۔ اور اسے بہت دور سے "جاگو بھائی جاگو" کی آواز سنائی دی۔ تو اس نے پھر موم بتی روشن کی۔ اور پاجنگی کنجی کو باہر نکالنا شروع کیا۔ جو اس وقت ایک ہی جھٹکے میں نکل آئی۔ اس کے بعد اس نے چار پانچ کنجیاں اور تبدیل کیں۔ جب کوئی چابی اس قفل کے قابل نہ معلوم دی۔ تو وہ نا امید ہو کر قفل توڑنے پر آمادہ ہوا۔ لیکن اس کی جیب میں اپنے گھر کے چند قفلوں کی چابیاں ایک زنجیر میں لٹک رہی تھیں۔ اس نے اپنی چابیاں بھی ایک ایک کر کے آزمانی شروع کیں۔ اور محض اتفاق سے ایک چابی نے قفل کو کھٹاک سے کھول دیا۔ کامران کا دل مسرت سے اچھل پڑا۔ اور وہ قفل کو چھت فرش پر رکھ کر یا تنگی دروازہ کھولنے لگا۔ کمرہ میں بالکل تاریکی تھی۔ اور بمقابلہ باہر کے اندر کی ہوا مدھم تھی

وہ اپنی موم بتی کو ہاتھ میں لے کر اندر گھسا۔ اور دھڑکتے دل سے کمرہ میں دور تک نظر ڈالی کمرہ بہت لمبا چوڑا نہ تھا۔ عمارت کسی قدر پرانی اور میلی تھی۔ جو بلند اختر کے فلاس کو اچھی طرح ظاہر کر رہی تھی۔ کمرہ میں ایک پورانی چٹائی کے اوپر دسوتی کا پرانا گرد آلود فرش بچھا ہوا تھا۔ وسط کمرہ میں ایک پورانی گول میز کے اوپر پورا نامیز پوش پڑا تھا جس پر ایک سیاہ رنگ کا پورانا کیش بکس اور چند کتب و کاغذات بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ میز کے پاس دو پورانی آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کامران نے موم بتی میز پر رکھدی۔ اور کمرہ کو چاروں طرف بغور دیکھنے لگا۔ بجانب غرب اس کمرہ میں دو کیواڑ تھے۔ جو اندر کی جانب بند ہوتے تھے۔ بظاہر یہی راستہ زنانہ مکان میں جانے کا تھا۔ مشرق کی طرف دو کھڑکیاں تھیں جن کے دراڑ بہت چوڑے ہو گئے تھے۔ اور اس وجہ سے کامران کو اندر کی آوازیں بخوبی باہر سنائی دینے لگی تھیں جنوبی دیوار میں ایک الماری تھی جس میں قفل لگا ہوا تھا۔ کامران اس وقت کمرہ میں اس نیت سے داخل ہوا تھا کہ کسی طرح معلوم کرے آیا بلند اختر کے پاس رفیق احمد کے والد کا وصیت نامہ ہے۔ یا نہیں۔ اور وہ اسے کس غرض سے چرا کر لایا تھا۔ وہ میز پر جھکا۔ اور اسے کیش و کتب پر کثرت گرد جمی ہوئی معلوم دی۔ اس روز دن بھر پوا ہوائیں چلتی رہی تھیں۔ جو کھڑکی کے سوراخوں میں سے بآسانی اندر داخل ہو سکتی تھیں اس نے جیب سے ایک رومال باہر نکالا۔ اور کتب کو جھاڑ جھاڑ کے دیکھنا شروع کیا۔ ان کتب اور کاغذات میں کوئی چیز از قسم وصیت نامہ نہ تھی۔ پھر اس نے کیش بکس کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا۔ آیا وہ کھلا ہوا تھا۔ یا بند کیش بکس بند تھا۔ اس نے اپنی جیب میں سے متعدد چابیاں نکالیں۔ اور یکے بعد دیگرے لگانی شروع کیں کیش بکس کا اندرونی تالا مضبوط تھا پیٹنٹ نہ تھا۔ وہ تیسری ہی چابی سے کھل گیا۔ اور کامران کو بکس کے اندر چند عمدہ قسم کے کاغذ نفاست نظر آئے۔ بظاہر جن کا بلند اختر کو بہت شوق تھا۔ اس نے اوپر کے درجہ میں کوئی مشتبہ کاغذ نہ پایا۔ پھر ڈھکنا نکال کر نیچے دیکھا۔ اس میں بہت سے پورانے خطوط جمع تھے جن میں ایک دو گل جان کی طرف سے بھی تھے۔ اس نے سب خطوط کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ ان میں سے بہت سے خطوط تو کسی نوجوان دوست کے لاہور سے آئے ہوئے تھے

جن کے طرز بیان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کا کاتب کوئی امیر زادہ ہے۔ اور بلند اختر کا گہرا دوست ہے۔ بظاہر اس شخص سے بلند اختر محض اس خیال سے دوستانہ گانٹھ رہا تھا۔ کہ شاید کسی وقت اسے اس سے مالی امداد مل سکے۔ پھر اس نے گل جان کے ہر دو خط پڑھے ان سے کامران کو معلوم ہوا۔ کہ اب سے ایک سال پہلے گل جان اپنے لڑکپن میں بلند اختر سے ناراض ہو گئی تھی۔ اور اس نے غصہ میں لکھا تھا "کہ میرے یہاں مت آیا کرو" لیکن دوسرا خط جو اس سے تین ماہ بعد کا تھا۔ پہلے خط کی تردید کر رہا تھا۔

پھر اس نے مسکرا کر کہا "شاباش۔ شاباش۔ مگر خامی ضرور ہے یا خامی مجھے ہی معلوم دیتی ہے۔ یا میرا وہم ہے۔ کوئی نہیں پہچان سکتا" پھر اس نے مولوی شفیق احمد کے دستخط پر غور سے نگاہ ڈالی۔ منشی مولوی کا دستخط بہ خط طغرا اس موٹے اور دبیز کاغذ پر کیسا خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ شفیق احمد اس کا دل اچھلنے لگا۔ واقعی دولت عجیب چیز ہے۔ دولت مند آدمیوں کے دستخطوں میں بھی ایک قسم کی کشش ہو جاتی ہے۔ اس نے ان دونوں پرزوں کو لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا اور کاغذات و کتب کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ کر باہر نکلنے لگا۔ اس وقت اسے پاسبان کی آواز پھر سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر لیمپ دنبی دونوں گل کر دیئے۔ اور میز پر اپنی دیا سلائی کو ٹٹولنے لگا۔ در اصل انسانی زندگانی کی حالت بھی اس شخص کے مانند ہوتی ہے۔ جو اندھیرے میں کوئی گمشدہ چیز تلاش کر رہا ہو۔ ہم اپنی زندگی کے مشاغل یا کامیابی ناکامیابی کو اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہیں کبھی کچھ ہاتھ آجاتا ہے۔ کبھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کرتا۔ کہ کہاں تلاش کریں۔ تین منٹ بعد کامران فاتح چوروں کی طرح اس پراسرار کمرہ سے نکلا۔ اور ہانپتا ہانپتا اپنے تنگ و تاریک مکان میں گھس گیا۔

پینتیسواں باب

نرمی سے ایک مست ہاتھی بھی رام کیا جا سکتا ہے

غریب گل جان اس آرام دہ زندان کی سہری پر دو گھنٹے تک بیہوشی کی نیند میں پڑی ہوئی مخواب دیکھتی رہی۔ خلاق عالم نے نیند بھی کیا چیز بنائی ہے۔ نوجوان لڑکی نیند کے نشہ میں اپنے قرب یا بعد کے سب خطرات سے بے فکر شولانی ندی کے کنارے پہنچ گئی تھی جہاں وہ چند گھنٹے پیشتر وہ باون درہ پل دیکھنے کے لئے اتری تھی لیکن اس وقت خشک ندی کی جگہ عظیم الشان سیلاب نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ننگے پاؤں ندی کے کنارے پر کھڑا دیکھ رہی تھی۔ اور اگرچہ اس کے گھٹنوں گھٹنوں تک پانی آ گیا تھا لیکن روح بھی عجب عجب صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس سرد اور یخ بستہ شب میں اس کے پاؤں سردی سے ذرا بھی سناٹہ نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن سیاہ پانی کی مواج خوفناک روانی سے لحظہ بلحظہ ٹر ہتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ پانی اس کی گردن تک پہنچ گیا۔ وہ ٹھوکر کے مارے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اوپر چیخ مار کر آنکھ کھولدی غریب ناتجربہ کار لڑکی نے جس وقت آنکھ کھولی۔ وہ بالکل شیر خوار بچے کی طرح بے سمجھ اور معذور ہو رہی تھی اور اپنے آپ کو ماں کی گود میں سمجھتی تھی۔ مگر بیداری کے ساتھ ہی اسے اپنا دماغ بہاری معلوم دیا۔ اور سے یاد آیا۔ کہ ابھی اس نے شب کا کھانا بھی نہیں کھایا وہ سوچنے لگی "میں نے کتنی دیر ہوئی دن کا کھانا کھایا تھا۔ کیا اب صبح ہو گئی" پھر اس کے دل میں یکایک دو گھنٹہ پیشتر کے واقعات آ گئے جن میں اسے کھی سکار دو غاباز آدمی اسرائیل خاں نے ہیبت ناک فرحت علی خاں کے تہ خانہ میں اتار دیا تھا۔ وہ خوف کے مارے سکڑ گئی۔ اور سہری پر اٹھ بیٹھی۔ قدرتی طور سے اس کی نگاہ اس پلنگ پر پڑی جس پر فرحت علی خاں لیٹا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فرحت علی کے چیچک آلودہ چہرہ اور چمکدار آنکھوں

سے اس کے بدن میں تیر سا لگ گیا تھا۔ اور اس کا دل اچھل کر گردن میں آنے لگا فرحت علی خاں بھی چونک کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "میں نے تمہاری نیند میں خلل انداز ہونے کے ڈر سے تمہیں نہیں جگایا تھا۔ کھانا تیار ہے۔ کچھ کھالو۔"

گل جان کو اس شخص کے ہر ایک لفظ میں ایک قسم کا جھوٹ اور ظلم معلوم ہوا اس نے سہم کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس وقت گل جان آرزو کر رہی تھی۔ کہ اس کے ہاتھ میں ایک پستول ہوتا۔ اور وہ اس شخص کا سر پاش پاش کر کے بھاگ نکلتی۔ وہ اپنی والدہ کی مفارقت اور اس کے زندان کے لازمی نتائج کا خیال کر کے کانپ گئی۔ اور اپنے دل کو مٹھی میں دبا کر آنسو بہانے لگی۔ فرحت علی خاں اپنے لحاف سے نکل کر اس کے بستر پر آیا۔ اور گل جان اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ فرحت علیخاں نے اس کے بدن سے کوٹ اتار دیا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت سرخ رنگ کا سوئٹر تھا۔ اور بکھرے ہوئے بالوں کی بھوری چوٹی پیچھے لٹک رہی تھی۔ اس کا منہ جنوب کی طرف تھا۔ اور اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا فرحت علیخاں نے اسکی گردن میں دایاں ہاتھ ڈال دیا۔ جو گل جان نے آہستہ سے نکال کر کہا "اب تم مجھے زیادہ مت ستاؤ۔ میں کہہ چکی ہوں۔ میں تم سے نکاح نہیں کر سکتی۔ خدا کو کاٹ کر دے۔ یا مجھے سنداق لاکر مار دے۔" ان الفاظ میں ایسا استقلال اور بے خوفی بھری ہوئی تھی۔ کہ فرحت علی خاں ڈر گیا۔ اور وہ کتنے دل سے بولا "میں نے تمہیں مارنے کیلئے نہیں طلب کیا میں تمہیں عزت کیساتھ اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ تم راضی نہیں ہوتیں اب میں کیا کروں میں اب تمہاری والدہ کو بیس ہزار روپے کو تیار ہوں۔" گل جان نے اشک آلودہ آنکھوں سے فرحت علی خاں کی طرف منہ کر کے رو کر کہا۔ کیا تم مجھے اس طرح ذلیل کر کے اب بیوی بنا کر خوش رہو گے۔ بہتر یہ ہے۔ کہ اب مجھے جلنے دو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ مجھے کسی سے شادی کرنا منظور نہیں۔ تمہاری عزت اور دولت میں کیا شک ہے۔ مگر میں کس دل سے منظور کروں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" اور یہ کہکر اس کا بدن لرز گیا۔ وہ سمجھی۔ کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر گئی۔ اور عجب نہ تھا۔ کہ فرحت علیخاں اس کا

سر پر کر دیوار سے دے مارے۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر مقاومت کے لئے تیار ہونے لگی مگر فرحت علی خاں نے مسکرا کر کہا "میری پیاری تم ذرا دیر میں تمہیں اپنی آنکھوں میں جگہ دونگا۔ اگر تم کہو۔ کوئی باضابطہ اقرار نامہ لکھدوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تمہارے بغیر زندگی دوبھر ہو جاوے گی۔ اب اگر کہیں سے باز آؤ" اب بھی قاضی اسکتا ہے میں نہایت مضطرب ہوں" اس وقت گل جان کے دماغ میں پوری بیداری ہو گئی تھی۔ اور وہ سمجھ چکی تھی۔ کہ اس شخص کے مقابلہ میں۔ عذر۔ بہانہ۔ عاجزی۔ زور۔ خوشامد۔ کارآمد ثابت ہونے والی نہ تھی۔ اس نے اپنے سوئٹر کی آستین سے آنسو پونچھ کر جواب دیا۔ تم بالکل جھوٹے ہو اگر تم کو میرا عشق ہوتا۔ تو تم میرا سر فرش پر نہ دے مارتے۔ کوئی اپنی معشوقہ کو بھی ستاتا ہے۔

فرحت علیخاں کے چہرہ پر ندامت اور افسوس کے آثار پیدا ہوئے۔ اور اسکا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اس نے اس پر چہرہ نرمی کی صورت میں اس وقت ایسی نزاکت اور صداقت پائی۔ کہ اس کے دل میں آیا۔ کہ اس کے پاؤں پڑ کر اس سے معافی مانگ لے۔ ساتھ ہی اس کی نفسانیت نے رائے دی۔ کہ اسے سینہ سے لگا کر منہ چوم لے اس نے گلجان کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔ اور اسوقت گلجان نے مزاحمت کی۔ فرحت علیخاں اس زبردستی کے غلبہ سے یہ سمجھ کر کہ وہ راہ راست پر آگئی اس کے منہ پر منہ پیوست لگانے لگا۔ تو گل جان نے اسے آہستہ سے پیچھے ہٹا کر کہا "بس اب زبردستی مت کرو۔ اگر تم میرے عاشق ہو۔ تو مجھے آرام سے لیٹ جانے دو۔ اور آدمیوں کی طرح بتلاؤ۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

فرحت علی خاں کا دل اچھل پڑا۔ مگر ساتھ ہی ایک نامیدی کی صورت میں اوسے ایسا معلوم دیا۔ کہ اس عورت اور اس کے مابین ایک خندق حائل تھی جسپر وہ کسی تدبیر سے پل بنا نہ سکتا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے گلجان کی طرف دیکھ کر کہا "اچھا لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لئے کھانا منگاتا ہوں" پھر بات کرونگا۔ یہ کہکر وہ گلجان کی مسہری سے اتر گیا۔ گلجان مسہری پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ میں اس طرح کیسے کھانا کھاؤں۔ معلوم نہیں۔ میری غریب

ماں کا کیا حشر ہوا۔ ہائے اللہ کیا بری ماں پر یہ مصیبت میری وجہ سے پڑی"
اور یہ کہکر چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آنسو بہانے لگی۔ فرحت علی خاں آخر انسان تو تھا ہی اور اس وقت وہ سختی کے مقابلہ میں نرمی کو زیادہ موثر سمجھ رہا تھا۔ اس نے گلجان کے پاس آکر اس کے سر کے بالوں کو درست کر کے کہا "اب تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ پیاری میں تمہارے پاؤں پر پڑ کر معافی مانگ لونگا میں نے تمہیں واقعی بڑی سنگدلی سے تنگ کیا۔ تمہاری والدہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کے لئے کھانا بھیجا گیا ہے" ماں کے ذکر سے گل حسن کا دل بھر آیا۔ اور وہ زور سے رونے لگی۔ اور روتی روتی بولی "مجھے کیا معلوم شاید تم میری ماں کو مار کر زمین کر دو"

فرحت علی خاں نے مسکرا کر جواب دیا "لاحول ولا قوۃ۔ میں تمہاری والدہ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ تمہاری والدہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دونگا تم صرف اپنی پیاری زبان سے یہ کہدو۔ کہ مجھ سے نکاح کرنے پر راضی ہو" یہ کہکر فرحت علیخاں نے اپنے سرہانے سے ایک رومال اٹھایا۔ اور گلجان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے گلجان نے رومال ہاتھ میں لیکر روتی ہوئی آواز میں کہا "تم اس قدر جلدی کرتے ہو۔ میں نکاح شادی کی باتیں کیا جانوں۔ آج تک کسی آدمی نے مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اگر تم اس بات کی قسم کھاؤ کہ میری والدہ کو کوئی تکلیف نہ دوگے۔ اور نہ مجھے ستاؤگے۔ وعدہ کرتی ہوں تین دن کے اندر تم سے نکاح کر لونگی۔

فرحت علی خاں کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ اور اس نے گلجان کی پیشانی کو بوسہ دیکر کہا "خدا کی قسم میں تمہاری والدہ کو ذرہ بھر بھی تکلیف نہ ہونے دونگا۔ اب جاکر دیکھتا ہوں۔ کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ لیکن میں تین روز تک کس طرح صبر کروں۔ تمہاری صورت نے میرے دل کو بے قابو کر دیا ہے۔ اب غصہ کو دور کرو۔ اجازت دیدو۔ کہ قاضی کو بلا لوں یا نکاح کل سہی۔ آج تم میرے دل کو ٹھنڈک دینے کے لئے مجھے بھر کے اپنی صورت دیکھ لینے دو۔ میں کیا کروں۔ تمہاری صورت مجھے لعل و جواہر سے زیادہ پیاری معلوم ہو رہی ہے"

گل جان اس کلمہ سے سہم گئی۔ اور دھڑکتے دل سے بولی "اب اس قدر جلدی مت کرو۔ مجھے اپنی مہمان سمجھ کر عزت کرو۔ آخر ایک دن تم مجھے بیوی بنا کر ان باتوں کو یاد کر کے پچھتاؤ گے۔ ایک گھنٹہ کے لئے میری والدہ کو مجھ سے ملاقات کرنے دو۔ میں تم سے قسمیہ وعدہ کرتی ہوں کہ پرسوں تم سے نکاح کرونگی" اور یہ کہکر شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں اسوقت لیمپ کی روشنی گلجان کے خوبصورت مگر مرجھائے ہوئے چہرہ پر بڑی آب و تاب سے پڑ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں لڑکپن اور بے فکری کی جگہ ایسی سادگی اور کمزوری برس رہی تھی کہ سنگدل سے سنگدل آدمی اس کے پاؤں پر گر پڑتا۔ خدا کی دی ہوئی خوبصورتی کسی جگہ چھپ نہیں سکتی۔ اگر کسی خوبصورت عورت کو کیچڑ میں لت پت کر دو۔ اس کا قدرتی رنگ روپ اس غلیظ اور ہولی جیسی سوانگ میں بھی نازوادا سے خالی نہ ہوگا۔ فرحت علیخاں نے گلجان کے پژمردہ ہونٹوں پر بوسہ دینا چاہا [redacted] پیچھے ہٹ گئی۔ اور مسکرا کر کہنے لگی "بس اب جلدی مت کرو"

فرحت علی خاں کے دل میں اس تبسم سے ایسی خوشی پیدا ہوئی۔ کہ اسکے عشق انگیز ارادوں میں جولانی اور مستعدی ہونے لگی۔ اور اس نے اچھلتے ہوئے دل سے کہا اب میں کھانا لاتا ہوں یہ کہکر وہ زینہ کی طرف لپکا۔ اور کیواروں میں دستک دیکر دربار علی کو جگانے لگا جسے زینہ کے پاس رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ گل جان نے جابر اور ضدی رئیس زادہ کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا پھر اپنے ڈرپوک دل سے باتیں کرنے لگی "لو ہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میری مال پنجہ میں پھنس گئی۔ ورنہ میں اس جیسے گدھے کو چٹکیوں میں اڑا دیتی" کاش یہ ظالم اسے ایک گھنٹہ کے لئے مجھ سے ملا دے" دس منٹ تک کمرہ میں سناٹا رہا۔ فرحت علی خاں نے دربار علی سے کھانے کیواسطے کہا۔ پھر زنانہ میں قفل ڈال کر خود اس کے ساتھ باورچی خانہ میں گیا کیونکہ اسے گل جان کی خاطر مدارات کیواسطے بٹھائی کھٹائی۔ چاء دہان کا بھی انتظام کرنا تھا جس وقت پر تکلف برتنوں میں کئی قسم کا کھانا میز پر لگایا گیا۔ تو دربار علی نے گلجان کے ہاتھ دھلانے چاہے۔ مگر گلجان نے اپنے متوتشال کھینچ کر کہا "میں اس وقت کھانا نہ کھاؤنگی جب تک تم قسم کھا کر نہ کہو کہ سچ نہ بتلاؤ سائیا میری والدہ کھانا کھا چکی ہے یا نہیں اور اسے کچھ تکلیف تو نہیں

نیز اس بات کی قسم کھاؤ کہ تم اسے ایک گھنٹہ کے لئے مجھ سے ملا دو گے۔

فرحت علی خاں نے دربار علی کے ہاتھ سے اقتا بہ لے لیا۔ اور مسکرا کر کہا "خدا کی قسم میں اس وقت تمہاری والدہ کے آگے خود کھانا بھاؤنگا۔ اور اس سے معافی مانگ لونگا۔ رہی ملاقات تو اس وقت ٹھیک نہیں۔ کل میں ایک گھنٹہ کیلئے تم سے ضرور ملا دونگا"۔

یہ کہکر فرحت علیخاں نے گل جان کے ہاتھوں پہ پانی ڈالنا شروع کیا۔ اور دھڑکتے دل سے کہنے لگا۔ کیسے پیارے ہاتھ ہیں۔ تمہاری رگ رگ میں خوبصورتی بھری پڑی ہے وہی مثل صادق آگئی ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

گل جان نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ اسکی زبان بند تھی۔ وہ خوفزدہ دل سے اسوقت بلند اختر کو یاد کر رہی تھی۔ اور اسے اس بات کا ڈر تھا۔ آیا اسے آج شب کہانا بھی نصیب ہوگا یا ساری رات بیچ بستہ شرک پر گذرنگی۔ وہ تولیہ سے ہاتھ پونچھ کر بستر پر آبیٹھی۔ اور مردہ دلی سے اس مزہ دار کھانوں کو زہر مار کرنے لگی۔ اسے بھوک ضرور تھی۔ تقاضائے بشریت مجبور کر رہا تھا۔ کھانے بھی لذیذ تھے لیکن اس کے دماغ میں خفیف سا درد تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس قیدی کی طرح سمجھ رہی تھی جسے نہایت سکلف کمرہ میں پابزنجیر کرکے نہایت عزت کے ساتھ دعوت دیجاوے"۔

اس اثنا میں دربار علی چند سیب۔ نارنگیاں۔ ایک پٹاری انگور چھری۔ کانٹے۔ پاندان اور ایک بوتل شراب توشہ خانہ سے لایا۔ اور سب چیزوں کو فرحت علی خاں کے حوالہ کرکے چلتا بنا۔ یہ سب چیزیں فرحت علی خاں نے الماری میں لگادیں اور دربار علی کے چلے جانے پر پوچھنے لگا۔ کیا تم شراب نہیں پیتیں۔

گل جان نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں نے آجتک شراب نہیں پی۔ اماں کبھی کبھی پیا کرتی ہے۔ فرحت علیخاں اپنے دل میں مسکرایا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا۔ تمہارے جیسی خوبصورت عورت کے پہلو میں شراب بغیر لطف نہیں آسکتا"۔

کس تعجب کی بات ہے۔ کہ انسان اپنی زندگی میں ہر چیز کا روشن پہلو دیکھتا ہے وہ کبھی غائر نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ شخص فرحت علیخاں گل جان کی خوبصورتی پر دین و ایمان نثار کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ اور اس کے لئے سب طرح کی تکلفات مہیا کر رہا تھا لیکن اسی کمرہ کے دس گز کے فاصلہ پر اس کی غریب بے بس ماں کو ایک کتے سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ آسخا کیونکہ گل جان اسی عورت کے گوشت و خون سے وجود میں آئی تھی۔ اور اسکے دل و دماغ کی پرورش اور اس کے رنگ و روپ کی دلفریبی میں محض اس بڈھیا عورت کا شیر مادر اس قدر حصہ لے چکا تھا۔"

چھتیسواں باب

تلاش لاحاصل

گلجان کا ملازم شجاعت علی سات بجے شب کی گاڑی سے مظفر نگر اترا۔ اور ماں بیٹیوں کے بستر سے ایک تنکی کے سرپر لدوا کر چودھری گھاسی رام کی کوٹھی کی طرف چلا۔ اس وقت سوشام تھی۔ اور سڑک پر آنے جانے والوں کی کثرت معلوم ہوتی تھی۔ وہ باطمینان خوش خوش آرہا تھا۔ اور مکلف دعوت نیز ناچ و رنگ کے جلسہ کے قرب سے اس کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کہ گذشتہ دو گھنٹوں کے اندر موٹر کار گاڑیوں نے معمولی زندگی کے معاملات میں اس قدر تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ گھاسی رام کی کوٹھی میں اس وقت خاص روشنی تھی۔ پھاٹک پر دو رنڈوں میں ایک لال ٹین جل رہی تھی۔ بوڑھا دربان ایک مونڈھے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ شجاعت نے معمولی اجنبی کی طرح دربان کی طرف دیکھا۔ پھر قلی کو "لے آ بھائی" کہہ کر دربان سے پوچھنے لگے "کیا اسرائیل خاں صاحب آگئے"

بڈھے دربان نے بے رونق آنکھوں کو اوپر اٹھا کر اور منہ سے حقہ لگا لگا کر کہا۔ کون اسرائیل خاں" شجاعت کو تعجب ہوا۔ کہ اس کوٹھی کا دربان ایسے بڑے آدمی کے

نام سے بھی ناواقف تھا جس نے اسی کوٹھی میں آج کی شب اتنا بڑا جلسہ رقص و سرود تجویز کیا تھا۔ کہ اس میں بمبئی و کلکتہ تک کی رنڈیاں بلائی گئی تھیں۔ اس نے منہ پھاڑ کر کہا "اجی وہی اسرائیل خاں رئیس قصہ جنہوں نے ناچ کا جلسہ ٹھہرایا ہے۔ تمہارے یہاں تو مہمانوں کی بہار ہو رہی ہوگی" بوڑھے دربان نے اس اجنبی کو شرابی یا اس شہر سے ناواقف سمجھ کر بڑی بے پرواہی سے جواب دیا "بھائی یہاں ناچ و رنگ کے جلسے نہیں ہوا کرتے کسی اور جگہ نام لیا ہوگا۔ یہاں تو آدمی ٹھہر رہے ہیں۔ ایک مریض ہے" اسرائیل خاں کوئی نہیں" شجاعت علی کے پاؤں پھول گئے۔ اور وہ گھبرا کر بولا "اسرائیل خاں صاحب رئیس قصہ نہیں رہتے" پھر کہاں ملیں گے" بوڑھا دربان جو اس وقت خود بھی افیون کے نشہ میں تھا۔ جھلا کر بولا "میں نہیں جانتا اپنا راستہ لے" شجاعت نے بڑی خجالت سے قلی کی طرف دیکھا۔ جو کہ سر پر دو پہاڑ بستر لدے ہوئے تھے۔ پھر دھڑکتے دل سے کہنے لگا "بھائی شاید مجھ سے غلطی ہوگئی چل اب بازار چل۔ وہاں کہیں پتہ لگاؤں گا"

قلی نے دونوں بستر فرش پر ڈال دیئے۔ اور ہاتھ پھیلا کر بولا۔ واہ صاحب واہ میں نے بازار کی شامی نہیں بھری۔ معلوم نہیں۔ تم کب تک مارے مارے پھرو گے میری مزدوری دو" شجاعت کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ درحقیقت مظفر نگر کے گلی کوچہ اور سرائے و ہوٹل سے بالکل ناواقف تھا۔ اور اس نے آج تک بھاری بھاری بنڈل سر پر نہیں اٹھائے تھے۔ اس نے فق شدہ چہرہ سے قلی کی طرف دیکھا۔ اور جیب سے نکال کر بولا "گھبراتا کیوں ہے۔ تجھے دو آنے ملیں گے" قلی اٹھا۔ دو آنے کے نام سے مزدور کا دل پسیج گیا" اور وہ بولا اچھا لاؤ" اٹھواؤ" لکھ کر ساتھ ہو لیا۔ شجاعت نے بازار میں اکثر دوکان داروں سے اسرائیل خاں کا تذکرہ کیا۔ لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ اسی کشمکش و پنج میں اسے ایک بوڑھا آدمی مل گیا۔ اسرائیل خاں کا نام سن کر اس کے پاس آیا۔ اور بڑی دلچسپی سے پوچھنے لگا "تم کسے دریافت کرتے ہو" شجاعت علی نے اس بوڑھے کو اپنی امداد سمجھ کر پگھلتے ہوئے دل سے کہا"

"بڑے میاں میں بیڈ مصیبت پھنس گیا ہوں۔ ہماری سرکار کی بیٹی گلجان بڑی پری زادہ ہے۔ وہ اور اس کی ماں ایک بڑے نامی گرامی رئیس اسرائیل خاں کے یہاں ایک ہزار روپیہ پر گانے آئی ہے۔ دو موٹر گاڑیوں میں ماں بیٹیاں اپنے یار آشنا سمیت آئی تھیں۔ میں ان کے بستر لیکر ریل سے آیا ہوں۔ اب یہاں معلوم ہوا نہ کوئی اسرائیل کو جانتا ہے۔ نہ موٹر گاڑیوں کا پتہ ہے۔ چودھری گھاسی رام کی کوٹھی کا پتہ بتلا کر گیا تھا۔ وہاں ساری رات گانا بجانا رہیگا۔ مگر وہاں تو کوے اڑ رہے ہیں میں حیرت میں ہوں۔ کہ یا اللہ کیا معاملہ ہے۔" بوڑھے ہاتف غیب نے شجاعت کو وہم کی آنکھ سے دیکھ کر جواب دیا۔ "تم کہاں سے تشریف لائے ہو" شجاعت علی نے بڑی تعظیم سے جواب دیا۔ "سہارنپور سے"

بوڑھے بزرگ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "اسرائیل خاں کے نام سے تو میں واقف نہیں لیکن آج ایک ہندو رئیس کے یہاں تو برات آئی ہے۔ کئی طوائفوں کا ناچ ہے شاید وہاں پتہ لگ سکے" شجاعت اس بوڑھے بزرگ کی مدد سے محلہ بجلہ اور ہندو رئیس کے دولت کدہ پر پہنچا جس کے یہاں برات آئی تھی۔ پھر اوسے معلوم ہوا۔ کہ برات ابھی ایک باغ میں تھی۔ جہاں سے وہ ایک گھنٹہ بعد سرگشت کے لئے اٹھیں گے۔ بوڑھا بزرگ تو لاٹھی ٹیکتا ہوا رخصت ہوا۔ شجاعت اس باغ کا پتہ لگاتا ہوا منزل مقصود پر پہنچا۔ جہاں اسے بڑی دقت کے بعد تماشائیوں سے بات چیت کرنے کا موقعہ ملا۔ اور ادھر ادھر نظر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں گل جان یا اسرائیل خاں کی ہوا بھی نہیں پہنچی۔ اس وقت قلی بے حد تنگ آگیا تھا۔ اس لئے گھبرا کر کہا۔ "لو صاحب اب میری مزدوری دو لیکن شجاعت بھی کچھ کم چلبلا نہ تھا۔ اس نے قلی کے ایک طمانچہ مار کر کہا۔ "بدذات ابھی مجھے خود معلوم نہیں۔ کہ کہاں جاؤنگا۔ اور تجھے مزدوری دینے پر رضامند ہوں۔ پھر بھی تو ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتا"

قلی کے دل میں آیا۔ کہ وہ شجاعت کے طمانچہ کا ترکی بہ ترکی جواب دے۔ لیکن اس وقت تک مزدوری چلا آنے ہو چکی تھی۔ اوسے تھپڑ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیسے

تھے اس نے آنکھ بھوں چڑھا کر جواب دیا "بھائی صاحب مزدوری کرنے آیا ہوں" کوئی غیرت تو نہیں بیچ دی۔ اگر پھر تم نے چھیڑا تو میں گت بنا دوں گا" شجاعت بھی یہ چاہتا تھا کہ مزدور کسی طرح اس کی جان بخشی کرے۔ وہ چپکے چپکے آگے ہو گیا۔ اور بازار میں آکر پھر لوگوں سے سوال و جواب کے پل باندھنے لگا۔ وہ ایک مسلمان تمباکو فروش کی دوکان کے سامنے کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا "یہ حضرت آپ اسرائیل خاں صاحب کو جانتے ہیں؟ کہ اسے شمال کی طرف سے ایک موٹر کا ربطرف جنوب آتی ہوئی دکھلائی دی۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور وہ کود کر سڑک پر آیا۔ وہ سمجھا۔ کہ شاید اسرائیل خاں کے موٹر کار اب مظفر نگر آئے ہیں۔ جب موٹر کار قریب آئی تو اس نے اسرائیل خاں کو اچھی طرح پہچان لیا۔ اور چلا کر بولا "میں آگیا ہوں" آپ کہاں ٹھہر رہے ہیں" مگر اسرائیل خاں نے اس کی فریاد نہ سنی اور منہ اٹھائے موٹر کو پوں پوں کرتا چلا گیا۔ شجاعت نے سمجھا۔ کہ شاید اسرائیل خاں نے اسے پہچانا نہیں۔ وہ قلی کا ہاتھ پکڑ کر بولا "میرے ساتھ رہا گا چلا آ" اور یہ کہکر اسرائیل خاں کے پیچھے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ شجاعت بہت دور تک "بات تو سنئے بات تو سنئے" چلاتا چلا گیا لیکن ڈاک خانہ کے قریب پہونچکر شجاعت کی آنکھوں سے موٹر کار غائب ہو گئی۔ بظاہر اس وقت اسرائیل خاں کا لجان کو فرحت علیخاں کے پنجہ میں ڈال کر میرٹھ جا رہا تھا شجاعت ہانپتا ہوا قلی کی طرف واپس آیا جو اس سے ایک میل پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر تھک کر کہنے لگا "بھائی اب تو سرائے چل مجھے پتہ نہیں لگتا" اس مقام سے سرائے بہت دور تو نہ تھی۔ اور قلی لوگ سرائے سے بہتر مقام مسافروں کے لئے نہیں سمجھتے۔ وہ ہلکے دل سے شجاعت کو کچی سرائے میں لایا۔ اور اسے بھٹیارن کے سپرد کر کے مزدوری لیکر چلتا بنا۔ سرائے میں بہت سے مسافر لوگ مقیم تھے۔ اور تین چار کمرے کچے صاف ستھرے نظر آرہے تھے۔ شجاعت نے ایک کمرہ اپنے لئے لے لیا۔ اور اسباب رکھکر سرائے کے آدمیوں سے اسرائیل خاں کے قیام اور پتہ کی گفتگو کرنے لگا۔ سب لوگوں نے بتلایا۔ کہ بھائی ہم تو واقف ہیں مگر شجاعت نے بڑے تعجب سے جواب دیا "آپ لوگ نہیں جانتے۔ کیا بتلاؤں۔ ابھی موٹر کار پر جا رہے تھے اگر میں انہیں آپ کے سامنے لے آتا۔ تو آپ لوگ پہچان لیتے بڑے نامی رئیس

تیر ران میں پار لگ جاوے گا۔ بعد ازاں شجاعت علی نے بھٹیاری سے واقفیت پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ایک گھنٹہ تک اس کے چولہے کے پاس حقہ کشی کرتا رہا۔ بھٹیاری مشتبہ چال و چلن کی عورت تھی اس کا شوہر بظاہر مر گیا تھا۔ شجاعت نوجوان آدمی تھا۔ پس کچھ عجب نہیں کہ بھٹیاری نے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ شخص اوسے زوجیت میں لے لینے پر راضی ہو جاوے۔ اس سے بڑی ہمدردی کے ساتھ آؤ بھگت کی اور جلدی ماحضر تیار کر کے پیش کیا۔ بارہ بجے شب کے قریب جب شجاعت اپنے کمرے کے قریب آئے جلنے والے مسافروں کا شور سنکر اُٹھا۔ تو اسے خیال آیا۔ کہ شاید اس وقت بھٹیاری سے تخلیہ میں بات چیت ہو سکے۔ وہ کیواڑ کھول کر باہر آیا۔ اس کے تعجب کی کوئی حد نہ تھی۔ جب اس نے بھٹیاری کے چراغ کے آگے دو نوجوان دوست بلند اختر اور دلاور علی اپنے اوپر کو لوٹوں میں کانپتے ہوئے دیکھے۔ وہ دھڑکتے دل سے آگے بڑھا۔ اور منہ پھاڑ کر پوچھنے لگا۔ "کیوں آپ یہاں کہاں"۔ دونوں دوستوں نے شجاعت کے دم کو غنیمت سمجھا۔ اور کلن اس سے شجاعت بھیا۔ شجاعت بھیا" کہہ کر لپیٹ گیا۔ ان چاروں نے بہت کچھ کہا سنا لیکن سب سے زیادہ کارآمد حصہ ان لوگوں کی ملاقات کا یہ تھا۔ کہ بلند اختر اور دلاور علی کو گل جان اور امیر جان کے نرم بستر سے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کو مل گئے۔ اتفاق وقت یا خوش قسمتی اس کا نام ہے۔ کہ نازک تن گل جان کا دل فریب بستر بلند اختر کے حصہ میں آیا۔ جس کا وہ در اصل مستحق بھی تھا۔ شجاعت نے اپنے اور کلن کے لئے دو چھوٹی چھوٹی کھاٹیں اندر ڈال لیں۔ اور اس تنگ و خام کوٹھڑی میں بلند اختر گل جان جیسی پری چہرہ لڑکی کے بستر کو پا کر حادثات زمانہ پر غور کرنے لگا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ کہ گلجان کے بستر میں اس کے لئے ایک قسم کی کشش تھی۔ اوسے اس بستر کی تار تار سے محبت اور دل آرامی کی بو آ رہی تھی۔ اور اس کا سر نشہ میں سرشار ہوا جاتا تھا۔ لیکن اسے چراغ کی روشنی کے آگے گل جان اشک آلود آنکھوں میں کھڑی کہہ رہی تھی "میرے بستر پر آرام کر رہا ہے۔ اور مجھے بھول گیا۔ مگر وہ ایسی دلربا عورت کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اور صبح ہوتے ہوتے اسی کی الفت کے جوش سے مظفر نگر آیا تھا۔

وقت مر نہیں تھا

سینتیسواں باب

محکمہ پولیس کی جولانیاں

گل جان اور اس کی والدہ کی عجیب و غریب گمشدگی پر کوتوالی مظفر نگر کے اندر تو سخت حیرت اور بے چینی شب گذشتہ سے پھیل گئی تھی۔ لیکن عوام الناس کے کانوں میں مفصل کیفیت اگلے دن پڑی۔ ایک نوجوان اور خوبصورت اور مالدار رنڈی زادی کو ایسے عجیب ڈھنگ سے بھگا لاکر پوشیدہ کر لینا جس قدر تحیر خیز تھا۔ اس سے زیادہ تردد انگیز یہ بات تھی۔ کہ کہیں ظالموں نے نوجوان کو بجز قابو کرنے کے اس کی ماں کو زندہ درگور نہ کر دیا ہو۔ بلند اختر اور دلاور علی کا زیادہ وقت کوتوالی میں گذرا۔ اور رنڈی زادی کے انوکھے طریقہ میں گمشدگی اور عوام بالخصوص بگڑے ہوئے نوجوانوں کو ایک قسم کی کہانی معلوم دی۔ اور جب لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ بلند اختر اس نوجوان لڑکی کا عاشق زار تھا جس کی گمشدگی کا ایسے زور شور سے چرچا ہو رہا تھا۔ تو خلقت خدا کے ذوق و شوق کی کوئی حد نہ رہی۔ کوتوالی کے گرد و جاہل اور تعلیم یافتہ سب ہی قسم کے لوگوں کا انبوہ جمع ہو گیا۔ سینکڑوں آدمی یہ سمجھ کر کہ شاید گل جان کی تلاش میں کانسٹیبل کسی سراغ پر روانہ کیے گئے ہوں۔ اور اسے کہیں سے نکال کر لا دیں۔ محض گل جان کی صورت دیکھنے کے واسطے کوتوالی کے باہر جمع ہو گئے۔ جس وقت بلند اختر اور دلاور علی نے معہ شجاعت دشمن الشکر پولیس سے اپنے گم شدگان کی خبریاں کی تو اس قدر چرچا ان کا عوام الناس کی زبان پر تھا لیکن جب وہ بارہ بجے دن کو پولیس کی مزید جرح و قدح سے تنگ آکر سرائے کو واپس جانے لگے۔ تو چہ لطیفے اور بڑے خدا جھوٹ نہ بلائے۔ دو سو آدمی ان کے پیچھے تھے۔ بلند اختر کا دل کش چہرہ اور پر مسیم مگر پریشان حلیہ سے تو خلقت کو ہمدردی ہی تھی لیکن اس امر سے پبلک کو حیرت تھی۔ کہ بلند اختر کے مکروہ صورت دوست دلاور علی کی

کا اس رنڈی زادی سے کیا تعلق ہے۔ اور ایک رنڈی کے پیچھے دو نوجوان کا پڑ جانا تو بمنزلہ اس بات کے تھا۔ کہ ایک مرغی کو دو للاں گھیریں۔ چند آدمیوں نے بلند اختر اور دلاور علی کے رنگ و ڈھنگ سے نتیجہ نکالا۔ کہ وہ بگڑے ہوئے رئیس زادے ہیں بہت سے آدمیوں نے یہ رائے قایم کی۔ کہ شاید وہ گل جان کو شہرت دینے کے لئے جھوٹے عاشق بن گئے ہیں۔ بہت سے واقف لوگوں میں اس امر پر بحث ہو رہی تھی کہ گل جان سہارنپور کی رئیسہ ہونے کی جگہ کسی تھیٹر میں نوکر تھی۔ اور یہ دونوں نوجوان بجائے پردہ کر تھے چند پرانی روش کے مہذب آدمیوں کی نگاہ جوان نوجوانوں پر پڑی اور ان کے پیچھے ایسا جم غفیر پایا۔ تو وہ لاحول پڑھکر دوسرے راستوں پر پڑ لئے۔ اور سرگوشی کی آواز میں کہنے لگے وہ صاحب یہ سب انگریزی تعلیم کا نقص ہے۔ نوجوان لوگ اس قدر آزاد ہو جاتے ہیں۔ کہ گھر باہر ماں باپ کو چھوڑ کر رنڈیوں کے پیچھے مارے مارے پھرنے لگتے ہیں چند پھٹے ہوئے پیچھے اس بات پر اڑ رہے تھے۔ کہ گل جان محض زیور کے سبب سے بھگائی گئی تھی۔ اب ماں بیٹیوں کا پتہ لگنا دشوار ہے۔ شاید وہ اس وقت اپنی قبروں میں پڑی سو رہی ہوں۔ بعض آدمیوں میں ان دونوں عورتوں کے گم ہو جانے پر شرطیں بندھی جانے لگیں۔ ایک گروہ کہتا تھا۔ کہ پتہ لگ جاویگا۔ اور دوسرا کہتا تھا۔ اب تا قیامت پتہ نہیں چلیگا۔ جتنے آدمی تھے۔ اتنی زبانیں تھیں۔

مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی معاملہ کے روشن اور تاریک پہلو پر اچھی طرح غور کر کے بدمعاشوں کی جرأت اور طرفہ گم شدگی کی جرأت پر حیران تھے۔ دوکانداروں میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ غروب آفتاب تک گل جان اور امیر جان کی ہستی خاک کشتگی ایک کھلا ہوا راز سمجھا جانے لگا تھا۔ اور مظفر نگر کے امیر غریب شریف و رذیل آزاد اور نوکری پیشہ چھوٹے اور بڑے لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا۔ جو گل جان کے نام سے ناشناسا ہو۔ اس عرصہ میں کوتوالی کے ہونہار انسپکٹر سعید رقم کاظمی نے اپنے تجربہ کار ماتحت اشفاق حسین سب انسپکٹر کی مدد سے کوتوالی مظفر نگر میں تہلکہ ڈالا تھا۔ جاسوسی کا مستعدانہ سلسلہ پہلے رنڈیوں کے چکلوں سے شروع ہوا۔ اور کسبیوں کا زیادہ

وقت طوائفوں کے اڈے کرے اور مکانات کی تلاشی میں صرف ہوا۔ وہاں سے فراغت پاکر پولیس بھٹیاروں کی طرف جھکی۔ اور جرح و قدح سے ناک میں دم کر دیا لیکن رنڈی یا بھٹیارن غریب کیا بتلاتیں۔ ان کے یہاں کوئی شخص اسرائیل خاں کے حلیہ کا نہیں آیا تھا۔ اور نہ انہوں نے کوئی موٹر کار اپنے گھروں کے پاس سے گذرتی دیکھی۔ بازار کے چند آدمیوں نے ایک تمباکو فروش نے اس بات کی شہادت دی۔ کہ بازار سے اس روز تین موٹر کار گاڑیاں گذریں لیکن کوئی آدمی ٹھیک طور سے نہیں بتلا سکتا تھا۔ کہ ان میں کون لوگ سوار تھے۔ موٹر کار سات بجے شب کے بعد گذری تھیں۔ ایک نو بجے رات شب کی تاریکی میں پبلک ان کے مالک کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان میں شک نہیں ہو سکتا کہ تمباکو فروش اور چند دیگر دوکانداروں نے موٹر کار دیکھ کر اپنے اوپر آفت مول لے لی ان شخصوں کے اوپر پولیس کے سوالات کی اس قدر بوچھاڑ پڑی۔ کہ معاملہ کے تشیب و فراز سے ڈر کر خود اپنی سلامتی کی طرف سے متردد ہو گئے۔ سارے دن بیچاروں کی دوکانیں بند رہیں۔ کبھی انسپکٹر بذات خاص ان لوگوں سے ملا کبھی ان کے پیچھے کانسٹیبل بھیجے گئے زیادہ مصیبت یہ ہوئی کہ تو الی میں گذرا۔ اور پختہ فرش پر بیٹھے بیٹھے بیچاروں کے گھٹنے تھک گئے۔ شام کو جب غریب تھکے ماندے گھر آئے۔ تو بیچاروں کے سر پر یہ فکر سوار ہو رہا تھا۔ کہ کہیں بدمعاش لوگ ان پر دست درازی کرنیکا منصوبہ نہ باندھ لیں۔ پولیس کے چند تجربہ کار کانسٹیبل خفیہ جاسوسوں کی طرح سفید پوش بنکر بازار اور محلوں میں پھرنے لگے چند سپاہی شہر کی نالیوں پل کنوئیں خندق اور دیگر مشتبہ مقامات کے کھوج میں نکلے۔ جہاں کوئی کسی کو مار کر پھینک سکے۔ شام تک پولیس کی کوشش سراسر لغو اور فضول ثابت ہوئی اور اسرائیل خاں کا نام و نشان بھی ہاتھ نہ لگا۔ یہ سمجھ کر کہ گلجان کی حویلی پر لوٹ مار یا بدمعاش لوگ بھی سعی کسر نکالنے کے لئے تاکہ نہ ڈالیں۔ انسپکٹر پولیس نے بلند اختر کے مشورہ سے انسپکٹر پولیس سہارنپور کو تار دیا۔ اور چند گھنٹوں کے اندر امیر جان کے مکان پر مسلح پولیس کا پہرا لگ گیا۔ بلکہ چاروں طرف مشہور ہو گیا۔ کہ گل جان کو کوئی بھگا کر لے گیا یا مار کر کہیں پھینک دیا چونکہ بلند اختر اور دلاور علی کے بیان کے مطابق امیر جان

ایک قسم کی رعیت تھی۔ اور شام تک پولیس کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔ انسپکٹر نے اس معاملہ پر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے گفتگو کی جس نے بڑی حیرت ظاہر کر کے مجرم اسمٰعیل خاں کی گرفتاری پر پانچسو روپیہ انعام تجویز کیا۔ اور اسی وقت صاحب مجسٹریٹ بہادر کی منظوری منگوا کر اعلان شائع کرادیا۔ بالکل یہ مثل پیش آگئی تھی۔ ڈھنڈورا شہر میں پٹکا بغل میں۔ بلند اختر اور دلاور علی کے پاس روپیہ بالکل نہ رہا تھا۔ اور نہ وہ اس شہر سے ناواقف ہونے کے باعث کسی کے آگے ہاتھ پھیلا سکتے تھے چنانچہ دلاور علی محض روپیہ لانے کے لئے سہارنپور روانہ کیا گیا۔

اڑتیسواں باب

اِنَّ کیدکنّ عظیم

جس ہیبت ناک اور خونخوار شب نے گل جان کو فرحت علی خاں جیسے سینکڑوں عاشق کے ہاتھ میں لا پھنسا۔ یا وہ اسے معمول سے زیادہ طویل اور دراوٹی معلوم ہوئی۔ فرحت علیخاں کے مکلف کہانوں سے فراغت پاکر وہ سہری پر چلی گئی تھی۔ اور فرحت علی خاں کے سوال سے مہمان رہنے کے لئے اس نے پلنگ پر جاتے ہی اپنی شال پر لحاف لی تھی۔ اس تہ خانہ میں معمولی مکانات کے مقابلہ میں سردی زیادہ تھی۔ گلجان نے جب شال سر پر کھینچی۔ تو سردی کے مارے اس کے دانت بجنے لگے۔ اور جسم کانپ اٹھا۔ فرحت علی خاں کے پاس بھاری لحاف تھا۔ اور دراصل گل جان کی سہری پر بھی ایک موٹا لحاف پڑا تھا لیکن وہ اس لحاف کو دوسرے شخص کی ملکیت سمجھ کر استعمال سے گریز کر رہی تھی جب گلجان نے لحاف کو نظر انداز کر کے محض شال پر قناعت کی۔ تو فرحت علیخاں کے دل میں اس کی کسر نفسی اور بے بسی کی تصویر پھر گئی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس نے اس لڑکی کو زبردستی زوجیت میں لے آنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور اس نے اپنے جابرانہ برتاؤ میں کوئی کمی بھی نہ کی تھی۔ لیکن نصف گھنٹہ

کے واقعات سے اسے کچھ امید اس بات کے ہونے لگی تھی۔ کہ شاید گل جان کو زوجہ بنا کر اسے وفادار اور محبت کرنے والی بیوی بنا سکے اس کی صورت شکل تو نزاکت کے قابل تھی لیکن ایسی زاہد فریب مکھڑے کے پیچھے مکار دل کا ہونا ایک قسم کا ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ جسے فرحت علیخاں سہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر اس نے ابھی اس لڑکی کی باتوں سے اس کی زندگی کے رنگ ڈھنگ کا کچھ بھی تجربہ حاصل نہیں کیا تھا فرحت علی خاں نے اس کے گھونسہ مارا۔ تو اس نے لات سے جواب دیا مارنے اس کی عصمت بگاڑنے پر ہاتھ پھیلائے۔ تو اس نے پاجی یا بدذات کہا۔

ظاہر ہے۔ کہ زبردستی فرحت علی خاں کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ اور گلجان سراسر بے قصور تھی۔ اگر گل جان کو فرحت علیخاں کی صورت سے نفرت تھی۔ تو اس خیال کو دنیا کی کوئی طاقت دل سے دور کرنے والی نہ تھی۔ لیکن گذشتہ نصف گھنٹہ کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ گل جان کو فرحت علی خاں سے ولی نفرت نہیں۔ بلکہ وہ محض ارادتاً اوس سے خوش یا ناخوش ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس کے تبسم میں وہ نزاکت بھری ہوئی تھی جسکی فرحت علیخاں کو ضرورت تھی۔ اگر وہ دل سے فرحت علی خاں کی محبت نے اشارات کا جواب نہ دے سکی۔ تو کیا مضائقہ اس شخص کو محض اس کا تبسم کافی تھا۔ اس کی دوسری خواہش قطعی نفسانی تھی۔ اور اس کے ایفا کے لئے گل جان نے اس سے پرسوں نکاح کر لینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیا مضائقہ اگر وہ اس سے ظاہر داری میں نفرت کی باتیں بھی کرے فرحت علی نے جب گلجان کو شال میں تھراتی ہوئی پایا۔ اس کے دل میں ایک قسم کی چوٹ لگی اور اسے خیال آگیا۔ کہ ایسی معصوم اور کمزور لڑکی پر زور و غصہ کرنا سراسر ظلم ہے وہ اپنے پلنگ سے اٹھا۔ اور مہری سے لحاف لے کر گلجان کے سر تک خوب کھینچ دیا۔ پھر گل جان کا منہ آہستگی سے کھول کر پوچھنے لگا "میری پیاری اب تو تم مجھ سے ناراض نہیں" گلجان نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ اور مسکرا کر بولی "نہیں مگر آپ میری اماں کو صبح ہی مجھ سے ملائیے گا"

"صبح ہی" فرحت علی خاں کے منہ سے نکلا۔ اور وہ اس پر بچہ لڑکی کے

کے مجسمہ حسن و خوبصورتی کو اپنی آنکھوں سے اس قدر قریب پاکر بوسہ لینے کے لئے جھکا مگر گل جان نے مسکرا کر منہ پر لحاف کھینچ لیا۔ اور کروٹ لے کر بولی "اب آپ نکاح تک مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کریں" اب آرام کیجئے" فرحت علی خاں نے ان الفاظ کی تعمیل کی لیکن سچ پوچھو۔ تو اس نے بڑی بہادری کا کام کیا۔

آگ اور روئی کا قرب سراسر خطرات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر گل جان فرحت علی خاں سے منہ پھیر لیتی تھی۔ تو فرحت علی خاں کی مزید بے چینی کی باتیں تھیں مگر یہ دوشیزہ لڑکی ان نکات سے واقف تھی۔ گل جان اور فرحت علی خاں دونوں نے اپنے اپنے پلنگوں پر بڑی بے چینی اور متوحش رات بسر کی اول الذکر کے دماغ میں تو تفکر اور تنہائی نیز بالکل اجنبی آدمی کی قید کا ڈر تھا۔ موخر الذکر کو محض اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی فکر تھی۔ اور وہ صبح تک اسی ادھیڑبن میں لگا رہا۔ گل جان کو ایک گھنٹوں کیلئے نیند آگئی تھی۔ اور وہ علی الصباح اٹھ بیٹھی گل جان کے بیدار ہوتے ہی فرحت علیخاں بھی جھٹ جمائیاں لیتا ہوا اٹھ گیا۔ اور دربار علی کو جگا کر گرم پانی اور چاء کا حکم دیا۔ پانی آجانے پر فرحت علی خاں نے زنانہ کے شمال و غربی گوشہ میں ایک دروازہ گل جان کو بتلا کر کہا۔ یہ بیت الخلا ہے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو۔ بلا تکلف جایئے" گل جان رفع حاجات کیلئے کئی گھنٹے سے بے چین تھی۔ وہ آفتابہ ہاتھ میں لے کر فوراً بیت الخلا میں گھس گئی۔ اس عرصہ میں دربار علی منہ دھونے کے لئے سیلابچی اور گرم پانی لایا۔ اور پندرہ بیس منٹ کے بعد گل جان ہاتھ منہ دھو شال اوڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی جس وقت گل جان کے آگے چاء لائی گئی تو اس نے مسکرا کر فرحت علی خاں کی طرف دیکھا۔ اور آنکھیں نیچی کر کے بولی "میں آپ کی مہمان نوازی کی از حد شکور ہوں لیکن میں اماں لغیر بے چین ہو رہی ہوں۔ فرحت علی خاں سنجیدہ صورت بنا کر دربار علی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر فرش کیطرف دیکھ کر بولا "اچھا میں آپ کی والدہ کو بھیجے دیتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اپنی والدہ کے کہنے سے نکاح کی تردید کی۔ تو میں کل کی باتیں دوہرانے پر مجبور رہونگا۔ پھر دربار علی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے زینہ پر چڑھ گیا۔ اور بالائی کمرہ میں آکر کہنے لگا "اس کی والدہ کو ایک

تفتیش کے لئے رہا کر دو۔ اگر یہ بدذات بڑھیا راضی نہ ہوئی۔ تو اسے مار کر زمین میں گاڑ دیں گے۔" یہ کہکر فرحت علی خاں شمالی دروازہ کے گول کمرہ میں چلا گیا۔ اور وہ بار علی نے امیر جان کے کمرہ کا قفل کھولا۔ امیر جان اس وقت اپنے پلنگ پر اوندھی پڑی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں بے رونقی اور خونخواری علوم دیتی تھی۔ جیسے کسی مجروح یا دیوانے کتے کے آخری وقت میں ہوا کرتی ہے۔ دربار علی کو دیکھتے ہی امیر جان کانپ گئی۔ پھر دانت پیس کر بولی "تو بار بار میرے سامنے کیوں آتا ہے۔ اس بدمعاش سے کہدے کہ یا تو گل جان کو میری آنکھوں کے سامنے بھیجدے۔ یا مجھے تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دے" بے رحم دربار علی نے مسکرا کر مصیبت زدہ عورت کی طرف دیکھا۔ پھر تمسخر صورت بنا کر بولا "بیگم صاحب اب تم گھبراؤ نہیں۔ تمہیں گل جان کے پاس جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ جاؤ سامنے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ لیکن اگر تم نے گل جان کو ہماری سرکار کی طرف سے ورغلایا۔ تو تمہاری خیریت نہیں۔ اس کلمہ سے امیر جان کا دل اچھلنے لگا۔ اور وہ اپنے سر سے لحاف پھینک پھاند کر اس طرف دوڑی جدھر گل جان کے زندان کا دروازہ تھا۔ وہ ابھی ایک ہی سیڑھی سے اتری تھی "میری لاڈلی گل جان اماں صدقے" کہا گل جان "اماں پیاری اماں" کہہ کر ماں سے لپٹ گئی معلوم نہیں عورتوں میں رونے دھونے کی قابلیت مصنوعی ہوتی ہے یا قدرتی کہ وہ حسب ضرورت دل کھول کر رو سکتی ہیں لیکن اس وقت انصافاً کہنا پڑتا ہے۔ کہ امیر جان اور گل جان کی آنکھوں سے مصنوعی آنسوؤں کی رو نہیں نکل سکتی تھی۔ ان کے دل بھر آئے تھے۔ اور دراصل یہ بالکل غیر معمولی موقعہ تھا۔ کہ فرحت علیخاں نے ان ماں بیٹیوں کو ایک دوسرے کی ملاقات سے مستفید ہونے کے لئے ایک گھنٹہ دیدیا تھا۔ ورنہ اس جیسے سنگدل اور ضدی آدمی کے برتاؤ کا خیال کر کے مجبوراً کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ ماں بیٹیاں پھر ملنے والی نہ تھیں۔ دو تین منٹ کے بعد دربار علی نے ایک دوسرا آفتابہ گرم پانی کا لا دیا۔ اور گل جان نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھکر کہا "ماں منہ ہاتھ دھو ڈالو" پھر اسکے سر کے نیچے شب گذشتہ کی چوٹ دیکھکر کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ہائے اماں یہ چوٹ کس طرح لگی" امیر جان

کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جو رات گل جان کے رضامند ہو جانے پر فرحت علی خاں نے اسے کھانا کھلاتے وقت شراب سے تر کر کے بندھوا دی تھی۔ بیٹی تیری جدائی سے میں سر پھوڑنے لگی تھی" امیر جان کے منہ سے نکلا۔ اور گل جان کی آنکھوں سے بار دیگر آنسو بہنے لگے۔ بار بار گل جان کے مزید اصرار پر امیر جان نے چھوٹے کمرہ میں جا کر منہ دھو ڈالا۔ اور دوپٹہ کتے ہوئے دل سے بیٹی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ گل جان نے دو پیالیاں چائے کی بنائیں۔ اور ایک پیالی ماں کے سامنے پیش کی۔ پانچ سات منٹ تک ان دونوں ماں بیٹیوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ فدا بار علی نے ان کی باتیں سننے کے لئے دروازہ بند کر کے کان لگا دیئے تھے۔ ایک دم سے زور کی آواز میں سنائی دیا "اماں تم بڑی چندی ہو۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں۔ مجھے نکاح کرنے دو" دوسری آواز فدا بار علی کے کان میں یہ پڑی "خیر تیری مرضی۔ مگر مجھے اس معاملہ سے ڈر لگتا ہے" امیر جان نے اپنی پیالی ختم کر کے سامنے کی الماری سے پاندان اٹھا کر چند ٹکڑے بنائے اور آہستہ آہستہ چند باتیں گل جان کے کان میں کہیں جن کی فدا بار علی کو کچھ خبر نہ ہوئی سپاہی ایک ٹکڑا امیر جان نے بیٹی کے ہاتھ میں دیکر ایک پان اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اور زینہ کے دروازہ کی طرف دیکھ کر اپنی انگشتری اتار کر گل جان کے ہاتھ میں دیدی۔ گل جان نے اپنی انگوٹھی ماں کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ گل جان کی انگلی میں امیر جان کی انگشتری کسی قدر ڈھیلی آئی۔ مگر اس نے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ پھر پانداں سے سروتا نکال کر سپاریاں کاٹنے لگی۔ ایک گھنٹہ بعد گل جان نے اپنی کلائی پر گھڑی دیکھی۔ جو اس وقت بند پڑی تھی مگر اس لہجہ میں زینہ کا دروازہ کھلا۔ اور فرحت علی خاں شرم سے نیچے دیکھتا ہوا بولا "معزز بیٹی کی معزز ماں! میں آپ سے اس جابرانہ برتاؤ کی معافی مانگتا ہوں لیکن دراصل سپاہی گل جان کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔"

امیر جان آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ بیٹا اس قدر زیادتی کرنے سے کیا فائدہ تھا میرا تو سر پھٹ گیا۔ اگر گل جان راضی ہے۔ تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں لیکن میں بیس ہزار لئے بغیر نکاح کی اجازت نہ دونگی"

فرحت علی خاں نے سر ہلا کر امیر جان کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا "بیس ہزار روپیہ تو میں تمہیں ضرور دونگا۔ اس کا تو ذکر ہی فضول ہے اب اجازت تو کہ قاضی کو ابھی بلالوں اب تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ شوق سے گل جان کے ساتھ رہو مگر نکاح اسی وقت ضرور ہو جاوے۔

امیر جان کے چہرہ پر سرخی پھیلنے لگی۔ اور اس نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ میں تو گل جان کی شادی رئیسوں کی طرح کرنا چاہتی تھی۔ خیر اگر تمہیں ضد ہے۔ تو کل صبح نکاح پڑھا لینا۔ آج تم نوکر کو بھیجکر یا خود جا کر گل جان کے لئے نکاح کا جوڑا تو تیار کرا دیا یونہی کھڑے کھڑے نکاح کرا دوں۔ شاید آج رات ہی کو اجازت دیدوں۔ لیکن ابھی میں نے بہت سی باتیں سوچنی ہیں۔ فرحت علی خاں کا دل ایسا تغیر پذیر تھا جیسا کہ چلنا گھڑا۔ وہ شب گذشتہ کی سب باتیں بھول گیا۔ اور اسوقت گل جان کو آنے والی رات میں عروس بنا کر آغوش میں کھینچ لینے کے لئے تیار کرنے لگا۔

انتالیسواں باب

کامران اپنی اندھیر بن میں ہے

دلاور علی پانچ بجے شام کی گاڑی سے سہارنپور پہنچا۔ اور ریلوے اسٹیشن سے پیدل آ رہا تھا۔ کہ جامع مسجد کے قریب اس کی کامران سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

کامران اس وقت عمدہ کوٹ پتلون اور ہیٹ کی ٹوپی پہنے کامران بی اے بن رہا تھا۔ اور چونکہ وطن سے عید الضحیٰ کر کے آ رہا تھا۔ انگریزی سوٹ بھی بہورے ڈنگ کے کشمیرہ کا تھا۔ وہ دن میں دو تین دفعہ گل جان کی حویلی کی طرف سے گذرا۔ کہ شاید ملنہ اختر وغیرہ واپس آ گئے ہوں۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ کسی وجہ سے دیر ہو گئی وہ یکہ جو سہ بازار میں ادھر ادھر دیکھتا بھالتا پھر رہا تھا۔ اسے اس بات کی مطلق خبر نہ تھی۔ کہ گل جان اور انگریز میں فرحت علی خاں

کے شکنجہ میں پھنس گئی ہے۔ اس نے دفعتاً دلاور علی کو اپنے سامنے پایا۔ تو اس نے اچھلتے ہوئے دل سے السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر عید مبارک کہہ کر نہایت گیر ہو اسلور سب سے پہلا سوال اس کا یہی تھا "کیا مظفر نگر سے نمٹ آئے؟ دلاور علی نے جھوٹی تبسم اور پریشان آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "آنجناب نمٹ آئے یا نمٹ بیتوں میں پھنس گئے۔ کامران کا چہرہ فوراً سنجیدہ بن گیا۔ اور اس نے گھبرا کر کہا "خیریت کا معاملہ ہے" دلاور علی سڑک کے ایک طرف ہو لینے لگا۔ کیونکہ پیچھے کوئی یکہ آرہا تھا۔ اور اپنے آپ کو سنبھال کر بولا "حضرت کیا آپ نے نہیں سنا۔ وہ بدمعاش اسرائیل خاں تو ایک قسم کا ڈاکو نکلا۔ گلبدن اور اس کی والدہ کا پتہ نہیں۔ میں بلند اختر اور کلن سڑک پر پڑے رہ گئے۔ بڑی مصیبت سر پر پڑی۔ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ خوبصورت لڑکی کی گمشدگی اور اس کی دوشیزگی کا خیال کر کے چیں بجبیں ہوا۔ اور فق شدہ چہرہ سے دلاور علی کی طرف مفصل کیفیت سنانے کی درخواست کرنے لگا۔ دو منٹ کے اندر دلاور علی نے پوری داستان ادا کی۔ پھر مصنوعی تبسم سے کامران کی طرف دیکھ کر بولا "جناب کھانے پینے کو ایک پیسہ پاس نہ رہا تھا بھٹیارہ سے کرایہ ریل قرض لے کر سہارنپور آیا ہوں۔ اب کچھ روپیہ کا بندوبست کر کے مظفر نگر جاؤنگا"

دنیا میں مواقعات ہر روز پیش نہیں آیا کرتے۔ اور جو کوئی شخص موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیتا ہے۔ وہ ساری عمر کف افسوس ملا کرتا ہے۔ کامران کو بلند اختر کا افلاس خوب معلوم تھا وہ سمجھا کہ یہ شخص دلاور علی بھی اسی قماش کا آدمی ہے اور کیا عجب وہ رفیق احمد کے قتل کا اس وجہ سے شایق تھا۔ کہ شکیلہ سے شادی کر کے اس کے نانا کی دولت پر قبضہ کر سکے۔ اور کیا عجب کہ وہ شکیلہ کے پراسرار خط کے مضمون سے آگاہ ہو اسے ان باتوں کی جہان بین کے لئے اس مشتبہ نوجوان کی نقل و حرکت کا امتحان نہایت ضروری معلوم ہوا۔ اور وہ چند روز سے اس فکر میں تھا بھی کسی طرح دلاور علی سے گہرا تعلق پیدا کرے۔ چونکہ اوس نے دلاور علی کے بیان پر نہایت متانت کے ساتھ اظہار تاسف کیا۔ اور جیب سے ایک چرمی بٹوہ نکال کر کہنے لگا "مجھے گلبدن کی گمشدگی کا بڑا صدمہ گذرا۔ میں بھی اس معاملہ میں آپ صاحبوں کا ہاتھ بٹاؤنگا۔ اور میں خود مظفر نگر چلونگا۔ اس وقت میں سرائے میں مقیم ہوں

اور افسوس ہے میں زیادہ روپیہ ساتھ نہیں لایا۔ لیکن میرے پاس دو اشرفیاں ہیں۔ جو اس وقت آپ کی نذر ہیں" دلاور علی کا دل اچھل پڑا۔ اور اس کے چہرہ پر سرخی پیدا ہو گئی مگر وہ مسکرا کر بولا "آپ مطلق نہ تکلیف کریں۔ میں کچھ بندوبست کر لونگا" لیکن کامران اس موقع کو ہاتھ سے دینے والا نہ تھا۔ اس نے بڑے اصرار سے بٹوہ دلاور علی کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور مسکرا کر کہا "آپ کو روپیہ کی ضرورت مظفر نگر پہنچنے کے لئے نہیں بلکہ گلجان کے متعلق تحقیقات کیواسطے آپڑی ہے۔ سو یہ اشرفیاں آپ کو نہیں دیتا۔ گل جان کو دے رہا ہوں۔ آپ کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔ میں گل جان سے نمٹ لونگا" دلاور علی کو ندامت سے عرق آگیا۔ اور وہ دراصل ریلوے اسٹیشن سے تھکا ہوا پیدل آیا بھی تھا جیب خالی ہونے کے باعث سے اس نے راستہ میں سگریٹ تک نہ پیا تھا۔ وہ بٹوہ سے ہاتھ ہٹاتا رہا لیکن کامران نے اسے اشرفیاں دکھلا کر بٹوہ زبردستی اس کے اوورکوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ پھر سڑک پر کھڑے کھڑے اپنی جیب سے وہ سگار نکالے جن میں سے ایک دلاور کی نذر کیا۔ دو اشرفیاں لینے سے دلاور علی کے قلب پر جس قدر اطمینان پیدا ہوا تھا۔ وہ سگار کے دو تین دم کھینچنے سے متمکن ہو گیا۔ اور دلاور علی نے دلی تپاک سے کامران کا شکریہ ادا کر کے کہا "آپ کی موجودگی سے اس وقت بڑی مدد ملی ہیں آج سہارنپور رہونگا۔ صبح کی گاڑی مظفر نگر جاؤنگا۔ آپ جیسے شریف اور دوست پرور آدمی کو سرائے میں مقیم رکھنا بڑی بھاری احسان فراموشی ہو گی۔ آپ براہ کرم آج میرے غریب خانہ پر قیام فرمایئے"

کامران تسلیم کہہ کر دلاور علی کے ساتھ ہو لیا۔ اور کہالہ پار محلہ میں اس کے ساتھ ساتھ آیا۔ جس مکان کے دروازہ پر پہنچکر دلاور علی نے اسے اپنا مکان بتلایا۔ وہ ایک چھوٹا خوبصورت پختہ مکان تھا۔ جو کم از کم دو ہزار روپیہ میں تیار ہوا ہو گا۔ عمارت بالکل نئی تھی اور مکان کا بہت سا حصہ نامکمل پڑا تھا۔ دلاور علی نے مکان کی دہلیز میں پہنچکر ایک زینہ کا قفل کھولا۔ پھر یہ کہکر "میں ذرا اندر ہو آؤں۔ دیکھو ملا موجود ہے یا نہیں۔ اس نے کامران کو چڑھ جانے اور بیٹھ جانے کی اجازت دی۔ کامران اس نئے زینہ کے راستہ سے اوپر

چڑھا۔ اور ایک دروازہ پر جس میں قفل پڑا ہوا تھا۔ جا کر ٹھہر گیا۔ اتنے میں دلاور علی ہانپتا ہوا اوپر آیا۔ اور ہنسکر کہنے لگا۔ واہ میں اوپر کا قفل کھولنا تو بھول ہی گیا۔ آپ بیٹھتے کہاں ہیں یہ کہکر قفل کھول دیا۔ اور کامران کو ایک کرسی پر بٹھا کر غربی دروازہ کے راستہ سے زنانہ مکان میں چلا گیا۔ یہ کمرہ بالکل نیا تھا۔ دیواروں پر پلاستر بھی نہیں ہوا تھا۔ فرش خام تھا البتہ کمرہ کی موزونیت اور طاق الماری میز کرسی کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دلاور علی ہر چیز میں انگریزی مذاق رکھتا ہے۔ کمرہ کے وسط میں ایک گول میز پر کاغذ رجہا لرپچی ہوئی تھی اور کاغذ اور لفافے دوات قلم وغیرہ پڑا تھا۔ جنوبی دیوار میں ایک چھوٹی سی الماری نصب تھی جس میں قفل پڑا ہوا تھا۔ دلاور علی کے چلے جانے پر کامران اکیلا بیٹھا رہا اور دل میں سوچتا رہا۔ یہ شخص کون ہے۔ اور اس نے آوارہ گردی اور اڑکپن کی عمر میں یہ مکان کس طرح بنا لیا۔ پھر وہ دل میں کہنے لگا۔ دلاور علی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ میں اس گھر میں چور بنکر آؤں۔ غیر دیکھا جاویگا۔"

پانچ منٹ کے بعد دلاور علی مسکراتا ہوا واپس آیا۔ اور مخمل آنکھوں سے کامران کو دیکھکر بولا۔ میرے گھر کی بے ترتیبی معاف فرمایئے گا۔ صرف ایک ماما کے اوپر ایک سارا گھر پڑا رہتا ہے۔ آپ کے لئے چائے تیار کرائی ہے۔"

کامران نے تسلیم کہکر تعجب سے دلاور علی کیطرف دیکھا۔ اور آہستہ سے پوچھا۔ کیا آپ کے متعلقین کہیں گئے ہوئے ہیں۔

دلاور علی نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ جناب ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ اور اس کلمہ سے دلاور علی کی آنکھوں میں ایک قسم کی تبدیلی معلوم ہوئی جس سے کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ بعض دفعہ دلاور علی کا چہرہ ایسا خوفناک ہو جاتا تھا۔ کہ دیکھنے والا ڈر جاوے کامران نے سنسنی سے سگار نکال کر پوچھا۔ کیا آپ کے والدین حیات ہیں؟

دلاور علی نے لمبا سانس بھرا۔ پھر زمین کی طرف دیکھکر بولا۔ جی نہیں والد صاحب کو پندرہ برس گذرے۔ انتقال کر گئے۔ والدہ زندہ ہیں۔ آپ سے کوئی بات چھپانا لاحاصل ہے میری والدہ ایک معزز خاتون کے یہاں بیس سال سے ملازم ہے۔ اسے بیس روپیہ ماہوار

ملتا ہے۔ میں اپنی والدہ کی کمائی پر گذر کرتا ہوں"۔

والدہ کے نام سے کامران چونکا۔ اور باتیں دریافت طلب سمجھتا تھا۔ لیکن زیادہ چھان بین کی تہذیب مانع تھی۔ اس نے مدعا درست کہکر دلاور علی کو مطمئن کر دیا اور دیر تک زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ اس عرصہ میں ایک بڑھیا ایک پرانی سینی میں چاء کا سامان لائی۔ اور دلاور علی نے اس کے ہاتھ سے سینی لے کر مہمان کی ہدایت کی۔ کامران اپنے گھر لاہور میں عید الضحیٰ کے موقعہ پر گرم لذیذ کھانے اور گہر کی چاء پی لینے کے بعد بازاری کھانوں سے اکتا گیا تھا۔ اسے دلاور علی کی چاء اور بسکٹ میں ایک قسم کا لطف آیا گو وہ دل میں ڈر رہا تھا۔ کہیں دلاور علی اسے زہر نہ دیدے۔ لیکن کامران کے شبہات بے بنیاد اور قبل از وقت تھے۔ دلاور علی محض اسے ایک معزز رئیس اور گل جان کا عاشق سمجھ رہا تھا۔ اور اسے اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ یہ وہی شخص تھا جو کلو بیگ کے لباس میں اس کے پیچھے چھال آصف نگر کی بلندی سے بھاگا تھا۔ یا بلند اختر کے مکان پر کلو بیگ کے لباس میں ایک جھلک شب کی تاریکی میں دکھلائی تھی"۔

چاء ختم ہو جانے پر دلاور علی نے پان اور حقہ منگوایا۔ پھر اس بالاخانہ کے برآمدہ میں سے ایک چارپائی اٹھا کر اندر بچھا دی۔ کامران اپنے مکان کو واپس جانے کیلئے بالکل تیار نہ تھا۔ اور وہ اپنی طاقات کو طول دینا چاہتا تھا۔ پس اس نے اپنے لئے چارپائی کا آنا نہایت مفید سمجھا۔ اور ہنسکر کہنے لگا "اگر آپ نے میرے قیام کی تکلیف کی ہے۔ تو میں بوریا بند سرائے سے لے آؤں۔ دلاور علی نے قہقہہ لگا کر جواب دیا جی نہیں۔ اب سردی میں کہاں جائیے گا۔ میں اندر سے ایک بستر آپ کے لئے تجویز کر دونگا آپ جانیں گھروں پر ان چیزوں کی کیا کمی"۔ چنانچہ بستر لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دلاور علی ایک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر پیشانی پر بل ڈال کر بولا "میں ایک دوست کو ملنے جاؤں آپ اتنے میں آرام کریں۔ اس عرصہ میں ماحضر بھی تیار ہو جائیگا"۔

کامران نے اپنے بدن سے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ اور بہت بہتر بہت بہتر کہتا ہوا۔ لحاف میں گھسنے لگا"۔

چالیسواں باب

شکیلہ ہرنگٹن کے نانا کا دفینہ

دلاور علی کو گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہونگے۔ کہ کامران ننگے سر جسم پر سفید سوٹ پہنے کاف سے اچھل کر جوتی پہننے لگا۔ پھر اس نے دانت پیس کر کہا "اس شخص کی والدہ میں روپیہ یا ہوا پر کسی مغز خاتوں کے یہاں نوکر ہے۔ اور یہ شکیلہ ہرنگٹن کے بنگلہ میں توشہ خانہ کی تلاشی میں رفیق احمد کے اس خط کے پرزے پا چکا ہوں۔ جو اس نے شکیلہ ہرنگٹن کے نام لکھا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص جب رفیق احمد پر حملہ آور ہوا اس توشہ خانہ میں چھپا ہوا تھا۔ اور اس کمرہ میں غلاظت کا ڈھیر اگلدان اس بات کا بین ثبوت ہے ہو نہ ہو یہ شخص رحمت کا بیٹا ہے۔ رحمت بیس سال سے شکیلہ کے یہاں نوکر ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ شکیلہ کے والد کے پُراسرار خط میں ہول کی جگہ پیپل کے درخت ہی اس بدمعاش نے بنائے اور دفینہ بھی اسی کے ہاتھ پڑا لیکن میں معلوم کروں۔ اس نے جمع کر رکھا ہے۔ اور اس غریب لڑکی کی بیشمار دولت حاصل کر لینے کے بعد بھی یہ شخص معمولی حیثیت میں کیوں پھر رہا ہے۔" وہ جوتی پہن کر شمالی دروازہ پر آیا۔ اور اس کی چٹخنی زور سے لگا کر دوسرے دروازوں کی طرف رجوع ہوا چاروں طرف کے کمرے بند کر دینے سے کمرہ کی تاریکی ہو رہی تھی۔ اس نے میز سے دیا سلائی اٹھا کر ایک دیوار گیری روشن کی۔ جو مشرقی دیوار میں لگی ہوئی تھی۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے کہنے لگا۔ "اگر یہ شخص آگیا۔ تو شاید مجھے مار ڈالے لیکن اس ایسا موقعہ ساری عمر نہیں ملیگا۔ میں کچھ چال چل سکتا ہوں۔ ہاں کہہ دونگا۔ میں ایک عمل پڑھ رہا تھا۔" وہ جھپٹ کر الماری کے قفل پر پہنچا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ اس کی سب چابیاں مکان پر رہ گئیں۔ اسکا دل لرز گیا۔ مگر اس کی جیب میں ایک چھلا اپنی ذاتی کنجیوں کا تھا۔ اس نے وٹر کتے ہوئے دل سے ایک میں لگائی۔ اور خوش قسمتی سے پہلی ہی کنجی نے قفل کو کڑاک سے کھول دیا۔

کامران کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اور خوفناک کتے کی طرح اس الماری کی اشیاء پر پڑا۔ الماری میں چینی کے برتن نہایت چمکدار رکھے ہوئے تھے۔ جو بظاہر رحمت نے چور اچھا کر دلاور علی کو دیئے تھے۔ کامران کو ان برتنوں سے کچھ سروکار نہ تھا اسے دفینہ کے متعلق پتہ لگانا تھا۔ ان برتنوں کے درمیان میں اسے دو چھوٹے چھوٹے ڈبے زنگ خوردہ چاندی کے نظر آئے۔ اس نے سب سے پہلے ایک ڈبہ باہر نکالا۔ جو خوب وزنی اور مضبوط تھا۔ کامران نے اس ڈبہ کو کھول کر دیکھا۔ تو اس کے اندر سے ایک چوکور ٹکڑا چاندی کا نکلا۔ کامران کا دل اضطراب سے گلے میں آنے لگا۔ اس نے جھپٹ کر اس ٹکڑا کو لیمپ کے آگے بغور دیکھنا شروع کیا۔ کامران کے دل کی خوشی اور فتحمندی کی اس وقت کوئی حد نہ تھی جب اسے ٹکڑے پر اپنے مفید مطلب تحریر دکھلائی دی۔ وہ ان حروف کی منشا سے واقف نہ ہو سکا اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اور منہ اور ناک پر پسینہ بہ نکلا تھا۔ اس نے اس ٹکڑا کو الٹ کر دیکھا لیکن پشت پر کوئی تحریر نہ تھی۔ اوس نے پھر سیدھی طرف کی تحریر پر نگاہ جمائی۔ تو اسے ایک مثلث کے ہر اضلاع پر ایک ایک نام لکھا ہوا ملا۔ ایک طرف شفیع احمد دوسری آلیور ہیرنگٹن تیسری طرف شکسپیر ہیرنگٹن مثلث کی شکل اس طرح تھی:۔

اس نے اس ٹکڑہ کو میز پر رکھا۔ اور بھاگ کر دوسرے ڈبہ کی طرف رجوع ہوا اس ڈبہ کے اندر بھی اوسے ایک نقرئی چوکور ٹکڑہ ملا جس پر پہلے ٹکڑہ کی طرح مثلث کے اندر ایک لاکھ پونڈ مصب ذیل لکھا ہوا تھا۔

اس دریافت سے کامران کا دل اس قدر مسرور اور مضطرب ہوا۔ کہ وہ اچھل کر اس کمرہ سے باہر بھاگنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ شکسپیر ہیرنگٹن اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی۔ اور کہہ رہی ہے۔ ان مثلثوں کا مطلب میں سمجھ گئی لیکن کامران اس عماد کو مطلق نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اتنی بات البتہ اس کی سمجھ میں آئی۔ کہ شاید دلاور علی و شکسپیر کے لئے کوئی

دستیاب نہ ہو سکا چاندی کے یہ دونوں بکس دلاور علی کو اس حصہ زمین میں ملے ہونگے"
جہاں اس وقت کامران کے ایما سے کھدائی ہو رہی تھی۔ ایک درخت کے نیچے ایک ڈبہ
دوسرے کے نیچے دوسرا ملا ہوگا۔ اور شکیلہ کے خیالات کو دوسری طرف منعطف کرنے کے
لئے دلاور علی نے بسول کی جگہ پیل بنا دیا ہوگا۔ وہ اس فکر میں تھا۔ کہ وہ ان ڈبوں کو کسطرح
چرا کر بھجوا دے۔ وہ اس کے اوور کوٹ کی جیب میں ضرور جا سکتے تھے لیکن اگر دلاور علی کو
کسی قسم کا شبہ ہو گیا۔ تو سب کام بگڑ جاویگا۔ اس لئے ڈبوں کو پہر اندر باہر سے بغور دیکھا لیکن
ان میں اور کوئی تحریر نہ تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے
ہر دو ڈبوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ اور چور کو رنگے ہاتھ پکڑنے کی مسرت کی نگاہ سے دیکھکر
کہنے لگے تمہاری قیمت ایک لاکھ پونڈ یا پندرہ لاکھ روپیہ ہے میں نہیں جانتا یہ روپیہ کہاں سے ملیگا"
لیکن میں اب تمہیں شکیلہ کے پاس لیجاؤنگا۔ یا رب تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ مجھے ایسے
غیر متوقع طریقہ میں ایسی بڑی کامیابی ہوئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ابھی تک اس
بد معاش کو پتہ نہیں ملا۔ اور واقعی ایک عمدہ تعلیم یافتہ اور انجنیر آدمی ایک لاکھ پونڈ ایسی
حماقت سے زمین میں نہیں گاڑ سکتا تھا۔ یہ عقدہ میری سمجھ میں بھی نہیں آتا چاہے شکیلہ یا ہر کار
پونڈ اسمجھ سکے"

یہ کہکر اس نے دونوں ٹکڑوں کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنی پتلون کی جیب میں
رکھ لیا۔ اور ڈبوں کو الماری کے سپرد کر کے بلکے دل سے قفل لگا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا
اس غیر متوقع جستجو اور غیر معمولی دریافت میں دس منٹ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔ اور کامران
ابھی شمالی دروازہ کی چٹخنی ہی کھول رہا تھا کہ اسے زینہ کے اوپر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ اس
کا بدن کانپ گیا۔ اور وہ سمجھا۔ کہ اگر یہ خوفناک آدمی ایک منٹ پہلے آجاتا۔ تو ہمارا سارا
کام بگڑ جاتا۔ کامران نے دلاور علی کے اوپر چڑھنے سے پہلے باہتگی کیواڑ کھول دیئے پھر
تیز تیز دل سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ دلاور علی مسکراتا ہوا دروازہ پر
آیا۔ اور نادم لگا ہوں سے دیکھکر بولا۔ آپ کو کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اوہو آپ نے لیمپ
جلانے میں تکلیف کی۔ میں بڑا گدھا ہوں خود روشن نہ کر گیا۔ کامران نے جھوٹے تبسم

سے مسکرا کر جواب دیا۔ جی نہیں۔ کچھ تکلیف نہیں ہوئی عین راحت ہے آپ جیسے شریف اور خاندانی لوگوں کے دولت کدہ پر مقیم ہونے کی عزت ہی میرے لئے بڑے فخر و مباہات کا باعث ہے۔ مجھے آپ جیسے واقف سے ملکر بڑی خوشی ہوئی" یہ کلمہ ادا کر کے کامران اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

دلاور علی نے ایک کرسی اس کے سامنے بچھا دی۔ اس وقت کامران ظاہداری کے لحاظ سے تملق اور دوستی کی باتیں نوکر رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے سامنے ایک نہایت بدذات اور خوفناک آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کی تنگ پیشانی پر رفیق احمد کے قتل اور شکیلہ بیگم کے دفینہ کی گمشدگی صاف طور سے لکھی ہوئی تھی۔ کامران اس شخص کا مہمان تھا اور پندرہ بیس منٹ کے اندر وہ اس کے گھر کا کھانا کھانے والا تھا لیکن وہ دراصل اپنے دلیر اس وقت کا سماں باندھ رہا تھا جب محض اسی کی وردی دھوپ سے اس ہیبتناک نوجوان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ کر وہ عدالت کے کٹہرہ میں پیش ہوگا۔ اور جہاں انصاف پسند جج بیس سال کی سزا تجویز کر کے اس بدبخت نوجوان کی قسمت پر مہر لگا دیگا۔ اس خیال سے کامران کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کا دل لرز گیا عام طور سے مشہور ہے۔ اور عقلاً خیال کرتے ہیں۔ کہ کون و مکان کا مالک خدا ہے لیکن انسانی خباثت اور ذلالت کا خیال کر کے بیساختہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات پاک اگرچہ انسان کے تن بدن میں حبل الورید سے زیادہ قریب رہتی ہے۔ مگر وہ اس کی آلائش کی ہوا سے لاکھوں کروڑوں کوس دور ہے"

اکتالیسواں باب

شب عروس

[illegible] جوان اور اس کی والدہ کی چار ختم ہو جانے پر فرحت علیخان [illegible] کرسی پر

ان دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اور عروسی جوڑے لئے گفتگو کرنے لگا۔ امیر جان نے لمبا سانس بھر کر کہا۔ میں تو اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے سے کرنا چاہتی تھی لیکن تمہاری ضد سے شاید نکاح آج ہی کر دوں۔ مگر باقاعدہ رخصت تو میں سہارنپور جا کر کرونگی مجھے ایک مہینہ تیاری جہیز کے لئے چاہئے۔ اور سب سے پہلے تو تم مجھے بیس ہزار روپیہ دو۔ یہ کہکر امیر جان نے تجربہ کار سنجیدہ آدمیوں کی طرح پیشانی پر بل ڈال لئے۔ اور گلجان شوہا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اور آہستہ سے بولی "اماں تم اپنی ضد پر اڑ رہی ہو۔ جب انہیں میری محبت ہے۔ تو تمہیں روپیہ کی کیا کمی۔ فرحت علی خاں نے مسکرا کر گل جان کی طرف دیکھا۔ پھر نادم لگا ہوں سے امیر جان کی پٹی بندھی ہوئی پیشانی کو دیکھ کر بولا" اس وقت تو بیس ہزار میرے پاس نہیں ہیں میں نے بینک چیک جمع کر دیا ہے۔ آج مجھے گل جان کے جوڑے سے فرصت نہیں ملیگی۔ اور نہ میں تم دونوں کو چھوڑ کر باہر جا سکتا ہوں" پولیس اسرائیل خاں کی تلاش میں پھر رہی ہے کہیں اس کو ٹھکانے کا پتہ لگا کر اور ہر نہ چلی آوے۔ بہتر یہ ہے۔ کہ تم بیس ہزار کی بابت مجھ سے تحریری اقرار نامہ لے لو۔ دو چار روز میں تمہارے پاس پہنچا دونگا۔

امیر جان کے چہرہ پر تردد کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور وہ دھڑکتے دل سے بولی" یہ شخص اسرائیل خاں کون ہے۔ اور پولیس کو کس طرح خبر ہوئی یہ تو بڑی آفت ہو گئی۔ اب تم پولیس کو کیا جواب دو گے" فرحت علی خاں کا بھی دل دھڑک رہا تھا اس نے ہونٹ چاٹ کر جواب دیا" اسرائیل خاں کی گرفتاری کا مجھے ڈر نہیں۔ تمہارے دوست بلند اختر اور دلاور علی کوتوالی میں سب کے حالات لکھا چکے ہیں۔ اور پولیس اپنی تفتیش میں مصروف ہے لیکن اسرائیل خاں محض فرضی رئیس بن کر تمہارے یہاں پہنچا تھا۔ وہ تو میرا کارندہ یوسف علی خاں ہے۔ اور اب میرٹھ سے بڑھ راست جلال آباد پہنچ گیا ہوگا۔ وہ ہاتھ آنے والا نہیں۔ البتہ اس بات کا خیال ہے۔ کہ جب نکاح کے بعد گل جان اور تم سہارنپور پہنچو گی تو پولیس تم سے ضرور پوچھے گی۔ کہ تم کہاں رہیں۔ بہتر یہ ہے۔ کہ اس وقت نکاح خفیہ خفیہ ہو جاوے۔ اور جب تم سہارنپور پہنچ جاؤ۔ بارہ دیگر نکاح پڑھا کر گل جان کو باعزت خواتین کی

طرح رخصت کرو مگر ہاں یہ بتلاؤ۔ کہ تم پولیس سے کیا کہو گی "

گل جان اور امیر جان دونوں کے دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگے۔ اور وہ سمجھیں اگر یہ دونوں عورتیں اس ظالم اور سنگدل آدمی کے پنجہ میں گرفتار ہو گئی تو نہیں۔ تو وہ بھی کچھ کم ان کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ گل جان کچھ بولنا چاہتی تھی۔ کہ اس کی ماں نے اس کا کلام قطع کر کے جواب دیا " جب تم سعادتمندی کے ساتھ میری داماد ی میں آنے پر رضامند ہو۔ اور گل جان کو محبت و آرزو سے رکھو گے۔ نیز مجھے بیس ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہو۔ تو میں تمہارے کمینہ برتاؤ کو دل سے فراموش کر دینے پر مجبور ہوں۔ بہتر یہی ہے۔ کہ آج کی شب کسی غیر مشہور اور موقوف مکان کو بلا کر فرضی ناموں سے نکاح پڑھا لو۔ پھر شرافت کیسا تھ مجھے اور گلجان کو سہارنپور جانے دو۔ میں ایک مہینے کے اندر اندر جہیز کا انتظام کر کے باجے گاجے اور دعوت ضیافت کے ساتھ اپنی لاڈلی کو تمہارے سپرد کر دونگی " ان کلمات کی ادائیگی پر امیر جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور وہ مثل سے آنکھیں پونچھ کر بولی " پولیس والے مجھ سے دریافت کرینگے۔ تو میں کہہ دونگی۔ اسرائیل مجھے ایک بنگلہ میں لے گیا تھا۔ جس کا پتہ نشان مجھے معلوم نہ تھا۔ اور گل جان کیساتھ زبردستی نکاح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہم دونوں ایک نوکر گل جان کا سنہرا جھومر دیکر نکل آئے۔ اور وہ کہیں بھاگ گیا۔

ان الفاظ کی موزونیت اور طباعی پر گل جان کا دل اچھل پڑا۔ اور وہ مسکرا کر کہنے لگی " اماں تم بڑی تجربہ کار ہو۔ ایسے ویسے آدمیوں کو تم چٹکیوں میں اڑا دو "

فرحت عیناں کے چہرہ پر رونق آگئی۔ اور وہ مسکرا کر بولا " واقعی اس سے بہتر تدبیر نہیں ہو سکتی۔ میں تمہاری شرافت اور محبت کا لوہا مان گیا۔ لو سب سے پہلے تو بیس ہزار کا کاغذ لکھے دیتا ہوں۔ دو چار روز کے اندر بیس ہزار بھیجدونگا۔ اس عرصہ میں تم گلجان کا کاغذ ٹھیک کر رکھنا۔ میں جنوری کے ختم پر باقاعدہ بیاہنے آؤنگا " یہ کہکر فرحت عیناں کرسی سے اٹھا اور ان دونوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا " اب تمہارا اس فرخ عیناں میں رہنا لاحاصل ہے۔ اب میں تمہارا نہایت قریبی عزیز اور دلی دوست ہوں۔ اس کوٹھی کو اپنا سمجھو۔ اس کوٹھی کو میں نے بیس ہزار کو خریدا تھا۔ اب نکاح کے بعد گل جان کو اس میں رکھونگا۔ آؤ میرے ساتھ چلی آؤ "

دونوں عورتیں فرحت علی خاں کے پیچھے ہولیں۔ امیر جان نے اپنے زندان خانہ سے شال لیکر اوڑھ لی۔ اور شمالی دروازہ کے راستہ سے ایک مکلف کمرہ میں داخل ہوئیں جسے فرحت علی نے ملاقات کا کمرہ بتلایا۔ کمرہ معمولی سامان سے خوب آراستہ و پیراستہ تھا۔ اور تمام دروازوں پر بڑی بہاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرہ میں بجانب شمال ایک دروازہ تھا جس کے راستہ سے فرحت علیخاں انہیں ایک مختصر سے کمرہ میں لے گیا۔ جو دوسرے کمرہ کی طرح صاف ستھرا تھا جس کا نام فرحت علیخاں نے لائبریری یا مطالعہ کتب کا کمرہ بتلایا۔ لائبریری سے ملحقہ کمرہ بجانب شمال استراحت گاہ تھا جس میں دو مکلف مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ گل جان اس کمرہ کو دیکھ کر جھجک گئی اور شرم سے گلعذار نیچی کرلیں۔ پھر فرحت علیخاں ماں بیٹیوں کو لائبریری میں واپس لایا۔ اور آرام دہ کرسیوں پر بٹھلا کر کہنے لگا "تو سردست عروسی جوڑہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک جوڑہ میم لوگوں کے لباس کا پرسوں میرٹھ سے منگایا تھا۔ کیونکہ میں گل جان کو میم لوگوں کی طرح رکھونگا۔ وہ کافی ہے۔ اور غالباً گل جان اسے مل سے پسند کرینگی" یہ کہکر وہ اٹھا اور تھوڑی دیر کے لئے دربار علی کے پاس گیا جسے اس نے سرسری الفاظ میں ہدایت کردی کہ دو تین مزدور کوٹھی کے چاروں طرف تعینات کردیئے جائیں۔ وہ صرف اس بات کی حفاظت رکھیں کہ کوئی چور اُچکا کسی دروازہ سے اندر نہ آسکے"۔

دربار علی فوراً مطلب سمجھ گیا۔ اور سرگوشی کی آواز میں سب باتیں طے کرنے لگا بعد ازاں فرحت علی لپکا لپکا استراحت خانہ میں گھس گیا۔ اور ایک بہاری ٹرنک اُٹھا کر لایا۔ اس وقت فرحت علیخاں کے سر پر سمور کی پہاڑی ٹوپی تھی بدن پر اونی سوئٹر تانگون میں گرم پتلون نما پائجامہ۔ پاؤں میں بہاری اونی موزے۔ ٹرنک کھول کر اس نے میم لوگوں کے کپڑے کا ایک نیا چمکدار ریشمی جوڑا نکالا۔ جس کے گل پرزوں سے آدھا فرش گھر گیا۔

گل جان نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کرلیں اور نرمی سے بولی "میں نے انگریزی لباس آج تک نہیں پہنا ہیں اسے کیا کرونگی؟" مگر فرحت علیخاں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "واہ ان کپڑوں میں بڑا آرام ہے۔ ایام جوانی کے لئے ان پائجاموں اور صدریوں سے بہتر لباس

نہیں ہو سکتا۔ میری پیاری اب تم غسل کر کے یہ لباس پہن لو۔ تمہارے خوبصورت مکھڑے اور لانبے بالوں پر یہ لباس بڑا ہی دلفریب معلوم ہوگا۔"

گل جان شرما کر "نہیں اماں نہیں" کہنے لگی۔ مگر اس کی ماں نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا "اب تو خود مختار سی کی باتوں کو خیرباد کہہ اب اپنے شوہر کی تابعداری میں کوشش کر۔ جا غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لے" پھر مسکرا کر فرحت علی خاں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "گل جان کا جھومر اور چنپا کلی کہاں ہے وہ کہیں گم مت کر دینا۔ مجھے لا دو یہ احمق کھو دے گی۔"

فرحت علی خاں نے اچھلتے ہوئے دل اور ہنستی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا۔ "باجی وہ سب چیزیں گل جان کی مسہری پر ہیں۔ دربار علی میرا بڑا پورا نانا اور پھر خواہ نوکر۔ ہے تم مطمئن رہو۔ وہ بڑا ایما نتار آدمی ہے۔ گل جان نہیں نہیں کرتی رہی۔ مگر امیر جان نے اس کی کمر میں آہستہ سے گھونسا مار کر کہا "جا غسل کر بڑی شرمیلی بنی ہے" شوہر سے کیا شرم" فرحت علیخاں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور وہ سمجھا۔ کہ بس اب گل جان کو آغوش میں کھینچنے کا وقت بہت ہی قریب آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے پھر اس نے سب کپڑوں کو کھونٹیوں پر لٹکا کر کہا۔ معزز خاتون آپ گل جان کو غسل خانہ لیجایئے۔ گرم پانی موجود ہے میں خود غسلخانہ میں گھڑا لاتا ہوں" گل جان اپنے بدن کو شال سے ڈھکتی ڈھکتی غسل خانہ میں پہنچی اور تین منٹ کے اندر فرحت علیخاں نے پانی، صابون اور ایک بڑا تولیہ۔ انگیٹھی کوئلے اور آگ غسلخانہ میں پہنچا دی۔ گل جان کی ماں نے اسے خوب مل مل کر نہلا دیا۔ اور اس کے نرم گوشت بھرے ہوئے جسم میں فوری چمک، دمک اور شادابی آگئی پندرہ منٹ کے بعد گلجان بھیگے ہوئے بالوں کو شال سے ڈھکے ہوئے لائبریری میں آئی۔ اور فرحت علیخاں نے انگریزی لباس کی قطع و برید سمجھا کر سب باتیں بتلا دیں۔ پھر تین چار منٹ کے لئے دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ جہاندیدہ ماں نے بیٹی کے سر کو تولئے سے خوب خشک کر کے انگریزی کپڑے پہنائے۔ اور واقعی سفید ریشمی لباس میں گل جان کا خوبصورت سرخ و سفید چہرہ اور لانبے بھورے بال بڑی دلکش اور دلفریبی سے چمک اٹھے

مقام مثل مشہور ہے۔

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

مگر اصلیت یہ ہے۔ کہ مکمل خوبصورتی بھی نفیس لباس سے دگنی رونق پذیر ہو جاتی ہے۔ گل جان کے اس لباس میں ملبوس ہو جانے پر فرحت علی خاں اچھل پڑا اور وہ چاہتا تھا۔ کہ دوڑ کر گل جان کے نرونازہ رخساروں پر بوسہ دے لیکن اس کی والدہ پاس تھی وہ بوالہوس اور گرسنہ نگاہوں سے گل جان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر ایک میز پر بیٹھ کر بولا "اچھا اب میں آپکو بیس ہزار روپیہ کا اقرار نامہ لکھے دیتا ہوں"

پانچ منٹ بعد امیر جان کی آنکھیں حسب ذیل مضمون پر پڑ رہی تھیں "منکہ فرحت علی خاں ولد رستم علی خاں رئیس جلال آباد ضلع مظفر نگر اقرار کرتا ہوں۔ اور لکھے دیتا ہوں کہ اس خفیہ نکاح کے بالعوض جس سے امیر جان صاحبہ رئیسہ سہارنپور کی لخت جگر گل جان میری جائز و شرعی زوجہ بن گئی ہے بیس ہزار روپیہ نقد امیر جان صاحبہ موصوفہ کو چار روز کے اندر اندر ادا کر دونگا۔ اگر ادا نہ کر دونگا۔ تو خاتون مذکور بذریعہ عدالت وصول کر لے نیز میں وعدہ اور اقرار کرتا ہوں۔ کہ گل جان کو اپنی جائز بیاہتی اور پیاری زوجہ سمجھکر ہمیشہ عزت سے رکھونگا" اور اپنی مظفر نگر والی کوٹھی موسومہ۔ فرحت منزل گل جان کے نام لکھدونگا۔ اگر میں اس تحریر میں دروغگوئی یا عیاری سے کام لوں۔ تو مجھ پر خدا کا قہر نازل ہو"

اس تحریر پر امیر جان نے مسرت اور شکریہ کا اظہار کیا۔ پھر مسکرا کر گل جان کے ہاتھ میں دیا جس نے شرم حضوری سے کوئی بات منہ سے نہ نکالی۔ اور گردن جھکا کر جلدی جلدی رقعہ ختم کر کے ماں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس اثناء میں دربار علی آہستہ سے پردہ اٹھا کر کمرہ میں داخل ہوا۔ اور گل جان کو ادب سے سلام کر کے بولا "بیگم صاحبہ کھانا تیار ہے" تینوں آدمی کھانے کے لئے تیار تھے۔ فرحت علی خاں کے استراحت خانہ میں ایک میز پر کھانا چنا گیا۔ اور ایک گھنٹہ تک ان تینوں نے بڑے لذیذ کھانوں کا لطف اٹھایا۔ فرحت علی خاں نے کھانے کے بعد تھوڑی سی شراب پی۔ اور امیر جان کے سامنے بھی پیش کی لیکن گلجان نے شراب سے قطعی انکار کیا۔ کھانا اٹھ جانے کے بعد فرحت علی خاں نے چند ضروری

چیزیں، چہری۔ کانٹے۔ سیب۔ انگور۔ شراب۔ پاندان استراحت خانہ کی ایک الماری میں رکھوالیں۔ امیر جان حیا سے لائبریری میں چلی گئی۔ فرحت علی خاں حقہ لے کر اپنی مسہری پر لیٹ گیا۔ اور کن آنکھوں سے گل جان کے نا ہدف ضرب کپڑے کی طرف دیکھ کر بولا "میری لاڈلی اس مسہری پر آجاؤ" گل جان کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہوگیا۔ اور وہ گھبرا کر بولی "ایسی جلدی اچھی نہیں۔ میری اماں کیا کہیں گی۔ وہ یہ کہکر اور بھاگ کر لائبریری میں گھس گئی"

بیالیسواں باب

داستانِ لطافت مہ جبیناں و حسرت دل

فرحت علی خاں نے دن بڑی مشکل سے کاٹا۔ سورج غروب ہوتے ہی اسے نئی نویلی مہ جبین عروس کے اشتیاقِ نکاح کی پڑ گئی۔ اور کئی بار امیر جان سے بڑی مضطرب آواز میں پوچھا "کسی ملاں کو بلا لیا جاوے؟"

گل جان شرم اور بے چینی کے مارے تہرا رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے خونخوار آدمی کے پنجہ سے رہائی پانے کی غرض سے اپنی ماں کے مشورہ پر لفظ بلفظ عمل کیا تھا لیکن نکاح جیسا پر تقدس لفظ اور شب عروس ایک دوشیزہ لڑکی کی آنکھوں میں بچوں کا کھیل نہیں"

وہ دراصل اپنی ماں کے ہاتھوں کٹھ پتلی تو بن رہی تھی۔ اور نشیب و فراز زمانہ سے ناواقف تھی لیکن اسے اس بات کا علم ضرور تھا۔ کہ نکاح ہوجانے ہی وہ فرحت علی خاں کی باقاعدہ زوجہ بن جاویگی۔ پھر شاید اس کا دل اس خوفناک کام کی جرأت نہ کرسکے جو اس کی ماں نے تجویز کیا تھا۔ یا اس ہیبت ناک کام کی تکمیل سے پہلے فرحت علیخاں اس پر قبضہ کرکے اس کی دوشیزگی کو ہمیشہ کے لئے برباد کردے یا عین وقت پر اس کے ہاتھ پاؤں کام کرنے سے عاری ہوجاویں۔ دن کے متواتر گھنٹوں میں اس کی ماں

سرگوشی کی آواز میں اسے بار بار سبق دے کر خوب ورد زبان کراتی رہی لیکن جب فرحت علی خاں ان ماں بیٹیوں کے سامنے آتا تو گل جان کا دل لرزنے لگتا۔ گل جان اور امیر جان کا زیادہ وقت استراحت خانہ میں گذرا۔ اور ماں بیٹیاں پان اور چار سے دن کاٹتی رہیں گل جان دل میں آرزو کر رہی تھی۔ کہ کسی طرح بلند اختر اور دلاور علی پولیس سمیت اس کوٹھی پر دوڑے آویں۔ اور اسے اس خوفناک سازش سے رہائی نصیب ہو جاوے جسکا سرانجام اس کی ماں اسے کوشش اور بہ رحمی سے سکھلا رہی تھی۔ اس کے بے چین اور ناتجربہ کار دل کو دن میں کئی بار کوٹھی کے گرد بلند اختر کی آواز سنائی دیتی لیکن وہ در اصل محض دل کی کمزوری کی غلطی تھی غلطی آنکھ بھی کرتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص عید کا چاند دیکھ رہا ہو اور اسے اصلی چاند کی جگہ دو ہو کر ہو جاوے۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ اس کی آنکھوں نے چاند دیکھ لیا۔ لیکن خلقت نے اعتبار نہ کیا۔

فرحت علی خاں کے موجودہ برتاؤ سے گل جان کسی قدر اس سے مانوس ہونے لگی تھی۔ اور بلند اختر کے مقابلہ میں اسے بے حد بہادر اور مالدار سمجھ رہی تھی لیکن دل کو کسی سے لو لگ جاتی ہے۔ وہ اسی کا ہو رہتا ہے گل جان کو بلند اختر اس گئی گذری حالت میں بھی ہزاروں من سونے سے زیادہ پیارا تھا اسکے ساتھ مفلسی میں زندگی کاٹ لینے پر تلی ہوئی تھی۔ کاش وہ اس کا پتہ لگا کر آجاوے۔ اور اسے سینہ سے چمٹا کر اپنی بپتی سنالے لیکن انسان کی دلی آرزو بہت کم پوری ہوا کرتی ہیں۔ بلند اختر یا پولیس کے فرشتوں کو بھی گل جان کی خبر نہ تھی۔ سات بجے ہی فرحت علی خاں نے مکلف استراحت خانہ میں کھانا منگوایا اور ایک گھنٹہ کھانے کے شغل میں کاٹا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے بہت سے سیب انگور گل جان کے سامنے رکھے۔ اور ایک نئی بوتل شراب کی کھولی کہ کھانا ختم ہو جانے پر امیر جان نے فرحت علی خاں کو علیحدہ لے جا کر کہا "اب تم ایک گھنٹہ کے لئے گل جان کو آرام کرنے دو۔ میرے لئے گول کمرہ میں پلنگ بچھوا دو۔ نو بجے کے قریب کسی ملاں یا قاضی کو بلوا کر نکاح پڑھا لو۔ فرحت علی خاں ان الفاظ کا مطلب بخوبی سمجھ گیا۔

گل جان کو مکلف مسہری پر آرام کرنے کا اور سوچنے کا موقعہ مل گیا۔ امیر جان

گول کمرہ میں گئی اور ایک پلنگ اس کے لئے آرام دہ بنا دیا گیا۔ فرحت علیخاں بہت دیر تک امیر جان کے پاس بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہا۔ اس اثنا میں وہ بار بار کسی ملاں کی تلاش میں نکلا۔ گلجان دھڑکتے دل سے مسہری پر سے اٹھی اور کمرہ کی چٹخنی ہاتھ سے لگا کر بیٹھ گئی۔ فرحت علیخاں کی مسہری کے پاس کمرہ کی انگیٹھی تھی جس میں خوب آگ جل رہی تھی۔ اور کمرہ اچھی خاصی گرمی دے رہا تھا۔ انگیٹھی کے اوپر نہایت چمکدار لیمپ جل رہا تھا۔ گل جان دھڑکتے دل سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اسکا خوبصورت چہرہ معمولاً دلفریب اور شوخ تھا لیکن اس کے ہونٹ پیرمرد سے تھے۔ اور آنکھوں میں بے چینی اور سرخی جھلک رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جسے وہ لائبریری سے ساتھ لائی تھی اور ایک فارنین پین سے جو اس نے فرحت علیخاں کی میز سے چرایا تھا۔ دس بارہ سطریں لکھیں پھر ایک دوائی پر خشک کر کے لائبریری کی طرف کان لگا کر سننے لگی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی آ رہا ہے مگر اسے اپنے خطرات اور امید و بیم کی حالت میں فضول آوازیں سنائی دے رہی تھیں اسے دراصل ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ سارا کمرہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا ہے جو وہ نہیں سمجھ سکتی ایسی لمحہ میں اسے ڈر ہوا کہ کوئی بھوت یا فرشتہ سامنے آکر اس کا سر نہ توڑ ڈالے۔ اور اس خیال سے اس کی روح لرز گئی۔ جان کس قدر پیاری چیز ہے لیکن دراصل بغیر محبت یا عصمت زندگی بھی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اور انسان اپنی مرضی کے خلاف ہر بات کو مصیبت سمجھنے لگتا ہے اس نوجوان دوشیزہ لڑکی کو بلند اختر کے سوا کوئی شخص اپنی شوہریت کے قابل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ دراصل اس وقت اپنی عصمت کو بلند اختر کے لئے بچانے کی کوشش کر رہی تھی اسے اس خوفناک لمحہ میں یہ بھی خیال ہوا۔ کہ اگر باوجود اس گناہ اور سینہ زوری کے بلند اختر نے اسکی عصمت پر شبہ کیا۔ تو وہ کیا کریگی۔ اس خیال سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن انہی خیالات میں اس نازک وقت ضائع ہو رہا تھا وہ اس قوہ کو جیب میں رکھ کر دانت پیستی ہوئی اٹھی۔ اور الماری سے ایک چھری اٹھا کر کانپ گئی ہائے ہائے میں ظلم یا اللہ کیا کروں۔ اس کے منہ سے نکلا مگر اسے اپنے کانوں کی شاں شاں اور دل کے دھڑکنے کے ساتھ اپنی زبان کی صورت دکھلائی دی۔ جو زبان حال کہہ رہی تھی بس جلدی جلدی

ورنہ تو برباد ہو گئی ماں نے اپنے بے قرار دل کو سینہ پر دبا لیا۔ اور زنگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کے خوفناک چمکدار ہیرے کو دیکھنے لگی۔ آہ وہ کیسی خوفناک چیز تھی۔ ایک ننھی سی چیز لیکن انسان کی ہستی جانگنی تصویر کو عدم آباد پہنچانے والی طاقت۔ اف خدا نے انسان کے کتنے دشمن کتنے دوست پیدا کئے ہیں۔ اور یہ مثل کس قدر راست تھی کہ اگر ایک چیز ایک آدمی کے لئے شیر مرغ ہو۔ تو دوسرے کے لئے سم قاتل بن سکتی ہے اس ہیرے کی کنی فرحت علیخاں کیلئے زہر تھی لیکن گلجان کے ابر رحمت یا آب حیات جوانی سے مسرت اور سچی شاد کامی بلند اختر کے سینہ تک پہنچا سکتی تھی۔ اور اس وقت کتے ہر کے دل سے تیز چمکدار چھری انگوٹھی کے نگینہ پر پہیری پہر اس کا دل کانپ گیا لیکن وہ مجنون کتے کی کیطرح اپنی دھن میں لگی رہی اس کا سر چکرا گیا۔ منہ پر پسینہ آگیا۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے تھوڑا سا برادہ اس تختہ کاغذ پر جمع کیا۔ اور انار دانہ سے شراب کی بوتل نکال کر اس برادہ پر اس میں جھونک دیا پہر اسکے الحاق خطا ہونے لگے لیکن اس نے دل کو قابو میں کر کے بوتل کو خوب ہلایا۔ اور ڈاٹ بند کر دی سجد اذاں وہ خوفناک چیتے کی طرح پہر انگشتری کیطرف جھپٹی اور تھوڑا سا برادہ جمع کیا۔ اور اس برادہ کو کاغذ میں چھپا کر اس نے پاندان سے چند ٹکڑے پان کے بنائے اور پاندان بند کھڑکا کھول کر نیچے رکھ دیئے بعد ازاں کتھے اور چونے کی چمکدار ڈبیوں میں ہیرے کی کنی ملا دی۔ یہ پانچ منٹ کی بات تھی لیکن اس نے موت و حیات کو بے پایاں سمندر کا پل باندھ دیا۔ گیا اسوقت فرحت علیخاں کی زندگی ایک تار پر لٹک رہی تھی۔ اور اس تار کا کونہ گل جان کے ہاتھ میں تھا۔ ذرا نا راضی ہوا یا۔ اور وہ تحت الثرے میں اتر گیا۔ اس نے دانت پیسکر دل سے کہا ماں تو بڑی سنگ دل ہے نہیں معلوم میں نے اس خوفناک کام کے ارتکاب پر کس طرح جرأت کی تھی۔ رحم۔ رحم لیکن فرحت تو نے اپنی دانست میں میری عصمت لگا ذوی تھی اب تو مجھے اپنی بیوی بنا کر منہ چومے گا ہرگز ہرگز نہیں میرا منہ صرف بلند اختر کے لئے بنا ہے ان الفاظ سے اس کے خوبصورت چہرہ کی رنگت فق ہو گئی۔ اور آنکھوں میں خون اتر آیا پہر وہ آپ سے دیوانہ وار چلا کر چیخنی کہنے لگی۔ وہ ابھی اپنی مسہری پر اگر لیٹی ہی تھی کہ پہر جان لپکی لپکی آئی۔ اور کہنے لگی۔ ملاں آگیا ہے۔ خدا کی قدرت میری لاڈلی بچی

کے نکاح کو ایک اندھا قاضی آدے۔ اور ایسے حرامزادے جیسا دربار علی اور اس کا ساتھی ہے
گیل نہیں۔ ہاں بیٹی تو پردے کے پاس آکر کہدے کہ تو نے فرحت علی خاں کو قبول کیا"
گل جان کا جسم لرز گیا۔ اور وہ اپنے سر کو سنبھالتی ہوئی اٹھی۔ پھر فق شدہ چہرہ سے اپنی
والدہ کو دیکھ کر بولی "اماں اس نکاح اور اس بے رحم کام سے میرا دل کانپ رہا ہے۔ کاش میں
اس دن کے لئے پیدا نہ ہوتی" امیر جان کا چہرہ اضطراب اور غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اور وہ سمجھی
کہ شاید یہ ناتجربہ کار نرم دل لڑکی سب بنا بنایا کام بگاڑ کر اپنے سر آفت مول لیگی۔ اس نے
آہستگی سے اس کا سر تھام کر جوابدیا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تو میرا چیلہ نہیں چکی
تو مجھے بتلا اب سوچنے کا وقت نہیں" اٹھ بیٹھ" پھر غضبناک آنکھوں سے اماری کیطرف دیکھ
کر بولی "یہ کیا ابھی سیر انہیں چھیلا" گل جان نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے جوابدیا "سب
سامان تیار ہے۔ مگر میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔ امیر جان
نے بیٹی کی انگلی میں جلدی سے انگشتری دیکھی۔ اور یہ معلوم کر کے کہ نصف سے زیادہ سیر کٹ
چکا تھا۔ اس نے ہیبت ناک تبسم سے بیٹی کو دیکھ کر کہا "شاباش" شاباش" اب میرے ساتھ
آ۔ اور نکاح میں کوئی خرابی نہ ہونے دے ورنہ کام بگڑنے میں کوئی دیر نہیں۔ پھر گلجان
کی بغل میں ہاتھ دیکر سنبھالتی ہوئی پردہ کے پاس لائی۔ مجلس کے پیچھے لائبریری میں فرحت
علیخاں ایک نابینا حافظ دربار علی اور دو سرا ملازم نجیب خان جمع تھے۔ گل جان کو کیواڑوں کے
پاس چھوڑ کر امیر جان لائبریری میں گئی۔ اور بہت سے تبسم سے بولی "کنواری لڑکیاں نکاح
کے نام سے ڈرتی ہیں۔ اچھا قاضی جی نکاح پڑھاؤ۔ نابینا حافظ نے قرات سے ایک سورہ
کلام مجید کی پڑھی۔ پھر کلمات طیبات پڑھ کر زور سے پوچھا۔ لڑکی کا کیا نام ہے؟ امیر جان نے
کانپتی ہوئی آواز میں جوابدیا "گل جان" حافظ نے شوق کے لہجہ میں فرحت علیخاں سے کہا
تو آپ اس لڑکی گل جان کو نکاح میں قبول کرتے ہیں؟ فرحت علی خاں نے اچھلتے ہوئے
دل سے جوابدیا "میں نے گل جان کو دل سے منظور کیا" پھر نابینا حافظ نے زور سے پوچھا
صاحبزادی کیا تو فرحت علی خاں کو اپنا شوہر تسلیم کرتی ہے" گل جان نے اشک آلودہ
آنکھوں کو پونچھکر روتی ہوئی آواز میں کہا۔ میری والدہ میری مالک ہے۔

امیر جان نے لرزتے ہوئے دل سے آواز دی۔ ہاں منظور کیا۔ بیس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت گل جان کا مہر تجویز کیا جاوے۔ اور اس رقم کو اس اقرارنامہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو فرحت علی خاں نے مجھے لکھ کر دیا ہے۔ فرحت علی خاں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ہاں ہاں بیس ہزار روپیہ نقد بعوض مہر میں گل جان کو علیحدہ دونگا۔ نابینا حافظ نے دونوں ملازموں کو باہمتگی کہا۔ تم دونوں گواہ شرعی ٹھہرے نکاح ہوگیا۔ دونوں نوکروں نے اپنا آقا و نعمت کو مبارک باد دی۔ اور چھوارے تقسیم ہوئے پانچ روپے نقد نابینا کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اور نجیب خاں اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے گیا۔ بنگلہ کے اندر فرش فروش لیمپ جھاڑ فانوس سے رونق پھیل رہی تھی۔ باہر خدا کی صنعت کا نقرئی چاند تمام کائنات کو نور کی چاندنی میں لپیٹ رہا تھا۔ نیز بیخ بستہ اور ترزمین کی شادابی سے سردی معراج کمال کو پہنچ رہی تھی تین منٹ کے اندر کوٹھی میں سناٹا چھا گیا۔ اور لائبریری کے اندر امیر جان اور فرحت علی خاں رہ گئے تھے۔ امیر جان نے باہمتگی فرحت علی خاں کے کان میں کہا اب تم نوکروں کو چھٹی دے کر آرام کرو۔ علی الصباح ملاقات ہوگی۔ فرحت علی خاں نے دھڑکتے دل سے امیر جان کو گول کمرہ میں پہنچا دیا۔ جہاں اس کے لئے آرام دہ چارپائی اور گرم گرم لحاف موجود تھا۔ ایک کرسی پر گل جان کے ریشمی کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ امیر جان نے مسکرا کر فرحت علی خاں کیطرف دیکھا۔ اور گل جان کے کپڑے ہاتھ میں دیکر کہا "سپردم تو مایہ خویش را" تو والی حساب کم و بیش را" فرحت علی خاں گل جان کے کپڑے لئے ہوئے لائبریری میں آیا۔ اور سب دروازوں کی چٹخنیوں استراحت خانہ میں داخل ہوا۔ خوبصورت گل جان اپنی سنہری پر شال اوڑھے بیٹھی تھی۔ شال کے نیچے اس کا انگریزی لباس دیا ہوا تھا۔ گل جان کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔ اور وہ بے پرواہی سے دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی فرحت علی خاں نے جس وقت استراحت خانے کی چٹخنی لگائی۔ گل جان کا دل لرز گیا۔ اور ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے۔ فرحت علی خاں مسکراتا مسہری کے پاس پہنچا اور گل جان کے شرمیلے خوبصورت مکھڑے کو شیطان کی طرح دیکھ کر بولا میری لاڈلی بیٹی دنیا کی دولت تم آخر کار اب میری ہوگئی۔ گل جان کے سینہ میں ایک ضرب

لگی۔ اور وہ شال کے اندر کانپنے لگی

فرحت علی خاں نے بڑی محبت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔ پھر آہستگی سے اس کے شاداب ہونٹوں کو بوسہ دیا۔ گل جان اس وقت بت کی طرح خاموش ساکت بیٹھی تھی۔ پھر فرحت علی خاں نے اٹھ کر اپنے کپڑے تبدیل کئے۔ اور اس کے جسم پر صرف فلالین کی قمیض اور سفید پائجامہ رہ گیا۔ اس کے بعد وہ الماری کیطرف جھپٹا۔ اور ایک بڑا گلاس شراب سے بھر کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ دوسرے لمحہ میں وہ خبیث بہوت کی طرح گل جان کی مسہری پر آیا۔ اور اس کے جسم سے انگریزی لباس اتارنے لگا۔ گل جان لکڑی کیطرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی لیکن جب اسے اپنی برہنگی کا خیال آیا۔ تو اس نے اپنا بدن شال سے ڈھک لیا۔ اور فرحت علیخاں کے ہاتھ سے ہندوستانی کپڑے لے کر پہن لئے ایک دو منٹ کے اندر فرحت علی خاں نے اسے بڑی بے تابی سے اپنے سینہ پر چپٹا لیا۔ اور اس کے رخ تاباں کو چومنے لگا۔ اس کے بعد فرحت علی خاں نے فرط شوق سے اس کے سارے بدن کو گدگدا ڈالا۔ اور اس کے لبوں پر ایسی صفائی سے بوسہ دیا۔ کہ اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ تمہارے منہ میں شراب کی بو آرہی ہے۔ میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔ جاؤ پان کھا کر آؤ۔ یا مجھے پاندان دو۔ فرحت علی خاں مست ہاتھی کی طرح مسہری سے اچھل کر الماری پر پہنچا۔ اور شراب کی بوتل ہاتھ میں لے کر غٹ غٹ سب پی گیا۔ بعد ازاں اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پاندان اٹھایا اور گل جان کے ہاتھوں میں دے کر بولا "جلدی پان دو۔ میں نہایت بے تاب ہوں نیند نیند چکر آرہے ہیں" گل جان نے ایک پورے پان پر پاندان کا سارا کتھا اور چونا لت پت کر دیا۔ اور فرحت علیخاں کے منہ میں دیدیا۔ پھر فرحت علی خاں بہوت کی طرح اس کے سینہ پر سوار ہونے لگا۔ گل جان نے اسے سخت ہاتھوں سے اتار کر ڈھٹکنے دل سے کہا "ٹھہرو ٹھہرو۔ میں ابھی بچی ہوں۔ ان باتوں کو نہیں جانتی۔ اماں سے پوچھ لوں" اور فرحت علی خاں کے دماغ میں اس وقت شراب نشہ گری گرفت کر چکا تھا اور اسے دین و دنیا کی خبر بھی نہ تھی۔ اس نے خوفناک بہوت کی طرح گل جان کے خساب کو چاٹنا

شروع کیا۔ اور گل جان نیز فرحت علی خاں پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ اسی عرصہ میں فرحت علی خاں کو اپنے معدہ میں کوئی چیز چاقو کی طرح کاٹتی ہوئی معلوم دی۔ اور اسے ایسی کمزوری محسوس ہوئی۔ جیسے کسی کو گہرے مہل کے بعد ہونے لگتی ہے۔ اس کا تمام بدن ڈھیلا ہو گیا۔ اور وہ ایک منٹ کے لئے سو سال کا بوڑھا بن گیا۔ اس وقت اس کا نشہ بالکل ہرن ہو گیا۔ اور اس نے نیم مردہ مریض کی طرح کہا "مجھے کیا ہو گیا۔ دست آرہا ہے۔ میرے پیٹ میں ایسا درد ہے۔ کہ آج تک نہیں ہوا" وہ مہری سے اٹھنا چاہتا تھا۔ کہ رفع حاجت کرے۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں اُٹھنے سے عاری ہو گئے تھے۔ ایک لمحہ کے اندر اس کا تمام چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس لحظہ میں گل جان کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ ایک گہرے دست سے تمام مہری تر ہو گئی۔ وہ اپنے کپڑے بچا کر مہری سے کود پڑی۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مہری کپڑے ہوئے اپنے انگریزی کوٹ کی جیب سے اس نے پرزہ کاغذ کا نکالا جو اس نے ابھی ایک گھنٹہ گذرا۔ فرحت علی خاں کیواسطے لکھا تھا۔ اس وقت گل جان کے جسم میں ایسی کانپنی چھوٹ رہی تھی۔ کہ وہ سنبھلے بھی نہ سنبھل سکی۔ اس نے اس رقعہ کو فرحت علی خاں کے سرہانے رکھ دیا۔ اور تھراتی ہوئی آواز میں بولی "مجھے تمہاری مصیبت پر بڑا صدمہ ہے لیکن تم نے میری مصیبت میں کوئی ہمدردی نہیں کی تھی میں خدا جانتا ہے میں نے جو کچھ کیا محض اپنی عفت کے بچاؤ کیواسطے کیا۔ میری پاکدامنی تمہارے لئے نہ تھی۔ بلکہ میں عرصہ سے بلند اختر کو اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہوں۔ خدا میری مدد کرے۔ تمہارا خدا حافظ" یہ کہکر اس نے بدن پر شال اوڑھ لی۔ بعد ازاں وہ اندھے بہرے آدمیوں کی طرح لائبریری میں داخل ہوئی۔ اسے اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اس کے پیچھے سینکڑوں بھوت مشعلیں لئے ہوئے بھاگو۔ دوڑو۔ گھیرلو" چلاتے آرہے ہیں۔ اس نے بڑے زور سے لائبریری کی دوسری چٹخنی کھولی۔ اور بھاگی بھاگی چیخ مار کر ماں کے سینہ پر گری۔ اس کی ماں نے دھڑکتے دل سے گھبرا کر پوچھا "کیوں۔ کیوں۔ گل جان نے رو کر جواب دیا" وہ مر گیا ماں جان خونخوار شیرنی کی طرح بستر سے اٹھی۔ اور جوتا پہن کر بولی "آ میری لاڈلی نکل" بھاگ۔ بھاگ"

اور ایک منٹ میں امیر جان اپنے سرہانے سے گلجان کی سنہری چمپا کلی اور جھومر اٹھا کر گول کمرہ کے دروازہ پر آئی۔ جو اس نے ابھی کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اور گلجان کی کمر میں مضبوطی سے ہاتھ ڈالے سیدھی مشرق کی طرف بھاگی۔ ان دونوں عورتوں کے سامنے بڑی صاف شفاف روشنی تھی۔ لیکن ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ انہیں دو سو گز جانے پر پختہ سڑک ملی۔ جہاں ایک یکہ بھاگا جا رہا تھا۔ امیر جان نے زور سے کہا "اے یکہ والے" یکہ والے نے ان دونوں عورتوں کو یکہ و حریدہ دیکھ کر تعجب کیا۔ اور گھبرا کر پوچھا "کہاں جائیگی بیگم صاحب" امیر جان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ریل۔ ریل" سہارنپور کو۔ . . . . گاڑی کس وقت جاتی ہے؟ یکہ والے نے دونوں عورتوں کو یکہ میں سوار کر کے کہا۔ سہارنپور کی گاڑی ٹھیک دس بجے چھوٹ جاتی ہے۔ تمہیں مل جاوے گی" یکہ نے ذرا حرکت کی تھی۔ کہ امیر جان کو سڑک پر نجیب خاں بنگلہ کی طرف مڑتا ہوا نظر آیا۔ امیر جان نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ اور نجیب خاں کو معلوم نہ ہو سکا۔ کہ یہ کون عورتیں تھیں۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ دونوں مالب نصیباں امیر جان اور گلجان تھیں۔ مگر وہ بہت دیر تذبذب میں رہنے والا نہ تھا اپنے گول کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ اور سیدھا اندر آیا۔ یہاں اسے امیر جان کا کمرہ خالی نظر آیا اسے یکہ والی عورتوں کی شالوں سے شبہ ہوا تھا۔ کہ شاید یہ امیر جان اور گل جان تھیں اور وہ بھاگا ہوا دربار علی کے پاس باورچی خانہ میں پہنچا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "لو یہ مٹھائی سرکار کے پاس پہنچا دو بیگم دلہن کی ماں کہاں گئی" دونوں نوکر گول کمرہ میں آئے پھر انہوں نے لائبریری کے کیواڑ کھٹ کھٹائے لیکن کیواڑ سب کھلے ہوئے تھے۔ دونوں نوکر گھبرائے ہوئے استراحت خانہ پہنچے۔ اور سرکار سرکار چلانے لگے۔ تمام کمروں کے دروازے کشادہ اور امیر جان ندارد۔ نوکروں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے زور سے چلا کر کہا "سرکار آپ کہاں ہیں مٹھائی لیجیے۔ اس کلمہ کے جواب میں ایک لمبی آہ سنائی دی۔ وہ گھبرا کر استراحت خانہ میں گھس گئے۔ اور ایک مسہری پر فرحت علی خاں بیہوش اور سکڑا پاکر ان کے ہوش خطا ہونے لگے۔ دونوں نوکروں کے منہ سے ایک دم یہ آواز نکلی یہ کیا ہوا۔ ڈاکٹر ڈاکٹر۔ پھر دربار علی نے آہستہ سے کہا۔ ڈاکٹر تو لاؤ گے

مگر گل جان اور امیر جان کا نام مت لینا۔ ابھی انسپکٹر صاحب اس کوٹھی پر آئے تھے۔ اور بنگلہ کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ میں نے یہ کہکر بڑی مشکل سے رخصت کیا۔ کہ سرکار کی بہن اور بہو بھی ابھی آئی ہیں۔ بہن کچھ بیمار ہیں۔ کل دن تشریف لائیے۔" نجیب خاں نے منہ پھاڑ کر کہا۔ یہ تو بڑے اندھیر کی بات ہے۔ سرکار کو تو ان دونوں نے زہر دیدیا۔ اب تم ڈاکٹر سے کیا کہو گے۔" دربار علی نے جھلا کر جواب دیا۔ بک بک کر رہا ہے۔ ڈاکٹر سے کیا ڈرنا ہے۔ پولیس کا ڈر ہے ابھی سب لوگوں کی مشکیں کسی جلدیں گی۔ تم ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو لے آؤ۔ وہ سرکار کا بڑا دوست ہے۔ سرکار خود سمجھ لیں گے۔ دربار علی نے فرحت علیخاں کو آہستہ سے اُٹھا کر دوسری مسہری پر لٹا دیا۔ اور جب اس مسہری کا بستر اٹھانے لگا۔ تو تکیہ کے نیچے اسے گل جان کا رقعہ ملا۔ دربار علی کچھ شدبُد اردو زبان میں رکھتا تھا۔ اس نے خوف زدہ نگاہ سے اس رقعہ کو پڑھ کر جیب میں ڈال لیا اور خشک چہرہ بنا کر دل سے کہنے لگا۔ واقعی گل جان سچ کہتی ہے۔ ہمارے لئے خاموشی کیسے ضرورت ہے مجھے سرکار کا حکم سر آنکھوں پر تھا۔ مگر یہ ایک بڑی پیاری تھی زہر اس کی مانے دیا ہوگا۔"

پھر اس نے فرحت علی خاں کے بدن پر لحاف ڈال کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو بالکل بے رونق اور نا آشنا ہو گئی تھیں۔ دربار علی نے بھاگ کر ایک دوسری بوتل شراب کی کھولی۔ اور نصف سے زیادہ فرحت علی خاں کے پیٹ میں پہنچا دی۔ شراب کے اثر سے فرحت علی خاں کے ٹھنڈے جسم میں دیکایک گرمی پیدا ہوئی۔ اور دربار علی نے نبض دیکھ کر کہا۔ الحمد للہ ابھی سرکار زندہ ہیں۔"

تینتالیسواں باب

دفینہ کے متعلق دوسرا دقیق مسئلہ

جس معرکہ آرا شب میں گل جان کو اپنی عصمت بچا لینے میں اس قدر کامیابی ہوئی

وہ شب فرحت علی خاں کی امیدوار آرزوؤں کا خاتمہ کر دینے والی ثابت ہوئی ملاء الملک جان کے لالے پڑ گئے لیکن تیسرا آدمی جس کو دراصل ان معاملات سے کوئی واسطہ نہ تھا اپنے دل کی تہ میں سب معاملات کو ٹٹول ٹٹول کر اصلی واقعات کی بنیاد پر پہنچ چکا تھا۔ یہ شخص کامران اس وقت امداد علی فرضی نام سے دلاور علی کے یہاں مستعار ہو کر شکیلہ بیگم کٹن کے نانکی گمشدگی دولت کے تہہ پر کچھ اپنی ہوشیاری سے کچھ محض اتفاق سے پہونچ گیا تھا۔ اور اسے یہ شب خوفناک مشتبہ نوجوان کی جہت سے نتیجے کا کھٹکا پڑ گئی۔ یہ بات کس قدر عجیب و غریب تھی۔ کہ ایک جاسوس اور ایک فراق اور وچا چاہیوں پر اس قدر قریب قریب لیٹے ہوئے تھے۔ کہ ان کے دلوں کی دھڑکن لوری کے سانس ایک دوسرے کو اچھی طرح سنائی دے سکتے تھے لیکن دراصل رازدان حقیقی دونوں کو اپنی باتوں میں دست اندازی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ دل کی بات کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ نہ کامران کو بطریقہ احسن علوم تھا۔ کہ دلاور علی کے دل میں کیا کیا خیالات ہیں اور نہ دلاور علی کو کامران کے ارادوں اور واقفیت کا ذرہ بھر علم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کو دوسرے بنی نوع انسان کے دلی حالات معلوم ہو جائیں۔ تو دنیا کے کاروبار خوشی کامیابی یا ناکامیابی کے افسانے بن جاویں۔

کامران نے یہ رات بڑی بے چینی سے گذاری۔ اور علی الصباح پانچ بجے اٹھ بیٹھا۔ اس کے بیدار ہو جانے سے دلاور علی بھی جاگ گیا۔ اور کامران نے کوئین لیمپ روشن کر کے کپڑے پہننے شروع کئے۔ صبح کو سات بجے سہانپور سے مظفر نگر کو گاڑی جاتی تھی۔ اور اسی کے ذریعہ دلاور علی نے مظفر نگر کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن کامران اس کے ساتھ مظفر نگر جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے شام گذشتہ کی تحقیقات اور آمدگی خطوط نقرہ متعلقہ دفینہ ہربرٹ ہربرٹسن سے طرح طرح کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ دلاور علی نے جلدی جلدی کامران کے لئے چائے تیار کرائی۔ اور چھ بجے قریب ریل پر جانے کے واسطے تیار ہونے لگا۔ کامران کا اسباب لاہی کرایہ کے مکان ہی میں تھا۔ وہ دلاور علی سے مختلف واقعات پر باتیں کرتا ہوا جامع مسجد تک آیا۔ جہاں ان دونوں کو گنجان کا بوڑھا

باورچی مل گیا جس نے بڑے جوش اور اشتیاق کے لہجہ میں بتلایا "رات ماں بیٹیاں بخیریت واپس آگئیں"

دونوں سننے والوں کے دل دھڑکنے لگے۔ اور انھوں نے یک زبان ہوکر پوچھا واپس آگئیں؟ الحمد للہ مگر کب کب؟

باورچی نے وقت اور مختصر حالات سنائے اور یہ دونوں پہلے پہلے گل جان کی حویلی پر پہنچے۔ جہاں پولیس کا پہرا بدستور لگا ہوا تھا۔ باورچی کی تشخیص سے ان دونوں کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ اور باورچی نے ان کی اطلاع اندر دی۔ امیر جان نے دونوں آدمیوں کو اندر بلا لیا لیکن سردی کمرہ میں کہٹی کہٹی ملاقات کرکے بولی "میں اس وقت نہایت پریشان ہوں۔ گل جان سخت بیمار ہوگئی ہے میں سوائے اس کے اور کچھ عرض نہیں کرسکتی۔ کہ خدا نے میری بچی کی عصمت قایم رکھی۔ اور ہم دونوں اسرائیل خاں کی قید سے آزاد ہوکر گھر آئیں۔ آپ پھر ملاقات کیجئے گا۔ آپ دلاور علی صاحب سول سرجن کو بلا لیجئے میری لاڈلی گل جان کو رات سے سخت بخار ہے تمام رات کراہتی رہی"۔ کامران گل جان کی مصیبت پر اور بیماری پر متاسف ہوا۔ اور ہمدردی کے کلمات ادا کرکے رخصت ہونے لگا۔ دلاور علی ہپاگ کر باہر نکلا۔ اور ایک یکہ کرایہ کرکے صاحب سول سرجن کو بلانے اور بلند اختر کو تار دینے کے لئے روانہ ہوگیا۔ دلاور علی کے چلے جانے پر کامران اسی وقت ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ اور روڑکی کا ٹکٹ حاصل کیا۔ اس نے اودھ روہلکھنڈ لائن کی گاڑی میں قدم رکھا ہی تھا۔ کہ ریل چھوٹ گئی۔ وہ آٹھ بجے گاڑی اور پونے نو بجے آصف نگر پہنچا۔ شکیلہ میرنگٹن کے بنگلہ پر پہنچا۔ اس نے بنگلہ کی ہیئت بدلی ہوئی دیکھی بجائے سبز شاداب پھول اور پودوں کے جا بجا مٹی اینٹ اور پتھر کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ اور وہ فق شدہ چہرہ سے چپٹا ہوا کچہ شرک پر پڑا تھا۔ اور شرقی برآمدہ کی طرف پھر پھر کر دیکھتا تھا۔ کامران کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے ہدایت دکھائی وہ چند منٹ میں کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اور جس وقت سے کامران نے ہدایت علی کو نہیں دیکھا تھا کامران کو ہدایت علی کی کارگذاری اور ٹھیکہ داری پر ہنسی آگئی اور وہ چپٹا چپٹا ہدایت علی کے پاس پہنچا جس نے اچھنکا کامران سے مصافحہ کیا۔ اور فق شدہ چہرہ

سے باآہستگی کہنے لگا۔ کیا آپ اب کلوسیگ نہیں گے؟ کامران نے آہستگی سے جواب دیا "اب ضرورت نہیں۔ برطانی بہادری کا میابی ہوئی کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں اب کامران بنکر آیا ہوں۔ مگر تم نے تو بڑی مستعدی سے کام کرایا۔ اور ملوہ کی گورنمنٹ نے کیا قیمت تجویز کی۔ پھر آہستہ سے یہ شعر پڑھنے لگا:

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

ہدایت علی نے مٹیں صورت بناکر جواب دیا۔ اس مقام پر راجہ جنگل میں کاگرائی محل یا شکارگاہ برآمد ہوئی۔ یہاں سے دو تین کے میل کے فاصلہ پر قصبہ منگلور اس راجہ کا دارالسلطنت تھا۔ سنا ہے وہاں بھی بہت سے کمنڈرات کسی وقت نکلے تھے۔ لکھنو سے صاحب انجنیر بہادر محکمہ آرچی لاجی تشریف لائے تھے۔

یہ سننے میں آیا ہے۔ کہ گورنمنٹ اس بنگلہ کو معہ اس ملبے کے خریدنا چاہتی ہے۔ تاکہ اس مسالہ سے از سر نو ایک محل بنایا جاوے۔ لیکن مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ سب اوورسیر محکمہ سڑک نے اس ملبے کا تخمینہ دس ہزار روپیہ لگایا ہے"

کامران نے غور سے ہدایت علی کی صورت دیکھی اور ہنسکر کہا۔ دس ہزار روپیہ یہ حویلی کسی وقت ایک لاکھ میں بنی ہوگی۔ شاید شکیلہ کو دس ہزار ملجاوے۔ لیکن اب اسے اس ملبہ کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ایک قسم کی مہارانی بن جاوگی۔ کیسے کیسے" ہدایت علی نے باآہستگی پوچھا۔ مگر کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ ابھی میں کسی کو نہیں بتلا سکتا۔ صبر کرو۔ تمہیں بڑا انعام ملیگا۔ پھر ہدایت علی سے رخصت ہوکر کامران شکیلہ کے کمرے میں آیا۔ اور کھڑکی میں عزیزن کو دیکھکر کہا" آہا تم مجھے پہچان گئیں اپی بیگم سے کہو کہ کامران لاہور سے آیا ہے۔ پانچ منٹ کے اندر کامران لائبریری میں طلب کیا گیا۔ وہاں کا سب سامان اس قرینہ اور ترتیب سے لگا ہوا تھا جیسا کہ دس بارہ روز پہلے چھوڑ گیا تھا۔

شکیلہ میز کلاتھ کے پردہ کے اندر سے ہاتھ پھیلا کر کامران سے مصافحہ کیا۔ اور رسمی سے کہنے لگی "کہئے آپ کب تشریف لائے۔ پھر عزیزن کو دیکھا۔ وہ

آپ کے لئے جلدی چائے تیار کر کے لاؤ۔ اور کھانے کا بندوبست کرو۔ عزیزان کے چلے جانے پر کامران نے کہا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ کہئے مزاج تو اچھا ہے۔ کوئی بات نئی تو نہیں؟" شکیلہ نے لانبا سانس بھر کر جواب دیا "نئی بات یہ ہے۔ کہ دقیقہ کی تلاش میں میرا سارا باغیچہ اجڑ گیا۔ چاروں طرف اینٹ اور پتھر نظر آرہے ہیں۔ کل سے محنت کر کے بخار آگیا ہے ڈاکٹر نے نمونیا بتلایا ہے؟ محنت کے ذکر سے کامران کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اور اس نے گھبرا کر کہا۔ نمونیا۔ تو آپ خوب علاج کریں۔ وہ تو آپ کی بڑی گہری رفیق ہے کہئے توشہ خانہ میں کوئی عضو تو شامل نہیں ہوا؟" شکیلہ نے برقعہ کے اندر سے مسکرا کر جواب دیا "واقعی محنت میری بڑی پرانی رفیقہ ہے۔ میں نے آپ کے چلے جانے پر اگلے دن توشہ خانہ میں تمہاری سب چیزیں اچھی حالت میں تھیں آپ نے جو محنت کو توشہ خانہ کے دروازہ پر دیکھا تھا۔ اس کی بابت خود مجھے علم ہو گیا۔ توشہ خانہ میں ایک پاٹ غلاظت سے بھرا ہوا نکلا۔ محنت کو کئی روز سے دست آرہے ہیں۔ اور چونکہ بیت الخلا دور ہے۔ وہ سردی کے مارے شب میں دور نہیں جا سکتی۔ اور میں نے اس کا عذر تسلیم کر لیا۔" کامران نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا "بیشک آپ کو محنت جیسی وفادار اور نیک مزاج عورت کی صحبت پر فخر کرنے کا موقعہ ہے خدا اسے تندرست رکھے اور میں اسے آپ کے پاس عرصہ دراز تک دیکھوں۔ واقعی میں نے بڑی بھاری غلطی کی کہ توشہ خانہ پر محنت کو دیکھ کر چور یا چوری کا شبہ کیا۔ میں معافی مانگتا ہوں۔

پھر شکیلہ نے بات بنا کر پوچھا۔ تو آپ کہاں سے آرہے ہیں کہئے کسی بات کا پتہ لگا ہے؟"

کامران نے ادھر ادھر دیکھ کر تبسم سے جواب دیا۔ پتہ تو لگا ہے لیکن کچھ مشتبہ سا ہے۔ اور پیشتر ازیں کہ میں آپ کو کوئی بات سناؤں۔ میں آپ سے حلف لینا چاہتا ہوں کہ آپ پندرہ بیس روز کسی سے ذکر نہ کریں گی۔"

شکیلہ کا دل اضطراب اور اشتیاق سے دھڑکنے لگا۔ اور اس نے اپنے ہاتھ کو بمشکل [illegible] آپ سے ڈرا کر حاضر و ناظر سمجھ کر کہتی ہوں۔ آپ

کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔ کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ اسوقت تو عزیزان آنے والی ہے آپ اس عورت کو ایک گھنٹہ کے لیے چمپت کر دیں۔ تو موتی ملے

کامران نے یہ الفاظ ختم ہی کئے تھے۔ کہ گول کمرہ کے اندر سے مردوں کی آواز آئی اور اس نے گھبرا کر شکیلہ سے کہا۔ وہ آگئی۔ پھر انگلی سے گول کمرہ کی طرف اشارہ کیا اس لمحہ میں عزیزان نے چاء کی موجودگی کا اعلان کیا۔ یہ دونوں گول کمرہ میں آگئے اور شکیلہ نے پر تبسم آنکھوں سے عزیزان کو دیکھ کر کہا "عزیزان تیرے بھیجنے کے بارہ میں ایک شخص نے کچھ کہلا بھیجا ہے۔ اجازت ہے تو میں ان سے بات چیت کروں۔ پھر تجھے سنا دوں گی عزیزان رشتہ کے نام سے سہم گئی۔ اور دل پر رضائی اپنی طرح کھینچ کر شکیلہ کے استراحت خانہ میں گھس گئی۔ اس کے چلے جانے پر کامران نے سب دروازوں پر پردے کھینچ دیئے اور چاء ختم کر کے شکیلہ کے قریب آبیٹھا۔ اس وقت شکیلہ کا دل بڑے اشتیاق سے بے چین ہو رہا تھا۔ اور وہ اس شخص کی ملاقات کو اپنی قسمت کی تبدیلی سمجھ رہی تھی اور دراصل بات بھی یہی تھی۔ کامران نے مسکرا کر ہانگی کہا میں شکیلہ بیگم تمہارے نانا کی دولت کسی انگریز نے چرائی ہے۔ لیکن وہ تمہارے قبضہ میں آجاویگی۔ دیکھو ایک دم چلا نا مت۔ تم پندرہ لاکھ روپیہ کی مالک بننے والی ہو یہ کلمہ ابھی پورے طور سے ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ شکیلہ کا دل گردن میں آلگا۔ اور وہ زور سے چلا کر بولی۔ پندرہ لاکھ روپیہ مقدس باپ میں اتنی بڑی دولت کیا کرونگی"

کامران نے اسے ہاتھ سے روکا اور ہانگی بولا "آپ تو اس قدر زور سے بولتی ہیں۔ کہ ضرور کوئی سن لیگا۔ آپ کو معلوم نہیں۔ دیوار ہم گوش دارد۔ سنئے تو سہی۔ اس انگریز کے پاس یہ دو ٹکڑے چاندی کے برآمد ہوئے ہیں" یہ کہکر اس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک لفافہ نکالا جس کے اندر وہ دونوں قطعات نقرہ تھے۔ اور اسے چپ سے نکال کر شکیلہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ ٹکڑے شکیلہ کے ہاتھ میں پڑتے ہی اور اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اور وہ گر گئے۔ اور اس نے گھبرا کر کہا یہ کیا شے ہے میرا تو دل بیٹھ گیا۔ کامران نے دونوں ٹکڑوں کو فرش سے اٹھا کر شکیلہ کے ہاتھ میں دیا اور ہنس کر کہنے لگا

"ذرا دست یہ ٹکڑے اور شلث تمہارے قابل باپ کی ذہانت کے نمونے ہیں۔ لو دیکھو"

پھر کامران نے دونوں ٹکڑے اچھی طرح شکیلہ کو دکھلائے۔ جس کا سارا بدن تھرانے لگا۔ اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "بے شک بے شک" یہ ٹکڑے میرے والد کے بنائے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔ کامران نے نہایت بے چینی کی آواز میں پوچھا۔ کیوں کس طرح کیا آپ کو ان ٹکڑوں کا علم تھا؟"

شکیلہ نے آہستہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں جواب دیا "نہیں مجھے علم نہیں تھا لیکن میرے بازو پر اس قسم کا مثلث بنا ہوا ہے"

شکیلہ کے بازو پر مثلث کے ذکر سے کامران کا دل دھڑکنے لگا اور وہ اس نوجوان لڑکی کو کسی پری یا جن کی بیٹی سمجھکر دل سے کہنے لگا۔

"ایں کہ بے بینم بیداری است یارب یا بخواب"

پھر اس نے فق شدہ چہرہ سے پوچھا "آپ کے بازو پر مثلث میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آپ مجھے دکھلا سکتے ہیں"؟

شکیلہ دھڑکتے دل سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور برقعہ کے اندر سے بایاں ہاتھ نکال کر بولی "میں اس وقت یہ سوئٹر پہن رہی ہوں اسے اتار دوں تو آپ دیکھ سکیں گے" شکیلہ کو اس شخص کے آگے اپنی گردن اور بازو برہنہ کرتے ہوئے شرم آئی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ ایک منٹ کی اجازت مانگ کر لائبریری میں آئی۔ اور دھڑکتے اور بے چین دل سے سوئٹر اتارنے لگی۔ سوئٹر کے نیچے اس کے نصف برہنہ بازو اور سفید گردن بڑی دلفریبی سے چمکنے لگی۔ اور اس کی اعلیٰ صدری اس کے خوبصورت گوشت بھرے ہوئے سینے سے چپٹی ہوئی معلوم دی۔ پھر وہ برقعہ پہن کر باہر نکلی۔ اور اپنا برہنہ بازو کامران کے سامنے کر دیا۔ شکیلہ کے گلابی گوشت بھرے بازو سے کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور ان خوبصورت انگلیوں اور دلکش زمین نیچہ کی تکمیل میں اگر کچھ کمی تھی۔ تو وہ نوجوان حسینہ کے گداز بازو نے پوری کر دی

وہ پراشتیاق نگاہ سے اس کے بازو پر جھکا اور جو تحریر و نقش اس نے شکیلہ کے جسم پر دیکھا۔ اس سے اس کا دل اچھلنے لگا بازو پر شکل نیلی رنگت میں گودی ہوئی تھی اور شدت کے اندر ایک چھوٹی سی آنکھ دکھائی دیتی تھی۔ کامران نے بے چین آواز میں آہستہ سے کہا "معزز بیگم آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ واقعی آپ کا معزز اور روشن ضمیر باپ اس خزانہ کو سینکڑوں قفل اور کنجیوں کے نیچے مقفل کر گیا ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور غالباً آپ بہت جلد اس دولت پر قابض ہو سکیں گی۔"

شکیلہ اپنے بازو کو چھپا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور دھڑکتے دل سے پوچھنے لگی "مفصل بتلایئے۔ خزانہ کہاں ہے؟"

کامران نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں کیا عرض کروں۔ خود میری عقل کام نہیں کرتی۔ آپ براہ کرم خود بتلایئے۔ کہ یہ نشان آپکے بازو پر کب سے ہے اور آپ کے والد صاحب نے آپ سے اس کے بارہ میں کبھی کوئی ذکر تذکرہ کیا تھا۔ یا نہیں۔ میں اس معاملہ کو اس قدر دقیق نہیں سمجھتا تھا جتنا کہ یہ اب ہوتا جا رہا ہے۔"

شکیلہ نے لمبا سانس بھر کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا "یہ نشان میرے بازو پر اس وقت سے ہے۔ کہ میں چار یا پانچ سال کی تھی۔ مجھے یاد نہیں۔ کہ والد صاحب نے اس کے بارہ میں مجھے کوئی خاص ہدایت کی ہو۔ البتہ مجھے ایام طفولیت کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میں شاید پانچ چھ سال کی تھی مجھے یاد نہیں۔ کہ والد صاحب ایک روز لائبریری کی چھت میں ایک لوہا سے کچھ لگوا رہے تھے جو بھاگی بھاگی لائبریری میں پہنچی اور والد سے کہا "بابا یہ کیا چیز ہے" اور میں نے ایک مکڑہ چاندی کی طرف اشارہ کیا جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے اس پر ایک آنکھ بنی ہوئی تھی ابا نے ہنسکر میری طرف دیکھا۔ اور میرا منہ چوم کر کہا "یہ ایک تعویذ ہے اس کمرہ کی چھت میں لگایا جاویگا جس سے مجھے کبھی نظر بد نہ لگے۔ پھر میرا بازو ننگا کر کے بولے "یہ تعویذ تیرے بازو پر بھی ہے" میں چاندی کی آنکھ دیکھکر کچھ ڈر گئی تھی۔ ابا نے مجھے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ پھر میرے ہی دیکھتے دیکھتے لوہار نے اس آنکھ کو چھت کے ٹی آئرن (لوہے

کی کڑی میں ٹانک دیا۔ میں نے اس آنکھ کو ہزار ہا دفعہ دیکھا ہے اور اسے سلمانوں کا کوئی تعویذ سمجھکر تقدس کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہوں۔"

شکیلہ کے اس بیان پر کامران کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور اس نے حیرت زدہ آنکھوں سے شکیلہ کی طرف دیکھکر پوچھا۔ کیا آپ اس آنکھ کو بھے دکھلا سکتی ہیں؟"

شکیلہ اٹھکر کامران کی طرف بڑھی۔ کامران اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لاشعوری کے عین وسط میں ایک سیاہی آئرن کے اوپر واقعی ایک نقرئی آنکھ چمک رہی تھی۔ جس کی طرف شکیلہ نے انگلی اٹھاکر کہا۔ اس آنکھ کو میں ہزار ہا بار دیکھ چکی ہوں۔" کامران نے ٹھٹھرتے دل سے جواب دیا۔ واقعی اس چھت میں اس آنکھ کی موجودگی اس معاملہ پر گہری روشنی ڈال رہی ہے اور آپکے بازو پر اسی طرح کی آنکھ کا ہونا اس امر کی دلالت ہے کہ اگر بازو کے مثلث کو دفینہ سے کچھ تعلق ہے۔ تو آنکھ اس کی نگہبان ہے۔ بازو اور چھت کی آنکھیں دونوں ایک ہی مطلب کے لئے ہیں۔"

نقرئی آنکھ کے تعویذ کی جگہ یہ آنکھیں آپ کے خزانہ کی محافظ ہیں۔ آپ ان باتوں کو کسی پر ظاہر نہ کریں۔ میں آج اس معاملہ پر غور کرکے کل آپ سے مفصل عرض کرونگا اس وقت مجھے مسٹر رفیق احمد سے ملاقات کرنی ہے۔ اب مسٹر رفیق احمد کیسے ہیں؟"

شکیلہ نے مضطرب آواز میں جواب دیا۔ مسٹر رفیق احمد اب اچھے ہیں۔ زخم کی تکلیف سے آٹھ سات روز بخار کی شدت رہی تھی۔ لیکن آپ قیام کہاں فرمائینگے اور خورد و نوش کا کیا بندوبست رہیگا۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ اب مرزا کلو بیگ کے بھیس میں نہیں آئے؟"

کامران مسکرا کر بولا۔ اب کلو بیگ کی ضرورت نہیں۔ احاطہ کی کہدائی قریب الاختتام ہے۔ میں آپ کے دوست مسٹر رفیق احمد کے یہاں قیام کرونگا۔ شکیلہ نے فی الفور جواب دیا۔ نہیں آپ یہاں ٹھہریئے۔ مجھے اس دفینہ کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ جلدی عورت کے بتلادیں۔ دفینہ کہاں ہے۔ یا اب بالکل گم ہو گیا

کامران نے کئی بار چہتے کی طرف دیکھا۔ پھر مضطرب آواز میں بولا "اچھا میں مسٹر رفیق احمد سے ملاقات کر کے آج ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب اجازت دیجئے" شکیلہ نے لمبا سانس بھر کر کہا۔ اس وقت کھانا تیار ہے۔ آپ میری گاڑی پر بنگلہ جا سکتے ہیں۔ پھر فوراً واپس آجائیے گا"

کامران نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور شکیلہ سے چند باتیں سرگوشی کے طور پر کہکر باہر نکل آیا۔ شکیلہ نے اپنے استراحت خانہ میں آکر عزیزن کو آواز دی۔ جو رخصت کی تیاری میں مصروف تھی۔ اور پانچ منٹ کے اندر کامران اسی کمرہ میں بجانب شرق ٹھہرایا گیا۔ جہاں وہ پہلے مقیم ہوا تھا۔

چوالیسواں باب

نوکری کی آواز

اس روز ایک بجے کے قریب کامران نے رفیق احمد سے ملاقات کی جس نے اسے اپنے مکلف گول کمرہ میں طلب کیا۔ اور اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ رفیق احمد اس وقت ٹرکی ٹوپی اور انگریزی لباس پہنے ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور بظاہر باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب کامران اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو رفیق احمد نے سگار کو چھپا کر کہا "کہئے آپ اس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟" کامران نے پر تفکر چہرہ سے رفیق احمد کو دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظر ڈال کر بولا "مجھے آپ کے وصیت نامہ کے متعلق ابھی کوئی چیز نہیں ملی۔ میں اس وقت سہارنپور سے آرہا ہوں۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ ملک اختر اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہے"

ملک اختر کی بے گناہی پر رفیق احمد نے مسرت ظاہر کی۔ لیکن اس لحظہ میں میٹھا ہی ہو۔ ڈالی کر بولا "لیکن میرے بھائی میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ وصیت نامہ اور

میرا خط لیں نے چرایا۔ بہرحال میں بے حد خوش ہوا کہ بلند اختر بے قصور ہے۔ کیا آپ مجھ سے مل کر سب باتیں معلوم کریں؟ کامران نے سنجیدہ صورت بنا کر جواب دیا۔ جی ہاں میں سہارنپور میں امداد علی کے نام سے مقیم رہا۔ اور آپ کے بھائی بلند اختر اور اس کی معشوقہ گل جان سے واقف ہوں۔ لیکن آپ ابھی ایک ماہ تک بلند اختر یا کسی اور شخص سے اس بات کا ذکر نہ کیجئے۔ کہ کامران اور امداد علی میرا ہی نام ہے ورنہ معاملہ بگڑ جائیگا۔ وصیت نامہ جس شخص کے پاس ہے۔ میں اس سے بھی واقف ہوں۔ مگر بدوست کچھ نہیں بتلا سکتا۔ آپ کو ایک ماہ صبر کرنا پڑیگا"

رفیق احمد کے چہرہ پر پسینہ پیدا ہوئی۔ اور وہ کامران کی طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن آپ میری حیرت کو خود بڑھا بڑھا کر بے چین کر رہے ہیں۔ آخر بتلایئے کہ معاملہ کیا ہے؟"

کامران نے متانت سے جواب دیا۔ اس وقت آپ اور بلند اختر دونوں کے لئے یہی مفید ہے۔ کہ میں آپ کو کوئی بات نہ بتلاؤں۔ جس شخص نے وصیت نامہ چرایا ہے۔ میں اسی سے پولیس کے حوالے کرنے کے واسطے اس کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ آپ اس بات سے مطمئن رہیں۔ کہ بلند اختر کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ آپ کو فکر کرنے کی جگہ ہے۔ البتہ آپ ایک خاص آدمی اپنی حفاظت کے لئے مقرر کر لیں ایک نوجوان شکیلہ کا عاشق اور آپ کا دشمن ہے۔ اسی نے آپ پر حملہ کیا۔ اور وہی اب بھی آپ کی جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے"

رفیق احمد کے چہرہ پر بے رونقی چھا گئی۔ اور اس نے خوفزدہ آواز میں کہا یہ کون شخص ہے شکیلہ کا عاشق۔ کیا آپ اس کا نام نہیں بتلا سکتے؟

کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ آپ کو نام بتلا دوں۔ تو وہ ہاتھ سے نکل جائیگا آپ کے پاس روپیہ ہے۔ اور خدا نے آپ کو جوانی اور طاقت دے رکھی ہے انسان کے سینکڑوں دشمن ہوا کرتے ہیں۔ آپ اپنی محافظت کریں۔ میں ایک ماہ تک کچھ نہیں بتلا سکتا۔ اور انصاف بھی اسی بات کا مقتضی ہے۔ کہ اس شخص کی گرفتاری تک

آپ خاموشی کر کے صبر سے بیٹھے رہیں۔ آپ شکیلہ سے بلا تکلف ملتے رہیں لیکن کہیں اندھیری رات میں نہ چلیئے۔ اور جو باتیں میں نے آپ کو اس حملہ آور کی بابت سنائی ہیں۔ ان کا کسی سے ذکر نہ کیجیئے۔ آپ کے بہائی کی کیا خبر ہے۔ جو آپ کی دولت میں حصہ دار بننا چاہتا ہے"؟ رفیق احمد نے مضطرب آواز میں ابرو چڑھا کر جواب دیا۔ علی الدین ایک ہفتہ سے روڑکی میں مقیم ہے۔ مجھ سے کل بھی ملا تھا۔ اس کے پاس میرے والد صاحب کا ایک خط ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ میرے والد اس کی والدہ کو ماہوار میں بیس روپے بھیجا کرتے تھے۔ اس کا دعوے جائز ہے صرف یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اس کی والدہ نے میرے والد سے باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ اور سنئے یہ معاملہ ایک وکیل کے سپرد کر دیا ہے۔ اور میں نے ابھی اپنے وکیل سے مشورہ کیا تھا جس سے معلوم ہوا۔ کہ ابھی میرے والد کے ترکہ میں سے کسی کو ایک پیسہ نہیں مل سکتا حصہ دار یا دعویدار اشخاص کو صاحب مجسٹریٹ بہادر کے یہاں باضابطہ درخواست دیکر چھ ماہ انتظار کرنا پڑیگا۔

کامران نے اس گفتگو پر اطمینان ظاہر کر کے پوچھا "تو کیا آپ اسے نصف دولت دینے پر رضامند ہیں؟

رفیق احمد نے پریشان آنکھوں سے کامران کو دیکھا۔ اور کچھ سوچ کر بولا "اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ لیکن شاید آپ کو یاد ہو۔ کہ میں تو والد صاحب کی دولت سے دست کش ہو کر پہلے ہی ارادہ کر چکا ہوں۔ کہ اس رقم کو مدرسہ عربی دیوبند میں دیدوں۔ اور شکیلہ سے والد صاحب کی مرضی کے خلاف نکاح کر لوں"

کامران نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ پھر آپ کس طرح گذر کریں گے۔ کیا اپنی والدہ صاحبہ کے حصہ پر؟ رفیق احمد نے منہ بنا کر جواب دیا۔ جی نہیں جب میں والد صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ تو مجھے کیا حق ہے۔ کہ انکی کمائی ہوئی جائداد کا متولی بن کر بیٹھوں۔ دراصل اس سے زیادہ کیا نمک حرامی ہو سکتی ہے

انسان کو خود کچھ پیدا کرنا چاہیے۔ اب میں گورنمنٹ کی نوکری کرونگا اور جب تک کسی معقول آسامی پر مامور نہ ہو جاؤں، شکیلہ میز گلٹن سے شادی نہیں کر سکتا۔"

شکیلہ کے نام سے کامران کو دوسرا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ لیکن مجھے امید ہے۔ کہ شکیلہ میز گلٹن آپ کو نوکری نہ کرنے دیگی۔ اس کے نانا کا ترکہ بڑی کثیر رقم ثابت ہوگا۔ مجھے اس کا کچھ پتہ لگ گیا ہے۔"

رفیق احمد کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ اور اس نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا شکیلہ کے والد کا وفینہ مل گیا۔ کس قدر مجھے بالکل علم نہیں۔ میں کل ہی شکیلہ سے ملا تھا۔"

کامران نے مسکرا کر جواب دیا۔ جی ہاں خود شکیلہ کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ لیکن میرے پاس چند خطوط ہیں۔ جن سے قوی امید ہے۔ کہ تقریباً دس پندرہ لاکھ روپیہ شکیلہ کو عنقریب مل جاویگا۔

رفیق احمد کرسی سے اچھل پڑا۔ اور فرط شدہ آنکھوں سے کامران کو دیکھ کر بولا۔ دس پندرہ لاکھ تب تو وہ مجھے کب خاطر میں لاویگی۔ یہ تو آپ نے بے ڈھب سنائی۔"

کامران نے رفیق احمد کی طرف متانت سے دیکھ کر بولا۔ آپ گھبرائیں نہیں شکیلہ کو آپ کے برابر کسی سے محبت نہیں۔ جس طرح آپ نے اس کی خاطر اپنے والد کی دولت پر لات ماردی ہے۔ اسی طرح وہ آپ کے لئے اپنے نانا کی دولت نثار کر سکتی ہے۔ دولت آپ دونوں کے معاملات میں مزاحم نہ ہوگی۔ محبت کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ اب آپ کو کسی نوکری کی ضرورت نہیں شکیلہ کی دولت کافی سے زیادہ کام دیگی۔ رفیق احمد نے ناک بھوں چڑھا کر کامران کی طرف دیکھا۔ پھر بقیہ جھانک کر بولا۔ آپ کو میرے دل کی اصلیت معلوم نہیں۔ میں شکیلہ میز گلٹن کی دولت میں سے ایک حبہ نہیں لونگا۔ میں نوکری کرونگا۔ مجھے ڈپٹی کلکٹری مل سکتی ہے میں اب شکیلہ سے معلوم کرونگا۔ آیا اب اس کا ارادہ تبدیل تو نہیں ہو گیا۔ اس وقت درحقیقت رفیق احمد بانکا جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اس گفتگو کے بعد کامران سے اجازت مانگی۔ دونوں آہستہ آہستہ باہر آئے۔ اور رفیق احمد اپنی ٹمٹم پر سوار ہو کر بجانب جنوب چلتا بنا۔ ۵۵

اس وقت صاحب لفٹننٹ گورنر سے ملنے جا رہا تھا۔ جو کرنل بنڈن بلڈ کے یہاں ایک روز کے لئے مقیم تھے۔

کرنل بنڈن بلڈ کمانڈنٹ سفر مینا سر امینڈ کالون کے داماد تھے اور موخر الذکر ہی اس وقت صوبہ اودھ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ سر کلینڈ کالون بہادر مولوی شفیق احمد صاحب سے خوب واقف تھے۔ اور ایسے معزز اور ذی ثروت آدمی کے بیٹے کو نوکری کی کمی نہ تھی۔ درآں حالیکہ وہ بی اے پاس تھا۔ پانچ منٹ میں شفیق محمڈن کالج کے پاس سے گذر کر کرنل بلڈ کی کوٹھی پر پہنچا۔ کوٹھی نہایت عالیشان اور مرتفع تھی غرب کی جانب دور تک سرخ کنکر بچھا ہوا تھا۔ بہ جانب شرق وسیع باغ لگا ہوا تھا۔ رفیق احمد نے اپنی ٹم ٹم جنوبی برآمدہ کی طرف روکی۔ جہاں اسے چار مسلح سوار زریں وردی پہنے کھڑے ملے۔ رفیق احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اصل خاندانی رئیس زادہ تھا لیکن اس وقت نوکری کے لئے آیا تھا۔

رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسے ایک زریں وردی پہنے خدمتگار نظر آیا۔ جو بظاہر صاحب لفٹننٹ گورنر بہادر کا اردلی تھا۔ رفیق احمد نے خوف زدہ نگاہ سے اردلی کی طرف دیکھا۔ پھر جیب سے کارڈ نکال کر بولا "ہز آنر کو دو منٹ کے بعد اردلی واپس آیا۔ اور آہستہ سے کہا۔ آپ کو سلام دیا ہے۔ رفیق احمد دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا۔ اور ایک لمبی گلی کے اندر آہستہ آہستہ چپراسی کے پیچھے چلتا رہا۔ اس گلی کے کنارے پر بجانب غرب اردلی نے ایک کمرہ کی چک اٹھائی۔ اور رفیق احمد دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا۔ یہ کمرہ خوب وسیع اور پر تکلف تھا۔ چاروں طرف قیمتی قالین اور بیش قیمت کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک خوبصورت میز پر لانبے بوڑھے سر کلینڈ کالون چشمہ لگائے کچھ لکھ رہے تھے۔ اور دوسری طرف لانبے مستعد خوبصورت کرنل بلڈ[1] سر ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سگار پی رہے تھے۔ رفیق احمد نے کمرہ میں داخل ہوتے

[1] کرنل بنڈن جو بعد میں سر بنڈن بلڈ ہو گئے ۱۹۰۲ء تک نواب پنجاب کے کمانڈنگ رہے۔

ہی سر سے ٹوپی اتار لی۔ کرنل بلڈ نے مسکرا کر رفیق احمد کیطرف دیکھا جس نے فوراً تعظیماً سلام کیا۔ کرنل بلڈ رفیق احمد سے واقف تھے۔ پھر سر آکلینڈ کالون نے اپنے کاغذات سے نگاہ اُٹھا کر انگریزی میں کہا۔ آپ مولوی شفیق احمد کے لڑکے ہیں؟ کرسی پر تشریف رکھیئے۔ اس وقت کرنل بلڈ اپنی کرسی سے اُٹھ کر باہر جانے لگے۔ اور ایک مکلف کرسی پر رفیق احمد کو بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ رفیق احمد نے ڈھڑکتے دل سے کرسی پر بیٹھکر جواب دیا۔ جناب میں مولوی شفیق احمد کا لڑکا ہوں۔ "ہوں۔ ہوں" آپ بالکل اپنے باپ کی شکل ہیں۔ کیا آپ بھی عیسائی مشنریوں سے مجاہدہ کرتے ہو۔ یہ کلمہ اد اکر کے سر آکلینڈ خوب ہنسنے لگے۔ رفیق احمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ میرے والد نے مجھے اسلامی مجاہد بنانے کے لئے تعلیم دی تھی۔ مگر میں اب گورنمنٹ کا نمک خوار بننا چاہتا ہوں اور یہ فقرہ ادا کر کے رفیق احمد کا چہرہ سفید ہو گیا۔ سر آکلینڈ نے چشمہ اتار کر میز پر رکھدیا اور منہ سیخ کر کے بولے۔ تمہارے جیسا خاندانی آدمی بہت اچھا گورنمنٹ سرونٹ (ملازم) بنیگا۔ مگر کرنل بلڈ ابھی کہتے تھے تمہارے والد نے ایک لاکھ روپیہ چھوڑا؟

رفیق احمد کے چہرہ پر پسینہ کی علامات پیدا ہو گئیں۔ اور وہ گھبرا کر بولا "جی ہاں لیکن چند خاندانی معاملات کے سبب وہ روپیہ سب مدرسہ عربی دیوبند میں منتقل ہو جاویگا۔ سر آکلینڈ نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا "اچھا میں دیکھتا ہوں۔ پھر تمہیں کیا نوکری چاہیئے"

سر آکلینڈ نے مسکرا کر کہا۔ ڈپٹی کلکٹری کے امیدوار میرے پاس بہت ہیں۔ مگر چونکہ تم اسلامی مجاہدین کی صف کو چھوڑ کر گورنمنٹ کی فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو میں تمہیں سب سے پہلے موقعہ دونگا۔ تم ایک باقاعدہ درخواست میرے پاس بھیجدو۔ میں تمہیں دیکھکر بہت خوش ہوا۔ پھر رفیق احمد کے کارڈ کو پڑھکر فرمایا۔ اچھا میں آپ کو یاد کرونگا۔ رفیق احمد نے سر آکلینڈ کا شکریہ ادا کیا۔ اور ادب سے سلام کر کے باہر نکل آیا۔ باہر آکر اس نے طمانیت کا سانس بھرا۔

پینتالیسواں باب

دفینہ کی برآمدگی

جوں ہی کامران رفیق احمد سے رخصت ہو کر شکیلہ ہیرنگٹن کے یہاں پہنچا اس نے شکیلہ سے ملاقات کی۔ اور آہنی شہتیر کی آنکھہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا کامران اس وقت اس امر کی طرف متیقن تھا۔ کہ خزانہ دلاور علی کے ہاتھہ نہیں پڑا۔ اور ضرور شکیلہ کے بنگلہ میں یا کسی اور جگہ مدفون ہے۔ اس نے شکیلہ سے درخواست کی کہ لائبریری کے فرش کو اٹھوا کر دیکھنا چاہئے۔ آیا پختہ فرش پر تو کوئی آنکھہ نہیں بنی ہوئی۔ شکیلہ نے اس خیال پر رضامندی ظاہر کی۔ اور انہوں نے لائبریری کے سب دروازوں پر پردے ڈال کر دری کا فرش اور اس کے نیچے کی چٹائی دور کی۔ عین وسط کمرہ میں کامران نے آنکھہ کے نیچے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پھر اپنی جیب سے رومال نکال کر پختہ فرش کی گرد ہٹائی۔ اس وقت کامران اور شکیلہ دھڑکتے دل سے فرش پر جھکے ہوئے تھے۔ اور شکیلہ اپنے آپ کو بند کمرہ میں کامران کے پاس تنہا پاکر کچھہ متردد بھی تھی لیکن کامران نے اسے زیادہ دیر تک تنہا نہ رہنے دیا اور فرش کو بغور دیکھہ کر بولا "آہا یہاں بھی مثلث بنا ہوا ہے" شکیلہ کے دل میں بڑی تیزی سے دھڑکن پیدا ہوئی۔ اور اس نے بیتابی سے جواب دیا۔ "میں بھی دیکھہ رہی ہوں یہ مثلث لوہے کا معلوم دیتا ہے۔ بالکل سیاہ رنگ کا ہے" کامران نے مضطرب آواز میں کہا۔ "نہیں لوہے کا نہیں چاندی کا ہے۔ زنگ کے سبب سے سیاہ ہو گیا ہے۔ آپ کا میرے پاس زیادہ ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔ عزیزن کو حکم دیجئے۔ کہ فی الفور ایک پہاوڑہ مانگ لاوے" شکیلہ اپنے غسلخانہ کے دروازہ سے عزیزن کے پاس گئی۔ اور دو تین منٹ کے اندر ایک پہاوڑہ لے آئی۔ کامران نے شکیلہ اور عزیزن کی موجودگی میں اس مثلث

کے گرد پھاوڑہ مارنا شروع کیا۔ اور دو تین منٹوں میں ایک بڑا ٹکڑہ فرش کا علیحدہ ہو گیا۔ تین چار دیگر ضربوں سے کامران کا پھاوڑہ کسی سخت چیز پر پڑتا ہوا معلوم ہوا اور خوشی کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ چلا کر بولا "ضرور کوئی یہاں صندوق ہے" شکیلہ کا دل اضطراب کے مارے گلے میں آ رہا تھا۔ عزیزن بھی اس کہانی کو کسی خزانہ کی خوشخبری سن کر بے تاب ہو رہی تھی۔ بارے کامران نے بڑی احتیاط سے پھاوڑہ چلانا شروع کیا۔ اور ایک منٹ کے اندر ایک سیاہ بکس نظر آنے لگا۔ یہ بکس مضبوط لوہے کا تھا۔ اور حجم میں ایک فٹ لمبا چھ انچ چوڑا تو اچھ گہرا ہو گا۔ بکس کے نکلنے پر شکیلہ کا دل نا امیدی سے بیٹھ گیا"

اس ذرا سے بکس میں کیا خزانہ ہو سکتا تھا۔ عزیزن آ اس بکس کو بچہ لگا کیل سمجھ کر ہنس پڑی۔ کامران البتہ نا امید ہونے والا آدمی نہ تھا۔ اس نے پرجوش آواز میں کہا "تمہارے والد صاحب بلا کے ذہین آدمی تھے۔ خزانہ مل گیا ہے لیکن یہ بکس اس خزانے کی کنجی ہے" خزانہ کی کنجی اس سے آپ کا کیا مطلب ہے" شکیلہ نے پوچھا۔ کامران نے دریافت کیا۔ اور وہ اپنا ہتھوڑا اٹھا ہوا سر کھجاتا ہوا سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ بکس مضبوط لوہے کا تھا۔ اور اس پر انگلستان کے کسی کارخانہ کی مہر تھی۔ اس میں پیتل کا چھوٹا سا مضبوط قفل لگا ہوا تھا۔ کامران نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مس شکیلہ آپ کے والد صاحب نے کچھ کنجیاں ضرور چھوڑی ہوں گی۔ مجھے کوئی گچھا دو۔ تاکہ اس قفل کو کھولوں" "ہاں ہاں میرے والد صاحب نے بہت سی چابیاں چھوڑی تھیں" شکیلہ ہینگلٹن نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر میز کی دراز سے چند چابیوں کی زنجیر کامران کے ہاتھ میں دیدی۔ کامران ان کنجیوں کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر ایک چھوٹی سی چابی دیکھ کر وہ چلا کر بولا "چابی مل گئی" اس لمحہ میں کامران نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس بکس کے قفل پر چابی لگائی وہ زنگ آلودہ قفل فوراً کھل گیا۔ بکس شکیلہ کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ اور شکیلہ و عزیزن اسے کھلے ہوئے منہ سے حسرت دیکھ رہی تھیں۔ کامران نے بڑھ کر بکس کا ڈھکنا کھولا۔ اور اس کے اندر ایک موٹا سفید لفافہ نظر آیا۔ اس نے فوراً لفافہ باہر

کھینچ لیا۔ اور اس وقت کامران اور شکیلہ دونوں کی آنکھیں اس لفافہ کی تحریر پر چمک گئیں۔ لفافہ کے اوپر ایک مثلث کے اندر ایک انسانی آنکھ بنی ہوئی تھی۔ اور اس پر حسب ذیل تحریر تھی۔

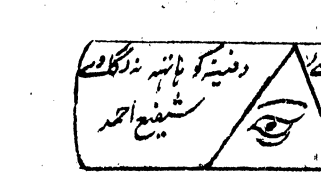

لفافہ کی تحریر سے کامران اور شکیلہ کا دل بڑی بے تابی سے اچھل پڑا۔ کامران کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ مگر شکیلہ کا سر مختلف جذبات کے اثر سے چکرا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ اور وہ گھبرا کر کامران کی طرف دیکھنے لگی۔ کامران مسکرا کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا "اب عزیزان کی ضرورت نہیں۔ یہ خط آپ کے والد صاحب چھوڑ گئے ہیں۔ اس سے آپ کو اپنے خاندان کے حالات معلوم ہو سکیں گے۔ عزیزان اس لفافہ کو بیکار سمجھ کر اوس کمرہ میں سے فوراً چل دی اور کامران نے لفافہ کی مہروں کو بغور دیکھکر شکیلہ سے کہا "دیکھئے سب مہریں صحیح و سالم ہیں۔ اس لفافہ پر کسی شخص نے دست درازی نہیں کی۔ اب میں آپ کی اجازت سے لفافہ کھولتا ہوں۔ لفافہ کے اندر سے تین موٹے موٹے کاغذ نکل پڑے۔ اور کامران نے ان کو شکیلہ کے ہاتھ میں دیدیا۔

شکیلہ دس پندرہ منٹ تک ان کاغذات کو پڑھتی رہی۔ اور کامران بھی اس کے پاس کھڑا ہوا مطالعہ کرتا رہا۔ ان کاغذات کے مطالعہ سے کامران تو بخوبی واقف ہو گیا۔ مگر شکیلہ نے خوفزدہ نگاہوں سے کامران کو دیکھ کر کہا "میری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ پندرہ لاکھ روپیہ یا خدا میرا سر چکرا رہا ہے"

کامران نے یہ سمجھ کر کہ کہیں اس ناتجربہ کار لڑکی کو شادی مرگ نہ ہو جاوے اس نے پیشانی پر بل ڈال کر شکیلہ کے برقعہ پوش چہرہ کی طرف دیکھکر کہا "مس شکیلہ آپ اس روپیہ کی مالک اس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک آپ تابت

کروں۔ کہ آپ مسٹر شفیع احمد کی لڑکی ہیں۔ آپ زیادہ خوش نہ ہوں۔ ابھی تک آپ سے سینکڑوں سوالات کریگا۔ آپ اپنے دل کو قابو میں رکھئے۔ روپیہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھ کر ہر سہ کاغذات کو بالترتیب پڑھنا شروع کیا۔

(۱) سب سے اوپر ایک تحریر حسب ذیل تھی۔

میری لاڈلی شکیلہ ہیرنگٹن جس وقت یہ لفافہ تمہارے ہاتھ میں پڑے۔ شاید میں دنیا میں ہوں یا نہ ہوں۔ اگر ہوں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں جس وقت میں نے تمہاری والدہ آلیو ہیرنگٹن سے شادی کی۔ انہوں نے مجھے اپنے جملہ خاندان سے مطلع کیا۔ اور اپنے والد نیز اپنے ایک پردادا کے وصیت ناموں کے مضامین سے باخبر کیا۔ ان کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوا۔ کہ ڈیڑھ سو سال گذرے۔ تمہاری والدہ کا کوئی پردادا ایک کثیر رقم چھوڑ گیا تھا۔ جو اس نے مشہور راتھس چائیلڈ کے بینک میں جمع کر رکھی ہے۔ یہ رقم تسلسل بعد تسلسل سب سے بڑے بیٹے یا سب سے بڑی بیٹی کے نام منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ اور کسی نے اس میں سے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ تمہارے نانا مسٹر ہربرٹ ہیرنگٹن نے بھی اپنی عمر میں ایک لاکھ روپیہ پیدا کیا تھا۔ وہ بھی اس بینک میں پرانی رقم کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ جیسا کہ تمہیں کاغذات مضمونہ سے معلوم ہوگا۔ تمہارے خاندان میں اب تک کسی کو اس رقم کی ضرورت نہیں پڑی۔ اور نہ شاید تمہیں ضرورت پڑے لیکن تمہاری والدہ کے پردادا کی تحریر میں ایک جملہ اس قسم کا ہے۔ کہ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید تم اس روپیہ کو اپنے مصرف میں لاؤ۔ بہرحال تم بلا شراکت دیگرے اس روپیہ پر قابض ہو سکتی ہو۔ صرف بیرن راتھس چائیلڈ لنڈن کے بینک کا پتہ کافی ہے لیکن اس روپیہ کیلئے تمہیں لنڈن جانا پڑیگا۔ اور تمہارے بازو پر جو نشانی مثلث و آنکھ ہے۔ وہ بینک کے مالکین کو دکھانا ہوگا۔ یہ نشان تمہارے خاندان میں تمہاری والدہ کے پردادا کا مجوزہ ہے۔ تمہاری والدہ اور تمہارے نانا ہر دو کے بازو پر یہ نشان تھا۔ خدا تعالےٰ سے دعا ہے۔ کہ تم اپنی زندگی۔ عزت۔ آبرو۔ نیک چلنی اور خوشحالی سے

گذارو۔ اور جو مسلک تمہارے بزرگوں کا چلا آیا ہے۔ اس کی روایات کو قایم رکھو۔
میں ہوں تمہارا محبت کرنیوالا باپ۔
شفیع احمد ۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء آصف نگر ہیرنگٹن لاج +

(۲) دوسری تھرشکیلہ کے نانا ہربرٹ ہیرنگٹن کی طرف سے شکیلہ کی والدہ آلیو ہیرنگٹن کے نام حسب ذیل تھی:

میری پیاری لاڈلی آلیو میرے انتقال کے بعد یہ لفافہ تمہیں ہربرٹ ہاتھس چائلڈ بینک لنڈن سے ملیگا۔ اور اس خط کے ذریعہ سے تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ تمہارے پردادا لارڈ شپ کرسٹوفر ہیرنگٹن اپنے ورثا کے لئے رقم کثیر چھوڑ گئے ہیں۔ میرے والد نے جب انتقال کیا۔ تو یہ رقم چودہ لاکھ روپیہ تھی۔ میں نے اس میں ایک لاکھ اور اضافہ کر کے پندرہ لاکھ کر دی ہے۔ جیسا کہ تمہیں اپنے پردادا کرسٹوفر ہیرنگٹن کے خط سے معلوم ہوگا۔ یہ رقم خرچ کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ نسلاً بعد نسلاً تقویت اور امداد خاندان کے لئے چلی آرہی ہے۔ اور میرے دادا صاحب مرحوم کی خاص وصیت بھی یہی تھی۔ کہ ہمارے خاندان کا ہر وارث اس رقم میں کچھ اضافہ کرتا رہے اور اپنی قابلیت و دست بازو سے خر خاندان کی جگہ فخر خاندان بن کر دکھلائے۔ خواتین کو کمانی کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔ اس وجہ سے میں نے ایک لاکھ روپیہ تمہارے لئے الگ بینک آف بنگال آگرہ میں جمع کر دیا ہے۔ تم اس ایک لاکھ کو شوق سے خرچو۔ لیکن پندرہ لاکھ روپیہ جو راتھس چائلڈ کے بینک میں ہے۔ وہ حسب روایات سابقہ بالکل خرچ نہ کیا جائے۔ اور اس کے متعلق تمہیں اپنے پردادا کے خط سے مفصل کیفیت معلوم ہوگی۔ مجھے تمہاری نیک چلنی تابعداری اور شرافت سے پوری امید ہے۔ کہ تم اپنی خاندانی اعزاز کو اور روایات کو ہر طرح سے محفوظ رکھوگی اور اپنی اولاد کو نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کرتی رہوگی۔ جیسا کہ تمہیں میری زندگی میں معلوم ہو چکا ہے۔ ہمارا خاندان دنیاوی دولت کو مذہب کے بدلے اینٹ پتھر سمجھتا رہا ہے۔ پس کوئی روشن خرد اینٹ پتھر کی جگہ وسیلہ نجات

کو فروخت کرنا پسند نہیں کر سکتا۔ مجھے تمہاری ذات سے پوری امید ہے۔ کہ تم اپنے پردادا کے احکامات کی تعمیل کرسکو گی۔ لیکن مجھے تمہاری اولاد کا قطعی علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے۔ کہ تم کس شخص سے شادی کرو گی۔ بہرحال میں تمہیں مقدس مسیح کی حفاظت میں چھوڑ کر دعا کرتا ہوں۔ کہ تم دنیا میں خوب پھلو اور پھولو۔ اور تمہارے ورثا اپنے پرانے خاندان کا تقدس قایم رکھیں۔ آمین"

میں ہوں تمہارا پیارا باپ ہربرٹ ہیرنگٹن

مگر تمہارے بازو پر جو نشانات مثلث اور ایک آنکھ بنی ہوئی ہے سو اس خزانہ کے متعلق ایک قسم کی شناخت ہے۔ ہمارے خاندان کے ہر ایک آدمی کے بازو پر یہ نشان گدا ہوا ہونا چاہیئے۔ اور اسی نشان کے ذریعہ سے بنک آف رائنس چائلڈ یہ رقم وعویدار کو دے سکیگا۔ میرے والد صاحب کا خط مجھ سے ہندوستان میں گم ہوگیا ہے۔ اس واسطے وہ شامل کرنے سے معذور ہوں"

(۳) تیسرا خط ہربرٹ ہیرنگٹن کے دادا لارڈ ڈبٹپ کرسٹوفر ہیرنگٹن کی طرف سے حسب ذیل مضمون کا تھا۔

میرے بیٹے۔ میرے وارثو۔ میری ذاتی جائداد یا دولت جو کچھ تھی۔ وہ میں تم لوگوں کو اپنی حین حیات میں دے چکا ہوں۔ اس خط کے ذریعے سے جو میرے بڑے بیٹے کرسٹی ہیرنگٹن کو رائنس چائلڈ بینک سے ملیگا۔ میں چند باتیں اپنی زندگی کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تقریباً بتیس سال گذرے ہیں۔ میں نے مقدس مسیح کے مذہب کی اشاعت میں دل وجان سے بیحد سرگرمی ظاہر کی تھی۔ اور افریقہ کے خونخوار جنگلوں ہیبت ناک موسموں ہیز مردم خوار آدمیوں میں دس برس محض تبلیغ مذہب میں صرف کئے تھے۔ جس کے اعزاز میں جج ہرمیجسٹی نے لنڈن شہر کا آرک بشاپ مقرر کیا۔ اور میری معقول مشاغرہ اور قابل رشک اعزاز سے میرے تمام خاندان کی عزت مسلمہ ہونے لگی۔ لیکن ان دنیاوی امتیازات سے زیادہ مستحکم اور اصلی اعزاز جو مجھے نصیب ہوا۔ وہ مقدس مسیح کی خوشنودی تھی۔ جس کا میں آگے

ذکر کرتا ہوں۔ میں نے ارک بشاپ مقرر ہونے پر جس روز شاہ عالم پناہ کے ساتھ دعوت کھائی۔ وہ دن میری زندگی کی بڑی کامیابی کا تھا۔ اور نہ کوئی شخص اس سے زیادہ اعزاز کی خواہش کر سکتا تھا میں بڑی فرحت اور اطمینان قلب سے بستر پر گیا اور تمام شب گہری نیند سوتا رہا۔ لیکن صبح کے چار بجے مجھے خواب میں ایک بزرگ سفید ریش جو اہری سبز لباس میں دکھلائی دیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس نے مجھ سے مصافحہ کر کے مجھے مبارک باد دی۔ اور میرے ہاتھ میں ٹکڑہ نقرہ دیا۔ میں نے بحالت رویا بستر سے اُٹھ کر اس بزرگ سے پوچھا "جناب یہ مبارک باد کس بات کی ہے۔ بزرگ نے فرمایا۔ مقدس مسیح نے تیری خدمات پر بیحد مسرت ظاہر کی ہے اور اس کے انعام میں ایک کثیر رقم تیرے لئے بھیجی ہے۔ جو تجھے اپنے پلنگ کے نیچے فرش کے اندر ملے گی۔ تو اس رقم کو کام میں لا سکتا ہے۔ لیکن مقدس مسیح نے فرمایا ہے۔ کہ یہ رقم اس کے مذہب کا سچا شیدا کبھی خرچ نہ کریگا۔ اور جس کسی کو اس رقم میں سے کچھ رقم خرچ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ وہ مذہب مسیح سے منہ موڑ گا اب تو اس رقم کو کسی بینک میں جمع کر دے۔ اور اپنی اولاد کو ہدایت کر کہ اس رقم کو مقدس باپ کا انعام سمجھ کر نسلاً بعد نسلاً بطور ایک سند کے محفوظ رکھے اور اس اعزاز پر فخر و مباہات کا موقعہ سمجھے۔ آجتک کسی انسان کو اس قسم کا اعزاز نصیب نہیں ہوا۔ اور نہ ہوگا۔ تیرا خاندان ہمیشہ پھولے پھلے۔ اور تیرے وشاہ و جانشین مقدس مذہب کے سچے پیرو ثابت ہوں"۔

میں نے اس وقت بعالم خواب مقدس باپ کی بارگاہ میں سر شکرانہ جھکایا اور اس اعزاز کو بالکل غیر متوقع انعام سمجھا لیکن چونکہ اس رقم کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے میں نے گھبرا کر مقدس بزرگ سے پوچھا۔ اے مقدس مسیح کے مقدس حواری کیا آپ مجھے سمجھا سکتے ہیں۔ کہ یہ رقم استعمال میں کیوں نہ لائی جاوے" بزرگ نے ہنس کر فرمایا۔ کہ مذہب اور دولت میں ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ تیرے خاندان میں کبھی آدمی مقدس مذہب کے سچے عاشق پیدا ہونگے۔ لیکن یہ سب لوگ اس دولت کو

مشت خاک سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔ مگر تیری ہی نسل میں کوئی عورت نکلیگی۔ کہ اسکے خون میں کسی دوسرے مذہب کی بو آتی ہے۔ مجھے دکھلائی دیتا ہے۔ کہ وہ عورت مقدس مسیح کے مذہب کی پابند تو ہوگی۔ لیکن اس کے دل میں ایک وقت ایسا خیال پیدا ہوگا۔ کہ مذہب سے زیادہ طاقت اثر کسی اور چیز میں ہے مجھے معلوم نہیں۔ وہ کیا چیز ہے لیکن تیری اولاد میں اتنا اثر پیدا ہوتے ہی مقدس مذہب کی تبدیلی کا وقت آجاویگا۔ اس قسم کے مذبذب لوگوں کی مقدس مسیح کو ضرورت نہیں۔ اس خیال کی پیدائش کے بعد تیری اولاد روز بروز پریشان اور مفروض ہوتی جاوے گی۔ اور ایک وقت آویگا۔ کہ اسے اس خزانہ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس وقت ہم دیکھیں گے آیا وہ عورت مقدس مذہب پر قایم رہنے کے لئے اس خزانہ کو تمہارے ارشاد کے موافق مشت خاک سمجھنے لگے گی یا نہیں یا اسے استعمال کر کے تیرے اعزاز کو بٹہ لگاویگی بہرحال میں دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ عورت مذہب عیسوی کو اگر تبدیل کرے۔ تو اپنی نجات کے وسیلہ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے "

مقدس حواری یہ الفاظ ادا کرتے ہی نظروں سے غائب ہوگیا۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے بستر پر ایک ٹکڑہ نقرہ پایا۔ اور بستر سے اٹھ کر مقدس باپ کی درگاہ میں سر بجھر جھکا کر اس عجیب و غریب اعزاز کا شکریہ ادا کیا۔ اور کمرہ میں لیمپ جلا کر فرش کھودنا شروع کیا۔ مجھے ایک آہنی مکس میں اس قدر اشرفیاں ملیں۔ کہ میری گنتی سے باہر تھیں۔ بہرحال میں نے یہ سب رقم اسی دن راتھس چائیلڈ کے مشہور بینک میں جمع کردی۔ میں اس اعزاز کے شکریہ میں اپنی اولاد کو ہدایت کرتا ہوں کہ میرا ہر ایک وارث اور جانشین مقدس مسیح کے مذہب کو اپنا دین و ایمان بنا کر اس پر مضبوطی سے قایم رہے۔ اور اس قطعہ نقرہ کو جس پر ایک مثلث اور ایک آنکھ بنی ہوئی ہے۔ سند اعزاز سمجھ کر اپنے بائیں بازو پر گود لیا کرے۔ میں نے یہ نشان اسی روز اپنے بازو پر گود لیا تھا۔ اور اپنے خط کی دوسری نقل میں راتھس چائیلڈ بینک کو ہدایت کردی تھی۔ کہ جب کبھی میری اولاد میں سے کسی شخص کو اس روپیہ کی ضرورت

ہو۔ پہلے اس کا بایاں بازو دیکھہ لیا جائے۔ تب روپیہ دیا جاوے۔ میری عین خواہش اور آرزو ہے۔ کہ میرے خاندان کا ہر ایک ممبر اس نشان کو سند اعزاز سمجھہ کر اس کی دل وجان سے قدر کرے اور سونے کی اشرفیوں پر بھی کبھی دل نہ لگائے" میں اپنے خاندان کی اس عورت کو نہایت بدبخت سمجھونگا۔ جو مذہب مسیح سے آزردہ ہوکر ان اشرفیوں کو کام میں لاویگی۔ پھر بھی اسے اپنے خاندان کی نام لیوا سمجھہ کر دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ دنیا میں عزت اور آبرو سے رہے۔ اور اپنے نانا پرنانا کے اعزاز کو حشر تک سینہ بہ سینہ پہنچا دے جب تک کہ میں خود اس سے دست وگریباں ہوکر پوچھوں۔ کہ اس نے میری سند اعزاز کو کیا کیا۔ اور اس کثیر رقم میں سے جو حضرت مسیح نے میرے لئے مرحمت فرمائی تھی۔ میرے واسطے کیا لائی"

الراقم

کرسٹوہیرنگٹن لندن ۸ جنوری ۱۸۰۱ء

چھیالیسواں باب

چاہ کن را چاہ در پیش

دس بجے شب کے وقت فرحت علی خاں اپنے مکلف استراحت خانہ میں لب گور پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ اس کا وفادار مگر بے چین ملازم دربار علی پائینتی بیٹھا ہمایت خاں کی واپسی اور ڈاکٹر ارشاد اللہ کی آمد میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ زمرد دنیں دنیا ومافیہا سے بے خبر سکڑ سکڑ کر نواڑ کے پلنگ میں گھسا جاتا تھا اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ ہر پانچ سات منٹ کے بعد ایک گہرا سبز رنگ کا دست نواڑ کے اندر بہ جاتا تھا۔ اور وہی آرام دہ خوش نما کمرہ جو گل جاج جیسی پری چہرہ لڑکی سے چیڑ چھاڑ کیوا سطے منتخب ہوا تھا۔ اب مریض کو گور سے زیادہ تنگ اور سخت معلوم

معلوم ہو رہا تھا۔ موت کی اصلیت پر اگر غور کیا جاوے۔ تو وہ فی الحقیقت ایک قسم کی جنگ ہے جس سے انسان کی روح مغلوب ہو کر کالبد خاکی سے نکل جاتی ہے اگر زخم یا صدمہ یا بیماری کی تکلیف انسانی روح کی طاقت سے کمزور ثابت ہوتی ہے تو انسان کا دم نہیں نکلتا۔ اگر یہی تکالیف روح کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ تو انسان کا نفس اس کے صدمہ سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ مشہور اور قابل اعتبار بات تو یہی ہے۔ کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اور فرحت علی خاں کی حالت کا موازنہ کرنے سے بھی یہ سبق ملتا ہے۔ کہ موت اپنے وقت سے پہلے نہیں آسکتی اس شخص کی عمر کا پیمانہ ابھی لبریز نہیں ہوا تھا۔ پس وہ جانستان تکالیف کے صدمات کو نزع کی حالت میں جھیل سکنے کی قابلیت رکھتا تھا۔ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات اور بڑا طاقتور سمجھا کرتا ہے لیکن کبھی اس بات پر غور نہیں کرتا۔ کہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ فرحت علی خاں کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ چند منٹ کے اندر وہ گلجان کے آرام دہ پہلو سے نکل کر دنیا کی سخت سے سخت مصیبت میں پھنس جاویگا۔ اسی طرح ایک گھوڑے یا گھوڑی کا سوار دل میں سینکڑوں بیہودگی کے خیالات کا طومار باندھے اڑا چلا جایا کرتا ہے کسی جگہ گھوڑا کسی چیز سے ڈر کر بلا تحاشا بھاگ پڑتا ہے اور سوار کو اس کے خیالات سمیت جگاکر ایسی خندق میں پھینک دیتا ہے۔ جو بالآخر گور کی کوٹھڑی ثابت ہوتی ہے۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

دنیا میں جس قدر حظائظ خوشیاں اور توقعات ہیں۔ ہر ایک کے بدلہ میں اس جیسی متضاد رنج و تکالیف اور صدمات ہیں۔ جو ایک آدمی ایک دفعہ عیش لذات اور عزت کے پیالے سے گھونٹ پیتا ہے۔ اسی پیالے میں رنج و تکلیف اور موت کا زہر بھی کسی نہ کسی دن آگھتا ہے۔ اس وقت فرحت علیخاں کی مصیبت سے بجز کچھ تکالیف اس کی جان پر آپڑی تھیں۔ اس کا قرار واقعی علم تو اسی شوریدہ بخت آدمی کو تھا۔ لیکن انسانی جان کی قدر و قیمت ہر تی ہے۔ اور یہ قدر و قیمت انسان کے تعلقات سے ہر کی جاتی ہے۔ دربار علی کی آنکھوں میں یہ شخص پرلے معزز خاندان کا اکلوتا

بیٹا تھا۔ اور پانچ منٹ کے اندر پانچ لاکھ روپیہ خرچ کر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ پس ایسے معزز اور ذی مقدرت رئیس کو اس کا نمک خوار پرانا ملازم بستر مرگ پر تڑپتا دیکھکر کس طرح آب دیدہ نہ ہوتا۔ اس وقت دربار علی دراصل خود بھی حواس باختہ اندھے بادلوں کی طرح بیٹھا تھا۔ اور یہ سمجھ کر کہ اب چند منٹ کے اندر اس خاندانی طاقتور اور با حوصلہ رئیس کی تجہیز و تکفین کا فکر کرنا پڑیگا۔ اس کے دماغ میں جنبش پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کی آمد میں منٹوں کی دیری کو مہینوں کی لمبائی سمجھ رہا تھا۔ اس نے بیسیوں دفعہ استراحت خانہ سے اُٹھ اُٹھ کر بڑے ہال کے دروازہ پر آکر دیکھا۔ کہ آیا ڈاکٹر آ رہا ہے یا نہیں۔ لیکن اسے کوئی شخص آتا ہوا نہ معلوم دیا۔ انتظار اور نا امیدی۔ امید اور بیم کے مارے اس کا کلیجہ نکلنے لگا۔ اور اس نے سر پیٹ کر کہا۔ کیا کروں۔ کیا کروں۔ یا دنیا کے پیدا کرنے والے اس نوجوان رئیس زادہ پر رحم کر۔" بارے اس کی دعا مقبول ہوگئی۔ اور اسے ایک گھوڑا گاڑی بنگلہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ ایک منٹ کے اندر نجیب خاں اور ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں دوائیوں کا بکس لئے ہوئے گاڑی سے کود پڑے۔ اور بنگلہ کی طرف بھاگتے ہوئے دربار علی سے پوچھنے لگے "کیا ابھی زندہ ہیں؟"

دربار علی نے سر کے بال نوچکر کہا "جلدی کرو۔ جلدی۔ دم نکل رہا ہے۔" یہ تینوں آدمی بحواس باختہ مریض کے سرہانے آئے۔ اور ڈاکٹر ارشاد اللہ نے اس کے دل اور نبض کو جلدی سے دیکھ کر لینا سانس بھرا۔ پھر جھٹ پٹ اپنی ادویہ کا بکس کھول کر تین دوائیں ملائیں۔ اور ایک چمچے سے گلاس میں ڈال کر فرحت علی خاں کے منہ میں پہنچا دیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ارشاد اللہ نے اس کے بدن پر لحاف پھیلا کر زور سے کہا "جلدی آگ لاؤ۔" انگیٹھی خوب گرم کر دو۔ دونوں نوکر بھاگ کر آگ لینے گئے۔ ڈاکٹر نے انگیٹھی سے لیمپ اٹھا کر فرحت علی خاں کے ایک دست کو آلہ سے بغور دیکھا۔ پھر دھڑکتے دل سے کہنے لگا "نوکر نے مجھے سنکھیا کہا۔ مگر یہ تو کوئی اور زہر ہے۔ بہرحال فرحت علی خاں مجھ سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا۔ یہ سب

بدمعاشی ان نوکروں کی ہے۔ ذرا ہوش آجائے۔ تو پوچھوں۔" اتنے میں نوکروں نے آگ اور کوئلوں کو لاکر انگیٹھی گرم کرنی شروع کردی۔ اور وہ تین منٹ کے اندر گرم گرم سرخ انگارے گرم گرم نکالنے لگے۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں ایک کرسی پر بیٹھکر سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر نوکروں کی طرف دیکھ کر بولا "یہ زہر سنکھیا کا نہیں۔ سچ بتلاؤ کیا معاملہ تھا۔ تم دونوں بھائی پر چڑھ جاؤ گے" نوکروں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "خاں صاحب آپ تو ہماری سرکار کے بڑے دوست ہیں۔ آپ سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی ہمیں سرکار کی زہر خورانی کا مطلق علم نہیں۔ سرکار ہوش میں آویں آپ خود دریافت کرلیجئے گا" اس اثنا میں فرحت علی خاں کو ایک اور دست آیا۔ اور اس نے ایک لمبی آہ بھر کر پلنگ پر ہاتھ مارا۔ ارشاد اللہ خاں نے اچھل کر اس کی نبض پکڑ لی۔ پھر لیمپ سامنے منگا کر زبان دیکھی۔ فرحت علی کی زبان کانٹے پڑ گئے تھے۔ اور وہ کتے کی طرح باہر نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک گھنٹہ کے اندر ہی سوکھ کر سفید ہوگیا تھا۔ اور آنکھیں ایسی بے رونق معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی مردہ کی ہوتی ہیں۔ ارشاد اللہ خاں نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر دیکر لگا دیا۔ پھر ایک منٹ کے بعد آلہ کو نکال کر دیکھا۔ اس وقت ڈاکٹر کے چہرہ پر اطمینان کی علامات ظاہر ہوئیں اور اس نے جوش بھری آواز میں کہا "یہ زہر میرے کئی کیس کا تھا۔ الحمد للہ ایک ہی دعا سے زہر ساقط ہوگیا۔ اب پندرہ منٹ کے اندر فرحت علی خاں آنکھ کھول دیگا" ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کا قیاس بالکل درست تھا۔ یہ تینوں آدمی بیٹھے ہوئے مریض کا منہ تکتے رہے۔ جس نے دس بارہ منٹ کے بعد دونوں ہاتھ زور سے پلنگ پر مارے اور اس کے منہ سے کوئی بات نکلی۔ ارشاد اللہ خاں نے اس کے منہ سے کان لگا دیئے۔ اور پانی کی مانگ سنائی دی۔ اس نے اپنے بکس سے تین دیگر ادویات گلاس میں ڈالیں۔ اور فرحت علی خان کے منہ میں ٹپکا دیں۔ دس منٹ کے بعد فرحت علی خاں نے زور سے آہ بھری۔ اور پھر پانی مانگا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے اس مرتبہ دودھ لانے کا حکم دیا۔ اور پانچ منٹ کے اندر چمچہ کے ذریعہ سے نصف گلاس دودھ

فرحت علیخاں کے شکم میں اتار دیا گیا۔ دودھ پلا دینے کے بعد ڈاکٹر نے پھر مریض کے دل و دماغ اور جگر کا ملاحظہ کیا۔ اور پیشانی پر بل ڈال کر کہا "اب زہر کا اثر بہت خفیف ہے۔ فرحت علیخاں کو نیند آگئی ہے پسینہ آرہا ہے۔ جاؤ اب تم لوگ آرام کرو میں صبح تک جاگتا رہوں گا لیکن تم لوگوں کا ہونا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ تم ان کے بڑے پرانے ملازم ہو اور جلال آباد کا بچہ بچہ تم سے واقف ہے۔ نوکروں نے چہرہ اور آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا "خاں صاحب آپ کیسے مسلمان ہیں خدا جانتا ہے۔ ہمیں اس زہر خورانی کا بالکل علم نہیں۔ آپ سرکار سے دریافت کر کے ایسی باتیں منہ سے نکالئے گا۔ یہ کہکر وہ لوگ کمرہ سے جانے لگے۔ ارشاد اللہ خاں نے اپنے لئے ایک آرام کرسی منگائی۔ اور فرحت علی خاں کے سرہانے بیٹھ کر اس عجیب و غریب زہر خورانی پر عقل لڑانے لگا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے تمام شب فرحت علی خاں کے کمرہ میں بسر کی۔ اور فرحت علی خاں کا جسم لحظہ بلحظہ تغیر پذیر ہوتا ہوتا صبح ہونے تک اس کی روح کے قفس میں آگیا۔ اور فرحت علیخاں نے بخار کی تکلیف میں زور زور کراہنا اور بڑبڑانا شروع کیا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ اچھل پڑتا تھا۔ اور وہ اس شخص کے دماغ میں فتور آجانے کے ڈر سے بے دم ہوا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خان کو ایک دفعہ یہ کلمہ سنائی دیا "قاضی آگیا۔ نکاح پڑھاؤ" جلدی جلدی میں مرا میں مرا"

پانچ سات منٹ کے بعد اس نے چیخ مار کر کہا "گل جان بھاگی جارہی ہے میری بیوی بن گئی ہے جلدی لاؤ۔ جلدی پکڑو پکڑو۔ مرا۔ مرا۔ مرا۔ ارشاد اللہ خاں نے اس کے سر کو ہاتھ کی دباکر کہا۔ خاں صاحب کیا آپ ہوش میں ہو طبیعت کیسی ہے؟

فرحت علیخاں نے پلنگ پر ہاتھ مار کر کہا "پیاس۔ پیاس" جلال آباد کتنی دور ہے۔ میری اماں نہیں آئی۔ کہاں ہوں؟

ارشاد اللہ خاں کو نوجوان دوست کی تکلیف اور اس کی متوفی والدہ کی یاد پر جھرجھری آگئی۔ اس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ تم اپنی کوٹھی فرحت منزل میں ہو۔ تمہارا

دوست ارشاد اللہ خاں تمہارے پاس ہے۔ گبھراؤ مت ابھی ایک گھنٹہ کے اندر بخار اتر جاویگا۔ فرحت علی خاں نے زور سے آہ بھری۔ اور ڈاکٹر کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ تکلیف اور بخار کی تیزی سے بیہوش ہو گیا۔ اس لئے گبھرا کر اس کی نبض دیکھی اور یہ سمجھ کر کہ کہیں دوا نہ بنا یا کام نہ بگڑ جائے۔ اس کے چھکے چھوٹنے لگے۔ اسے پسینہ آگیا۔ اور خوفزدہ نگاہ سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ تکلیف اگر کم ہو جاوے۔ تو اس کی صحت یابی کی صورت ہے۔ پھر اسے الماری میں دو تولیس شراب کی معلوم ہوئیں۔ ایک بوتل خالی تھی۔ دوسری نصف سے زیادہ خرچ ہو چکی تھی۔ اس نے بھاگ کر بوتل ہاتھ میں لی اور بیمپ کے سلینے لاکر ایک گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈالی پھر اس میں ایک پڑیا کے اندر سے کچھ دوا چھوڑ دی۔ دو منٹ کے اندر اس نے اس شراب کو انگیٹھی کی آگ پر ڈالنا شروع کیا۔ پھر آہستہ سے بولا "اس شراب میں کوئی زہر نہیں ہے" پھر اس نے بوتل فرحت علیخاں کے منہ سے لگا کر ساری شراب اس کے پیٹ میں پہنچا دی۔ فرحت علیخاں کے جسم پر لحاف کھینچکر وہ خالی بوتل کی طرف رجوع ہوا۔ اور اس کے اندر چند قطرات شراب کے پاکر ان کا امتحان کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد اس نے اپنا گلاس آگ پر رکھدیا۔ اور شراب جم جانے پر اس نے اس کی شکر کو ایک بلوری طشتری میں ڈال کر خوردبین سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ نصف گھنٹہ تک اس کے اجزا کا مطالعہ کرتا رہا پھر ایک دم چلا کر بولا "سنکھیا ہرگز نہیں۔ اوہو میں کس قدر بیوقوف ہوں۔ یہ تو ہیرے کی کنی ہے۔ جیسے کہ دستوں میں تھی۔ ہیرے کی کنی اس بوتل میں ملائی گئی۔ مگر کس نے ملائی۔ اور فرحت علی خاں نکاح اور گل جان کن کن لوگوں کے نام لے رہا تھا۔ یہ تو عجیب و غریب راز ہے۔ گل جان گل جان مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ کل انسپکٹر صاحب نے اسی عورت کی گمشدگی کا ذکر کیا تھا۔ اوہو یہ تو بڑے معرکہ کا کام ہے فرحت علیخاں گل جان اور نکاح خوب دیکھو لونگا۔ ذرا فرحت علی خاں کو ہوش آجاوے"

سینتالیسواں باب

جیسی کرنی ویسی بھرنی

نصف گھنٹے کے اندر دلاور علی نے پانچ روپے بذریعہ تار بلند اختر کے پاس مظفر نگر روانہ کئے۔ اور صاحب سول سرجن بہادر کو لے کر گل جان کے محل پر پہنچا۔ امیر جان ان دونوں کو لے کر استراحت خانہ میں پہنچی۔ جہاں ایک مسہری پر گل جان بہت تیز بخار میں پڑی جل رہی تھی۔ کمرہ میں غربی کھڑکیوں کے آئینوں کے ذریعے سے روشنی آرہی تھی۔ مگر انگیٹھی نہ ہونے سے یہ مقام کسی قدر سرد اور نم دار ہو رہا تھا۔ سول سرجن نے آتے ہی انگیٹھی اور کوئلہ کا حکم دیا۔ پھر گل جان کے چہرہ پر جھک کر اس کے خوبصورت لیکن پژمردہ مکھڑے سے خجل ہو کر پوچھنے لگا۔ اس لڑکی کی کیا عمر ہے؟"

امیر جان نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ ابھی سترھویں سال میں آئی ہے

سول سرجن نے گل جان کی نبض دیکھ کر تھرمامیٹر منہ میں رکھ دیا۔ اور گل جان نے آنکھیں کھول کر لمبی آہ بھری۔ اس کی ماں نے بیٹی کے رخساروں پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری لاڈلی بچی چار بجے صبح سے سخت تکلیف میں ہے" سول سرجن نے سخت سردی اور دماغی صدمہ کا بخار تجویز کر کے بیماری کی وجوہات دریافت کیں۔ تو امیر جان نے خوف زدہ آواز میں کہا "ایک شخص اسرائیل خاں میری بچی کو بہکا کر لے گیا تھا۔ اور زبردستی نکاح کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ بڑی مصیبت کے بعد گل جان کو رہائی نصیب ہوئی۔ اللہ نے عزت رکھ لی" پھر دلاور علی نے انگریزی میں مفصل کیفیت بیان کی جس پر سول سرجن نے بیحد تعجب ظاہر کیا۔ اور متین آواز میں بولا "بیشک ایسی خوبصورت لڑکی کے سینکڑوں عاشق اور دشمن ہو سکتے ہیں۔ تم لوگوں کو بڑی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں پردہ کا رواج بہت بہتر ہے۔ مجھے تعجب

ہے۔ کہ تم اس لڑکی کو پردہ میں کیوں نہیں رکھتے۔ ہمارے ملک کی اخلاقی حالت ایسی خراب نہیں ہے۔ کہ عورتوں کو پردہ میں رکھنے کی ضرورت ہو۔ مگر یہاں ہندوستان کے لوگوں میں عورتوں کو محض ذریعہ عیاشی و آرام دہی سمجھ کر ہر شخص انہیں محض نفس پرستی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے۔ کہ گل جان جیسی لڑکی پردہ میں رکھی جاوے۔ میں بنگلہ جاکر دوا تجویز کرونگا۔ ایک شخص میرے ساتھ بھیجدیا جاوے۔ امیر جان مسول سرجن کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئی۔ اور گل جان کو پردہ میں رکھنے کی تجویز کو ضروری سمجھنے لگی۔ لیکن اس لڑکی کے لئے جس نے گرکپن سے ایک طوائف کی صحبت میں پرورش پائی ہو۔ اور ایک طوائف ہی کے خون سے پیدا ہوئی ہو۔ پردہ مفید ہونے کی جگہ مضر ہی ثابت ہوسکتا تھا۔ اور اگر کچھ اور نہیں۔ اس کی صحت جسمانی کو ضرور خراب کرسکتا تھا۔ پہر اس کے ساتھ امیر جان کو یہ بھی سوچنا چاہئے تھا۔ کہ گل جان کی خوبصورتی اس قدر بلاخیز اور مضر نتائج سے پر نہ تھی جتنی اس کی خوبصورتی کی قیمت جو اس مکار اور عیش پرست عورت نے مقرر کر رکھی تھی۔ اصابت یہ ہے:۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

امیر جان نے خود گل جان کے بارے میں بیس ہزار کی رقم کا تذکرہ کرکے اس کی قیمت حد سے زیادہ بڑھا دی تھی۔ اور یہی سبب اوسے مصائب میں پھنسا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ بارے ولی علی صاحب مسول سرجن کیساتھ ان کی ٹم ٹم میں بنگلہ تک گیا۔ اور وہاں سے فی الفور دوا لے کر واپس آیا۔ صاحب مسول سرجن کو ایک دفعہ کی فیس سولہ روپے دی گئی۔ اور ان سے درخواست کی گئی کہ شام کو بھی لحاظ کے لئے تشریف لاویں۔ دنیا وی تکلفات انسان کے لئے درحقیقت ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ بن گئے ہیں۔ جنگلوں میں نہ کوئی بیمار ہوتا ہے۔ اور نہ کسی ڈاکٹر کو سولہ روپے بطور فیس دیا جاتا ہے۔ جس قدر آرام عزت اور ظاہرداری

انسان اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اسی قدر اخراجات کا بوجھ اس کے سر پر لدا لگتا ہے۔ ہندوستان میں تہذیب کی ترقی کے ساتھ تمدن کے لوازمات بھی ترقی پذیر ہیں لیکن جس قدر دولت ممالک متمدنہ میں ہے۔ اس قدر ہندوستان میں نہیں پس نتیجہ یہ ہے۔ کہ یہاں کی پرانی رسوم اطوار و عادات نیز ذرائع آمدنی ممالک غیر کے پر تمدن تعشق کے آگے شکار ہوئے جاتے ہیں۔ ہندوستانی بجائے اصلی ترقی کے تنزل کے گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں۔ رسول مرحوم کی دوا سے گل جان کے بخار اور تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ اور اس کی حالت لحظہ بلحظہ بگڑتی گئی۔ چار بجے شام کی گاڑی سے بلند اختر اور گل جان کے ملازم مظفر نگر سے واپس آ گئے۔ اور بلند اختر بجائے اس کے کہ گل جان کو صحیح و سالم اور تندرست پا کر خوش ہوتا۔ وہ اس کی علالت سے بیتاب ہو گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اسے یہ بات کماحقہٗ معلوم ہو گئی۔ کہ گل جان اور اس کی والدہ دو شب و یک روز اسرائیل خاں کے پنجہ میں پھنسی رہیں۔ اور ایک نوکر کو رشوت دینے سے ان دونوں ماں بیٹیوں کی گلو خلاصی ہوئی مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ اسرائیل خاں کس بنا پر ان کو لے گیا تھا۔ اور پولیس اس بنگلہ سے کس طرح بے خبر رہی۔ اس نے سب سے پہلے تو گل جان کی حالت دیکھی۔ پھر امیر جان سے ہر طرح کے سوالات کئے۔ امیر جان نے معاملہ گول مول بتلا کر کہا "کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بچی کی عصمت بچ گئی" ورنہ عصمت بگڑ جانے میں کیا کسر تھی "اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا۔ تو اسے گل جان کی عصمت کی طرف سے سینکڑوں شبہات پیدا ہو جاتے۔ لیکن بلند اختر گل جان کا سچا شیدا اور اس کی معصومیت میں سچا شریک ثابت ہوا۔ اسکے دل میں تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال پیدا ہوا بھی کہ شاید اس کی معشوقہ کی عصمت بگڑ گئی ہو لیکن اس کے دل کی آگ کو عصمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ بڑی پرانی مثل ہے کہ جب عشق کسی کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ تو عقل اور پیش بندی دوسری کھڑکی کے راستہ سے بھاگ جایا کرتی ہے۔ بلند اختر کو اپنی معشوقہ کی عصمت کھوئے جانے کا ذرہ بھی وہم و شبہ نہ ہوا تھا۔ بلکہ اسے اس مصائب میں گرفتار ہو جانے پر زیادہ

واپس دیکھ کر اس کے دل کی محبت اور بڑھ گئی۔ اور اس نے شرم وحیا کو دور پھینک کر گل جان کے چہرہ کو بے تاب دیوانہ کی طرح دیکھا۔ اور اس کی ماں یا دلاور علی کی موجودگی کا کچھ خیال نہ کر کے اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہا۔ میری لاڈلی گل جان تجھے کیا معلوم ہے۔ میں تیری گمشدگی سے کس قدر پریشان تھا۔" پھر اس کی پامیتی ہٹیھ کر اس کے پریشان اور متوحش چہرہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دو دفعہ گل جان نے آنکھ کھولی۔ اور چیخ مار کر کہا۔ نکاح ہو گیا۔ ہو گیا۔ میں فرحت علی خاں کی بیوی بن گئی۔ ہائے ہائے۔ مری۔ مری۔ پھر وہ دوسری کروٹ لے کر کراہنے لگی بلند اختر نے اس کا سر ہاتھوں سے دبا کر کہا "میری پیاری تم کیا بک رہی ہو۔ اپنی عقل قبضہ میں رکھو۔ تم اچھی ہو جاؤ۔ تو میں اس شخص اسرائیل خاں کو زندہ درگور کر دونگا یہ کلمہ گل جان کے کان میں پہنچا۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اسکی آنکھوں کے آگے بڑے بڑے فربہ جسم اور دیو زاد آدمی چھت کے برابر لانبے کھڑے ہیں۔ اور ان کے سر پر اس قدر جھاری صافے ہیں۔ جیسے کھانا پکانے کی دیگ ہوتی ہے۔ ان ہیبت ناک آدمیوں کے جسم اور صافوں کا بوجھ اسے اپنے سر پر پڑتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے جلدی سے سانس بھر کر دوسری کروٹ لی۔ اور "اماں۔ اماں کہہ کر کراہنے لگی۔ اس کی والدہ نے اس کا سر نرم ہاتھوں سے دبا کر کہا "بیٹی گھبرانے کی بات نہیں۔ تو کل بالکل اچھی ہو جائیگی شجاعت کو پیر سول سرجن کے پاس بھیجتی ہوں" اور یہ کلمہ ادا کر کے اس نے ایک خوراک دوا کی گل جان کے منہ میں ٹپکائی۔ جو میسری خوراک تھی۔ دوا کے گلے سے اترتے ہی گل جان نے سرخ انگاروں جیسی آنکھوں سے بلند اختر کو دیکھ کر چیخ ماری اور رو کر کہا "یہ فرحت علی خاں کھڑا ہے۔ میں اس کی بیوی بن گئی۔ نکاح ہو گیا۔ نکاح ہو گیا۔ زہر۔ زہر۔ زہر۔ میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ پھر دوسری لمبی آہ بھر کر کچھ بڑبڑانے لگی۔ بلند اختر نے اس کا منہ چوم کر کہا "پیاری گل جان یہاں فرحت علی خاں کوئی نہیں۔ تو کیا بک رہی ہے۔ میں تیرا بدنصیب عاشق بلند اختر ہوں۔ ذرا آنکھ کھول تجھے معلوم نہیں۔ کہ تیرے ایک تبسم سے میرے مردہ دل میں جان پڑ جاوے گی

گل جان نے آنکھ کھول کر بلند اختر کی طرف دیکھا۔ اور پھر اماں۔ اماں" کہکر آہستہ سے بولی" فرحت علی خاں۔ مرگیا۔ میرے پیچھے" بھوت۔ بھوت۔ بھوت" اور یہ کہکر گل جان کا سانس پھول گیا۔ امیر جان نے چلا کر کہا۔ ہائے میری لاڈلی۔ لوگو دوڑو۔ ڈاکٹر لاؤ۔ بلند اختر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس نے رو کر کہا۔ دلاور علی خدا کے لئے جلدی سول سرجن کو لاؤ۔ میری گل جان کو سخت تکلیف ہے گل جان بغیر کیا کر دیگا" اس وقت امیر جان کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ اور خورد سال کلن نے رو کر کہا" ہائے سرکار۔ ہائے گل جان سرکار تمہیں کیا ہو گیا" خورد سال لڑکا فرش پر لوٹ لوٹ کر رونے لگا۔ اور اپٹاپاں لگڑنے لگا بلند اختر نے بہرے ہوئے دل سے اسے گود میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا اس وقت گل جان کا سانس بہت بے ترتیب ہو گیا تھا۔ اور اس کے سینہ پر کچھ پسینہ کی علامات ظاہر ہوئیں امیر جان نے نوجوان بیٹی کے سر کو لحاف کھینچ دیا۔ اور اپنا دل پکڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بلند اختر بیحس و حرکت پائینتی کے نیچے بیٹھا رہا۔ اور اس کی آنکھوں سے اس قدر آنسو بہے۔ کہ رفتہ رفتہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد صاحب سول سرجن بہادر گھبرائے ہوئے داخل ہوئے۔ اور گل جان کی نبض و دل و دماغ کا ملاحظہ کر کے کہا۔ اس وقت کی حالت کچھ بری نہیں۔ پسینہ آ رہا ہے" پھر ایک دوا جو سول سرجن گھر سے بنا کر لائے تھے گل جان کے منہ میں ٹپکا دی۔ اور مریض کو آرام میں چھوڑ کر سب لوگ دوسرے کمرے میں چلے گئے"

اڑتالیسواں باب

خاموشی کی ضرورت

صبح صادق ہو جانے پر ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے لیمپ گل کر دیا اور عزیز

دروازہ سے پردہ ہٹا دیا جس کے پیچھے دن کی سفید روشنی شب کے ہولناک نظارہ کے مقابلہ میں نئی دنیا معلوم ہوئی۔ اس نے لائبریری میں جاکر نوکروں کو جگایا اور اپنے لئے منہ ہاتھ دھونے کے واسطے گرم پانی مانگا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں چالیس سال کا مضبوط بہاری جسم کا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ گندمی رنگ اور گول تھا۔ ناک کسی قدر موٹی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ ڈاڑھی چھری اور بالکل سیاہ تھی۔ اس کا قد موزون تھا۔ نہ بہت لانبا نہ پستہ۔ اس کے سر پر بڑی ٹوپی تھی جس پر سیاہ گلوبند بندھا ہوا تھا۔ بدن پر بہاری اوور کوٹ کے نیچے شروانی اچکن اور ٹانگوں میں گرم کشمیرہ کا پتلون نما پاجامہ۔ پاؤں میں سیاہ اونی موزہ کے اوپر سیاہ رنگ کا ولایتی بوٹ تھا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں لائبریری سے واپس آیا۔ تو اس نے فرحت علیخاں کی آنکھیں کھلی ہوئی دیکھیں، جو سر سے لحاف اتارے کراہ رہا تھا۔ ارشاد اللہ خاں نے جھپٹ کر فرحت علی خاں کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اور آہستہ سے پوچھا "خانصاحب کیسی طبیعت ہے" فرحت علی خاں نے مری ہوئی طبیعت میں جواب دیا "میرے سر میں بے حد درد ہے۔ مجھے کیا ہو گیا۔ آپ کون ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں؟"

جی ہاں میں ارشاد اللہ خاں ہوں۔ آپ کو کسی نے زہر دیدیا تھا۔ میں دس بجے رات سے آپ کے علاج معالجے میں لگ رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ آپ بچ گئے۔ اب آپ ایک دوا اور پی لیں۔ تو میں آپ سے اس معاملہ میں گفتگو کروں۔ زہر کے نام سے فرحت علی خاں کے ابرو چڑھ گئے۔ اس کے زرد سوکھے ہوئے چہرے پر تاریکی پھیلنے لگی۔ اور اس نے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں میں جان نہ تھی۔ اس سے اٹھا نہ گیا۔ ارشاد اللہ خاں نے اسے روک کر کہا۔ آپ ہرگز نہ اٹھیں۔ آپ میں اس وقت اتنی توانائی کہاں۔ گھبرائیے نہیں میری موجودگی میں اب آپ کو کوئی زہر نہیں دے سکتا! اتنے میں دربار علی آقا بہ اور سیلا بچی لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور ڈاکٹر ارشاد اللہ کو فرحت علی خاں سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ دھڑکتے دل سے فرحت علی خان کے پاس آیا۔ اور اپنے داہنے ہاتھ کو

کو اچکن سے لپٹکر فرحت علی خاں کی پیشانی پر رکھکر بولا "اللہ آپ کو سو سال کی عمر کرے۔ بڑی خیریت ہوگئی" پھر حبیب سے ایک پرزہ کاغذ نکال کر فرحت علی خاں کے داہنے ہاتھ میں دیدیا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں اپنے بکس سے کوئی دوائی نکال رہا تھا۔ ادھر ملازم نے گرم پانی لاکر دیا۔ تو اس نے گھبراکر کمرہ کے دروازہ کی طرف دیکھا۔ اور یہ سمجھ کر نماز فجر کا وقت نکلا جاتا ہے۔ اس نے بڑی گھبراہٹ میں فرحت علی خاں کے منہ میں دوا چھوڑ دی۔ فرحت علی خاں نے پرزہ کاغذ کو لحاف میں کر لیا۔ دوا نہایت تلخ تھی۔ دربار علی نے مستعدی سے پوچھا "سرکار پان لاؤں" فرحت علی خاں نے گھبرا کر نہیں نہیں کہا۔ اور دائیں کروٹ پر لیٹ گیا۔ اور رقعہ کو پڑھنے لگا یہ خط گل جان کی طرف سے حسب ذیل مضمون کا تھا "

جنابمن۔ آپ نے جس قدر میرے ساتھ تعشق ظاہر کیا تھا۔ وہ سراسر لغو اور نا راستی سے پُر تھا۔ آپ نے جس حیلہ بہانہ سے مجھے طلب کر کے قید کیا۔ اور پہلی ہی شب میری عصمت پر دست درازی کی۔ اس کے غصے میں مجھے آپ سے اس قدر نفرت ہوگئی۔ کہ اگر آپ ایک کروڑ روپیہ بھی میری ماں کو دیں۔ میں ہرگز آپ کی بیوی نہ بنوں۔ اس وقت آپ مجھے اپنے نکاح میں لینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور میں آپ کو دوسری دنیا میں پہنچانے کی فکر کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں یہ خط آپ کے ہاتھ میں پڑ سکیگا یا نہیں۔ لیکن مجھے عدالت کا بھی ڈر نہیں۔ اگر آپ زہر کے اثر سے مر گئے۔ اور مجھے عدالت میں اقدام جرم کا اقبال کرنا پڑا۔ تو میں اپنی عصمت کے مقابلے میں جیل خانہ جانے پر تیار ہوں۔ لیکن آپ کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جس شخص کو آپ نے اسرائیل خان بنایا ہے۔ وہ آپ کا کارندہ ہے اگر میں نے آپ کو زہر دے کر مارنے کی تیاری کی ہے۔ تو اس سے پہلے آپ بڑے سنگین جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ کسی ناکتخدا لڑکی کو زبردستی بھگا لانا اور اسکی عصمت بگاڑ دینے کے لئے زبردستی کرنا کون سے قانون یا شرع سے جائز ہے میں اگر بیس سال کو جیل خانہ گئی۔ تو آپ ضرور دس سال کے لئے کالی کوٹھڑی کا

منہ دیکھیں گے اور اگر آپ مر گئے۔ تو خدا کے یہاں مجھ سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی کیونکہ اپنی عصمت بچانے کا خود خدا اور رسول نے حکم دیا۔ اگر آپ بچ گئے۔ تو بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے صاف دل سے معاف کر کے پھر کبھی میرا نام نہ لیں۔ میں بھی آپ کو معاف کر دونگی اور آپ کے برتاؤ کا کسی سے ذکر نہ کرونگی۔ کیونکہ ہم اسرائیل خاں کے سر الزام تھوپتی ہیں گی۔ اور چونکہ پولیس اسرائیل خاں کو گرفتار نہیں کر سکتی۔ اور ہم آپ کے بھگانے کا پتہ دیتے اس طرح آپ کا نام ان الزامات سے بے لوث رہیگا۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ آپ کی جان بچ جاوے۔ اور آپ مجھے ایک خط میں معافی مرحمت فرماویں۔ آپنے بیس ہزار کا اقرار نامہ جو میری والدہ کو دیا ہے۔ آپ کے خط آنے پر واپس کر دیا جاوے گا۔

(گ) (ج)

اس خط کے مضمون سے فرحت علی خاں کے تن بدن کو آگ لگ گئی۔ اس کے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ اور غصہ کے مارے دماغ سر سے باہر نکلنے لگا۔ کہ زور آدمیوں کو غصہ بھی بے حد آنے لگتا ہے۔ اور اس کی حالت اس وقت ایسی ناگفتہ بہ تھی۔ کہ شاید دنیا میں کوئی اس وقت اس جیسا کمزور ہو۔ اس کا بدن کانپ گیا اور اپنے دانت پیس کر دل میں کہا "اس جہنال کو پہلے دنیا بھر کی عورتوں سے زیادہ خوبصورت سمجھتا تھا۔ مگر اب وہ مجھے مردار کتیا کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔ اگر وہ اس وقت میرے سامنے آجاوے۔ تو میں اس کا خون پی جاؤں۔ میں تندرست ہو جاؤں۔ تو اسے ضرور مزا چکھا دونگا" اس عرصہ میں ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نماز سے فارغ ہو کر کانپتا ہوا فرحت علیخاں کے سرہانے آیا۔ اور نوکر سے مسکرا کر کہا "انگیٹھی میں آگ جلاؤ۔ سردی کے مارے بدن بے قابو ہوا جاتا ہے۔ اب زہر خورانی کا سبب معلوم ہو جاویگا۔ اگر تم لوگ بے تصور ہو تو اس سے کیا بہتر" پھر ارشاد اللہ ایک کرسی کھینچ کر فرحت علیخاں کے پاس بیٹھ گیا۔ اور سنجیدگی سے بولا "خاں صاحب اگر آپ پسند کریں۔ گرم گرم دودھ پی لیں۔ آپ کے چہرہ پر اس قدر بے رونقی اور کمزوری چھا گئی ہے۔ کہ کوئی

شخص شناخت نہیں کرسکتا۔ کہ آپ فرحت علیخاں رئیس جلال آباد ہیں۔ فرحت علیخاں نے آنکھیں نیچی ڈال کر جواب دیا۔ مجھے بھوک ہے نہ پیاس ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے دل سے کوئی طاقت نکل گئی ہے آپ ایمان سے کہئے۔ میں اب اچھا بھی ہو جاؤں گا؟

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے مسکرا کر فرحت علی خاں کی طرف دیکھا۔ پھر کھانس کر کہا" لاحول ولاقوۃ آپ تو اچھے ہو گئے۔ اب کچھ ڈر کی بات نہیں۔ ہاں معمولی تندرستی کے لئے ابھی ایک ماہ علاج جاری رکھنا پڑیگا۔ اگر آپ اجازت دیں۔ دودھ منگاؤں۔ اس وقت دربار علی اور نجیب خاں آگ دہکانے میں مصروف تھے فرحت علی خاں نے آہستہ سے کہا۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے چاء کا سامان کرو اور پاندان دھو کر نئے سرے سے مصالحہ ڈالو" ڈاکٹر ارشاد اللہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے جلدی سے پوچھا" کیا کہئے۔ چونے میں بھی زہر ہے۔ دیکھوں۔ دیکھوں۔ مگر فرحت علی نے گھبرا کر دربار علی کی طرف دیکھ کر کہا" دربار علی اس پاندان کو دھو کر صاف کرو۔ جی نہیں زہر کا اس میں کیا ذکر۔ کل میری پھوپھی اور پھوپھی زاد بہن مقیم تھیں۔ ان کے بچوں نے سارا پاندان ناپاک کر دیا۔ آپ جانتے ہیں۔ مجھے ناپاکی سے بڑی نفرت ہے ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں تو اس کلمہ کی تہ تک نہ پہنچا لیکن دربار علی نے اچھل کر پاندان اٹھالیا۔ اور غسلخانہ میں لیجا کر صاف کرنے لگا۔ پاندان کے اندر اسے دو تین ٹکڑے پان کے بنے بنائے ملے لیکن اس نے انہیں زہر آلودہ سمجھ کر فوراً دور پھینکدیا۔ اور دربار علی نے پاندان دھویا۔ ادھر نجیب خاں نے چاء تیار کی۔ بنگلہ کے باورچی خانہ میں ایک ماما محض تیاری طعام کے لئے مامور تھی۔ اور چونکہ فرحت علیخاں کا قیام زیادہ تر مظفر نگر ہی رہتا تھا۔ اس کوٹھی میں ہر قسم کی اجناس و اشیاء خوردنی ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اصطبل میں چار گھوڑے ایک اونٹ ایک بھینس ایک دوگائیں کھڑی رہتی تھیں۔ فرحت علی خاں کسی قدر شوریدہ سر آدمی تھا۔ کہ ایک رنڈی زادی کے پیچھے پڑ گیا۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے بلک کی معزز بیگمات میں سے کسی کو زوجہ بنا سکتا تھا

دس منٹ کے اندر ڈاکٹر ارشاد اللہ کے لئے چار انڈے مٹھائی بسکٹ وغیرہ لائے گئے۔ اور اس کے ارشاد کے بموجب فرحت علی خاں کے لئے گائے کا دودھ لایا گیا۔ جو ارشاد اللہ نے فرحت علی خاں کے دونوں نوکروں کی مدد سے اٹھا کر پلا دیا پھر نجیب خاں نے بھاگ کر حقہ تازہ کیا۔ اور اپنے رئیس کی سلامتی کا شکریہ ادا کر کے فرحت علی خاں کے منہ سے لگا دیا۔ درباری علی نے چند بڑے پان کے بنائے اور مکلف تھالی میں ارشاد اللہ اور اپنی سرکار کے سامنے پیش کئے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر اپنے اپنے کام لگ گئے۔ اور ارشاد اللہ نے مسکرا کر فرحت علیخاں کے حقہ پر چند دم کھینچتے ہوئے کہا "ہاں تو خانصاحب اس واقعہ کی اصلیت بیان کیجئے۔ آپ رات گل جان اور نکاح کا ذکر کر رہے تھے۔ اس معاملہ کی تہ میں ضرور کوئی راز ہے گل جان شاید وہی عورت ہے جس کی گمشدگی کا مظفر نگر میں گھر گھر چرچا ہے اور کل انسپکٹر صاحب کے منہ سے بھی میں نے یہ ذکر سنا"

فرحت علی خاں کی آنکھوں میں مردنی چھا گئی۔ اور اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے گھبرا کر جواب دیا "کیا میں اپنی بیہوشی میں گل جان اور نکاح کی بابت بڑبڑا رہا تھا۔ آپ یقین جانئے۔ مجھے گل جان کی مطلق خبر نہیں۔ ہاں میں اس کا عاشق ضرور ہوں۔ اور ابھی چند روز گذرے۔ اس کی والدہ کو بیس ہزار روپیہ اس نیت سے دے رہا تھا۔ کہ وہ گل جان کو میری منکوحہ بنا دے۔ مگر اس نے نامنظور کیا۔ میں اس کا عاشق اب بھی ہوں۔ مگر اس کی گم شدگی کا مجھے ذرہ بھر بھی علم نہیں" یہ کب کی بات ہے؟

ڈاکٹر ارشاد اللہ نے فرحت علی خاں کی منفعل آنکھوں کو غور سے دیکھ کر جواب دیا۔ ابھی ایک دو دن کا تازہ معاملہ ہے۔ خیر اگر گل جان کی گم شدگی سے آپ کو کوئی تعلق نہیں۔ تو یہ بتلایئے۔ آپ کو ہیرے کی کنی کس نے کہلا دی"

فرحت علی خاں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس کے کانوں میں ڈرمٹ کی آوازیں آتی ہیں۔ اسے سارا جگہ گھومتا ہوا معلوم دیا اس

نے ذرا دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر آہستہ سے بولا "زہر کا معاملہ یہ ہے۔ کہ کل رات میں نے اپنی پھوپھی دھنیشیرہ کو رخصت کرکے آٹھ بجے کے بعد کھانا کھایا کھانے میں نمک کم تھا۔ میری الماری میں دو تین روز پیشتر کا نمک پسا ہوا رکھا تھا میں نے دربار علی سے نمک مانگا۔ اس نے ایک پڑیا لاکر مجھے دی۔ کم بخت دربار علی کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ کہ اس الماری میں ایک پڑیا سنکھیا کی رکھی ہوئی تھی۔ میری پھوپھی نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ ان کے پرانے گھر میں بمقام جلال آباد چوہے بکثرت ہوگئے ہیں۔ اور آجکل پلیگ کے سبب سے چوہے بڑے خوفناک سمجھے جاتے ہیں۔ جلال آباد میں سنکھیا نہیں مل سکتی۔ اور نہ ہر کس وناکس کو عطار لوگ دیتے ہیں۔ میں آج شام کو بازار گیا۔ تو سنکھیا لینا آیا تھا۔ اور الماری میں رکھکر پھوپھی سے کہدیا تھا۔ کہ چلتے وقت اپنے دامن میں باندھ لیں۔ مگر وہ شاید بھول گئیں سنکھیا عطار کے ہاں پسا ہوا ملا تھا۔ میں نے اسے جھٹ پٹ کھانے میں ڈال لیا۔ اور یہ شومت اعمال سے یہ مصیبت مجھ پر آپڑی۔ اب آپ ہی فرمایئے۔ کہ گل جان کو مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

ارشاد اللہ خاں نے گردن دوسری طرف پھیر لی۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا وہ بڑا تجربہ کار اور چالاک آدمی تھا۔ جو فرضی قصہ اسے فرحت علی خاں نے سنایا اس پر کسی طرح باور کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ درآنحالیکہ وہ خود بوتل کے قطرات شراب اور دستوں سے سنکھیا کی جگہ ہیرے کی کنی دیکھ چکا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "خاں صاحب آپ بچوں جیسی باتیں نہ کریں۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے اگر واقعی آپ نے سنکھیا کھالی۔ تو مجھ سے صاف طور سے کہدیجئے۔ مگر آپ کے دستوں نیز خالی بوتل شراب میں سنکھیا کا نام بھی نہ تھا۔ یہ تو ہیرے کی کنی کا زہر تھا اور اگر آپ کو کسی نے زہر دیا ہے۔ تو میں آپ کی مدد کو ہر طرح تیار ہوں" اور عدالت میں اس زہر کے ذرات کو پیش کرکے حلف اٹھا سکونگا"

عدالت میں ہیرے کی کنی اور اس راز کے طشت از بام ہونیکے ڈر سے فرحت علی خاں

کا کمزور دل لرز گیا۔ اور اس نے آہستہ سے جواب دیا" ارشاد اللہ خاں صاحب آپ اس کمرہ کی چٹخنی لگا دیجئے۔ ارشاد اللہ خاں نے لائبریری کی سمت کا دروازہ بند کر دیا۔ تو فرحت علیخاں نے اپنا خوفزدہ چہرہ اس کی طرف کر کے جواب دیا" خانصاحب جو کچھ آپ فرما رہے ہیں رہیں اس کی بابت آپ سے جرح کرنے کی طاقت رکھتا ہوں لیکن اگر آپ اس معاملہ کو کسی پر افشا نہ کریں۔ تو میں آپ کا ساری عمر شکر گزار رہونگا اور آپ میرے اتنے پرانے دوست ہیں۔ کہ مجھے مشکلات میں پھانسنے کی جگہ غالباً میری مدد کریں گے"

ارشاد اللہ نے نہایت متین چہرہ بنا کر کہا" خاں صاحب آپ کیا باتیں کر رہے ہیں میں ہمیشہ آپ کا سچا دوست ہوں۔ بخدا میں آپکے راز کو اپنا راز سمجھونگا۔ آپ معاملہ تو سنا دیئے" فرحت علی خاں نے دھڑکتے ہوئے دل سے گل جان کا خط ارشاد اللہ خاں کے ہاتھ میں دیدیا جسے ڈاکٹر نے بڑی بے چینی اور اضطراب سے پڑھا۔ پھر متوحش صورت بنا کر بولا" میں اس کا مطلب نہیں سمجھا"

فرحت علی خاں نے مقید چور کی طرح بے بس ہو کر کہا" دراصل گل جان کو میں نے ہی طلب کیا تھا۔ اور اس سے نکاح کر چکا ہوں۔ لیکن معلوم نہیں اس نے کس طرح مجھے زہر دیدیا۔ کہ حین شب زفاف میں وہ میرے پہلو سے دوشیزہ نکل کر چلدی سا اور مجھے اپنی دانست میں مار گئی۔ اب فرمایئے میرا قصور زیادہ ہے یا اسکا میں اس کا عاشق تھا۔ اور دراصل اسے دنیا بھر کی محبوبوں سے زیادہ دلربا سمجھتا تھا میں اس کے حاصل کرنے کے واسطے اپنی ساری دولت نثار کر دینے پر تلا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر مسکرا کر بولا" خاں صاحب مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ضرور ہے لیکن قصور آپ کا بھی کچھ کم نہیں۔ آپ نے واقعی بڑے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ کہ ایک دوشیزہ لڑکی کو زبردستی اپنے نکاح میں کھینچ لیا۔ میں اس بات کی قسم کھاتا ہوں۔ کہ آپکا راز کسی پر افشا نہ کرونگا

لیکن یہ تم مشروط ہے ایک معاہدہ پر آپکو معلوم ہے میرا کاروبار عرصہ سے بگڑا ہوا ہے اور مجھے دو ہزار روپیہ قرضوں میں دینا ہے۔ اگر آپ دو ہزار کی کفالت کر سکیں۔ تو میں بے دامو آپ کا غلام بن جاؤنگا۔ اور آپکی طرف ہو کر اس عورت کو سزا دلا سکونگا۔ اس وقت ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کے چہرہ پر مکروہ جمالت کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے چند جنگلی سور بھاگتے ہوئے دیکھ لئے۔ فرحت علی خاں نے اطمینان کا سانس بھر کر کہا "دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں۔ میں تمہیں دو ہزار ضرور دونگا۔ لاؤ یہ رقعہ واپس دو۔ میں گل جان کو سزا دلانا نہیں چاہتا میرا معزز خاندان عدالتی جرح و قدح کی تاب نہیں رکھتا" فرحت علی خاں نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے رقعہ لینا چاہا۔ مگر اس نے مسکرا کر جواب دیا "آپ اس رقعہ کو لیکر کیا کریں گے فرحت علیخاں نے کہا۔ لائیے میں آگ میں ڈالدوں"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے غضب ناک بھیڑیئے کی طرح فرحت علیخاں پر آنکھیں نکال کر کہا "جی نہیں پہلے دو ہزار دلوائیے۔ پھر رقعہ دونگا" یہ کہکر ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے لائبریری کے کیواڑ کھول دیئے۔ اور فرحت علیخاں کے پاس آکر آہستہ سے بولا "روپیہ کی کچھ جلدی نہیں۔ میں آپ کا دلی دوست ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں۔ دنیا میں موقعہ نہیں مل سکتا۔ میں اس رقعہ کو دو ہزار کی ضمانت سمجھ کر پاس رکھوں گا۔ اور جب آپ دو ہزار دیدیں گے۔ یہ رقعہ آپ کے حوالہ کر دونگا۔ اس وقت مجھے اجازت دیجئے۔ میرے متعلقین میری غیر حاضری سے بے چین ہو رہے ہونگے"

فرحت علیخاں نے مردہ دلی سے "بہت اچھا" کہا اور بالآخر اسے اس معاملہ پر خاک ڈال کر خاموش ہو جانے میں مصلحت معلوم ہوئی"

انچاسواں باب

مشکلے نیست کہ آساں نشود مرد باید کہ ہراساں نشود

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں اپنا چرمی بیگ لئے ہوئے فرحت علی خاں کی عظیم الشان کوٹھی فرحت منزل کے برآمدہ میں کھڑا تھا۔ سامنے نکلنے والے آفتاب کی شعاعیں لانبے درختوں کے پتوں کو مس کرتی ہوئی برآمدہ کے فرش پر بکھر رہی تھیں۔ کہ اسے کوتوالی مظفر نگر کا انسپکٹر اور چند کانسٹبل اپنی طرف آتے ہوئے دکھلائی دیئے ان کے چہرہ پر تعجب اور خوف کا اثر پیدا ہوا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مجرم لوگوں کا دل بہت بے قرار ہوتا ہے۔ کیا اس وقت ارشاد اللہ خاں مجرم نہ تھا۔ اگر وہ محض دوستی کے ارادہ سے فرحت علیخاں کے راز کو پوشیدہ رکھتا۔ تو بھی جرم کی اعانت میں شریک ہوتا۔ اور اس وقت تو وہ دو ہزار روپیہ کے عوض اخفائے راز کا بیڑا اٹھا چکا تھا۔ وہ مجرم خواہ مخواہ بن گیا تھا۔ اور اب اور کون شخص تھا۔ گل جان کی پُر جرأت اور بے باکانہ تحریر اس کے اور رکوٹ کی جیب میں تھی۔ پولیس انسپکٹر کسی سبب سے ادھر آ رہا ہوگا۔ مگر اسے مجرم کی تلاش تھی۔ ارشاد اللہ خاں بھی ایک قسم کا مجرم تھا۔ اس کا دل تردد کے مارے سکڑنے لگا۔ اور وہ الٹے پاؤں اندر داخل ہوا۔ دربار علی نے ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کے فق شدہ چہرہ کو تعجب سے دیکھ کر پوچھا "کیا کچھ بھول گئے؟"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے خوف زدہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا "نہیں کچھ نہیں" پھر لپکا لپکا فرحت علیخاں کی آرام گاہ میں پہنچا۔ اور اسکے سوکھے ہوئے مضطرب چہرہ کو متانت سے دیکھ کر بولا "انسپکٹر پولیس آ رہا ہے" غالباً گل جان کی تلاش میں آیا ہے۔ تم زہر کا ذکر مت کرنا۔ میں درد قولنج کی سخت تکلیف کا بہانہ کر دونگا۔ سمجھے تم کوئی بات منہ سے نہ نکال کر کام نہ بگاڑ دینا۔ میں تمہارا دوست ہوں" پھر وہ لپکا

نیکا باہر آیا۔ اور برآمدہ میں انسپکٹر کو السلام علیکم کہکر شستہ و بھیبی آنکھوں سے پوچھنے لگا۔ آپ نے کیسی تکلیف فرمائی۔ بعض مجرمین اپنی موشگافی اور زمانہ سازی سے بے قصور سیدھے سادے بچوں کی صورت بن جایا کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو جرم میں شریک ہونے کا پتا ہی موقعہ تھا۔ اس کے دل پر ایسا خوف چھایا۔ وہ خواہ مخواہ مجرم کی صورت بن کر انسپکٹر کو شبہات میں ڈالنے کا موقعہ دینے لگا لیکن انسپکٹر اس وقت اپنی سراغ رسی حالت میں نہ تھا۔ وہ فرحت علیخاں کی ریاست اور امارت سے مرعوب ہو کر کہنے لگا۔ اور صحیح رہا تھا۔ کہ اس سے ملکر گلخان کی بات کس طرح ذکر چھیڑے۔ اس نے پیشانی پر پریشانی کے بل ڈال کر کہا "میں فرحت علیخاں سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ آپ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیا کوئی بیمار ہے" لاتے ہیں دربار علی خیب خاں برآمدہ میں آگئے۔ اور انسپکٹر کو ادب سے سلام کر کے کہا "اندر تشریف لے آیئے۔ انسپکٹر معہ اپنے کانسٹیبلوں کے اندر داخل ہوا۔ اور ڈاکٹر ارشد اللہ خاں کا دل خون کے مارے بیٹھنے لگا۔ بارے اسنے دل قوی کر کے جوابدہا۔ فرحت علیخاں صاحب رات یکایک بیمار ہو گئے۔ درد قولنج کا ایسا دورہ پڑا۔ کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ شاید ہی آپ سے ملاقات کریں۔" انسپکٹر نے بے پروائی کیساتھ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو دیکھا۔ پھر فرحت علی خاں کے اذکروں کی طرف دیکھکر بولا جن مستورات کا تم نے شام کو ذکر کیا تھا انہیں پردہ میں کر دو۔ میرا ان کو تلاشی لینا چاہتا ہوں" ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں اور نوکروں نے یک زبان ہو کر کہا "خیریت کا معاملہ ہے" پھر دربار علی نے کہا اس کر عرض کیا "سرکار کی بہو بیٹی اور بھتیجہ تو چلی گئیں۔ آپ شوق سے تلاشی لیں مگر سرکار سے اجازت لے لیجئے" انسپکٹر کی زبان سے "اچھا اطلاع کر دو" نکلا۔ اور سب آدمی آہستہ آہستہ لائبریری میں جمع ہو گئے۔ "دربار علی نے اندر اطلاع کی اور انسپکٹر اپنے آدمیوں کو لائبریری میں چھوڑ کر آرام گاہ میں گیا۔ ارشاد اللہ خاں بیٹھے دل سے پیچھے ہو لیا۔ انسپکٹر نے فرحت علیخاں کی پائینتی پہنچکر السلام علیکم کہا۔

فرحت علیخاں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ مگر ارشاد اللہ خاں نے روکدیا۔ انسپکٹر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور متغفل آنکھوں سے فرحت علیخاں کو دیکھکر بولا "جناب خانصاحب میری گستاخی معاف کیجئے گا۔ میرے فرائض منصبی مجھے مجبور کرتے ہیں۔ کہ میں آپ کی کوٹھی کی تلاشی لوں" آپنے شاید سنا ہو۔ سہارنپور کی ایک طوائف اور اس کی لڑکی گلجان کو لوگ بہکا لائے ہیں۔ کوئی شخص اسرائیل خاں سرغنہ ہے۔ کل شام گلجان کے عدوت بلند اخترسے پرسیل تذکرہ معلوم ہوا۔ کہ آپ بھی عرصہ سے گل جان کے گھر لگے رہا کرتے تھے۔ پس تحقیقات اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی۔ کہ آپ کے اظہارات لیکر تلاشی نہ لیجاوے"

فرحت علیخاں کا دل ڈر کے مارے سکڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تاریکی اور کانوں میں شاں شاں کی آوازیں پیدا ہوئیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اس کی زبان تالوے سے لگ گئی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زبان نہ اُٹھتی تھی۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں موقعہ کی نزاکت اور فرحت علیخاں کی پریشانی تاڑ گیا۔ اور اس سے مسکرا کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ پھر قہقہہ مار کر بولا "خوب خانصاحب کیا آپ بھی گل جان کے عاشق ہیں۔ مجھے خبر نہ تھی لیکن انسپکٹر صاحب دس بجے رات سے تو میں یہاں ہوں میں نے تو یہاں گل جان کا ذکر ہی نہیں سنا۔ ان کی بہو بیٹی اور بہن کا ذکر تھا۔ فرحت علیخاں صاحب نے تکلیف کے اندر کسی بار اپنی بہو بیٹی کو آواز دی۔ مگر نوکروں نے معلوم ہوا۔ کہ وہ دس بجے شب کی گاڑی سے دیوبند چلی گئیں۔ اس وقت فرحت علیخاں کے دل سے کچھ خوف کم ہوا۔ اور اس نے کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا "بیشک میں گل جان پر عرصہ سے شیدا تھا۔ اور اب بھی اس کا عاشق ہوں مگر مجھے اس کی گندگی کا علم نہیں۔ میرے یہاں چار روز سے میری بہو بیٹی اور اس کی دختر مقیم تھی۔ لڑکی کچھ بیمار رہتی ہے۔ حاجی محمد عابد صاحب کے پاس علاج کیلئے گئی ہے آپ شوق سے تلاشی لیجئے" انسپکٹر کے چہرہ پر سرخی پھیل گئی۔ اور اس نے بہت اچھا کہکر لائبریری کا راستہ لیا۔ پھر اپنے کانسٹیبلوں کو لیکر دس کوٹھی

کے جملہ کمروں۔ باورچی خانہ۔ اصطبل وغیرہ کو بڑی ہوشیاری سے دیکھا۔ انسپکٹر نے نصف گھنٹہ تک چہان بین کی۔ اور کوٹھی کے تہ خانہ میں اگر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوئے۔ لیکن دربار علی نے بڑی مستعدی سے بتلایا کہ اس کمرہ میں سرکار کی پھوپھی اور ہمشیرہ تھیں۔ ہمارے سرکار کو بچوں کی نسبت سے بڑی نفرت ہے۔ کمرے ناپاک ہوجانے کے سبب سے یہ کمرہ الگ صاف کردیا گیا تھا۔ انسپکٹر نے سب باتیں نوٹ کرلیں۔ پھر فرحت علی خاں کے اظہارات قلم بند کرنے کے لئے استراحت خانہ میں آیا۔ فرحت علی خاں نے اپنے اظہارات میں گل جان کی گمشدگی سے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔ اور اپنی پھوپھی و ہمشیرہ کی موجودگی میں فوج کی سخت تکلیف کو بڑی عمدگی سے دوہرادیا۔ انسپکٹر کو فرحت علی خاں اور ڈاکٹر ارشاد اللہ خان کے اظہارات سے اطمینان ہونے کی جگہ ایک قسم کا خلجان اور شبہات پیدا ہوگئے۔ اور وہ اس فکر میں ہوا کہ کسی طرح دیوبند جاکر فرحت علیخاں کے بیانات کی تحقیقات کرے لیکن جوں ہی وہ فرحت منزل سے نمٹ کر کوتوالی پہنچا۔ اسے قریب کے ایک قصبہ سے ایک خوفناک قتل کی خبر ملی جس میں ایک نوجوان ہندو لڑکی کسی اشتعال انگیز خاطر جھپٹنے کی علت میں اپنے شوہر کے ہاتھ سے فوج ہوگئی۔ انسپکٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے مگر اسی وقت قصبہ کے ارادہ سے روانہ ہوگیا۔ اور جب چار بجے شام کے لاش معائنہ کرکے آیا تو اسے بلند اختر کا رقعہ ملا جس میں لکھا تھا "گل جان اور اس کی والدہ سہارنپور پہونچ گئی ہیں۔ جمعہ نام ولد علی کا نام سہارنپور سے آیا تھا۔ آپ تحقیقات جاری رکھیں میں مفصل کیفیت سہارنپور سے روانہ کرونگا اگلے دن صبح کی ڈاک سے جو خط انسپکٹر کے نام بلند اختر کے پاس سے آیا اسکا مضمون حسب ذیل تھا

میں سہارنپور پہونچگیا۔ گل جان بہت سخت بیمار ہوگئی ہے۔ سول سرجن کا علاج ہورہا ہے دونو ماں بیٹیوں کے بیان سے اتنا پتہ لگتا ہے۔ کہ اسرائیل خاں ان دونوں کو کسی بنگلہ میں لیگیا تھا جہاں اس نے گل جان کی عصمت برباد کرنے اور اس سے زبردستی نکاح کرنیکی کوشش کی لیکن گل جان کی عفت خوش قسمتی سے بچگئی۔ اور ایک نوکر رشوت دینے پر دونوں ماں بیٹیوں کی گلوخلاصی کی دونوں عورتیں اس بنگلہ کا پتہ نہیں بتاسکتیں۔ اور نہ اسرائیل خاں کے سوا کسی شخص کو پہچان سکتی

آپ اسرائیل خاں کی گرفتاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اس کا حلیہ ہاں بیٹیوں نے بالکل وہ ہی بتلایا ہے۔ جو میں اور داماد علی درج کرا چکے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا۔ کہ آپ خود سہارنپور تشریف لاویں اور گل جان کی صحتیابی پر مفصل کیفیت خود معائنہ کر لیں۔ بلند اختر کے خط سے انسپکٹر کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی وہ اسرائیل خاں کی گرفتاری میں پہلے ہی دن سے بہ گرمی دکھلا رہا تھا لیکن اس پر یہ معلوم کر کے کہ گل جان کا کوئی تعلق فرحت علی خاں سے نہیں تھا۔ اور اس کے روز گذشتہ والی تحقیقات سراسر لغو اور فضول ثابت ہوئی اسے ایک قسم کی خجالت بھی تھی اسی نوجوان ہندو لڑکی کے قتل اور اس کے شوہر کی فراری سے دوسری طرف بھی دھڑا دھڑ پے در پے کم مصیبت آ رہی تھی اس نے جس قدر جلد ممکن ہو سکا۔ اپنے سب انسپکٹر ماتحت کو سہارنپور بھیجا۔ سب انسپکٹر نے گل جان کو بالکل بیہوش پایا۔ اور اس کے بیانات قلم بند کرنیکا کوئی موقعہ اسے نہ ملا۔ البتہ اس کی ماں نے بڑی خوفزدہ اور متوحش بے ربط فقروں میں سب الزام اسرائیل خاں کے سر تھوپا۔ اور سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا۔ کہ اس کی بیٹی کی عزت کروڑوں روپیہ کی تھی جب وہ بچ گئی۔ تو اسے آئندہ کسی بات کا ڈر نہ تھا۔ رہا اسرائیل خاں وہ ضرور کسی دن پکڑا جاویگا۔ داماد کے معاملہ کے بیچ و تاب سے کسی قدر نابلد تھا۔ اور نہ اسے گل جان کے ساتھ کوئی ہمدردی تھی۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ بلند اختر نے گل جان کی والدہ کے اظہارات کو مستحکم کرنے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے ساری مصیبت کا ذمہ اسرائیل خاں کو ٹھہرایا۔ اور اپنے بیان میں صاف طور سے یہ بات درج کرائی۔ کہ وہ گل جان کی عصمت محفوظ رہنے کا پورا اعتقاد مند تھا۔ اور ایک لحظہ کے لئے اس کی اخلاقی قوت پر بے اعتباری کرنیکے لئے تیار نہ تھا۔ اور بجز اس کے فرحت علی خاں کی مشکلات ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کے سپرد کیں اور چلا گیا۔

پچاسواں باب

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کی چاندی ہو گئی

کسی کا گھر چھپے کوئی تالے بڑی پرانی کہاوت ہے۔ اور اسے کا قرار واقعی استعمال اس وقت بہت اچھا ہو رہا تھا۔ بلکہ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں فرحت علیخاں کے ہاتھ سے گل جان کی تحریر لیکر واقعات کی پیچیدگی سے اپنے مفاد کو عملی صورت میں کہڑا کرنیکی فکر میں لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے گو اب تک کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے چند سال گذشتہ کی مالی مشکلات اور اس سال کے بنیادی تجربہ نے اس کے دل کو ایسا سخت اور آزردہ کر دیا تھا۔ کہ جس کسی معاملہ میں اسے روپیہ ملنے کی توقع نظر آتی۔ وہ اس کے سامنے دین و ایمان کی فروشی کی پرواہ نہ کرتا۔ اس شکل سے کرتا۔ اس نے جب فرحت علیخاں کی بے بسی اور اپنی کامیابی کا موقعہ دیکھا۔ اپنی حالت میں فرحت علیخاں نے اسے دو ہزار روپیہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ تو وہ اپنی غیر متوقع فتحیابی پر چونک گیا اصلیت یہ ہے انسان اس دنیا میں بالکل اندھے بادلوں کی طرح دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے اسے ذرا علم نہیں ہوتا کہ کل کیا ہونیوالا ہے۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو جب نجیب خاں بلانے گیا۔ تو وہ اپنی تکلیف اور درد سر کا معاوضہ سو پچاس روپیہ سے زیادہ نہ سمجھتا تھا۔ مگر رات بھر فرحت علیخاں کی تیمارداری کرنیکے بعد اسے یکایک ایسی بڑی نظر آئی۔ کہ وہ اس پر قدم رکھتے ہی کامیابی اور فارغ البالی کے قصر سر بفلک چومنے اپنے قرضخواہ اور بیگانوں کو شکست سے جبرک دینے کی قابلیت حاصل کر لی۔ ایسے سنہری موقعہ کو بہت کم لوگ ہاتھ سے دیتے ہیں۔ اور ایسے نازک وقت پر ضمیر اور نفس کی جنگ قابل دید ہوتی ہے لیکن در اصل دنیاوی آلائش اور صورت ضمیر کو اتنی تکلیف نہیں پہنچتی جتنی نفس جیسے متعدد اور ہر قدم کے کام دینیوالے اگر کوئی کرتب کا مقابلہ ہیں۔ کہ نفس ایسی غیر متوقع حالت میں صرف زیادہ مشتعل ہو کر ان اسباب پر ہاتھ پھیلانے لگے جنکا حصول اسے ساری عمر کیواسطے بیفکر اور آزاد کر دے۔ نفس کی فریاد اور ذوق و شوق سے تھوڑی دیر کے لئے ضمیر مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور اپنے نفس کا شکار بنکر ضمیر کے کئے ہوئے طعنہ زنی سے ایک قسم کی نئی تکلیف میں پھنس جایا کرتا ہے جسکا نام عقلمند نے پشیمانی رکھا ہے مگر یہ حالت بہت دیر بعد پیدا ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کا حریص اور دنیاوی دل اپنی کیفیت سے بالکل اندھا تھا اور وہ ہائے ہائے کہکر چلا رہا تھا کہ اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے دے ان خیالات کی پرورش میں چند منٹ سے زیادہ عرصہ نہ لگا ہوگا کہ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں بہت دیر کی طرح دو ہزار روپیہ کی تھیلی پر ہاتھ مارنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور وہ تھیلی پیش آگئی۔ مان مان میں تیرا نہ جان

لیکن انسپکٹر پولیس کی آمد اور بنگلہ کی تلاشی اور نیز ایک خفیہ تہ خانہ کی برآمدگی سے ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو دو ہزار روپیہ کے حصول میں ایک دیوار حائل معلوم ہوئی اس کا جو کنا اور مضطرب دل اس دیوار کی مسماری پر تل گیا۔ اور وہ اپنے گہرے جال میں اسی سوچ بچار میں رہا۔ کہ اگر بے ایمانی سے دو ہزار کما یا جاوے تو کوئی کمزوری کا پہلو ایسا نہ رہ جاوے کہ وہ معاملہ کی برہمی کی کالی کوٹھری بن جائے۔ وہ اسوز تمام دن غلطاں و پیچاں رہا اور اس کے دل پر جو پریشانی اور خوف رہ زمرہ چھایا رہتا تھا۔ وہ آج معمول سے زیادہ خوفناک اور مصیبت خیز معلوم دیا لیکن ان جملہ تکالیف اور دلی پریشانیوں کے بیچ اگر کوئی چیز تقویت بخش یا ڈھارس بندھانے والی تھی۔ تو وہ یہ تھی۔ کہ دو ہزار کسی طرح فوراً حاصل کیا جاوے۔ اگر کوئی تدبیر ایسی ہو۔ کہ وہ پولیس کے بکھیڑوں میں پڑنے سے بچے۔ اس کا جال اور انتشار پریشان دل اس معرکے میں زیادہ دیر مصروف نہ رہا۔ اس نے شام تک یہ بات طے کر لی کہ دو ہزار کی رقم تو اسکی ہر طرح سے ہو گئی تھی لیکن انسپکٹر پولیس پر اس تہ خانہ اور مستودات کی رسائی و یونہ اپنے بیانات کے مطابق کسطرح ثابت کرے۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں اپنی مصیبت کے سبب معاملات اپنی زوجہ کو سنایا کرتا تھا آج اسنے فرحت علیخاں کی زہر خورانی اور قتل جان کی شرارت نیز بے گناہی کا سب دکھڑا اپنی بیوی سے کہہ دیا اور اپنے آپ کو فرحت علیخاں کا سچا دوست ثابت کر دینے کے لئے اسلئے اس بات پر رضامندی کیا کہ وہ فرحت علی خاں کی بیوہ بی بن کر دیوبند جاوے۔ اور اپنی نوجوان بیٹی راشدہ کو ایک دو روزہ کے واسطے حاجی محمد عابد صاحب کی خدمت میں جہت معالجہ بھیجا دے۔ شروع میں تو اس کی زوجہ ان متوحش خیالات پر بہت جھلائی اور اگر اوسے دو ہزار روپیہ کی خبر لگ جاتی۔ تو وہ غریب معصوم شریف زادی کبھی اپنے شوہر کو اعانت جرم کا مشورہ نہ دیتی لیکن بالآخر ارشاد اللہ خاں نے ایسی ایسی میٹھی باتیں بنائیں اور فرحت علی کی وہ کالیے مضبوط اور سفارشانہ الفاظ میں دم بھرا۔ کہ وہ بیچاری پسیج کر دیوبند جانے پر راضی ہو گئی۔"

---

* جناب مولانا حاجی محمد عابد صاحب سلمہٗ دیوبند ضلع سہارنپور کے بڑے ذی وجاہت بزرگ ہیں۔ جن کے فیض سے ہزارہا نفوس فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

اپنی زوجہ کو رضامند کرکے ڈاکٹر ارشاد اللہ فرحت علیخاں کے پاس آیا۔ اور معاملہ کے نشیب و فراز پر اچھی طرح بحث کرکے بولا۔ میں دو ہزار کی رقم تم سے بطور مختانہ کے وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انسپکٹر پولیس تو خانے اور تمہاری پھوپھی دہشیرہ کے فکر سے کچھ بدگمان ہوگیا ہے۔ اور غالباً ان باتوں کی خوب تحقیقات کریگا۔ اگر تم پسند کرو میں اپنی زوجہ کو تمہاری پھوپھی اور اپنی لڑکی کو تمہاری ہمشیرہ بنا کر دیوبند لیجاؤں میری لڑکی چند روز سے کچھ بیمار رہی ہے۔ میں خلل آسیب کا بہانہ کرکے حاجی صاحب موصوف کو بھیجا دیدونگا۔ لیکن میری زوجہ اور لڑکی تنہا نہیں جاسکتیں۔ تم میں جانے کی توانائی نہیں۔ اور نوکروں پر یہ کام چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اگر تم دو ہزار کی جگہ تین ہزار دینے پر راضی ہو۔ تو میں خود تمہارے کسی عزیز کے نام سے دیوبند جاؤں۔ اور معاملہ کو پختہ کرآؤں۔ فرحت علی خاں تمام دن متوحش خیالات میں پیچ و تاب کھا کھا کر نیم مردہ ہوگیا تھا۔ اور اسے اپنی علالت کے پیچھے پولیس کے مکھیڑوں کا حد سے زیادہ خوف دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے ارشاد اللہ خاں کی گفتگو اور مشورہ کو نہایت صائب سمجھا۔ لیکن ایک ہزار کے مزید خرچ سے جھجکا۔ مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ وہ اپنی حماقت اور شوریدہ سری کا نتیجہ اب سزائے اس کے کچھ اور نہیں سمجھتا تھا۔ کہ اس جھوٹے دوست کی مٹھی گرم کرکے اسے بھی اعانت جرم میں شریک کرلے۔ اس نے خوابیدہ آنکھوں سے ارشاد اللہ خاں کی طرف دیکھا۔ پھر لمبا سا سانس بھر کر بولا "وہ اختم ہوگئی۔ آپ بھی وہ دا اور بنادیں اس سے مجھے فائدہ معلوم ہوتا ہے لیکن یار تم تو شہ گمن کی طرح مجھ پر پڑ گئے ہو۔ دو ہزار بہت کافی ہے۔ اپنی زوجہ محترمہ کو ضرور دیوبند لے جاؤ۔ میری پھوپھی آجکل جلال آباد ہے۔ اس کے بڑے بیٹے کا نام اضیا رعلی خاں ہے۔ تم اضیا رعلی بن کر دیوبند جاؤ"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے اچھل کر کہا۔ اس طرح تو ٹھیک نہیں بیٹھتا لاحول ولاقوۃ میں اپنی بیوی کا بیٹا کس طرح بن سکتا ہوں۔ نعوذ باللہ کسی اور شخص کا

نام لو۔ لیکن میں تین ہزار سے کم پر یہ عصمت مول۔ لینے والا نہیں معاملہ اس قدر نازک ہوگیا ہے۔ کہ میں اس رقعہ کو آپ کو دیکر میں اپنی گلو خلاصی کرنا چاہتا ہوں مجھے ڈر ہے۔ کہ تمہارے ساتھ میں بھی پولیس کے ہتھکنڈوں میں نہ پھنس جاؤں اگر تین ہزار نہیں دے سکتے۔ تو اپنا رقعہ واپس لو۔ میں ابھی پولیس انسپکٹر سے جاکر کہتا ہوں کہ نوکروں نے جھوٹ بولا۔ تمہارے گھر میں گل جان اور اس کی والدہ تھی"۔

فرحت علی خاں کا دل خوف کے مارے ڈوبنے لگا۔ اس کے چہرہ اور آنکھوں میں تاریکی پھیل گئی۔ اور گھبرا کر بولا "خوب آپ بھی بڑے دھوکہ باز ہیں آپ تو میرے دوست بنتے تھے۔ ایسے دوستوں پر خدا کی پھٹکار۔ خیر تمہیں تین ہزار درکار ہے میں ابھی رقعہ اپنے پاس رکھو"۔

جس وقت ارشاد اللہ خاں نے تین ہزار کا نام سنا اس کا سب غصہ فرو ہوگیا اور وہ مسکرا کر بولا "ہاں تو کسی دور کے رشتہ دار کا نام بتلاؤ" فرحت علی خاں نے سوچ کر جواب دیا "حرمت علیخاں کہدینا" "میری پھوپھی کا شوہر حرمت علیخاں ہے اس گفتگو کے ختم ہو جانے پر اسی شب ارشاد اللہ خاں اپنی زوجہ و دختر کو لے کر دیوبند پہونچا۔ اور اگلے دن حاجی محمد عابد صاحب سے ملاقات کی۔ اور اپنے متعلقین کو پیش کر کے بولا "میں دو روز سے سرائے میں مقیم ہوں۔ لڑکی کچھ زیادہ علیل ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔ اب حضور کی خدمت میں آیا ہوں۔ اسے عرصہ سے آسیب کا خلل ہے حاجی صاحب موصوف نے دونوں عورتوں کو اپنی بیٹھک میں مقیم کر کے کچھ فلیتے جلا کر امتحان کیا۔ اور آسیب خلل کی تردید کی۔ مگر ارشاد اللہ خاں اپنی ہٹ پر اڑا رہا۔ اور دو دن دیوبند میں حاجی صاحب کا مہمان رہا اس کی دوسری اور تکلیف کسی قدر کارگر گئی کیونکہ کوتوالی مظفر نگر کا کوئی شخص دیوبند نہ آیا۔ مگر پولیس مظفر نگر کے ڈر سے ارشاد اللہ خاں بھی زنان خانہ میں گھسا رہا۔ اور اپنے آپ کو مریض بنانے کے لئے سخت دست آور دوا کھا بیٹھا۔ جب دو دن کے بعد اس کے بدن میں معمولی طاقت آگئی۔ تو اس نے حاجی صاحب سے اجازت روانگی مانگی۔ اور پر سر تذکرہ دریافت کیا۔ آیا اس کے عزیز فرحت علیخاں

کے پاس سے کوئی آدمی تو نہ آیا تھا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ کسی طرح پولیس مظفر نگر کی خبر مل جاوے۔ جناب حاجی صاحب نے لاعلمی ظاہر کی اور ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کی تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اس کی وجہ اور دخل جناب حاجی صاحب کے تابعین میں شمولیت کا اعزاز حاصل کر کے صدق دل اور بڑے اطمینان سے مظفر نگر واپس آئیں۔ مظفر نگر آنے پر ارشاد اللہ خاں نے فرحت علی خاں سے لمبی چوڑی ملاقات کی اور اسے تندرست پاکر سمجھ گیا۔ کہ پولیس مظفر نگر اب اس کی طرف سے بے فکر ہو گئی تھی۔ فرحت علیخاں نے اس کی سرگرمی سے متاثر ہو کر اپنی گذشتہ سخت و سست تقریر پر معافی مانگی اور تین ہزار کا چیک ارشاد اللہ خاں کے لئے لکھنے بیٹھا۔ مگر ارشاد اللہ خاں نے گھبرا کر جواب دیا۔ "ابھی آپ صبر کریں جب پولیس بالکل ٹھنڈی پڑ جاوے گی۔ اس وقت دیکھا جاوے گا۔"

پولیس کے نام سے فرحت علیخاں کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ مگر اس نے ارشاد اللہ خاں کو اپنے سے زیادہ چالاک اور تیز فہم سمجھ کر چیک لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تاکہ اسے معلوم ہوتا۔ کہ ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کسی دوسری فکر میں تھا۔ اور گل جان کے رقعہ سے گلجان اور اس کی والدہ کو ورغلا کر ہمکا ہزارہ و ہزارا اور چھینے کا منصوبہ باندھ رہا تھا۔"

اکیاونواں باب

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

فرحت علیخاں کی خوفناک زہر خورانی کو دس روز گذر گئے تھے۔ اور اب اس کی صحت معمولی رفتار پر آنے لگی تھی۔ اگرچہ اس نے ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے یہ ایام حبس تذبذب اور بے چینی میں گذارے۔ ان کی کیفیت دوسری جگہ گلجان اور اس کی والدہ کے دلوں پر ضرور عکس ہو رہی تھی۔ چالاک ڈاکٹر وقتاً فوقتاً پولیس کے کانسٹیبلوں اور انسپکٹر کوتوالی سے مل مل کر بڑی بے پرواہی لیکن اندرونی خدشہ کے

حیدر سے اسرائیل خاں کی نقل و حرکت کا پتہ لگاتا رہا تھا۔ مگر اسے ہر روز یہی خبر ملتی تھی۔ کہ اسرائیل خاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پری چہرہ گلجان آٹھ روز سخت مریض رہی اور سات روز تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہی۔ آٹھویں دن سول سرجن نے اسکی صحتیابی کی امید ظاہر کی۔ اور اس سے پیوستہ دو تین روز بعد نشست و برخاست کے قابل ہوگئی مگر نوجوان لڑکی اپنے پر لے نازوعشوہ اور دل فریبی سے اب کوسوں دور ہو چکی تھی اسنے اپنے دل میں ایک خوف جما ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ذرا سی بات پر دل ہلنے لگتا تھا اس کے دل کے راز سے امیر جان ضرور واقف تھی مگر اس کا دل چغتائی کا تھا وہ اپنی معصوم ناتجربہ کار لڑکی کی خوف زدہ حالت کو اس بیوقوف جیسا سمجھتی تھی جو کوئی سانپ مار کر آیا ہو۔ اور اسے دیوتا سمجھ کر آنے والی بدشگونیاں کے ڈر سے مرا جاتا ہو لیکن گل جان نے زہر خورانی کا ارتکاب اس نازک اور متوحش موقعہ پر بے سمجھے بوجھے کر تو دیا۔ مگر اس کے بے ہوش دل میں اس خونخوار نتیجہ کی مقاومت کی تاب نہ تھی۔ اسے اب صحت یاب ہونے پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے دل سے کوئی چیز نکل گئی ہے اور اپنی گذشتہ تندرستی اور حظایظ زندگی پر بھی کبھی دسترس نہ ہو سکے گی یہ کیفیت تو اس کے اندرونی جذبات کی تھی۔ بصورت ظاہر اس کا سارا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اور آٹھ دس روز کی علالت سے وہ گھل کر آدھی رہ گئی تھی۔ سرخ و سپید رنگت کی جگہ چہرہ پر پیلاہٹ اور سیاہی پھیل گئی تھی۔ اور آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کے سامنے لذیذ سے لذیذ کھانے لائے جاتے تھے۔ مگر اس کا دل سب چیزوں سے فوراً ہی اکتا گیا۔ اور اسے پانی کے سوا کوئی چیز اچھی نہ معلوم دیتی تھی۔ امیر جان اور بلند اختر اسکی کیفیت سے بے حد ہراساں تھے۔ اور ہر روز کی حالت سول سرجن کے ملاحظہ میں لاتے تھے۔ لیکن گل جان اب ادویہ کی ضرورت کو تسلیم نہ کر کے خاموش پڑے رہنے کی آرزو کرتی تھی بلند اختر اسے گھنٹوں پاس بیٹھ کر دلچسپ کہانیاں سناتا۔ اور اس کی خوش طبعی کے لئے قصے کہانیاں پڑھتا لیکن گل جان کے دل پر ایک قسم کا خوف اور بے چینی چھا گئی تھی اسے کوئی چیز بھلی معلوم نہ دیتی تھی۔ شب کو اسے دو دو بجے تک نیند نہ آتی تھی۔ اور آنکھ لگتے ہی

وہ چلائی فرحت علی خاں آگیا۔ مارو۔ مارو۔ شاؤ۔"

بلند اختر اپنا زیادہ وقت گل جان کے گھر پر گذارتا لیکن بجائے مسرت کے روز متفکر اور حیران ہوتا جاتا تھا۔ اس سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ معلوم ہوتی تھی کہ گل جان اسرائیل خاں کی بجائے بار بار فرحت علی کا نام کیوں لیتی ہے؟ اور اس نے دن میں موقعہ پاکر امیر جان سے اس راز پر گفتگو کرنی چاہی مگر امیر جان اسے ناتجربہ کار محض صورت پرست عاشق سمجھ کر پتہ کی کوئی بات نہ بتائی۔ اور سب الزام اسرائیل خاں پر تھوپ کر اسے سینکڑوں دعائیں اور کوسنے دیتی۔ ایک روز گل جان کے دل کی بے چینی صبح ہی سے زیادہ تھی۔ اور وہ رہ رہ کر رونا چاہتی تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر گھٹا جاتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں علی الصباح سے فرحت علی خاں کی صورت تھی۔ اسے صحت یابی کے شروع ہوتے ہی اس بات کی فکر پڑ گئی تھی۔ کہ فرحت علی خاں زندہ ہے یا مر گیا۔ لیکن یہ نازک اور دل خراش سوال کسی کے آگے کہنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ بلند اختر اس بات کو سن کر شاید کچھ پتہ لگاتا۔ مگر اپنی والدہ سے فرحت علی خاں کا ذکر چھیڑ کر وہ مُردوں کی قبر کھودنے کے ڈر سے کانپ جاتی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں وہ سما جاتا تھا جہاں وہ فرحت علی خاں کو بیہوش چھوڑ کر بھاگی تھی۔ تمام دن وہ اپنے دل کی انتشار رہی غلطان و پیچان رہی۔ اور کوئی تازہ سبب اپنی پریشانی کا نا معلوم کر کے اس نے استراحت خانہ کی کھڑکیاں سیر بابغ سے محفوظ ہونے کو کھولدیں۔ وہ ایک آرام کرسی پر شال اوڑھے بیٹھی تھی شام کے چار بجے ہونگے۔ مغرب کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھول اور پودوں سے معطر ہوائیں پھک پھک آرہی تھیں۔ مگر ان معطر آزاد و روح بخش ہواؤں کو کیا خبر تھی۔ کہ اس مکان کے مکین کو کس بات کی ضرورت ہے اور وہ کیوں بے چین ہے۔ مدعا اصل وہ اس وقت اس موقعہ کو یاد کر کے بے کل ہو رہی تھی جبکہ اس نے فرحت علی خاں کی شراب میں زہر ملا دیا۔ وہ اپنے دل سے کہہ رہی تھی!! کاش میں اس دن کے لئے پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ ہائے کوئی فرحت علی

خاں کی خبر نہیں لاتا۔ اگر وہ زندہ ہو۔ اور مجھے معاف کر دے۔ تو میں دنیا میں نئے سرے سے داخل ہوں"

کمرہ میں خوب روشنی تھی۔ سامنے چمکے ہوئے زرد آفتاب کی روشنی کھڑکیوں کے آئینوں پر ٹکرا ٹکرا کر چکا چوند کر رہا تھا۔ تندرست خوش مزاج آدمی گھر سے باہر اور درخت اور پھولوں اور چہچہے کرنے والے پرندوں کے دوا دوش سے اچھل کر باہر جنگلوں میں نکل جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر معصوم گل جان اس وقت دنیا کے زندہ چلنے پھرنے والے آدمیوں کے طبقہ سے باہر ہو گئی تھی۔ اس کا دماغ اس حالت پر پہنچ گیا تھا۔ کہ ذرا سے صدمہ سے جنون پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی والدہ نیلوفر کو پاس لئے ہوئے وسیع صحن میں متفکر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اتنے میں شجاعت دہلیز کی طرف سے آتا ہوا معلوم دیا۔ دونوں نے شجاعت کی طرف دیکھا جس نے امیر جان کے پاس آکر کہا۔ مظفر نگر سے کوئی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں آپ ماں بیٹیوں سے خلیہ میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں"

امیر جان کا دل خوف کے مارے سکڑ گیا۔ مگر یہ مشہور بات ہے کہ قاتل اپنی قتل گاہ کے سامنے عجیب و غریب طریقہ کی انسیت محسوس کیا کرتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور روٹھر کتے دل سے بولی" اچھا آنے دو" مگر اس وقت امیر جان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور وہ اپنے دل میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی" الٰہی خیر" دونوں جہاں کے پیدا کرنے والے خیر" میری بچی کی خیر"۔ دوسرے لمحہ میں تندرست و مضبوط نوجوان ڈاکٹر ارشاد الدخاں صحن میں داخل ہوا۔ اور امیر جان کے قریب پہنچ کر بولا" بیگم صاحب معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو بڑے نادقت تکلیف دی آپ کسی دوست سے ملاقات کر رہی ہیں۔ میں ایک سرکاری کام سے آیا تھا۔ آپ کی صاحبزادی سے ملاقات کرنے کا از حد مشتاق ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو مجھے پیش کر دیجئے" امیر جان کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ اور اسے سارا صحن گھومتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا" گل آج گل جان بیٹی ہے اللہ کے گھر

سے بچی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ضروری کام ہے۔ میں گل جان سے پوچھ لوں"
بلند اختر نے ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو کرسی پر بٹھلا کر حسب و نسب دریافت کیا
اور خوفزدہ مگر مضطرب اور دریافت طلب آواز میں پوچھا۔ کیا آپ پولیس مظفر نگر کی
طرف سے آئے ہیں۔ کیا اسرائیل خاں کا پتہ لگ گیا"
ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے غور اور فکر سے بلند اختر کی طرف دیکھا۔ پھر جھوٹے
تبسم سے مسکرا کر بولا" معاف فرمایئے گا۔ میں آپ سے ناواقف ہوں۔ میں جس
کام کے لئے آیا ہوں۔ اس کی بابت آپ سے کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ مجھے پولیس یا
اسرائیل خاں سے کوئی تعلق نہیں"
بلند اختر کھسیانا ہو گیا۔ اور اس اجنبی نووارد کو محض گل جان کی صورت کا
شیدا سمجھ کر دوسرے خیالات میں الجھنے لگا۔ ادھر امیر جان شال سنبھال کر آہستہ
آہستہ گل جان کے پاس پہنچی۔ اور دھڑکتے دل سے کہنے لگی" بیٹی کوئی ڈاکٹر مظفر نگر
سے آیا ہے۔ تجھ سے ملنا چاہتا ہے"
گل جان کا دل اس کلمہ سے لرز گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایسی دہشت اور
خوف پیدا ہوا۔ جیسا کسی قاتل کی آنکھوں میں پھانسی کی خبر سن کر ہویدا ہوا کرتا ہے"
اس کی زبان تالوے سے لگ گئی" دل سینہ سے نکلنے لگا۔ اس نے گھبرا کر مری ہوئی
آواز میں کہا" مجھ سے کیا کام ہے۔ خیر پولیس مجھے چھوڑنے والی نہیں۔ اچھا اسے
آنے دو۔ اگر مجھے پولیس گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ تو میں بھی بہرے کی کسی کہا لوں گی۔
بلاؤ۔ مگر تم میرے پاس سے مت جانا۔ کبھی میں خوف کے مارے مر جاؤں" امیر
جان دھڑکتے اور پریشان دل سے باہر آئی۔ اور ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کو آیئے کہکر
اندر لے گئی"
ڈاکٹر صاحب آرام گاہ میں داخل ہوئے۔ تو سورج کی روشنی میں اس نے ایک
ہی نگاہ گل جان کی صورت دیکھ لی۔ وہ اسے تندرست اور خوبصورت سمجھ کر خوب
ڈرانے دھمکانے کے لئے آیا تھا۔ مگر اب اسے مریض گورا اور ایسی نقیہ پا کر

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اگر ایمان سے کہا جاوے۔ تو اسے اس نوجوان نا تجربہ کار لڑکی کی حالت پر رحم آیا کیا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ فرحت علیخاں نے اسے دھوکہ سے بلا کر زبردستی نکاح کرنے اور اس کی عصمت بگاڑ دینے کی جرأت کی تھی۔ اور اب وہ اس قدر بیمار تھی۔ کہ اس کی گم شدہ خوبصورتی کی جگہ اس کے وفریب تکھڑے پر ایسی اداسی خوف اور انقباض جھلک رہا تھا۔ جیسا کسی مریض کے چہرہ پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہو کر گورکا شوربا بتلا کر چل دیتا ہے۔ وہ دھڑکتے دل سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور جھوٹے تبسم سے گل جان کو دیکھ کر بولا "آپ تو سخت بیمار ہیں۔ میں آپ کو تندرست سمجھ کر کچھ راز کی باتیں کہنی چاہتا تھا۔ مگر آپ میں اتنی سکت کہاں۔ کہ مجھ سے بات چیت کر سکیں"

گل جان اپنے متوحش تفکرات نیز ڈاکٹر کی تشخیص سے نہایت بے چین ہوئی۔ اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ اس ایک مجروح چڑیا کی طرح ایسی کمزور اور بے بس ہو گئی تھی۔ کہ جس کا دل چاہے۔ اسے پاؤں میں روندڈالے۔ اس نے اپنا دل قابو کر کے آہستہ سے جواب دیا "نہیں آپ فرمایئے۔ آپ کس کے پاس سے آئے"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خان نے گل جان کی خوف زدہ آنکھوں کو بغور دیکھا۔ پھر دل کڑا کر کے بولا "میں فرحت علی خاں کے پاس سے آیا ہوں۔ وہ زندہ ہے۔

فرحت علی خاں کے نام سے گل جان کا دل لرز گیا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ چاروں طرف سینکڑوں چیخ پکار میں لوگ کہہ رہے ہیں "گھیر لو۔ گھیر لو" جانے نہ پاوے۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ تمام جسم کانپنے لگا۔ اس کی ماں نے خونخوار شیرنی کی طرح دل کو مضبوط کر کے جواب دیا "فرحت علی ہم سے کیا چاہتا ہے۔ کیا اس کی زیادتی اور ظلم میں کچھ اور کسر رہ گئی ہے۔

ارشاد اللہ خاں نے منہ پھیر کر امیر جان کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر جواب دیا "دراصل بات تو یہ ہے۔ کہ قصور اسی کا تھا۔ مگر آپ صاحبوں نے معاملہ حد سے

سے زیادہ سنگین کر دیا ہے۔ اور جہاں تک میرا علم ہے آپ کو پولیس چھوڑنے والی نہیں۔ مگر میں آپ کا دوست ہوں۔ میں ڈرانے دھمکانے کی بجائے آپ کی امداد کو آیا ہوں۔"

امیر جان اور گل جان کے دل بڑی تیزی سے دھڑک اٹھے۔ اور ایک منٹ تک کمرہ میں بالکل سناٹا رہا جس کے بعد امیر جان اس طرح پر گویا ہوئی "ہمیں کچھ معلوم نہیں آپ ہمارے دوست ہیں یا دشمن لیکن ہم نے کوئی بات ایسی نہیں کی۔ کہ پولیس ہم پر دست درازی کرے۔" ارشاد الدھاں کا چہرہ امیر جان کی جسارت اور بیباکی پر سرخ ہو گیا۔ اور اس نے کن انکھیوں سے گل جان کو دیکھ کر کہا "مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ کہ آپ نے یا اس نے کیا کیا۔ مگر اس وقت میں بحیثیت ایک وکیل کے آیا ہوں۔ جسے ہر دو فریق کی سلامتی اور ناموس کا لحاظ ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ آپ میری رائے پر عمل کریں۔ اور آئندہ کے فیصلوں سے محفوظ رہیں۔"

گل جان نے لمبا سانس بھر کر امیر جان کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی "کیا آپ کو فرحت علی خاں نے بھیجا ہے۔ کیا اس نے ہمیں معاف کیا؟"

ڈاکٹر ارشاد الدھاں کا دل اچھل پڑا۔ اور اسے وہ بات مل گئی جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس نے محبت بھری نگاہ سے گل جان کو دیکھ کر جواب دیا "خوبصورت لوگوں میں عقل اور سلامت روی زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے سخت حیرت ہے۔ آپ سے اس قدر جرم قبیح کا ارتکاب کس طرح ہوا۔ دراصل مجھے فرحت علی خاں نے بھیجا ہے اور اس نے اپنی تعدی پر معافی مانگ کر درخواست کی ہے کہ آپ بھی اسے معاف کر دیں۔ اور چونکہ آپ کا ان کے ساتھ نکاح ہو گیا ہے۔ آپ چپکے چپکے ان کی زوجہ بنجاویں"

گل جان اپنی گلوخلاصی کے خیال سے کسی قدر ڈھارس پا کر دلیر ہو کے سوالات کرنا چاہتی تھی۔ مگر نکاح کرنے اور فرحت علی خاں کی زوجہ بننے کے خیالات سے یکایک اس کا دماغ بھڑک اٹھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "خیر ان باتوں کا تو اب ذکر ہی فضول ہے۔ اگر فرحت علیخاں مجھے معاف کر کے پھر کبھی نام نہ لیں۔ تو میں بھی صدق دل سے معاف کر دونگی۔"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے مسکرا کر جواب دیا "میں آپ سے مذاق کرنا نہیں چاہتا۔ دراصل فرحت علیخاں جب آپ کی صورت سے بیزار ہے اور اس معاملہ کو پولیس کے ہاتھوں میں ڈال کر آپ دونوں کو سزا دلانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا علاج کیا ہے اور میں نے ہی بڑی کوشش سے یہ بات معلوم کی کہ آپ نے ہیرے کی کنی کہاں دی تھی"

گل جان کے دل میں تہلکہ سی پیدا ہو گئی۔ اور اس کا سانس رک گیا اس نے ہانپتے ہوئے کہا "بس بس آپ اس کا ذکر نہ کریں۔ میری روح کانپ رہی ہے"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں اپنے مطلب پر پہنچنے کے لئے بے قرار تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا "ہاں فرحت علی خاں نے آپ کا رقعہ میرے ہاتھ میں دیکر کہا تھا۔ کہ میں اسے انسپکٹر پولیس کے حوالہ کر کے آپ کو سزا دلاؤں۔ لیکن خدا جانتا ہے۔ میں شروع ہی سے آپ کے نام اور تذکرہ میں ایک قسم کی محبت پاتا ہوں مجھے کسی طرح منظور نہ تھا۔ کہ آپ کا ذکر پولیس میں چھیڑ کر آپ کو مصیبت میں ڈالوں۔ میں اس رقعہ کو ساتھ لایا ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کو دوں"

گل جان کے جسم میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ اور اسے امید کی خوبصورت آمد کی بشارت سے دماغ خیالات سے بھرا ہوا معلوم ہوا۔ اس پر امید آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگر آپ وہ رقعہ لائے ہیں۔ تو مجھ پر بڑا احسان کیا" امیر جان نے نہایت بے چینی سے ہاتھ باہر نکالے۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولی "ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ کہ معاملہ رفع دفع ہو یہ رقعہ آپ ہمیں دیدیں۔ اور اس کے بدلے ہم سے فرحت علی خاں کا وہ اقرار نامہ لے لیں جس میں بیس ہزار کا وعدہ کیا گیا ہے"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں کے چہرہ پر سرخی نمودار ہوئی۔ اور اس نے مسکرا کر ہچکچاتے دل سے جواب دیا "جی ہاں میں دراصل اس رقعہ کی تلاش میں آیا ہوں لیکن آپ جانتی ہیں دنیا میں کوئی کام ذاتی غرض بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ میرے پاس وہ رقعہ ضرور موجود ہے لیکن میں خواہ مخواہ اس معاملہ میں وکیل کیوں بنوں۔ میری خاموشی کی ایک قیمت ہے۔ اور اس کی ادائیگی بغیر کوئی بات نہیں ہو سکتی"

"امیر جان اور گل جان دونوں کے دل تڑپنے لگے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے یہ تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر گل جان نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "آپ کا کیا مطلب ہے صاف طور سے کہئے"

ڈاکٹر ارشاد اللہ خاں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ بات یہ ہے میں ایک ہزار روپیہ نقد لے کر یہ رقعہ آپ کو دونگا۔ دونوں ماں بیٹیوں کو سارا کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہوا اور انکی عقل کے سامنے ایک پردہ سا کھنچا ہوا دکھلائی دیا"

گل جان نے اپنی ماں کی طرف دیکھکر "اماں ایک ہزار روپیہ" میری گلوخلاصی کرائے میں کچھ بیمار نہیں۔ صرف یہی آزار میری جان کو کھا رہا ہے"

امیر جان نے خونخوار شیرنی کی طرح آنکھیں نکال کر جواب دیا "میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔ تو جان تیرا کام"

گل جان کا دل سکڑنے لگا۔ اور وہ فرش کی طرف دیکھکر سوچتی رہی پھر جھلا کر بولی "اماں تمہیں ایک ہزار کا انتظام کرنا پڑیگا" کسی سے قرض لیکر دو۔ اگر تم نہیں دے سکتیں۔ میں بلند اختر سے کہتی ہوں۔ وہ کہیں سے لاکر دیگا"

امیر جان نے غصہ کے مارے دانت پیس ڈالے۔ اور آنکھیں نیلی کر کے بولی "میں ان جھگڑوں میں پڑنے والی نہیں تجھے پالا پرورش کیا۔ اب تیرے واسطے ہزار روپیہ کا مچلکہ لکھوں۔ جا بلند اختر سے کہہ"

گل جان اپنی شال کو سنبھال کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جسم کو قابو کئے ہوئے باہر آئی جہاں بلند اختر بیٹھا ہوا تھا بلند اختر اسے باہر آتے دیکھکر گھبرایا ہوا آیا۔ اور منت بھری آواز میں بولا "میری لاڈلی تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے ہیں۔ کیا معاملہ ہے"

گل جان نے بلند اختر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اگر وہ اس کے شانوں پر ہاتھ نہ رکھتی تو گر پڑتی۔ اس کی شال جسم سے گر گئی۔ اور صحن کی روشنی میں اس کا پیلا چہرہ اور بے ترتیب بال اس غریب نوجوان عورت جیسے ہو گئے جو اپنی بیوگی کے صدمہ اپنے عزیز بھائی سے مل کر دریافت کرتی ہے مگر اصل اس وقت گل جان اپنے مظلوم

نکاح سے طلاق لے رہی تھی اس نے بلند اختر کی گردن پر سر رکھ کر کہا "اختر تمہیں میری محبت نہیں ہے میں تمہارے واسطے اپنی عصمت بچا کر لائی ہوں اب یہ خوفناک ڈاکٹر میرے ایک رقعہ کے عوض ایک ہزار روپیہ مانگتا ہے۔ اماں روپیہ دینے سے انکار کرتی ہے تم کہیں سے ایک ہزار فوراً لا کر دو"

بلند اختر نے گل جان کے بدن پر شال درست کی۔ اور اس کے گرم سرد سے ہوئے ہونٹوں کو بوسہ دیکر بولا "گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ایک ہزار کی جگہ میں تمہاری والدہ کو بیس ہزار ابھی دس روز کے اندر دونگا چلو تمہاری والدہ سے اقرار کئے دیتا ہوں۔ بلند اختر روتی ہوئی نوجوان معشوقہ کو اس کی والدہ کے پاس لایا۔ اور نہایت غضبناک آواز میں بولا "کیوں صاحب تم سے ایک ہزار نہیں دیا جاتا۔ میں تمہیں دس دنکے اندر بیس ہزار دونگا۔ اگر نہ دوں۔ تو مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دینا۔ ایک ہزار روپیہ گلجان کو فوراً دیدو"

امیر جان کا غصہ اس وقت فرو ہو گیا تھا۔ اور معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کر کے صورت رہائی یہی معلوم ہوتی تھی۔ کہ ڈاکٹر کے منہ میں خاک ڈالدی جاوے وہ کھسیانی ہو کر اٹھی۔ اور اپنی مسہری کے نیچے ایک کیش بکس کھول کر بولی "میرے پاس صرف پانچ سو روپیہ ہے"

گل جان نے ٹٹولنا شروع کیا۔ اور روکر بولی "پانچسو روپیہ کی چوڑیاں ہیں۔ پانچسو اماں دیتی ہے۔ لاؤ میرا رقعہ لاؤ۔ دو منٹ کے اندر گل جان کا رقعہ اس کی والدہ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ اس کے بدلہ میں فرحت افزا خانم کا رقعہ واپس لے لیا گیا"

خوبصورت سے بعض گل جان کے ہاتھوں سے سنہری چوڑیاں نکل گئیں۔ تو وہ فرحت علی خان کے فرضی نکاح کی بیوہ بن گئی۔ لیکن اس کا دل اسی وقت سے سکڑا سکڑا سا جا رہا تھا ڈاکٹر کے چلے جانے پر گل جان مسہری پر گر گئی۔ اور بلند اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولی "پیارے بلند اختر تم کسی طرح اماں کا پانچسو روپیہ ادا کر دو۔ میں تم سے بلا اجرت و بیکار کے

ماں کی مرضی کے خلاف نکاح کرو گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میری عصمت صرف تمہاری قسمت سے بچی تھی۔ سارا قصہ سپرسناؤ گی" بلند اختر نے مسکرا کر گل جان کے منہ کو بوسہ دیا۔ اور جوش بھری آواز میں بولا" پیاری بچے کسی قصے کی ضرورت نہیں تمہارے پیارے مکھڑے میں دنیا بھر کی داستانیں موجود ہیں"

باونواں باب

شکیلہ کی مشکلات

جس قدر نا امیدی اور بے چینی شکیلہ ہیرنگٹن کو اپنے نانا کی گمشدہ دولت کے متعلق گذشتہ چند ہفتوں میں رہی تھی۔ اس سے زیادہ پر اضطراب وہ کاغذات ثابت ہوئے۔ جو کامران نے اسے لائبریری کے فرش سے نکال کر دیئے اس میں شک نہیں کہ پندرہ لاکھ کی کثیر رقم کبھی شکیلہ ہیرنگٹن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور اس غیر متوقع کامیابی سے زیادہ پر بہجت سماں کوئی دوسری مالی امداد رفع الحال مشکل سے پیدا کر سکتی تھی۔ بالکل ممکن تھا۔ کہ اتنی بڑی دولت کی وارثہ کو شادی مرگ ہو جاوے لیکن شکیلہ جیسی راسخ الاعتقاد اور ناتجربہ کار لڑکی کو اس دولت گرانمائیہ کی برآمدگی کے ساتھ ہی ایک نئی قسم کی مشکل کی پیدائش دکھلائی دے رہی تھی۔ جسے ابھی کامران کا خیر رس دماغ نظر انداز کر رہا تھا۔ اس وقت تک شکیلہ ہیرنگٹن جس استحکام اور اندھا دھند تقلید سے اپنی والدہ کے مذہب پر قائم تھی۔ ان طاقت ور اعتقاد کو شکست کرنے کے لئے اس دولت کی برآمدگی بہت سخت اور تیز آلہ ضرور تھی۔ مگر شکیلہ کے دل میں مذہب کا شجرہ ایسے استحکام سے جڑ پکڑ گیا تھا۔ کہ وہ محض سرسری لہ میوں سے گر جانے والا کسی طرح نہ تھا۔ اور در اصل جس وقت مذہب اور دنیا داری کی جنگ آپڑتی ہے عموماً دنیا کی خواہش کے آگے مذہب کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔ مگر انسانی مزاج ایسے ہیں کہ اپنے دنیا

کے علماء پر حفاظت اور آرام دہ تکلفات محض سطحی اثر رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں نوجوان شکیلہ نے ناز و نعم میں پرورش ضرور پائی تھی لیکن ایک مشنری لیڈی کی تعلیم و تلقین اور اپنی متوفی والدہ کے ارشادات کی متابعت میں وہ مذہب کو دنیا کے جملہ کوائف سے مقدس تر سمجھتی تھی۔ اور اگر کسی بیجا اعتدال نے اس کے مذہب میں دست درازی کی بھی تو وہ نوجوان رفیق احمد کی محبت تھی۔ مگر یہ سب کو معلوم ہے۔ کہ جب رفیق احمد دو سال کامل شکیلہ پر اپنا تعشق جتانے کے بعد اسے اپنی منگیتر بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ تو بسبیل تذکرہ اس نے شکیلہ کو مذہب اسلام اختیار کرنے کی تحریص دلائی تھی۔ پھر اپنے والد کے متعصبانہ خیالات اور بیجا دباؤ سے تنگ آکر اس نے شکیلہ کو لکھ بھیجا تھا۔ کہ جب تک وہ مشرف باسلام نہ ہوگی وہ اسے اپنی زوجہ بنانے سے معذور رہیگا مگر ایک سال تک رفیق احمد کی جدائی گوارا کر لینے کے بعد ہی شکیلہ ہیرنگٹن اس ارادہ پر اڑی رہی تھی۔ گو اسے ساری عمر رفیق احمد کے انتظار میں گذر جاوے۔ مگر وہ مسلمان نہ ہوگی۔ اور اس ارادہ میں بالآخر شکیلہ ہیرنگٹن کو اس وقت پوری کامیابی ہوگئی تھی۔ جب رفیق احمد اپنے والد کے انتقال پر اس کے ترکہ کو اپنے لئے ناقابل حصول اور دولت کے مقابلہ میں شکیلہ ہیرنگٹن کو زیادہ عزیز سمجھ کر اس سے کہنے آیا تھا۔ کہ وہ اس سے باوجود تفرقہ مذہبی شادی کر لیگا۔ گویا کہ پہلے مذہب کے مقابلہ میں شکیلہ ہیرنگٹن کو اپنے مطلوب کا عشق بصورت حال کہہ رہا تھا!! یا تو میری ہو جا یا اسکی اور شکیلہ نے اپنی جان پر کھیل کر رفیق احمد سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا عہد یا کم از کم ارادہ کر لیا تھا۔ پس اس وقت اس کے نانا کی دولت اور اس کے عقیدہ یا مذہب میں جنگ آپڑی تھی۔ اور جب شکیلہ اپنے محبوب کے مقابلہ میں اپنے مذہب کو شکار ہوتا دیکھ کر رفیق احمد سے قطع تعلق کرنے اور صابر رہنے پر تل گئی تھی تو اس وقت اس کے سامنے محض دنیاوی دولت کی تحریص اسے مذہب سے تنفر کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ صورت واقعات نے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہونچا دیا۔ کہ اگر شکیلہ مذہب کے مقابلہ میں رفیق احمد کو

دل سے بہلا سکتی تھی۔ تو دنیاوی دولت پر بڑے ہلکے دل سے لات مار دینے کیلئے تیار تھی۔ چند روز گذرے۔ جب کامران نے اسے ان کاغذات کی برآمدگی پر مبارکباد دی۔ تو شکیلہ نے لانبا سانس بھر کر جواب دیا تھا۔ یہ دولت میرے قابو کی نہیں معلوم ہوتی میں اپنے مذہب پر جان دینا گوارا کر لونگی۔" شکیلہ نے معاملہ کے نشیب و فراز پر غور و غوض کرکے یہ ارادہ قایم کیا۔ کہ وہ مذہبی تقدس اور اپنے خاندان کی روایتی اعزازات کو ہرگز دولت کے بدلے فروخت نہ کریگی اور گو کامران و رفیق احمد نے اسے ایک ہفتہ کا مہل مذہب اسلام کی صداقت اور اس کی خاندانی پیشین گوئی پر پرزور الفاظ میں بحث کرکے ثابت کرنا چاہا۔ کہ وہ مذہب اسلام اختیار کرکے نہ صرف سچے اور سہل الاصول مذہب پر پہونچکر باعث فخر خاندان ہوگی۔ بلکہ دنیاوی دولت کو بلا زحمت و تردد پہنچ اپنا غلام بنالیگی مگر اس کا دل پیچ و تاب کھا کھا کر اچھل پڑا۔ اور وہ اس دنیاوی تحریص کے پنجہ میں بال بال پھنس جانے سے بچ گئی۔ اور اس نے قوی دل اور مستحکم الفاظ میں یہ رائے قایم رکھی۔ جب میں نے مذہب کے مقابلہ میں رفیق احمد کو کچھ نہیں سمجھا۔ تو ہی مقدس مذہب کے سامنے دولت کی کیا حقیقت ہے۔" پچھلے ایک دو سال کے عرصہ میں اسے اپنی "سہیلی" مس بالٹی مور کے ذریعہ سے جو روپیہ بطور قرضہ روڑکی سے مل گیا تھا اس سے سکھدرشی کا ڈراس کے نازک اور تازہ پروردہ دل کو شب و روز پریشان کرتا رہتا تھا۔ مگر اس وقت اپنے اعاظم میں ایک نامعلوم پہری راجستانی حویلی کے پتھروں کی بدولت اسے تقویت ہوگئی تھی۔ کہ کم از کم دو تین ہزار روپیہ گورنمنٹ ضرور دیگی۔ اور اس رقم سے وہ اپنے قرضے کو بے باق کر سکے گی۔ پر اسرار وصیات نامجات کے مقابلہ میں اس نے کامران اور رفیق احمد کی ایک بات نہ سنی۔ اور بالآخر دونوں مجبور ہوگئے۔ شکیلہ ہیرنگٹن کو رہ رہ کر بار بار یہی خیال دامنگیر ہوتا تھا۔ کہ اس کے بزرگ لارڈ بشپ ہیرنگٹن نے جس خاندان کو اعزاز حضرت مسیح کے دربار میں حاصل کیا۔ وہ محض اس نااہل لڑکی کی ذرا غفلت اور طمع سے اجتناب کے لئے سلب ہو جاویگا اور اس کے عزیز و اقربا کی ارواح اسے میدان حشر تک برابر کوستی رہیں گی۔ جو

اصحاب اس قصہ کو پڑھ رہے ہیں۔ وہ خیال کریں گے۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن کے لئے اس دولت سے مستفید ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ اور وہ مذہب عیسوی پر قایم رہنے کے باوجود اس دولت کے حصول میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ اور واقعی یہ ناممکن بات نہ تھی لیکن جب انسان کسی خاص مذہب کا معتقد ہوتا ہے اس کی نظر اذراسی باتوں کو نظر خاص سے دیکھا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ شکیلہ کے آباؤ اجداد میں سے ایک فخر خاندان بزرگ نے اپنی اولاد کو اس روپیہ سے ہمیشہ دست بردار رہنے کی علانیہ تبلا یا تھا۔ کہ یہ دولت اس لڑکی کے ہاتھ میں آویگی۔ جو مذہب عیسوی کی دشمن ثابت ہوگی۔ پھر انسان ایک ہی وقت میں ایک مذہب کا دوست اور دشمن ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر شکیلہ کو مذہب مسیح سے محبت تھی۔ تو اسے اس دولت سے دستمنی ٹھان لینی لازم تھی۔ جس کے اکتساب سے وہ سارے خاندان کے نام کو بٹہ لگا دینے والی شمار ہوگی۔ جن دنوں شکیلہ کے ہاتھ میں اس کے خاندانی کاغذات پڑے وہ نہایت افسردہ دلی اور اور تذبذب کے دن رات بسر کرتی تھی۔ اور کسی خاص ارادہ یا خیال پر پڑ کر اپنے دل کو قبضہ میں کر لینے کی خواہش مند نہ تھی لیکن اسے ایک طرف دنیاوی طمع ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنی فریاد سنا رہی تھی۔ دوسری طرف اس کا معزز پرنانا لارڈ بشپ ہیرنگٹن اپنی مقدس انگلی اٹھا اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ "تو ہی وہ لڑکی ہے۔ جس کے خون میں دوسرے مذہب کی بو آتی ہے" لاجرم شکیلہ ہیرنگٹن کو اپنے پریشان کن خیالات کے جذبات سے مغلوب ہونا پڑا۔ اور ایک ہی ہفتہ کے اندر اس کے دماغ اور اعضائے رئیسہ پر ایسا گہرا اثر پڑا۔ کہ وہ خوبصورت اور ہشاش بشاش لڑکی کی جگہ متفکر اور پوری دنیادار عورت بن گئی لیکن اس نے مذہب سے منحرف نہ ہونے کا پورا تہیہ کر رکھا تھا۔ اور وہ اپنے ارادوں سے نہ پھرنے والی معلوم ہوتی تھی۔ اسی عرصہ لکھنؤ سے محکمہ صنادید و عمارت قدیمہ کے انجینر مسٹر سک ان توش تشریف لائے۔ اور انہوں نے شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں ایمنٹ پتھر کل بلیے کی قیمت دس ہزار روپیہ تجویز کی۔

مجسٹریٹ ضلع کی منظوری صاحب انجینر بہادر ایک دو روز پیشتر لے چکے تھے

پتھر محکمہ جنگلات ڈیرہ دون و سہارنپور کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کا حصہ ڈھائی ہزار تجویز ہو کر بنگلہ کا احاطہ صاف ہونے لگا۔ کامران اس فکر میں تھا کہ شکیلہ کے بنگلہ کی کھدائی ختم ہو جاوے۔ اور جس خوبی کا حیلہ بہانہ پہلے ضروری سمجھا گیا تھا اسے برابر کر کے انسر لونا بچھنے لگائے جانے کی تجویز شکیلہ نے بھی منظور کر لی اور کامران اپنے دوست و ماتحت کے ساتھ سہارنپور کی تیاری کرنے لگا۔

شکیلہ ہیرنگٹن کامران کے فرائض کو ختم ہوتا دیکھکر اس سے ملاقی ہوئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اس کی محنت کا معاوضہ پوچھنے لگی لیکن سرد مہر کامران نے معاوضہ لینے سے انکار کیا۔ اور مسکرا کر کہا "ابھی آپ کو کچھ نہیں ملا۔ ایکہزار تو صرف کھدائی میں خرچ ہو گیا ہے۔ آپ اپنے قرضوں سے بے باقی حاصل کیجئے جب آپ اپنے نانا کی دولت لے لینے کی تیاری کریں گی۔ میں آپ سے خود معاوضہ مانگ لونگا۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ مسٹر رفیق احمد سے شادی کر لینے کے بعد اس دولت سے مستفید ہونے میں کوئی دقت محسوس نہ کریں گی۔ میں ابھی آپ سے رخصت نہیں ہوتا۔ مجھے بہت سا کام کرنا ہے"۔

تیرہواں باب

ایک نئی مصیبت

رفیق احمد اپنی مکان کوٹھی کے گول کمرہ میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ صبح کے آٹھ بجے ہونگے۔ سردی خوب زور پر تھی۔ اور آرام کرسی کے پیچھے دو دکش کے اندر خوب تیز آگ جل رہی تھی۔ رفیق احمد چائے پی کر آیا تھا۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن سے ملاقات کرنے کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے بدن پر سیاہ کشمیرہ کا سوٹ اور سر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ پاؤں میں سیاہ موزے کے اوپر بادامی

ڈاک کا پوٹ تھا۔ آج کی ڈاک ابھی اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی۔ اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی نئی بات اس کی ملازمت کے متعلق معلوم ہو۔ یا ہز آنر دی لفٹننٹ گورنر کا کوئی خط آ دے وہ ایک روز گذشتہ کے اخبار پانیر کو کسی قدر اضطراب اور بے پرواہی کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن کی پہلی ملاقاتوں سے پوری طرح یقین ہو گیا تھا۔ کہ جس طرح اس نے محض شکیلہ کی وجہ سے اپنے باپ کی دولت سے منہ موڑ لیا۔ اسی طرح شکیلہ محض مذہب کی محبت میں اپنے نانا اور پرنانا کی دولت پر لات مار رہی تھی اور اب اپنی اور شکیلہ کی حالت کو یکساں سمجھ کر وہ اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ اسے ڈپٹی کلکٹری کا معزز عہدہ مل جاوے۔ اور دو چار ماہ کے اندر وہ اپنی پیاری لفریب معشوقہ کو اپنی زوجیت میں کھینچ کر نوکری کی حالت میں کوئی چھوٹا سا بنگلہ کرایہ پر لیکر ساتھ رکھنے لگے۔ اور جس قدر اشتیاق اسے شکیلہ کو اپنی زوجہ بنانے میں معلوم ہو رہا تھا۔ اسی قدر نوکری کی آرزو تھی۔ کیونکہ وہ سر آکلینڈ کالون اور کرنل ہنڈن بلڈ جیسے معزز لوگوں کو گورنمنٹ کے ملازمین سمجھ کر حلقہ ملازمت کو عزت سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں بار بار خیال آتا تھا۔ کہ شاید وہ بھی کسی دن ترقی کرتا کرتا کسی ضلع کا کلکٹر ہو جاوے۔ یا اس کی محنت یا ورثی کر کے کسی روز اسے بھی نائٹ کے موقر خطاب سے ملقب کرا دے۔ ان جملہ خیالات کے ساتھ اسے نوکری اور اپنی محنت سے کمائی کرنے کے ارادہ میں ایک قسم کی جوانمردی اور آزادی معلوم ہو رہی تھی۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ سارا عمر باپ کی دولت کا منہ دیکھ کر بیٹھ رہنا ادنیٰ ترین نامردی اور کاہل الوجودی کی مثال ہو گی۔ پس کیا عجب کہ وہ نوکری حاصل کرنے اور ہز آنر کے مکاتبہ کا شوق اور بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ کہ اس کا ملازم ہاتھ میں چند خطوط اور اخبار پانیر ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔

رفیق احمد نے مڑتے مڑتے دل سے خطوط ہاتھ میں لئے اور مضطرب نگاہ سے انہیں الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگا۔ کہ وہ کس کس کے پاس سے آئے ہیں۔ اسے ایک موٹے لفافہ پر گورنمنٹ کے صیغہ سکرٹیریٹ کی مہر سے فی الفور معلوم ہو گیا۔ کہ ایک لفافہ

ہزار آنر کے دفتر سے آیا ہے۔ اس نے بے تاب دل سے لفافہ کھولا۔ اور اپنی گزشتہ درخواست کے جواب سے حسب ذیل عبارت پڑھی:

تمہاری درخواست پہنچی۔ تمہارا نام منتخب شدہ امیدواران ڈپٹی کلکٹری میں درج ہو گیا ہے۔ سرٹیفکیٹ صحت سواری اسپ اور اپنی ٹھیک عمر اپنے والد صاحب کی تحریر یا یادداشت کے بموجب فی الفور روانہ کرو۔

سرکاری خط کے باضابطہ الفاظ اور موقعہ کے اضطراب سے رفیق احمد کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کہ پہلے ضروری اسناد کی تیاری کروں۔ یا شکیلہ بیرنگٹن سے ملاقات کر آؤں۔ بارے اسی لمحہ میں اس نے دیگر خطوط کا مطالعہ کیا اور سب سے اخیر میں جو خط اس کے ہاتھ میں پڑا۔ اس کے مطالعہ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اس خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔

جناب من تسلیم مجھے ابھی حال میں معلوم ہوا۔ کہ آپکے والد مولوی شفیق احمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ جناب مولوی صاحب موصوف ہم سے داد و ستد کا معاملہ رکھتے تھے۔ اس لئے ہم امید کرتے ہیں۔ کہ آپ بھی اپنے والد صاحب کے نقش قدم پر چل کر ہمیں ضرورت کے وقت یاد کریں گے آپ کے والد صاحب مرحوم مغفور نے دس بارہ سال گذرے میرے والد لالہ کاشی رام صاحب دو وقعات کے ذریعے بیس ہزار یعنی کل چالیس ہزار قرض لیا تھا۔ سود تو ہمیں ہمیشہ وقت پر ملتا رہا لیکن اصل بیس سے اب تک ایک حبہ وصول نہیں ہوا۔ آپکے والد صاحب کو بارہا اس معاملہ میں لکھا۔ لیکن انہوں نے کبھی پرواہ نہیں کی اور آخری خط جو آپ کے والد صاحب نے اس بارے میں میری یاددہانیوں پر لکھا اس سے پوری امید تھی۔ کہ روپیہ جلد ملجاویگا لیکن ان کے انتقال کے سبب اب آپ کو لکھنا پڑا۔ براہ کرم اس چالیس ہزار کی رقم کو جلد ادا فرمایئے۔ اور اگر آپ کو کچھ عذر ہو تو لاپسی اک اطلاع دیجئے۔ کہ ہم اپنا دعویٰ عدالت مجاز میں پیش کر کے چارہ جوئی کریں جواب بہت جلد ارسال ہو۔ کیونکہ آج کل ہمیں ایک شادی کی وجہ سے روپیہ کی سخت ضرورت لاحق

ہو گئی ہے"

عریضہ نیاز

موتی رام خلف لالہ کاشی رام صاحب مہاجن رئیس سہارنپور

یہ خانیلے عمدہ کاغذ پر لکھا ہوا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ موتی رام انگریزی دان اور تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ رفیق احمد کے خوبصورت چہرہ پر بے چینی اور تردد کی علامات ظاہر ہوئیں۔ اور اس کی نازک پتلی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے خط کو بار دیگر پڑھا پھر اس کے دل سے خط کا لفافہ دیکھنے لگا۔ کہ شاید کسی اور شخص کے نام کا ہو۔ جس کے والد کا نام اس کے والد کی طرح شفیق احمد ہو۔ مگر لفافہ پر اپنا نام و پتہ صاف دیکھ کر وہ بے ساختہ سخت غصہ میں آیا۔ اور خط کو میز پر پھینک کر اپنے دل میں کہنے لگا میرا والد میرے لئے کیا چھوڑ گیا ہے۔ کہ اس قدر آن دبان سے وصیت نامہ تیار کیا۔ اور مجھے شکیلہ سے نکاح کرنے کی علت میں اپنے ترکہ سے محروم کر دینے کی دھمکی دی۔ لاحول ولا قوۃ نصف کا حصہ دار تو وہ خانساماں علی الدین ہے جس کی والدہ سے نکاح کر کے حضرت نے اپنی اعلیٰ شرافت کا ثبوت دیا۔ پھر اسے طلاق دے کر اس کے لڑکے کو خانساماں بنے کو چھوڑ دیا۔ اب چالیس ہزار کا دعویدار یہ مہاجن زادہ ہے گویا میرے والد مرحوم عربی دیوبند کے لئے بارہ پندرہ ہزار بچتا ہے۔ مگر حضرت نے اپنی بیوی اور قرضوں کو اس قدر دنیا سے کیوں چھپایا۔ پھر دنیا بھر کو اپنے تقوی اور نجیب الطرفینی سے متاثر کرنا چاہتے تھے۔ میں تو اس انسان کو اعلیٰ صفات سے متصف سمجھوں گا۔ جو حقداروں کے حقوق کی محافظت کرنا جانتا ہو۔ اسلامی مجاہد اور اس قدر متعصب یہ سب باتیں دنیا دکھاوے کو تھیں۔ دیکھوں والدہ صاحبہ کیا کہتی ہیں اپنے دل سے یہ باتیں کر کے رفیق احمد نے موتی رام کا خط موڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور لپکا لپکا اندر آیا دالان خانہ کی شرقی سمت میں داخل ہو کر وہ بجانب شمال مڑا۔ اور ایک صاف ستھرے زینہ کے راستہ سے دھم دھم کرتا اوپر چڑھ گیا۔ ایک مکلف کمرہ کے برآمدہ میں صاف ستھرے کپڑے پہنے ایک بوڑھی چھالیا کتر رہی تھی۔ اور کمرہ کے اندر ایک گوشہ میں قالین

بچی ہوئی چوکی پر اس کی والدہ تلاوت کلام مجید میں مصروف تھی۔ رفیق احمد کی آہٹ پاکر بوڑھی ماں نے تبسم سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ پھر استفہامیہ سے آمد کا سبب دریافت کرنے لگی۔ رفیق احمد مکلف کمرہ سے ایک کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گیا۔ اور ماما کو آواز دیکر کہا "دیکھو باہر کوچوان کو کہو۔ ذرا انتظار کرے۔ میں ابھی آتا ہوں"

ماما کے نیچے اترتے ہی رفیق احمد نے پیشانی پر بل ڈال کر آہستہ سے کہا۔ اماں میں ہمیشہ سے یہ خیال کرتا رہا ہوں۔ کہ ابا کسی کے مقروض نہ تھے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"بوڑھی عزیز خاتون" کی آنکھوں میں خوف چھا گیا۔ اور اس نے گھبرا کر جواب دیا "بیٹا خدا نہ کرے۔ تیرے والد کسی کے مقروض نہ تھے۔ اگر ہوتے تو ایک لاکھ بارہ ہزار کہاں سے چھوڑتے۔ کیوں کیا معاملہ ہے؟"

رفیق احمد نے اپنے سر سے ٹوپی اتار لی اور سفید ریشمی رومال سے پسینہ پونچھکر بولا۔ اماں اصل بات یہ ہے۔ کہ مجھے ابا کی بعض بعض باتیں ہمیشہ سے ناپسند تھیں۔ اور اب ان کی وفات کے بعد چند باتیں ایسی مشاہدہ میں آرہی ہیں کہ مجھے ان کے زہد و تقویٰ سے بھی بدگمانی ہوتی جاتی ہے۔ آپ شاید ناراض ہوں مگر میں پوچھتا ہوں۔ کہ جب ان کے سر پر چالیس ہزار کا ایک قرضہ تھا۔ تو انہوں نے اس کی بے باقی کی فکر کیوں نہ کی اور علی الدین کی والدہ کو طلاق دے کر اس کے بیٹے کو میرے پیچھے کیوں ڈالا۔ میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ ان کے ترکہ میں ایک پیسہ کو ہاتھ نہ لگاؤنگا۔ لیکن ان کمبختوں کو کون سمجھا دے"

بوڑھی معززاں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اس نے چیں بجبیں ہو کر کہا "بیٹا اپنے باپ کی برائی نہیں چاہیئے۔ ماما آیا چاہتی ہے۔ نیچے چل میں بھی سنوں کیا معاملہ ہے"

رفیق احمد اپنی والدہ کو لئے ہوئے اپنے استراحت خانہ میں آیا۔ اور موٹی رقم کا خط ہاتھ میں دیکر بولا "میں والد صاحب کی برائی آپ کے سوا کسی سے نہیں کر سکتا۔ اور گو میں نے ان کی دولت سے ہاتھ دھو لیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین

ولاتا ہوں۔ کہ میں اپنے والد کی عزت میں جان گنوا دینے کے لئے بھی تیار ہوں"
اس کی والدہ نے دو منٹ تک خط پر آنکھیں لگائے رکھیں۔ پھر فق شدہ چہرہ اوپر اٹھا کر بولی مجھے اس قرضہ کا بالکل علم نہیں۔ خدا جانے یہ روپیہ تیرے والد نے کیوں لیا تھا" جب تو بینک کے روپیہ سے دست بردار ہو گیا ہے۔ اور نوکری ہی کی ٹھان لی ہے۔ تو سب سے پہلے اس قرضہ کی بے باقی کرنی چاہئے"

رفیق احمد نے منہ بنا کر جواب دیا" بے باقی کس طرح کروں۔ میرے ہاتھ میں روپیہ کہاں ہے۔ علاوہ ازیں میں اس روپیہ سے دست کش ہو چکا ہوں۔ اب میرا کیا تعلق۔ مدرسہ عربی دیوبند جانے اور یہ وغیرہ ارلوگ جانیں۔ لیکن اس قرضہ اور علی الدین کا معاملہ عدالت میں جاویگا۔ میں کیا کروں۔ میں چاہتا تھا۔ کہ شکیلہ مسلمان ہو جاوے۔ اور میں اس روپیہ پر قابض ہو کر ان دونوں کے حسابات بے باق کرتا میں کسی طرح نہیں چاہتا۔ کہ والد صاحب کے معاملات عدالت میں جاویں۔ مگر اب چارہ ہی کیا ہے شکیلہ مسلمان ہو جانے والی نہیں۔ اور میں ڈپٹی کلکٹر ہو جاؤں۔ تو اس سے فی الفور شادی کر لونگا"

اس کی والدہ نے لمبا سانس بھر کر جواب دیا" بیشک تو اپنی ضد پر اڑا رہیگا اور شکیلہ اپنی ہٹ دھرمی پر۔ خیر ابھی روپیہ کسی کو مل بھی نہیں سکتا۔ اس شخص کو رد کو دیکھو شاید کوئی تدبیر کارگر آ ہی نکل آوے۔ اس شخص کو لکھدو کہ مطمئن رہے اور کسی سے ذکر نہ کرے"

رفیق احمد نے خط لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور پیشانی پر بل ڈال کر کہا اچھا جواب لکھدونگا۔ شکیلہ اگر مسلمان ہو جاتی۔ تو سب معاملات فوراً طے ہو جاتے میں پہلے علی الدین کے دعاوی سے بے چین تھا۔ اب اس شخص کے قرضہ سے خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ اگر کسی اور کا قرضہ نکل آیا۔ تو کیا ہوگا۔ والد صاحب قبلہ بڑے متقی پرہیزگار اور متشرع سمجھے جاتے تھے۔ اور علم حدیث و فقہ میں بڑی دست رس رکھتے تھے۔ لیکن میری رائے میں مذہب کے تعصبات اور ظاہر داری کی فقہ و حدیث سے کوئی

بہبودی مرتب نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنے دل اور نفس پر قبضہ نہ رکھے۔ دوسروں کے مذاہب کو گالیاں دینا یہ بھی ایک قسم کی خباثت ہے اور دوسروں کے حقوق کو پامال کر دینا یہ بھی پرلے سرے کی دنائت ہے۔"

میں نے رفیق احمد کیا بک رہا ہے۔ اپنے مرحوم و مغفور باپ کی شان میں یہ بیہودہ گوئی بڑھیا عورت کے منہ سے نکلا۔ مگر رفیق احمد دل میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور لپکا لپکا ٹم ٹم پر سوار ہو گیا۔

چونواں باب

کامران کی جوانیاں

دن کے نو بجے ہونگے۔ گل جان بیٹی والدہ کے پاس صحن کے باغیچہ میں کرسی بچھائے بیٹھی تھی۔ نوجوان پری چہرہ لڑکی فرحت علی خاں کی زیادتی اپنی والدہ کی سازش اور خوفناک عدالت کے پنجہ سے رہا ہو کر اطمینان و تسلی سے واپس آئی تھی۔ اور اب اپنے دل کو تفکرات اور متوحش نتائج کے خوف سے آزاد پاکر نئے سرے سے زندگی شروع کر رہی تھی۔ ہنوز اس کے دلفریب مکھڑے پر گذشتہ علالت اور خوف و ہراس کی علامات ضرور موجود تھیں۔ مگر آج اس نے غسل صحت کیا تھا اس وقت وہ شمال کی طرف پشت کئے ہوئے ایک مکلف کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے لانبے بھورے بال سنہری اون کے شکل میں پیچے لٹکے ہوئے تھے۔ جنہیں بوسہ دینے کے لئے زمین بھی جوش و خروش سے کھینچے جاتی تھی۔ اس کے سفید رنگ پر آفتاب کی روشنی صاف طور سے تبلا رہی تھی۔ کہ ابھی اس کی زاہد فریب ملاحت میں سرخی کی کمی ہے۔ اس کے جسم پر سرخ رنگ کی ریشمی قمیص تھی

جن کی آستینوں سے زر و رنگ کا اونی بنیان نظر آرہا تھا اس کی ٹانگوں میں ریشمی پاجامہ کا ڈھیلا ڈھالا پائجامہ تھا۔ جو پاؤں کے آغاز پر بے حد چست ہو گیا تھا اس کے سفید خوبصورت پاؤں ننگے تھے۔ اور وہ کامدار سلیپر سے پاؤں نکالے حمیدہ آرام کرسی پر چت پڑی تھی۔ اس کے جسم پر زیور کا نام نہ تھا ہاتھوں کی چوڑیاں بھی ندارد تھیں صرف کانوں کی لو میں بلوری بندکیاں سورج کی شعاعوں سے ہم آغوش ہو کر قوس قزح کے دو زندہ رنگوں کی طرح جھلک دکھلا رہی تھیں اور اس کے سامنے اس کی معزز مگر عیار ماں دوسری کرسی پر لیٹی ہوئی گل جان کے بے عیب چہرہ کو تبسم آفرین تحسین سے دیکھ دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتی تھی۔ اسی لمحہ میں ماں بیٹیوں کو جوتیوں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ اور بلند اختر کو آتے دیکھ کر گل جان کے چہرہ پر سرخی اور تبسم پدیدار ہوا۔ بلند اختر کے پیچھے دلاور علی تھا۔ اور دونوں دوست انگریزی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے گل جان نے دونوں دوستوں سے صاحب سلامت کر کے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور بلند اختر نے بہرے ہوئے دل سے مسکرا کر کہا "پیاری گل جان لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم نے غسل صحت کر لیا۔ اب تمہاری صورت بالکل نئی معلوم ہوتی ہے مگر تمہاری خوبصورتی پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے

گل جان کے رخساروں پر سرخی جھلکی۔ اور اس نے مسکرا کر کہا "بلند اختر میں گھر پر پڑی پڑی اکتا گئی مجھے شولانی ندی کے آس پاس کے جنگل ایسے سہانے معلوم ہوئے تھے۔ کہ بے اختیار پھر جنگل کی سیر کو دل چاہتا ہے۔ اگر تم راضی ہو۔ تو چلو پھر جمن کے مونہڈ پر ایک شب گذاریں"

بلند اختر اور دلاور علی دونوں نے مشتاق آنکھوں سے گل جان کی بات سنی اور دونوں اشتیاق کی آواز میں بولے "ہماری عین آرزو ہے آج ہی سہی کیوں اماں کہا آج چل سکو گی؟" گل جان کے منہ سے نکلا۔ اور اس نے پر اشتیاق دل سے ماں کی طرف دیکھا"

بڈھی ایجوان نے لمبا سانس بھر کر جواب دیا "میں اسرائیل خاں کی کرا

سے اس قدر ہراساں ہوگئی ہوں۔ کہ مجھے جنگلوں میں جانا پڑا خدشہ معلوم ہوتا ہے آج تو کسی طرح ممکن نہیں۔ کل علی الصباح لہناب اوڈیرہ بھیجوا دیا جاوے۔ دو بجے ریل کو روانگی بہتر ہوگی۔"

گل جان "بے شک اماں کی رائے بالکل درست ہے۔ کل چلیں گے لیکن اختر کو بھی سامان دل بستگی کا بھی ہونا چاہیئے۔ مجھے گھوڑے کی سواری نہیں آتی نہ بائیسکل پر چڑھنا جانتی ہوں۔ موٹر کار ہم غریبوں کو کہاں نصیب؟"

بلند اختر نے لمبا سانس بھر کر جواب دیا "دیکھو اگر قسمت نے یاوری کی تو ہم ایک موٹر کار خرید دونگا۔ ولایت کی ایک لاٹری میں میں اور دلاور علی دونوں شریک ہوئے ہیں کسی طرح چالیس ہزار ملجاوے۔ تو پھر ہم راجا ہو جاویں۔" دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور گل جان نے چہرہ سرخ کر کے کہا "لاٹری کیسی کیا وہ ہے جس میں پندرہ پندرہ روپیہ کے ٹکٹ خریدے جاتے ہیں؟"

دلاور علی نے گل جان کی آنکھوں کو عزت اور لحاظ سے دیکھ کر جواب دیا "جی ہاں لیکن مجھے ان لاٹریوں پر اعتبار نہیں۔ بلند اختر کی رائے سے شریک ہوگیا ہوں۔ میں تو اصلی لاٹری یا قسمت آزمائی اسے سمجھتا ہوں۔ کہ اپنے دست و بازو سے کمائے۔"

امیر جان نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "مگر معاف کیجیے گا۔ آپ دونوں دوست تو اپنی زندگی ایسی بری طرح گذار رہے ہیں۔ کہ مجھے قطعی امید نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی اپنے دست و بازو سے کمانے کے قابل بن سکے۔"

دونوں نوجوان دوستوں کے دل غصہ سے اچھل پڑے۔ اور دلاور علی کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہوئی۔ جو اس کے چہرہ کو اسی قدر خوفناک اور وحشت خیز کر دیتی تھی۔ لیکن یہ دونوں دوست امیر جان کی تقریر کو بالکل درست سمجھ کر اپنے دل کی عیاریوں سے واقف تھے۔ اور چونکہ اپنی عیاری کے جال بچھانے کے واسطے نامدار آدمیوں کی تلاش رہتی تھی۔ وہ گل جان جیسی یا سوز اور شہری

لڑکی کی ماں سے دشمنی خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں بلند اختر تو اس کے دم بریدہ کتے کو بھی محبت کی نظر سے دیکھتے پرتلا ہوا تھا۔ پس انہوں نے خاموشی کے ساتھ اس فقرہ کو سہہ لیا۔ اور بلند اختر مسکرا کر بولا "بیگم صاحب آپ بالکل درست فرما رہی ہیں لیکن ہم دونوں دن رات اسی فکر میں رہتے ہیں۔ کہ کسی طرح اپنے دست و بازو سے کما دیں۔ اور دنیا میں معزز و ممتاز بنیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ سوائے گورنمنٹ کی نوکری کے کوئی چارہ نہیں۔ کیا کریں؟"

گل جان اپنی والدہ کی سخت اور گستاخانہ رائے سے کسی قدر ملول ہوگئی تھی اس نے دھڑکتے دل سے دلاور علی کی طرف دیکھا کہ جو ابدیا "اماں بلا سمجھے بوجھے یونہی ہر معاملہ میں بول اٹھا کرتی ہے۔ آپ بالکل برا نہ مانیں یہ آپ صاحبوں کا لڑکپن ہے کیا معلوم کیا ہونے والا ہے۔ اگر آپ دونوں ہی کسی دن تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر ہو جاویں پھر اماں خود آپ ہی صاحبوں کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ معزز اور قابل فخر سمجھنے لگیں گی"

امیر جان کے دل میں غصہ کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ مگر اس نے جھوٹے تبسم سے مسکرا کر کہا۔ خدا کرے۔ تم میں سے کوئی مسمار پور کا تحصیلدار ہو جاوے اور میرے سر سے سرکار کی فصول اور جابرانہ ٹیکس اقتا دے۔ خدا کی پناہ دو سو روپیہ ماہوار میں کون سی لمائیاں کر رہی ہوں ایک ہزار روپیہ میں رہ گیا ہے۔ وہ بھی چند روز کا مہمان ہے" یہ کہکر امیر جان نے لمبا سانس بھرا۔ گل جان کے دل میں والدہ صاحب کی حالت پر ترس آیا۔ اور اس نے مسکرا کر بلند اختر کی طرف دیکھا۔ پھر زمین پر نگاہ ڈالی اور بولی "خدا کرے۔ کہ بلند اختر کو اس لاٹری میں چالیس ہزار مل جاوے۔ اور ہمارے سب دلدر پار ہو جاویں"

ابھی گل جان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ کہ دہلیز کی طرف دوسرے اجنبی کے جوتہ کی چرچراہٹ سنائی دی۔ اور مسٹر کامران ایک نئے سوٹ سے مزین مسکراتا ہوا آگے آیا۔ گل جان نے مسکرا کر کامران کی طرف دیکھا۔ اور اس کے قریب آجانے پر کہتہ سے

بولی:

حدیث عشق زاں بطال منیوش
کہ مدسختی کند یاری فراموش

کیوں جناب امداد علی صاحب آپ کو میری علالت کی خبر نہیں ہوئی؟" کامران کے چہرہ پر سرخی جھلکی۔ اور اس نے پیشانی پر بل ڈالکر کہا "معزز خاتون میں نے ایک رونا سنا تھا۔ کہ آپ علیل ہیں۔ مگر اسی دن میرے نام لاہور سے تار آگیا تھا۔ مجھے قطعی علم نہیں۔ آپ کا مزاج کیسا رہا؟"

امیر جان نے کامران کو کرسی دیکر کہا "حضرت گل جان تو موت کے منہ سے بچی" پھر بلند اختر و دلاور علی نے اپنے اپنے منہ سے علالت کی شدت اور اس کی خوفناک حالت کی مزید کیفیت سنائی۔ مگر اسرائیل خاں کے واقعہ پر سب کی زبان بند رہی کامران نے متانت سے گل جان کی طرف دیکھکر کہا "الحمدللہ اب بالکل اچھی ہیں۔ میں نے اسرائیل خاں کے واقعہ کی خبر سنی تھی۔ اخبار پاونیر میں آپ کی گم شدگی کا ذکر تھا میں اس معاملہ کی تحقیقات کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے فرصت نہیں ملی کیا اسرائیل خاں گرفتار ہوگیا۔ آپ کس طرح واپس آئیں۔ کچھ کیفیت تو سنائیے"

امیر جان نے عیارانہ الفاظ میں گول مول واقعہ سنایا۔ اور فرحت علیخاں کے ذکر کو دبا کر سب الزام اسرائیل خاں کی گردن پر ڈالے" کامران گردن جھکائے سب سنتا رہا۔ پھر پیشانی پر بل ڈال کر بولا "یہ شخص اسرائیل خاں کون تھا کہ پولیس اسے اب تک گرفتار نہ کر سکی۔ میری رائے میں یہ ایک تدبیر آئی ہے جس سے اسرائیل خاں کا پتہ لگ سکے۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں۔ میں اس معاملہ میں ہاتھ ڈالوں"

امیر جان اور گل جان دونوں نے خوفزدہ آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھا پھر گل جان فق شدہ چہرہ اوپر اٹھا کر بولی "اجی آپ اس معاملہ پر خاک ڈالئے۔ اب مجھے دنیا کا تجربہ ہوگیا ہے۔ دراصل تجربہ کا مدرسہ بڑا شاق و سخت سبق دیا کرتا ہے لیکن انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"

کامران نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا "یہ تو بالکل درست ہے لیکن آپ صاحبوں کے ہاتھ میں ایک ذریعہ ہے جس سے آپ مجرم کو گرفتار کرا سکیں گے"

دلاور علی جو معاملہ سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ اور جس سے بلند اختر نے اصلیت پوشیدہ رکھی تھی بڑا شتیاق آمیز لہجہ میں بولا "حضرت آپ تو محکمہ پولیس کے قابل تھے کچھ تو بتلایئے۔ کیا تدبیر ہے مظفر نگر کوتوالی کا انسپکٹر تو مجرم کی گرفتاری سے مایوس ہو چکا۔ اور پانچو کا انجام اب تک کہلا ہوا ہے۔ آپ ہی حاصل کیجئے"

ماں بیٹیوں اور بلند اختر کے دل دھڑکنے لگے۔ اور تینوں نے اضطراب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کامران نے مسکرا کر دلاور علی کی طرف دیکھا اور اپنے دل کے غصہ کو دبا کر اپنے دل میں کہا۔ میں تیرے جیسے بدمعاش کی گرفتاری سے پانچ ہزار کمانا ننگا پھر آہستہ سے بولا "صاحبو آپ لوگ سراغرسانی کے کوچہ سے نابلد ہیں۔ میں نے ایک دفعہ سراغرساں بننے کا ارادہ کیا تھا مگر ناکامیاب رہا۔ مظفر نگر جس کے نام جو خط استیل خاں کے پاس سے آیا تھا۔ اس میں جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے اس پر ایک خاص نشان ہے۔ جو خط طغرا ہے وہ نشان چپراسی کی پیٹی پر تھا۔ مجھے اگر آپ اجازت دیں تو کل دو ہفتہ کے اندر اصلی مجرم کو پولیس کے حوالہ کر دوں"

چاروں سننے والوں کے دل دھڑک اٹھے۔ اور دلاور علی کی آنکھوں میں وہ مکروہ وحشت خیز آگ چمکی جس سے اس کا چہرہ اس قدر خوفناک اور مکروہ بن جایا کرتا تھا۔ گل جان جھلا کر بولی۔ اب اس معاملہ پر خاک ڈالنی چاہئے۔ خدا ہمیں ایسے بدمعاشوں سے بچائے جیسا اسرائیل خاں ہے" پھر ماں کی طرف تبسم سے دیکھ کر بولی۔ امید ہے مسٹر امداد علی کو بھی نہ موند پڑے چلیں گے"

امیر جان نے اپنے دل کے متوحش خیالات کو ضبط کر کے جواب دیا "بیشک بیشک" پھر گل جان نے سیر و تفریح کی تجویز کا خاکہ کامران کے سامنے پیش کیا۔ اور مسکرا کر بولی "مسٹر امداد علی کوئی سامان پوری دل بستگی کا فرمایئے۔ میں بیماری کے زمانہ میں گھر سے ایسی اکتا گئی ہوں۔ کہ پہاڑوں کی سیر کو دل چاہتا ہے"

کامران اپنی آنکھوں کو سکوڑ سکوڑ کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا "سب سے زیادہ دلچسپ تجویز یہ ہے۔ کہ ہم لوگ ایک جہاز اس تھیٹر نہر کے موہنڈ پر منعقد کریں اور دس بیس معزز آدمیوں کو مدعو کریں۔ سو دو سو روپیہ کا خرچ ہے ایک دو طوائف کو بھی لے جاویں۔ خوب گانا بجانا رہے۔ اور جو جلسہ بدمعاش اہل مجلس نے چودھری گھاسی رام کی کوٹھی پر تجویز کیا تھا۔ وہ ہم خود کر دکھلاویں۔

گل جان کی باچھیں کھل گئیں۔ اور سب لوگوں نے بھرے ہوئے دل سے کہا اہ ہو مسٹر امداد علی آپ تو بڑے روشن ضمیر آدمی ہیں۔ واقعی اس سے بہتر دل بستگی کا سامان نہیں ہو سکتا"

اپنی تجویز کو مقبول سمجھ کر کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس کے خیالات دور دور پہونچ گئے۔ پھر اس نے چہرہ کو متین بنا کر جواب دیا۔ تھیٹر کے لئے پردے تیار کرانے پڑیں گے۔ بہتر یہ ہے کسی ہوشیار آدمی کی مدد سے سب سامان کا تخمینہ لگایا جاوے اور دس بارہ روز کے لئے یہ جلسہ ملتوی کر دیا جاوے۔ پھر تاریخ مقررہ کر کے سو سو روپیہ چندہ دینے والوں کو شریک کیا جاوے۔ سب سے پہلے سو روپیہ میں پیش کرتا ہوں" کامران نے سو روپیہ کا ایک نوٹ گل جان کے آگے ڈال دیا جس نے دھڑکتے دل سے نوٹ اٹھا کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ امیر جان کے چہرہ پر تردد کے آثار ہویدا ہوئے مگر اس نے جھرجھری سے جواب دیا "علم چندہ مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی جیب سے دو سو روپیہ دونگی۔ سو مسٹر امداد علی دیتے ہیں چند معزز آدمیوں کو مفت کرم داشتن کے طریقے پر مدعو کر لینا چاہئے۔ واقعی یہی رائے بھلی ہے" بلند اختر اور دلاور نے بیک زبان ہو کر کہا۔ کیونکہ ان دونوں کے پلے ٹکہ نہیں تھا۔ اس وقت کامران نے ایک طبعزاد ناٹک کا خاکہ تیار کرایا جس میں گل جان کو پری زاد اور بلند اختر کو شہزادہ عظیم بخت کا خطاب دیا گیا۔ اور علی کو زرکار سی قزاق کا کام بتلایا گیا۔ جو گل جان کا عاشق بن کر اس کی اڑا لیجانے کی تدابیر اختیار کریگا۔ کامران خود سرانجام تھا۔ جو گل جان کو زرکار سی کے پنجہ سے

رہائی دلا کر بلند اختر کے سینہ سے لگا دیا گل جان کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو بھر آئے۔ اور اس نے چلا کر کہا "مسٹر امداد علی آپ تو بڑے ہوشیار اور زمانہ شناس آدمی نکلے" تھیٹر کا انعقاد دس روز کے لئے ملتوی کیا گیا۔

پچیسواں باب

مصنوعی تھیٹر کی تیاریاں

وہ دن گل جان اور بلند اختر نے بڑے شوق اور اضطراب سے گذارا جس روز کامران نے ایک تھیٹر کی تجویز پیش کی تھی بہنوں نے بڑی سرگرمی اور اشتیاق سے تھیٹر کی کامیابی اور دل بستگی کا پروگرام تجویز کیا۔ اور سہارنپور کے ایک بدمعاش اوباش آدمی کے ذریعے سے جس نے عرصہ تک تھیٹر کی نوکری کی تھی۔ مجوزہ تھیٹر کے اخراجات وغیرہ معلوم کئے گئے۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی حشمت خاں نامی تھا۔ جو کسی زمانہ میں خوبصورت مشہور تھا۔ اور عورت جیسی آواز رکھنے کے سبب تھیٹر میں بڑی جلدی نوکری حاصل کر لیتا تھا۔ اس شخص کا چہرہ کسی قدر دلکش تھا۔ آنکھیں بڑی ناک لمبی لیکن رنگت کسی قدر سیاہ تھی مگر یہ عیب پاؤڈر کی سفیدی سے ڈھک دیا جا سکتا تھا۔ اس نے بڑی متعدی سے گل جان کے منصوبہ میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا۔ اور اپنے شباب کی سیاہ کاریوں کو یاد کر کے گل جان کو ہوس ناکیوں سے دیکھا۔ کامران اس شخص کے اطوار اور مزاج سے فوراً آگہی واقف ہو گیا۔ اور وہ اس سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ مگر گل جان اور بلند اختر کو اس کی ملازمت اور برباد شدہ مہ جبینوں کی کہانیاں ایسی دلچسپ معلوم ہوئیں۔ کہ گل جان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اسے بڑے اعزاز سے بٹھلا کر اپنے دل کی خواہش متعلقہ تھیٹر بیان کی۔ چنانچہ نصف گھنٹہ کے اندر سب کی متفقہ رائے سے حسب ذیل باتیں منظور کی گئیں۔

(۱) سب سے پہلے صاحب ایگزیکٹو انجینر محکمہ نہر سے نہر کے موہنڈ پہ مصنوعی تھیٹر بنانے کی منظوری لی جاوے۔ اور صاحب ممدوح کو معہ میم صاحبہ شریک ہونے کی تکلیف دیجاوے۔"

(۲) تھیٹر گاہ پھونس اور بانس کی ٹٹیوں سے بنایا جاوے۔ اور نیچے اوپر چاروں طرف سرخ ڈل کا کپڑا منڈھا جاوے۔

(۳) ایک بڑے خیمہ میں معززین کی شب باشی کا انتظام کیا جاوے۔ اور اس کے پاس باورچی خانہ غسل خانہ اور بیت الخلا کے واسطے ٹٹیاں لگادیجاویں

(۴) خاص تھیٹر گاہ میں پانچ پردے یا ایکٹ رکھے جاویں۔ اور وہ حسب ذیل نظاروں میں تقسیم ہوں۔

پہلا پردہ پریزاد کا پریوں کے لباس میں اپنے باغیچہ میں پھولوں کی سیر کو آنا اور شہزادہ عظیم بخت کا بلباس فاخرانہ اس پر عاشق ہوجانا۔

دوسرا پردہ۔ شاہزادہ عظیم بخت کا پریزاد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر منہ چومنا اور شادی کی درخواست کرنا۔ اسی لمحہ میں ایک قزاق زرکاری نامی کا مسلح لباس میں سامنے آجانا اور پریزاد پر عاشق ہوجانا۔

تیسرا پردہ۔ شہزادی پریزاد کا ایک مکلف مسہری پر اپنی والدہ کے پاس سونا اور زرکاری قزاق کا پریزاد کو زبردستی اٹھاکر بھگا لیجانا۔

چوتھا پردہ۔ مسٹر امذوبی کا دیو بن کر زرکاری سے لڑنا اور شہزادی پریزاد کو بخیر و خوبی واپس لانا۔

پانچواں پردہ۔ شہزادی پریزاد کا اپنے عاشق عظیم بخت سے گلے ملکر رونا۔ اور اس کی والدہ کا شادی کی اجازت دیدینا۔

(۵) تھیٹر کے اختتام پر ایک مکلف دعوت جملہ معززین کے لئے تجویز کیجائے اور سب سے آخر میں ایک مقام دعوت خانہ کے لئے مخصوص ہو۔

(۶) تھیٹر کے انعقاد کرنے والوں کو اجازت دیجاوے۔ کہ وہ اپنے معزز

دوست یا احباب کو مدعو کریں۔ لیکن ان کے اسماء کمیٹی کے کارپرداز اں کے سامنے پیش کئے جاویں۔

(۷) تھیٹر کے لئے جس قدر سامان امیر جان کے گھر میں موجود ہو۔ صاحب اگزکٹو انجمن کی منظوری آجانے پر فوراً روانہ موہنڈ (مخرج نہر) کر دیا جاوے۔ یہ حشمت خاں اور کامران نے امیر جان کے جملہ کمروں اور اسباب خانہ کی مختلف اشیا دیکھیں۔ اور ضروری ضروری چیزوں کو نوٹ کر لیا۔ اس اثنا میں شجاعت نے کھانے کی تیاری کا اعلان کیا۔ اور گل جان نے مضطرب آنکھوں اور بیقرار دل سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا "اماں سب صاحبوں کو کھانے میں شریک کرنا چاہئے"

امیر جان نے مسکرا کر رضامندی ظاہر کی۔ اور دس پندرہ منٹ کے اندر اندر بیرونی کمرہ کے فرش پر صاف شفاف چاندنی کے اوپر وسیع دسترخوان بچھا دیا گیا خورد سال کلن نے سب صاحبوں کے ہاتھ دھلائے۔ اور بالترتیب مزہ دار کھانوں کی قابیں چنی گئیں۔ اس وقت گل جان کو مطلق جھوک نہ تھی اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ تھیٹر کے سوا اس کا دل کسی شغل سے خوش نہیں ہو سکتا۔ اور جن جن باتوں کا پروگرام تیار ہو چکا تھا۔ ان سے گل جان کو اپنے سامنے بڑی سخت منزل معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دوران طعام میں ہر شخص اس مجوزہ تھیٹر کے متعلق چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ اور ہر لقمہ کے ساتھ ایک نہ ایک بات طے شدہ سمجھی جاتی تھی۔ کامران کے دماغی ذہانت کی حشمت خاں نے بھی تعریف کی۔ اور اس کی ہر ایک بات پر صاد کرتا رہا۔ اسٹیج اور پردوں کی زیبائش پر بحث ہو چکنے کے بعد حشمت خاں نے بڑی مستعدی اور مشاقی ایکٹروں (کارپردازاں) کے لباس تجویز کئے۔ اور اپنے لئے پیانو باجے پر گانا بجانا مخصوص کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس سرد و گرم چشیدہ اوباش آدمی نے تبلایا۔ کہ ایکٹر لوگ اپنا اپنا پارٹ شعر و اشعار میں کریں۔ اور کسی شاعر کو بلا کر حسب حال اشعار تصنیف کرا لینے چاہئیں لیکن اگرچہ گل جان اور اس کی والدہ اس تجویز پر از حد محظوظ ہوئیں۔ اور بلند اختر اور

لادعلی نے واہ واہ کہہ کر داد دی سنگر کامران نے گل جان کی دوشیزگی اور عفت حشمت درخواہ مخواہ کی شہرت لحاظ کر کے اس تجویز پر قطعی ناپسندیدگی کا اظہار متین لہجہ میں کیا۔ حشمت خاں صاحب یہ بات آپ قطع کرلیں۔ کہ ہم کوئی ناٹک تو قایم کر ہی نہیں رہے محض دل لگی کا مشغلہ ہے۔ شعر و اشعار اور فرضی بناؤ۔ سنگار سے گل جان پر چاروں طرف سے انگشت نمائی ہوگی۔ اور جو عزت اور ادب اب رئیس و روسا گل جان کو شریف ادمی سمجھ کر ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ وہ سب ملو الف گریزی ہیں تبدیل ہو جاویگا پھر ہم جیسے شریف آدمیوں کی جگہ بھڑوے نقال بہت آنے لگیں گے۔"

گل جان کے رخساروں پر حیا و شرم سے سرخی پھیل گئی۔ اور اس نے کامران کے منہ سے ایسے معزز اور دل خوش کن الفاظ سننے کے بعد کامران کو زہر کتے دل سے دیکھ کر کہا۔" واقعی مسٹر امداد علی ہم سب سے زیادہ معزز اور تجربہ کار ہیں۔ میں بھی آپ کی رائے کی تائید کرتی ہوں شعر و اشعار سے سردست احتراز لازم ہے پھر بھی دیکھا جاویگا۔"

بلند اختر اور دلاور علی نے کسی قدر بے چینی سے حشمت خاں کی طرف دیکھا اور اسے مجوزہ ناٹک کی روح رواں سمجھ کر اس کی ناراضی کے اندیشہ سے ڈرنے لگے مگر میرجان نے مسکرا کر اس فقرہ سے سب کا اطمینان کر دیا۔" واقعی حشمت خاں صاحب کا باغ ناٹک کے معاملات میں غضب کا مشاق ہوا ہے مگر مثل مشہور ہے:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

بہتر یہی ہے۔ کہ اس جلسہ کو محض دل لگی اور تفریح سمجھ کر مہذب اور رومانہ سنجیدگی یا انگریزی طرز مذاق کے طریق پر رکھا جاوے۔"

امیر جان جیسی چالاک اور زمانہ ساز عورت کے منہ سے اپنی تعریف سنکر حشمت خاں نے جھوٹے تبسم سے کامران کی طرف دیکھا۔ پھر کن انکھیوں سے گل جان کے چمکتے ہوئے رخساروں کو گھور کر بولا۔" اچھا مسٹر امداد علی صاحب میں

ہارا۔ آپ جیتے۔ آگے چلئے۔ لیکن شہزادہ اور شہزادی کا لباس تو ضرور فاخرانہ ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ پر ڈیڑھ گھنٹہ بحث ہوتی رہی۔ بالآخر گل جبان کے معمولی لباس کی جگہ وہ زنانہ لباس سمہ تاج تجویز ہوا۔ جو فسانہ عجائب کی تصویروں میں حاص خان عالم کی معشوقہ انجمن آرا کے دیکھنے میں آتا ہے۔ اور بلند اختر کو عمدگی سے شہزادہ عظیم بخت بنانے کے لئے انگریزی کوٹ پتلون کی جگہ لکھنو والوں کی اچکن لمبی چست پائجامہ کے اوپر ایک کامدار عمامہ بہتر معلوم ہوا۔ جس سے وہ شاہان اودھ کی صورت اختیار کر سکے۔ پہر ولا اور علی یا "زرکاری قزاق" اور مسٹر امداد علی" یا دیو خونخوار کے لباس پر ذکر چھڑا۔ اور ان دونوں کو اجازت دی گئی۔ کہ اپنے چہرہ کو کاجل سے سیاہ اور خوف ناک بنا کر جس قدر چاہیں۔ دل کش بنالیں"

کامران نے اپنے سر پر گائے کے سینگ مہیا کئے جانے اور دلاور علی نے اپنے لئے تیر و تفنگ اور بندوق تلوار کی خواہش ظاہر کی۔ اسلحہ کا حاصل کرنا فنا دشوار تھا۔ اور حشمت خاں نے سر ہلا کر کہا "او ہو آپ کو ہتھیار نہیں مل سکتے۔ لکڑی کی تلوار بندوق بنا لیجائے" اس فقرہ پر خوب قہقہہ پڑا۔ اور بلند اختر نے دلاور علی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں اس طفلانہ کلمہ سے غصہ کی جھلک آگئی تھی۔ پہر بلند اختر مسکرا کر کہنے لگا "جی نہیں کوئی کام کرے۔ تو ادھورا کیوں چھوڑے میرا پھوپھی زاد بھائی اشتیاق احمد انبالہ میں ڈپٹی انسپکٹر پولیس ہے۔ ایک دو روز کے لئے بندوق و تلوار ضرور مل جاوے گی۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ہاں تیر و کمان اور زرہ بکتر آج کل ٹیڑھی کھیر ہے" پہر پیشانی پر بل ڈال کر بولا "آہا خوب یاد آیا تیر و کمان اور زرہ بکتر رفیق احمد کے یہاں ہے۔ عرصہ دراز سے بطور خاندانی ہتھیاروں کے بیکار پڑے ہوئے ہیں۔ میں کل ہی لا دونگا"

کامران کے چہرہ پر سرخی پھیل گئی۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس نے کہا نس کر کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا۔ رفیق احمد کون ہیں۔ کیا کوئی صاحب

تعلقدار اودھ سے ہیں؟

بلند اختر نے مسکرا کر جواب دیا "جی نہیں معمولی رئیس زادے میرے حقیقی ماموں کے بیٹے ہیں" "درست۔ درست" کامران کے منہ سے نکلا۔ اور اس نے اپنے دل کی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے حشمت خاں کی طرف دیکھکر پوچھا "ہاں صاحب میں تو کھانے سے فراغت پاکر صاحب اگر کٹوا نجیتر نہر سے منظوری لیتے جاؤنگا۔ مسٹر بلند اختر تیر و تفنگ کا ذمہ لیتے ہیں۔ دلاور علی صاحب میرے لئے بگھی کے سیٹنگ لادیں گے۔ آپ بیدوں کے قابل ہر طرح کے نمونے گل جان صاحبہ کو پسند کرادیں۔ میں واپس آکر خود خرید لونگا"

اس عرصہ میں سب صاحبوں نے کہلانے سے ہاتھ کھینچ لئے گل جان عرصہ سے شکم سیر ہو کر محض طعام کو طوالت دینے کے لئے ہاں میں ہاں ملا رہی تھی نوکروں نے کھانا بڑھایا۔ اور صابون سے ہاتھ صاف کرا کر دو بڑے بڑے ٹرکی تولئے سامنے ڈال دیئے۔ کھانا اٹھ جانے پر گرم گرم قہوہ کا دور چلا۔ حشمت خاں جیسے عیاش اور آوارہ آدمی کو مرغن کھانا اوپر سے قہوہ نصیب ہو گیا۔ تو اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر امیر جان کیطرف دیکھا۔ اور دل سے کہنے لگا۔ اگر ایسی مالدار عصمت کی لڑکی ہاتھ آجاوے۔ تو دنیا کی سب ہنکنڈوں سے ہاتھ دھولوں" بیرونی کمرہ سے اٹھ کر سب لوگ اندر والی کمرہ میں داخل ہوئے اور گل جان نے سب کو اعزاز سے بٹھلا کر حقہ لوبان کا حکم دیا۔ پھر جنوبی کمرہ میں کامران کو لیجا کر تھوڑی دیر کے لئے معافی مانگ کر شانہ کرنے چلی گئی۔ پانچ منٹ تک اپنے استراحت خانہ میں ایک آئینہ کے سامنے چوٹی باندھنے کے بعد گل جان مسکراتی ہوئی ان لوگوں میں آئی۔ پھر شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں۔ کیونکہ حشمت علی اسے ایسی آوارہ اور فہمیدہ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ اس نے کسی مرد کو اس طرح آنکھ ملاتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ وہ کھسیانی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور دھڑکتے دل سے کامران کو دیکھکر بولی "جی ہاں تو کپڑا وغیرہ آج خرید کر سب سامان مہیا کر لیا جاوے۔ پہلے آپ منظوری لائیے"

کامران نے متین صورت بنا کر جواب دیا "منظوری کے لئے آپ کی جانب سے درخواست ہونی چاہئے۔ مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ آپ انگریزی میں ایک درخواست لکھ دیجئے۔ اور ایک پرائیویٹ خط کے ذریعہ سے صاحب اگزکٹو انجینئر کو تھیٹر میں مدعو کیجئے"

دلاور علی نے آنکھیں پھاڑ کر ذرا واقف کاری کی آواز میں کہا "مسٹر رمضہ ہاکن دونوں کو مدعو کرنا چاہئے۔ گل جان فوراً کانپتی ہوئی انگلیوں سے درخواست لکھنے بیٹھ گئی" ملیدا خبر مضمون بتلا رہا تھا۔ ایک طرف میز پر گل جان و ملیدا خبر بڑبڑا رہے تھے۔ دوسری طرف حشمت خاں حقے کے دھوئیں سے تمام کمرہ کو بھرے ہوئے تھا۔ ایک جانب امیر جان سیرتہ کے نیچے سپاری کٹکٹ کاٹ رہی تھی ایک طرف کامران دلاور علی سے دوستانہ اور خوش طبعی کی باتیں کر رہا تھا غدو میاں کلن نے امیر جان کے پاس آکر آہستہ سے کہا "سرکار میں بھی ناٹک دیکھوں گا"

امیر جان نے لڑکے کے منہ پر تھپیڑ جڑ دیا جس کے صدمہ سے خوردسال کلن منہ بنا کر چپ چاپ رونے لگا۔ گھبرائی ہوئی گل جان نے آنکھ اٹھا کر کلن کی طرف دیکھا۔ اور بھرے ہوئے دل سے کہا "کیوں روتا ہے۔ تجھے اور شجاعت اور باورچی سبھی کو لے چلیں گے حشمت خاں صاحب اس لڑکے کے لئے خدمتگار کی درخواست کیجئے" یہ سن کر آنکھیں مل کر ہنس پڑا۔ پھر شجاعت کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر آہستہ سے بولا "بتیا شجاعت ناٹک کب ہے؟ اس نے کلن کا ہاتھ ہٹا کر آہستہ سے کہا خاموش کھڑا رہ۔ سرکار لکھ رہی ہیں" دس منٹ کے اندر گل جان نے ایک درخواست اور خط کامران کے ہاتھ میں دیا۔ اور وہ حقہ کے دو تین دم کھینچ کر گل جان کی طرف مسکراہٹ سے دیکھ کر بولا۔ ہاں مجھے اپنی فٹن دلوایئے۔ تاکہ صاحب انجینئر پر کچھ رعب بھی طاری ہو۔ ورنہ کہٹ سے انکار مل جاوے گا۔ اس لمحہ میں فٹن کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ حشمت خاں، نیوتی لوگوں کی طرح بے تحاشہ حقہ کا دھواں نکال کر بولا۔ اچھا تو کپڑوں کے نوٹنے لے آؤں" جوں ہی کامران اور حشمت خاں رخصت ہوئے

گل جان نے دو ڈیروں کا فکر شروع کیا۔ اور شجاعت کے ہاتھ ایک خط میر عاشق حسین صاحب رئیس سہارنپور کے پاس بھیجا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ تک دونوں ماں بیٹیاں اور دونوں آوارہ مزاج دوست تھیٹر کی پرزمزار ضرورت پر لن ترانیاں ہانکتے رہے۔ اور ایک صاف کاغذ پر ان اشخاص کے نام لکھے گئے جو اس کمپنی میں نوکر کئے جانیکے قابل تھے ہر ایک شخص کو اجازت دیگئی کہ ایک دو شخصوں کو نوٹ بھیج سکے۔ تب پہلے گل جان نے اپنی طرف سے میر عاشق حسین صاحب کا نام تجویز کیا۔ جو عرصہ دراز سے گل جان کو نظر عشق سے دیکھتے تھے۔ پھر اس کی والدہ نے کرامت خان صاحب رئیس دیوبند کا نام پیش کیا جو وقتاً فوقتاً گل جان کے مداحین شمار ہونے میں آیا کرتے تھے۔ بندہ اختر نے اپنے ماموں زاد بھائی رفیق احمد اور پھوپھی زاد بھائی استیاق احمد کے اسماء درج کرائے۔ دلاور علی نے اپنی معشوقہ شکیلہ بیگم کا نام لکھوایا جس کے نام سے دونوں ماں بیٹیوں کے دل اچھل پڑے اور گل جان ایک نئی انگریزی النسل شریف زادی سے واقف ہونے کا موقع حاصل ہوتا دیکھکر پرمسرت دل سے کامران کی جدت طرازی کی داد دینے لگی۔ جو اس تھیٹر کا اصلی محرک تھا۔ اس پروگرام میں مسٹر ومسز ہاکسن کے اسماء درج کر دینے کے بعد مسٹر امداد علی اور حشمت خاں کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی۔ تین بجے کے قریب کامران اور حشمت خاں دونوں واپس آئے اور کامران نے منہ کا پسینہ پونچھکر کہا "لیجئے صاحب بڑا کام تو آج طے ہوگیا۔ اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے۔ کہ صاحب بہادر اور میم صاحبہ دونوں نے تمہارے تھیٹر میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں بیس جنوری مقرر کر آیا ہوں۔ اب اس تاریخ کی پابندی لازم ہوگی۔ انگریزوں کا معاملہ ہے"

گل جان کی آنکھیں گلابی مست اور بے چینی سے کھل گئیں۔ اور وہ آج کے مشاغل اور مسرت خیز باتوں سے اس قدر متاثر ہوئی۔ کہ کامران کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی۔ اور ہو مسٹر امداد علی جب ہمارے تھیٹر کی شرکت انگریزوں نے بھی منظور کر لی۔ تو ضرور یہ کانک قابل دید ہوگا۔ یہ دیکھو پروگرام میں ہر شخص نے ایک دو جاہ

مشورہ کرنے کی رائے دی ہے۔ مسٹر دلاور علی شکیلہ ہیرنگٹن کو بلاتے ہیں۔ ایک انگریزی عورت گویا اور شریک ہوگی۔ آج معلوم نہیں۔ کس قسم خوشی کے سامان پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ میں تو ابھی سے تھک گئی۔ اچھا اب آپ لوگ استراحت خانہ میں آکر بحث کریں۔ میں ذرا آرام کرونگی" کامران نے اپنے ہاتھوں کو گل جان کے شانوں پر رکھدیا۔ اور اس کی پرعشوہ شرمیلی آنکھوں کو محبت سے دیکھ کر بولا" اچھا چلئے استراحت خانہ ٹھیک ہے۔ آپ بہت تھک گئی ہیں۔ ابھی تک کمزوری باقی ہے۔ شکیلہ ہیرنگٹن کون ہے؟ گل جان نے مسکرا کر دلاور علی کی طرف دیکھا جس نے شرمندہ آنکھوں سے کامران کو دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اور دھڑکتے دل سے بولا" شکیلہ ہیرنگٹن ایک بڑی خاندانی رئیسہ ہے۔ وہ روڑکی کے قریب چھال آصف نگر پر رہتی ہے"

کامران نے نہایت مضطرب اور پراشتیاق آواز میں پوچھا" کیا آپ کا ان سے دوستانہ ہے؟"

دلاور علی نے شرما کر جواب دیا۔ نہیں میں ان سے واقف ہوں۔ جب مسٹر بلند اختر رفیق احمد کو بلا رہے ہیں۔ تو شکیلہ ہیرنگٹن کو بھی مدعو کرنا چاہئے کیونکہ ان دونوں میں بڑی گہری دوستی ہے"

کامران نے دھڑکتے دل سے جواب دیا" اچھا میں سمجھ گیا۔ مگر یہ رئیس زادہ خوبصورت اور مالدار ہوگا۔ کہ ایک انگلش لیڈی اس سے مانوس ہے"

بلند اختر نے منہ بنا کر کہا۔ رفیق احمد کچھ خوبصورت آدمی نہیں ہے اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ دیکھئے اگر یہ دونوں آگئے بڑی مسیبت ہوگی لیکن یہ سننے میں آیا ہے کہ شکیلہ ہیرنگٹن پردہ کرنے لگی ہے۔ شاید برقعہ میں آوے" انگریز عورت اور برقعہ شکیلہ ہیرنگٹن کی کیا عمر ہوگی؟" بلند اختر نے ہنس کر جواب دیا" میں نے اس عورت کو کبھی نہیں دیکھا۔ مسٹر دلاور علی سے پوچھئے" دلاور علی نے بڑی بے پرواہی سے کہا"

"کوئی سترہ اٹھارہ سال" اسی لمحہ میں حشمت خاں نے دس بارہ تھان مختلف اقسام کے کپڑوں کے ایک گٹھڑی سے کھولنے شروع کئے ساتھ ہنس کر بولا "لیجئے یہ سارے بازار کے عمدہ کپڑوں کا عطر ہے۔ جھٹ پٹ پسند کر لیجئے۔ آدمی ساتھ آیا ہے" گل جان اپنے استراحت خانہ کیلئے شانہ کر کے چلائی۔ اور سب لوگ تدریک لانے کمرہ میں گھس آئے۔ نوکروں نے مزید کرسیاں ڈالیں۔ اور کھڑکیوں سے پردے ہٹا کر کیواڑ کھول دیئے۔ دونوں ماں بیٹیاں مہربان پلیٹ گئیں۔ اور چاروں طرف کپڑوں کے حاشیہ تراشی میں لگے رہے بارے ایک گھنٹہ کے بعد خاص خاص کپڑے پسند کر لئے گئے۔ اور کامران سو روپیہ لے کر بازار جانے لگا گل جان نے اسے روک لیا۔ اور چار کا حکم دیا۔ سب نے بے فکر اور ہنس مکھ آدمی کیطرح چار پی۔ اور جب کامران باہر نکلنے لگا۔ تو گل جان نے قہقہہ لگا کر کہا "ہاں مسٹر اسد علی سب سے پہلے آپ ان اشخاص کے نام درج کرا دیجئے جنہیں آپ مدعو کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دعوت کے خطوط آج روانہ کر دیئے جاویں گے" کامران کے چہرہ پر تردد کے نشانات ظاہر ہوئے۔ اور اس کا خیال فوراً احمد آباد اسکیلہ ہیرنگٹن کیطرف رجوع ہو گیا۔ جنکے نام وہ خود خطوط بھیجنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے جھوٹے تبسم سے جواب دیا "ایسی کیا جلدی ہے۔ ذرا صبر کیجئے۔ التعجیل من الشیطان والتانی من الرحمان" دعوت نامے کل روانہ کیجئے گا۔ اسی عرصہ میں جیسا دور کا خیال کامران کے دماغ میں پیدا ہو رہا تھا ایسی طرح ایک خیال دوسری شکل میں بلند اختر کے دل میں سمایا۔ اور اس نے چلا کر کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک بڑی زبردست فروگذاشت ہو گئی۔ یا رولا در علی ہوتی رام کو سب بھول گئے" ولا در علی نے اوہو کہہ کر بلند اختر کا منہ تکا۔ اور بلند اختر نے گل جان کے سرہانے سے پروگرام لے کر موتی رام کا نام درج کر دیا۔ گل جان نے تعجب ہو کر پوچھا "کون موتی رام" بلند اختر نے ہنس کر جواب دیا "تم نہیں جانتیں بڑے کام کا آدمی ہے۔ تمہاری ملاقات کرا دیں گے" کامران اس تذکرہ کو بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ پھر گل جان کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بلند اختر کی باتوں

نے اس کا خیال دوسری سمت پہنچا دیا۔ وہ کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ بلو نہیں رہیں گیا کہ پہنچا تھا۔ یہاں میری طرف سے ایک نہور گورو صاحب اور ان کے چیلے کو مدعو کر آیا تھا۔ گورو جی کا نام پنڈت لکشمی نرائن اور چیلے کا نام درگا داس ہے۔ سب لوگوں نے مسکرا کر کامران کی طرف دیکھا۔ پھر تعجب سے پوچھنے لگے۔ آپ کا ان سے کیا تعلق ہے؟

کامران نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ تعلق کچھ نہیں۔ یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک مندر میں رہتے ہیں اور اصلیت یہ ہے کہ پنڈت لکشمی نرائن بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ آپ سب لوگ نہایت محظوظ ہونگے

گل جان نے مسکرا کر جواب دیا بغیر اگر آپ ایسے صوفی منش ہیں۔ تو کچھ مضائقہ نہیں مگر دلاور علی اور بندا خیر نے خدا رسیدہ بزرگ کا ذکر سن کر اپنے دل میں ایک قسم کی بے چینی اور ٹھرکن محسوس کی مگر وہ حشمت خاں کی ہمرنگی اور تمسخرانہ ٹھٹھولوں کے آگے بہت جلدی دل سے محو ہو گئی۔ اس لمحہ میں میر عاشق حسین صاحب نے ڈیروں کی منظوری بھیجی۔ اور غروب آفتاب سے پہلے تھیٹر کا انعقاد ۔ حضوری کا ایسا مستحکم اور مسلمہ سلسلہ ہو گیا جیسے دن کے بعد رات۔

چھپنواں باب

علاج و تدارک کے مقابلہ میں پیش بندی ارزاں پڑتی ہے

اگلے دن کامران سویرے اٹھا۔ اور ہدایت علی کو ضروری اشیا خرید لینے کی ہدایت کر کے پنڈت لکشمی نرائن سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ پنڈت لکشمی نرائن اس خدا رسیدہ ہستی کا نام ہے۔ جس نے کامران کو چند منٹ کہنے اپنی مقناطیسی قوت سے مدہوش کر کے رفیق احمد کے حملہ آور کی اصلی

کیفیت آبشار آصف نگر کے پل پر دکھائی دی تھی طلوع آفتاب سے پہلے کامران مہنت موصوف کی سرد رسی میں پہونچا۔ جہاں اوسے اوس کے پہلی کیفیت پوجا پاٹ میں مصروف پایا۔ کامران نے بڑے ادب سے ڈنڈوت اوا کی یہ مقدس مہنت اپنے اشغال میں ہمہ تن محو ہو رہا تھا۔ اس نے کامران کی طرف منہ بھی نہ اٹھایا۔ دو تین منٹ کے اندر بزرگ سفید ریش جوگی کی پوجا ختم ہوگئی اور مندر سے نکل کر ہکا بکا کامران کی طرف دیکھنے لگا۔ اوس وقت مقدس فقیر سرتاپا ننگا تھا۔ البتہ جائے ستر پر ایک کپڑا باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں بالکل ننگے تھے۔ سر کے لانبے سفید بال منہ پر بکھر رہے تھے۔ یہی کیفیت پہلے تھی کامران نے بارویگر آداب عرض کیا۔ تو مہنت نے مسکرا کر دونوں ہاتھوں سے سلام لیا۔ اور کامران سے مصافحہ کر کے کہا "میں نے آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔ معاف فرمائیے گا۔ مزاج کیسا ہے کیسے تکلیف فرمائی" کامران نے نہایت ادب کیساتھ "الحمدللہ" کہکر سائیں کی مزاج پرسی کی۔ صدر سیدہ فقیر نے ایک بیچ کے اوپر سے اپنا کمل اٹھایا۔ اور اوسے اوڑھ کر باہر نکل آیا۔ شرق کی جانب زرد آفتاب کی کرنیں درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر رخشندہ فرش پر گر رہی تھیں۔ اور آس وپاس پرندوں کے چہچہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مقدس فقیر نے لمبا سانس بھر کر آفتاب کی طرف دیکھا۔ پھر پیشانی پر بل ڈال کر بولا "یہ سانس جو کہ آرہ لگ آگے جاتے ہے۔ وہ ہان حرمن عمر کو میری کھائے جائے ہے" کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اسے اس شعر کے ہر لفظ میں ایسی کشش معلوم ہوئی۔ کہ گویا فقیر اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ بچھے فرش پر کمنڈل کی طرف ایک بیچ بچھی ہوئی تھی۔ فقیر ایک کنارے پر بیٹھ گیا اور کامران کو شفقت سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں مقدس فقیر کا چیلا بھی کمل اوڑھ کر بیٹھا۔ مقدس جوگی نے دونوں ہاتھ کمل سے نکالے اور درختوں کی طرف کر دیئے۔ اوسی لحظ میں کامران کو چار نارنگیاں بوڑھے فقیر کے ہاتھوں میں گرتی ہوئی نظر آئیں۔ اور کامران کا چہرہ فق ہوگیا۔ مقدس

فقیر نے نازنینوں کو سنبھال کر کامران کی طرف دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی تیزی اور چمک ہویدا ہوئی۔ کامران کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ جوگی کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ اوس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ ڈر گیا۔ مبادا یہ خدا رسیدہ مہنت اوسے پہلے کی طرح بیہوش نہ کر دے۔ مگر بزرگ درویش کے چہرہ پر تبسم ظاہر ہوا۔ اور اوس نے نازنینوں کو چاروں طرف میں پھینک کر آہستہ سے کہا "بلند اختر۔ دلاور علی۔ رحمت ہوتی رام" کامران کا دماغ چکر میں آگیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرگی آگئی۔ اوسے ایسا معلوم ہوا کہ اوس کے سامنے ایک فوٹو گراف تھیٹر کا پردہ کھنچا ہوا ہے۔ اور وہ بلند اختر۔ دلاور علی۔ اور رحمت رمتی رام کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی ہوئی دیکھ رہا ہے۔ کامران کے کانوں میں شائں شائں ہونے لگا۔ اور اس کی زبان بند ہوگئی۔ مقدس مہنت نے جھٹ پٹ اچھل کر کامران کی پیشانی پر ہاتھ پھیر دیا۔ اور مسکرا کر کہا۔

"چالاک سراغرساں بیدار ہو جا" کامران کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اسے اپنی زبان قابو میں معلوم ہوئی۔ اس نے چلا کر کہا "اے مقدس ان باتوں سے کیا مطلب" بزرگ درویش نے ہنسکر جواب دیا ہے

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ہاں آپ فرمایئے مزاج کیسا ہے۔ کیسے تکلیف فرمائی" کامران کو اس وقت اپنا دل بالکل وصلی اور تندرست حالت میں معلوم ہوا۔ اور اس نے اپنی زبان کو قابو میں کر کے بزرگ درویش کی طرف دیکھ کر عرض کیا "مقدس جوگی جی۔ اس شہر میں میری ایک عورت گل جمان سے دوستی ہے۔ وہ بیس جنوری کو نہر مین کے سیج پر ایک تھیٹر منعقد کر رہی ہے۔ چند معزز آدمی جمع ہونگے۔ میری عین آرزو ہے۔ کہ آپ اپنے چیلے سمیت تشریف لا دیں" بوڑھے جوگی اور چیلہ دونوں کے چہروں پر تبسم ظاہر ہوا اور مقدس فقیر نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "بچوں کا کھیل ہے۔ بہت اچھا۔ آپ جایئے انتظام کیجئے" اس وقت کامران کے بدن میں حد سے زیادہ چستی اور پھرتی پرواز

معلوم ہوئی۔ وہ بیچ سے کھڑا ہی ہوا تھا۔ کہ اپنے کرایہ کے مکان میں ہدایت علی کے پاس کھڑا پایا۔ جو اس وقت سلوار کے اندر چار تیار کر رہا تھا۔ کامران کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور اس کے ناک پر پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر ٹکا ٹکا ہدایت کی طرف دیکھنے لگا کامران کو سنڈھا دیکھ ہدایت علی نے ایک پیالی چاء کی بنائی۔ اور ہاتھ میں ایک بسکٹ دے کر پوچھنے لگا "آپ کہاں تشریف لے گئے تھے" کامران نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "میں ذرا جوا خوری کے لئے جنگل گیا تھا۔

اس وقت اوس کے دل میں مہنت فقیر کی کرامات کا اس قدر گہرا اثر تھا۔ کہ وہ اس کے رعب میں کوئی بات اوس کے کمالات کے متعلق زبان سے نکالنے کا یارا اپنے اندر نہ پاتا تھا۔ اوسے اپنا جسم معمول سے زیادہ کمزور اور ہلکا معلوم ہو رہا تھا۔ چائے کر اوس کے جسم میں توانائی آئی اور اس نے خوف زدہ نگاہ سے ہدایت کو دیکھ کر کہا "میں اس وقت ڈاکخانہ میں جاؤنگا۔ چند ضروری خطوط روانہ کرتے ہیں۔ تم چائے کر شب گذشتہ کی بنائی ہوئی اشیائی الفور خرید لو۔ آج میں سارے دن گل جان کے یہاں رہونگا۔ شاید دن کا کھانا بھی وہاں ہی کھاؤں۔ آج ضرور ہی اسباب متعلقہ تھیٹر بند کرا کر گاڑیوں میں روانہ ہو جانا کیا جاویگا" جی ہاں آپ مطمئن رہیئے" ہدایت علی کے منہ سے نکلا اور کامران اپنے کیواڑوں میں جھانک کر باہر نکلا۔ وہ اپنے گھر سے بیس ہی قدم بڑھا ہوگا کہ جنوب کی طرف سے اوسے بلند اختر و دلاور علی آتے ہوئے ملے اور ہنسکر کہنے لگے "وہ حضرت آپ ادھر کہاں" کامران نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "میں اولیں مقدس بزرگوں کو تھیٹر کی دعوت دینے گیا تھا جن کے اسماء کل لکھا چکا ہوں۔ کہئے کوئی نئی بات تو نہیں" دونوں نوجوان دوستوں نے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کہا اس سے زیادہ نئی بات اور کیا ہوگی۔ کہ گل جان نے ہمیں تمام شب جگایا۔ سب ضروری اسباب حشمت خاں کی مدد سے منتخب ہو کر بکسوں میں بند ہو رہا ہے۔ بائیس بکس ہو گئے ہیں۔ تین چھکڑوں میں لدے گا۔ ہم دونوں مسٹر مرتی رام سے ملنے گئے تھے۔

اوسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔ یہ ہندو مہاجن اوپیہ کے کیڑے ہوتے ہیں کھیل کو کود کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔" کامران نے خوفزدہ نگاہوں سے دونوں بدحواش دوستوں کی طرف دیکھا۔ اور بے شک بے شک کہہ کر آہستہ سے بولا "میں ذرا بازار ہو آؤں۔ کچھ کپڑا سلوانا ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد گل جان صاحبہ کے یہاں پہونچتا ہوں ہم بھی اسی وقت تک آویں گے۔" عیار نوجوانوں کے منہ سے نکلا۔ اور کامران اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اسے اس وقت اس بات کا تعجب تھا۔ کہ رات بھر اسباب بند کرنے کی زحمت گوارا کر کے ان دونوں کو ایکہ کی ضرورت آپڑی تھی۔ کہ صبح سویرے موتی رام کے درشن کو روانہ ہوگئے۔ آخر یہ دونوں دوست اس سے اس قدر مارا مارا کیوں رکھتے ہیں۔ پھر اس کے خبرس دماغ نے چند صائب باتوں پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ اور وہ دھیرے دھیرے دل سے بولا۔ کاش میں اس راز کو بھی حل کر لوں۔" نصف گھنٹہ کے بعد وہ جنرل پوسٹ آفس متصل ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ اور اپنے خط مانگے۔ اس کے نام آج تین خط تھے۔ ایک اوس کی زوجہ کا لاہور سے دوسرا رفیق احمد کا اور تیسرا اسکیلہ ہیرنگٹن کا معلوم ہوتا تھا۔ اوس نے معمولی بے پرواہی سے تینوں خطوط پڑھے۔ مکان پر خیریت تھی۔ اسکیلہ ہیرنگٹن نے لکھا تھا۔ کہ اوسے محکمہ سڑک سے ڈھائی ہزار مل گیا۔ رفیق احمد کا خط البتہ اس کے لئے دماغی غذا لایا تھا۔ اور اوس کی عبارت حسب ذیل تھی:۔

ڈیر کامران۔ امید ہے۔ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ ایسی جلدی سہارنپور چلدیئے۔ میرے نام آپ کے چلنے پر ایک خط موتی رام پسر لالہ کاشی رام مہاجن سہارنپور کا آیا۔ جس میں اوس نے لکھا ہے۔ کہ اوس کے والد کا چالیس ہزار روپیہ میرے والد صاحب پر نکلتا ہے۔ میں نے والد صاحب سے دریافت کیا۔ آیا میرے والد صاحب کسی کے مقروض تھے۔ مگر وہ قطعی لاعلمی ظاہر کرتی ہیں۔ اور مجھے اس معاملہ میں کلام ہے۔ بہرحال میں اپنے والد صاحب کے ذاتی معاملات کو عدالت میں پہنچانے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ اور چاہتا ہوں۔ کہ علی الدین اور موتی رام کو بینک سے روپیہ دلوادوں۔ لیکن

سب سے بڑی مشکل جیسا کہ آپ واقف ہیں یہ ہے کہ مس شکیلہ ہرنگٹن نہ مسلمان ہوگی اور نہ میرا قبضہ بینک کے روپیہ پر ہو سکے گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ جس شخص نے میرے والد صاحب کا وصیت نامہ اور میرا خط چرایا۔ وہ سہارنپور میں موجود ہے۔ اور آپ اوس سے واقف ہیں۔ براہ کرم آپ پتہ لگانے کی کوشش کیجئے آیا موتی رام اوس شخص سے تو واقف نہیں۔ اور جس قرضہ کا موتی رام نے ذکر کیا ہے وہ دراصل قابل ادائیگی ہے۔ یا محض حیلہ۔ میں نے سردست موتی رام کو اطلاع دیدی ہے کہ وہ سردست میرے والد صاحب کے تمسک کو عدالت میں پیش نہ کرے۔ اور میں عنقریب اوس کے متعلق کوئی مسہیل سوچ لونگا۔ میں چالیس ہزار کے تمسک کو خود سہارنپور آکر دیکھونگا لیکن اس وقت میں کسی قدر عدیم الفرصت ہوں۔ اس لئے آپ کو لکھدیا گیا ہے۔ کہ آپ کسی طرح ایک جہلک اوس تمسک کی دیکھ کر مجھے اطلاع دیں۔ اور اگر میرے آنے کی ضرورت ہو۔ بذریعہ تار اطلاع کر دیں۔

آپ کا خادم رفیق احمد عفی عنہ

اس خط کے مضمون سے کامران کا دل بے تابی کے ساتھ اچھل پڑا۔ وہ اس معاملہ کے نشیب و فراز سے فی الفور اچھی طرح تو مطلع نہ ہوا۔ لیکن اوسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ اس کی کوئی نہ کنجی گم ہوگئی تھی۔ اور وہ اس وقت اوس کے ہاتھ میں آگئی لیکن اوسے یاد نہیں تھا۔ کہ وہ اس کنجی سے کونسا قفل کھولنا چاہتا تھا۔ اور کس پر از معرکہ معاملہ کا اس کنجی سے تعلق تھا۔ وہ ڈاکخانہ کا ایک اسٹول کھینچ کر برآمدہ کی میز پر بیٹھ گیا۔ اور جیب سے چند کاغذات اور لفافے نکال کر خطوط لکھنے لگا۔ اوس نے جلدی جلدی تین خطوط لکھے۔ ایک۔ اپنی زوجہ دوسرا شکیلہ تیسرا رفیق احمد کے نام اوسے اس وقت اپنا دماغ اس قدر خیالات سے لبریز معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اوسے اچھی طرح علم نہ تھا۔ کہ وہ کیا لکھ رہا تھا۔ مگر رفیق احمد کے خط کو اس نے بار دیگر پڑھا۔ جس کا مضمون اس طرح تھا۔

"ڈیر رفیق احمد صاحب۔ آپ کا خط مل گیا۔ میں اس وقت نہایت عدیم الفرصت

ہوں۔ مگر جو معاملہ آپ نے تحریر کیا ہے۔ اوس کی تحقیقات کے متعلق کوشش کرونگا سہارنپور کی ایک مشہور رنڈی زادی گل جان کے پاس سے آپ اور شکیلہ ہیرنگٹن کے نام اگر ایک تھیٹر کی شرکت کا خط آوے۔ تو آپ بڑی خوشی سے منظور کر لیں۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن سمیت ۲۰ جنوری کی شام تک بلا حجت و اکراہ موہنڈ نہر حسن شرقی پر پہنچ جاویں۔ مجھے خود معلوم نہیں۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر گل جان میری بڑی گہری دوست بن گئی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ میں اس تھیٹر کے بعد آپ کو ایک دلچسپ معاملہ بتلا سکوں۔ مگر خدا کے واسطے میری اس تحریر کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اور اگر شکیلہ ہیرنگٹن اگر مجھے تھیٹر میں پہچان لیں۔ تو مجھ سے ہرگز بات نہ کیجئے گا۔ میں ان لوگوں میں کامران نہیں ہوں۔ امداد علی وکیل لاہور کے نام سے مشہور ہوں۔ یہ جلسہ واقعی قابل دید ہوگا اور آپ و شکیلہ ہیرنگٹن نہایت محظوظ ہونگے۔ اوس وقت تک خدا حافظ۔

نیاز مند ک۔ ن۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان خطوط کو کامران لیٹر بکس میں ڈال چکا۔ تو اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی روشنی آئی۔ اوس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے اپنے دل سے کہا۔ اوہو واقعی اس سے اچھا موقعہ نہیں مل سکتا۔ کامران اور رفیق احمد کا قاتل۔ اب اصلیت معلوم ہو جاویگی۔ بڑے ہوشیار نکلے" یہ کہہ کر وہ پھر ڈاک خانہ کی میز پر آیا۔ اور ایک مختصر سا خط چوتھے آدمی کے نام لکھا۔ جس کا نام و پتہ ہماری طرح معاملہ فہم ناظرین پر ہرگز پوشیدہ نہیں۔ ڈاک خانہ سے فارغ ہو کر کامران گل جان کی حویلی پر پہنچا اور اوسے تمام رات بیدار رہنے کے سبب سے نہایت مضمحل مگر ہنستی ہوئی پا کر کہنے لگا۔ پیاری گل جان تم بالکل کمزور ہو۔ اس قدر محنت مت کرو۔ اب تم آرام کرو۔ تم نے خوب رت جگا کر لیا۔ اب سب کام ہم مردوں پر چھوڑ دو۔ گل جان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے کامران کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ مسٹر امداد علی آج ہمارا گھر اجڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تمام ضروری چیزیں راتوں رات بند کر دیں۔ اب میں سونا چاہتی ہوں

اسباب اور ڈیرے آج روانہ کر کے کل روانہ ہونگے۔ آپ نے بیٹھ کر کی خوب صورتی کی کامرات نے پیار سے اوس کے بال درست کئے۔ اور مسکرا کر کہا "آپ جیسی پرکھ رہ لڑکیاں صرف پریزاد بنکر محظوظ ہو سکتی ہیں" اور یہ بات ٹھیک بھی تھی۔

ستاونواں باب

تفریح

شام کے چھ بجنے والے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ شاندار فٹن کے جاندار بہاری ہر کم بلند گھوڑے تین گھنٹہ کی لگاتار دوڑ سے پسینا پسینا ہو گئے تھے۔ راستہ کی گرد سے چمکدار فٹن کے پھٹے ہوئے ساز و سامان میلا ہو چلا تھا نہر جمن کے دائیں کنارہ پر پختہ سڑک سے پل پر مڑکر فٹن بجانب شمال چلی اور گاڑی کے بیٹھنے والوں کی آنکھیں نہر کے تیز رفتار سیاہ پانی پر جھک گئیں۔ سامنے پہاڑوں کا سلسلہ ہیبت ناک لوڈہ ہائے سنگین میں سر بآسمان کھڑا تھا۔ جن پر نظر پڑتے ہی صناع ازل کے دست قدرت کے رعب سے دیکھنے والوں کے دل دہڑکنے لگے۔ اوس گاڑی میں گل جان اوس کی والدہ۔ کامران۔ بلند اختر۔ دلاور علی و حشمت خاں سوار تھے۔ پیچھے ایک تیز رفتار یکہ میں امیر جان کے نوکر چاکر آرہے تھے۔ نہر کے کنارہ پر ایک طرف لانبے شیشم اور ببول کے درختوں دوسری جانب پانی کی روانی سے خنکی پیدا ہو رہی تھی۔ اور ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ مسافروں کے ناک میں پانی کی مفرح مگر تر ہوا بھری جاتی تھی۔ شام کے چٹ پٹے اور سرسبز پہاڑوں کی ہیبت ناک وسعت نیز انسانی ہاتھ کی زمین طرازی نے ایسا دل کش اور جاذب نظر سماں پیدا کر رکھا تھا۔ تھوڑی

دیر تک ہر شخص صم و بکم اپنی ہستی کو ہمہ تن فراموش کر کے بت کی طرح ادھر ادھر تکتا رہا۔ اور گھوڑوں کے سموں سے دھپ دھپ کے سوا اگر کوئی آواز ادھر ادھر سے کان میں آئی۔ تو وہ شب کے بسر کرنیوالوں پرندوں کے چہچہے کی آواز تھی۔ یکایک گل جان کی آنکھوں میں تبسم ظاہر ہوا۔ اور اس نے کامران کی طرف دیکھکر کہا "مسٹر امداد علی اس سے زیادہ خوش نما منظر دنیا میں کونسا ہو سکتا ہے"۔ تین چار زبانوں سے یہ کلمہ نکلا "واقعی بڑی تفریح کا مقام ہے"۔ ایک میل بجانب شمال نکلنے پر چاروں طرف برائے نام تاریکی پھیلنے لگی۔ اور نہر کے مخرج سے پانی کے گرنے بڑھنے کی آوازیں وہاں وہاں سنائی دینے لگیں سامنے شام کی تاریکی میں نہر کے پل اور منبع کے سیاہ آہنی پھاٹکوں کے اوپر زبردست زنجیروں سے جکڑا ہوا انجن دکھائی دیا۔ جو اس وقت خاموش اور بیکار کھڑا تھا۔ نہر کی بائیں پٹڑی پر نہر کی کوٹھی بنگلے نظر آئے۔ اور ایک کوٹھی کے پاس آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ پچاس گز آگے آجانے پر بنگلوں کے اندر لیمپ یا لال ٹین کی روشنی چمکنے لگی اور نہر کے دائیں کنارہ پر ایک وسیع احاطہ میں جو چاروں طرف درختوں سے گھرا ہوا تھا ایک بڑا خیمہ کھڑا دکھائی دیا۔ جس کے پاس پانچ سات مزدور کھڑے تھے۔ مزدوروں نے فٹن کی طرف دیکھا۔ اور گاڑی کے پیچھے سے شجاعت نے چلا کر کہا "او ہو یہ تو ہمارا ڈیرا ہے بس بھائی بس ٹھیرا دو"۔ کوچبان نے فٹن کے گھوڑوں کی کمر پر ہاتھ مارے اور وہ تھم گئے۔ سب لوگ ہنستے اور بڑبڑاتے نیچے اترے اور یکے بعد دیگرے اپنے پاؤں سے گھاس اور تودہ ہائے زمین کو روندتے ڈیرا کی طرف روانہ ہوئے۔ گل جان نے مسکرا کر کہا "واہ صاحب واہ! ابھی تو ایک بھی ڈیرا کھڑا نہیں ہوا۔ تمام اسباب بندھا پڑا ہے مزدوروں نے چلا کر جواب دیا بیگم صاحب تین گھنٹہ میں ایک ڈیرا لگ چکا ہے۔ اب سب سامان کھولے دیتے ہیں کامران نے دلاوری و بلند حوصلگی کا ساتھ لیکر ایک چھکڑے سے کرسیاں اور میزیں اتروائیں۔ پہرہ سپاہیوں کو ٹھہلا کر کہنے لگا "دست خود دہان خود" پیاری گل جان ہم لوگ مدتی کر کے ضروری اسباب کھولتے ہیں۔ اتنے ہم لوگوں کے لئے چائے تیار کیجئے۔ باورچی کا یکہ بھی آگیا۔ مگر لطف اسی میں ہے کہ اس وقت چار آپ خود بنا دیں۔ باورچی کو کھانا تیار کرنیکا حکم دیدیں

گل جان نے جلا کر کہا۔ آہا آج ہم خوب سی کھانا پکاویں گے۔ بڑی مزے کی بات ہے۔ مگر میں دریا دیکھنا چاہتی ہوں" بلند اختر نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "آپ کو دریا کی پڑی ہے۔ یہاں آنتیں بھوک کے مارے نکلی جاتی ہیں۔ آپ جلدی چلئے بنا ئیے"

ادھر گل جان اور اس کی والدہ نے برتنوں کا صندوق اتروا کر سامان نکالا۔ ادھر مزدوروں نے جھکڑوں سے صندوق اتارے کامران نے ایک لالٹین روشن کر کے ڈیرے میں رکھدی۔ دلاور علی نے ایک لاٹھی میں کپڑا باندھ کر مٹی کے تیل میں بھگو کر مشعل بنا دی۔ اور کامران نے اسباب نکالنے کے لئے صندوق کھولنے شروع کئے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر بہت ضروری سامان برتن بستر اجناس وغیرہ باہر نکل آئے۔ اور بڑے ڈیرے کے اندر پانچ چھ پلنگ بچھا دیئے گئے۔ شجاعت نے جھٹ پٹ ایک میز ڈیرے میں رکھدی۔ اور ایک بڑا لیمپ روشن کر کے پلنگوں پر بستر پھیلا دیئے۔ اس عرصہ میں گل جان نے مزہ کی چاء تیار کر لی۔ اور ولایتی بسکٹ کا ایک ٹین کھول کر سب چیزیں میز پر لگا دیں سب لوگ بھاگے میز پر آئے۔ اور سب نے کپڑے کپڑے بسکٹ کھا کھا کر ایک ایک پیالی ہاتھ میں لے لی۔ کئی گھنٹہ کی تکان اور ایک گھنٹہ کی محنت سے سب لوگ چور چور ہو گئے چاء ختم کر کے ماں بیٹیاں تو اپنے بستروں پر گر گئیں۔ اور کامران نے سب بندوقوں کی گنتی کر کے ایک جگہ جمع کرا دیئے۔ اور مزدوروں کو حکم دیا۔ کہ ان کے قریب دوسرا خیمہ لگا کر اپنے آرام کا بندوبست کر لیں۔ کھانے پینے کی ہر ایک شے موجود تھی۔ دو کوزوں میں شجاعت نے پانی لا کر رکھا۔ اور خورد سال کلن نے حقے تازے کئے"

امیر جان نے بستر پر پڑ کر الحمد للہ کہا۔ اور شجاعت کو آواز دے کر پانی دان لگانے کا حکم دیا سب سے زیادہ ذمہ واری کا کام بورچی کے سر پر پڑا۔ کیونکہ اسے چولہا چڑھا کر مزہ دار کھانا نہایت جلد پکانا تھا۔ قریب دس بجے رات کے کھانا تیار ہوا۔ اور ڈیرے کی تر گھاس روئیدہ زمین پر ایک جاجم بچھائی

نئی سب آدمیوں نے گوشت اور دال سے گرم گرم روٹیاں خوب سیر ہو کر کھائیں اوپر سے گرم گرم چائے پی سب لوگ ہاتھ دھو کر بستروں پر آ پڑے۔ اور جنگل کی سرد سنسان ہوا میں لحاف سروں پر کھینچنے لگے۔ اس ڈیرہ کے اندر یہ لوگ بالکل خانہ بدوش معلوم ہوتے تھے۔ جنہیں دنیا کی تہذیب اور تمدن سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ مگر واقعی انسان جس بات کا عادی ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے بعد تک لازمی ہو جاتی ہے جن لوازمات زندگی کے یہ لوگ شہروں میں خوگر ہو گئے تھے۔ انہیں بدون ڈیرے جنگل میں زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ لاجرم انسان اپنی عادت کا غلام سمجھا جاتا ہے بجائے خود لوازمات زندگی کو اپنا غلام بناتا۔

نہر کی کوٹھیوں سے گھنٹے نے دس بجائے۔ اور گل جان نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ گھنٹہ کہاں بج رہا ہے" کامران نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا "نہر والوں کا گھنٹہ ہے۔ کوئی صاحب علاقہ پڑا ہوگا۔ کل صبح ہی دریا اور نہر کی سیر کریں گے" گل جان کے منہ سے نکلا۔ اور اسی لمحہ میں ایک دو آدمیوں کے گلے سے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ محنت اور تکان کے بعد نیند کس قدر مفرح اور شادابی بخش ہوتی ہے۔ اور جنگلوں کی لطیف اور پاک و صاف ہوا تندرستی میں کس قدر مدد دیسکتی ہے مگر بہت کم لوگ ان باتوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

اٹھاونواں باب

اسٹیج کی تیاریاں اور صنوبری مشق

اگلے چار روز اسٹیج کی تیاری میں صرف ہوئے۔ اور تین روزیوں کی دن رات لگاتار محنت کے بعد اسٹیج کے واسطے پردے اور فروش تیار ہو گئے سب لوگ

دن بھر تھوڑا بہت کام تھیٹر کے متعلق کرتے رہتے تھے۔ اور شام کو سیر جنگل سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ دن جتنی تفریح اور سرگرمی سے بسر کرتے تھے اسی قدر دنیا وی سبق انسان کو دے رہے تھے۔ یہاں یہ لوگ ایک مصنوعی ناٹک کی تیاری میں ہمہ تن محنت وجانفشانی میں لگے ہوئے ایک خاص منزل کی تیاری کر رہے تھے۔ جو انہیں دلفریب پردوں اور اپنے اپنے پارٹ کو عمدگی سے سرانجام دینے کی آرزو پر کھینچ رہی تھی۔ اگر غور کیا جاوے۔ تو انسانی پیدائش کا بھی یہی مقصد عظیم ہے کہ انسان اپنے یا دوسرے کی فلاح وبہبودگی میں لگاتار محنت کرتا ہے۔ اور اپنی آئندہ زندگی کو ایک نئی دنیا کے واسطے مفید وسود مند بنانے کی خاطر سب قسم کی آلائشوں سے پاک وصاف رہ کر نجات اخروی کے لئے تیار کرے۔ مگر اس دنیا میں روزمرہ کے مشاغل اور حظائط انسان کو اس کے ضروری مقصد سے کوسوں دور کھینچ لیجاتے ہیں۔ اور وہ اپنی آنے والی زندگی کو خواب وخیال سمجھ کر اس موجودہ زندگی کو اس قدر نزدیک اور دلفریب سمجھنے لگتا ہے۔ کہ اصلی کام کی جگہ ضروری نکمے اور منقوش اور تباہ کن مشاغل میں پھنس کر اپنے نفس کو ہلاکت کے درجہ پر کھینچ لیتا ہے اور آنے والی زندگی کو ضروری اور اصلی سمجھنے کی جگہ اس سے ہراساں ہو کر اس دنیا سے نکلنے کا نام بھی نہیں لینا چاہتا۔ اگر انسان ذرا عقل ودانش سے کام لے تو وہ دوسری زندگی کو لابد اور کبھی نہ ٹلنے والی سمجھ کر موجودہ دنیا کے بکھیڑوں کو عارضی سمجھے۔ مگر ایک ذرا سی غلطی سے ساری کائنات کے تناسب کا شیرازہ نہ بکھر جاتا ہے اور انسان اس دنیا کی زندگانی کو چھوڑ دینے کے بعد نہ صرف اپنے آپ بلکہ دوسروں کو بھی نالاں بنا کر چلتا ہے۔ چار روز کی محنت شاقہ کے بعد اسٹیج وسیع پنڈال (مکان) تیار ہو گیا تھا۔ اور پچاسوں مزدوروں کو چھٹی مل گئی تھی۔ انیس جنوری کی شام کو ہر شخص اپنے اپنے پارٹ پر دہٹہ کتے دل سے غور کرنے لگا۔ اور پنڈال کے دروازہ پر ایک چمکدار لال ٹین کے نیچے سب لوگ جمع ہوئے۔ کامران نے سب لوگوں کو تبسم سے دیکھ کر اندر داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ایک مکلف خس پوش سرخ لوٹن سے سندھا ہٹا

کمرہ میں سب داخل ہوئے جس پر بارہ تیرہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں چھت میں تیز چمکدار لیمپ لٹک رہا تھا سامنے چھینٹ کا چمکدار خوش نما پردہ اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ پندرہ منٹ تک سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر اس کمرے کے بائیں طرف ایک ٹٹی کے دروازہ سے سب لوگ دوسرے کمرہ میں داخل ہوئے۔ جہاں جملہ ایکٹروں کے ملبوسات کھونٹیوں پر لٹک رہے تھے۔ سب لوگوں نے اپنا اپنا بھیس بدلنا شروع کیا۔ اور دس منٹ اندر سب کی صورتیں تبدیل ہوگئیں۔ پرچہرہ گل جان اس وقت پریزادبن گئی۔ اس کے سر پر ایک تاجدار جھوٹے کام کی ٹوپی تھی جس کے اندر اس کے خوبصورت بالوں کی مانگ اور لانبی چوٹی بڑی دلفریب معلوم ہو رہی تھی اس کے جسم پر سچے کام کا ریشمی کوٹ تھا جس کے اندر سینکڑوں رنگ برنگ موتی ٹنک رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں میں پائجوں کی چمکدار ریشواز تھی۔ پاؤں میں سرخ ریشمی موزہ کے اوپر چمکدار موتیوں کا سلیپر تھا۔ بندا ختر نے لکھنو والوں کی چمکدار موتی جڑی ہوئی اچکن سے مزین ہو کر سر پر چمکدار موتی جڑا ہوا عمامہ باندھ رکھا تھا جس کے اندر سفید بگلے کے پروں کی کلغی نکل رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں سبز رنگ کا چست زیب دار پائجامہ تھا۔ سرخ ریشمی موزوں پر کامدار جڑاؤ جوتہ تھا۔ اس کی کمر میں مانک ریشمی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں نقرئی ہینڈل کی چمکدار تلوار لٹک رہی تھی دلاور علی نے اپنا چہرہ کاجل سے سیاہ کر کے سر پر لوہے کی خود پہن لی تھی جس سے وہ شاہ نامہ کا فردوسی پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ اور اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ جسم پر فولاد کی زرہ کا انگریزی کوٹ تھا جس کے اوپر زرہ بکتر بڑی مسخرہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں سیاہ انگریزی نیکر بالکل نیچے فٹ بال کھیلنے کا موزہ نظر آتا تھا۔ اور پاؤں میں سیاہ بنگ کا فوجی بوٹ تھا۔ اس کی کمر میں زرد رنگ کی چرمی پیٹی تھی جس کے ساتھ پیس کی معمولی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پرانے زمانہ کی بندوق لوڈر تھی۔ ان اسلحہ جات اور زرہ بکتر کے وزن سے اس کی کمر جھک گئی تھی مگر وہ اس دہال کو اپنی شجی کے آگے کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ اور باوجود زرہ بکتر کی چبھن کے اپنے

آپ کو سیدھا کر رہا تھا۔ کامران نے اپنے خوبصورت چہرہ کو کاجل سے سیاہ کر اور خوفناک بنا کر سر پر ایک سفید پگڑ مسی لپیٹ لی تھی جس کے اندر گائے کے سینگ سرخ رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ ان سینگوں کے درمیان اس نے ایک گوبھی کو پھول لگا رکھا تھا جس سے اس کا دماغ دبا جا رہا تھا۔ اور اس کے اعضاء رئیسہ میں ایک قسم کی تری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم چماریوں کی طرز کی ایک سرخ ٹول کی روئی دار صدری تھی۔ اور ٹانگوں میں چماریوں جیسا سرخ ٹول کا لمنگا اس کے پاؤں بالکل ننگے نہ تھے۔ ان میں گنواری طرز کا بہاری دیہاتی جوتہ تھا۔ مذاق کی نیت سے اس نے اپنے پاؤں میں گھنگرو پہن لئے تھے۔ اور اپنے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال لیا تھا۔ اس کی کمر میں چمڑہ کی پیٹی تھی۔ اور اس کے اندر اس کی دو شاخہ کمان لٹک رہی تھی۔ اس کے بائیں بازو میں ایک آہنی زنگ خوردہ پرانے زمانہ کا تیر تھا خورد سال کلن کے بدن میں سرخ بانات کا کوٹ پتلون تھا۔ اور سر پر سرخ رنگ کی پگڑی تھی۔ کمر میں سبز رنگ کی پیٹی شجاعت کو سپاہی بنانے کے لئے بالکل زمانہ حال کی پولیس کی وردی پہنا دی تھی۔ جو بلند اختر کو اپنے بھائی اشتیاق احمد ڈپٹی انسپکٹر پولیس انبالہ کی مدد سے مل گئی تھی۔ امیر جان چونکہ پرزاد کی ماں بننے والی تھی اس لئے اس کا لباس بھی گل جان کی طرز کا تھا۔ مگر گل جان پر یہ لباس سجتا تھا۔ اور اس کی طرف نگاہ اٹھانے سے ہر آدمی کا دل سینہ میں بے کل ہو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے امیر جان کے کانوں کی مکروہ بالیاں اور ناک کے لونگ تاج کے نیچے ایسے ایک خواجہ سرائے کی صورت پیش کر رہی تھیں۔ جو نہ مرد اور نہ عورت۔ بوڑھی امیر جان کے جسم کا کوٹ اور شلوار بدقسمتی سے کسی قدر تنگ بن گئی تھی۔ اور چونکہ اس وقت ترمیم کی گنجائش نہ تھی۔ اسے اپنا سینہ کپڑوں کی کھچاوٹ سے جکڑا ہوا معلوم ہوتا تھا حشمت خان بے معاش نے ڈاڑھی مونچھ مونڈھ انڈی کا بھیس بدلا تھا۔ اور زنانہ دیسی سرخ و سبز کپڑوں میں منہ پر پاؤڈر مل کر وہ اچھا خاصہ دھوکہ دے رہا تھا حشمت خاں کے کان اور ناک بندھی ہوئی تھی۔ اس نے تھوڑا سا زیور بھی لاد لیا تھا۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو تھے

کپڑوں میں بڑے پائنچوں کی شلوار سر پر سرخ رنگ کا جھبلے کام کا دوپٹہ۔ حشمت خاں کے بال لانبے لانبے تھے۔ اس نے عورتوں جیسی چوٹی بنا کر دوپٹہ سر سے اتار دیا تھا اور جب وہ سب سے پہلے کمرہ میں کرسی کھینچ کر پیانو پر بیٹھ گیا۔ تو اسکی پشت کی طرف دیکھنے سے ہر ایک کو دھوکا ہوتا تھا کہ وہ عورت ہے۔ کامران نے بہادر میاں کو کر کے دلاور علی کی طرف دیکھا۔ اور تھوڑی دیر سب لوگوں میں ہنسی مذاق ہوتا رہا پھر اس کمرہ میں سب نے جمع ہو کر تصفیہ کیا۔ کہ سب آدمی نمبروار اپنا اپنا پارٹ کریں۔ اور باقیماندہ ایکٹر تماشہ دیکھیں سب سے پہلا پردہ بلند اختر اور گل جان کی ملاقات کا تھا۔ گل جان اور بلند اختر پردہ کنارہ اٹھا کر اندر گھس گئے جس میں لیمپ ضرور جل رہا تھا۔ مگر انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بلند اختر نے گل جان کی گردن میں ہاتھ ڈالکر کہا "میری پیاری پریزاد" اور بڑے شوق سے اس کے ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ اتنے میں حشمت خاں نے پیانو بجانا شروع کیا۔ اور اسی لمحہ میں شجاعت نے باہر کی جانب سے ایک چرخی کے ذریعے سب سے آگے کا پردہ چھت پر چڑھا دیا۔ جس کمرہ میں نشست گاہ بنائی گئی تھی وہاں اس وقت کامران۔ دلاور علی۔ امیر جان۔ نوکر چاکر اور چند مزدور کھڑے تھے ان لوگوں کو اپنے سامنے ایک مکلف باغ نظر آیا۔ جابجا چھوٹے چھوٹے درخت اور پھول لگے ہوئے تھے سینکڑوں گملوں میں پھولدار پودے تھے۔ اور درخت زیادہ تر کیلے کے تھے۔ باغیچہ میں اس وقت پریزاد تنہا کھڑی ہوئی گلاب کے پھول پر جھکی ہوئی تھی۔ گلاب کے پھول کو توڑ کر اس نے اپنی ناک کو لگایا۔ اور ہنسکر بولی "کیسی عمدہ خوشبو ہے مگر میری عمر اب کب تک پھول سونگھنے کی رہیگی مجھے اب کسی شہزادے کی ضرورت ہے۔ جو مجھے اپنی چھاتی سے لگا دے" یہ الفاظ سب لوگوں کو صاف سنائی دیئے کسی آدمی کو ان الفاظ کا وہم و گمان بھی نہ تھا سب نے واہ واہ کہہ کر تالیاں بجائیں اسی لمحہ میں باہیں طرف سے شہزادہ عظیم بخت وارد ہوئے۔ اور پریزاد کو اچھی طرح دیکھ کر سہم گیا پریزاد نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "آپ کون ہیں۔ میرے باغیچہ میں کس طرح چلے آئے"۔

"عظیم بخت نے جھک کر عرض کیا۔ میں نے آپ کے حسن کی بڑی تعریف سنی تھی سو آپ فرما رہی تھیں۔ کہ آپ کو ایک نوجوان شہزادہ کی ضرورت ہے جو آپ کو سنبھالے" پریزاد نے مسکرا کر عظیم بخت کی طرف دیکھا۔ پھر گردن نیچی کر کے بولی "آپ شہزادے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے"؟

عظیم بخت نے ادب سے جواب دیا "میں شہزادہ عظیم بخت ہوں۔ کیا آپ مجھے اپنی دوستی میں منظور کر سکتی ہیں میں آپ کا ایک ہی نگاہ میں عاشق ہو گیا ہوں۔

پریزاد نے اپنا منہ سرخ کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے عظیم بخت نے بوسہ دیکر پریزاد کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دونوں ادھر ادھر ٹہلتے رہے شجاعت نے پردہ عمل کو غیر ضروری سمجھ کر پہلا پردہ چھوڑ دیا۔ اور شمت خاں نے زور زور سے گانا بجانا شروع کیا۔ پھر دس بارہ فلیوں نے کیلے کے درخت ہٹا کر دو کرسیاں لگائیں۔ اور پریزاد اور عظیم بخت آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ عظیم بخت نے پریزاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میری لاڈلی اب مجھ سے شادی کر لو۔ میں زیادہ دیر صبر نہیں کر سکتا پریزاد نے شرم سے گردن جھکا لی۔ عظیم بخت نے کرسی کے پاس آ کر اس کا منہ چوم لیا۔ اسی وقت بائیں جانب سے زرکاری قزاق برآمد ہوا۔ اور واہ کر کہنے لگا تم دونوں کون ہو"

عظیم بخت نے گھبرا کر جواب دیا "آپ کون ہیں۔ اس محل میں آپ کس طرح گھس آئے" زرکاری نے غضب ناک ہو کر جواب دیا "میں پریزاد پر عرصہ دراز سے عاشق ہوں۔ تو کون ہے۔ جو تو نے اس طرح سے اس کا منہ چوما۔ دیکھ تجھے سزا دیتا ہوں یہ کہکر چاہتا تھا کہ میان سے تلوار نکالے۔ کہ پریزاد ڈر کے مارے فرش پر گر گئی اور شجاعت نے پردہ چھوڑ دیا۔ اور مزدوروں نے کرسیاں اٹھا کر ایک سیڑھی لا بچھائی۔ اور امیر جان نشست گاہ سے نکلکر تیسرے کمرے میں پہنچی۔ دونوں ماں بیٹیاں سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا سو رہی ہیں۔ شجاعت نے پردہ اٹھا دیا۔ ماہ رخ بیگم اور ماہ جبیں کو اپنی اپنی کرسی سے لیٹا دیکھ کر تماشائیوں نے تالیاں بجائیں۔ اتنے میں زرکاری

بے دلے پاؤں مسہری کے پاس آیا۔ اور پریزاد کو گود میں اٹھا کر بھاگا۔ پریزاد نے ہائے اماں چور" ہائے اماں قزاق" چلانا شروع کیا۔ پریزاد کی والدہ نے سر لپیٹ کر کہا "وزیرو دوڑو" پاسبانوں دوڑو" میری دولت لٹ گئی" تمہاری شہزادی کو زرکاری بدمعاش لے گیا۔ اور کھڑکی ہو کر سر پیٹنے لگی۔ شجاعت نے پردہ چھوڑ دیا۔ اور فرضی واقعہ کی جگہ امیر جان کے پارٹ کو نہایت موثر پاکر بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ مزدور نے اس مرتبہ پلنگ نہ اٹھایا۔ بلکہ کامران بھاگ کر مسہری کے پاس باہر کی جانب سے پہونچ گیا۔ شجاعت نے پردہ چھت پر پلٹ دیا۔ اور سامنے کامران نے دھاوا کر کہا "مجھے تیرے وزیر نے طلب کیا ہے۔ کیا شہزادی کو زرکاری بھگا لے گیا پریزاد کی والدہ نے رو کر کہا "اے دیو خونخوار میری بیٹی کو جلدی واپس لا۔ میں صدمہ سے مر جاؤں گی" دیو نے میان سے کمان نکال کر کہا "میں ابھی زرکاری کا سر توڑ کر پریزاد کو لاتا ہوں" اس مرتبہ پھر پردہ گر گیا۔ اور قلیوں نے مسہری ہٹا دی دو منٹ کے بعد شجاعت نے پردہ ہٹایا۔ اور تماشائیوں کو دور ایسا معلوم ہوا۔ کہ ایک کمرہ میں بہت سا ہوس اور کباڑ جمع ہے۔ پلنگوں اور سر کنڈوں کے اوپر پریزاد پڑی ہوئی ہے۔ اور زرکاری اس کے منہ کے پاس بیٹھا ہنس رہا ہے۔ پریزاد بالکل بیہوش پڑی تھی اسی لمحہ میں دیو خونخوار وارد ہوا۔ اور وہاں کر بولا "پاجی بدمعاش شہزادی کو ہاتھ نہ لگانا۔ اگر تجھے مردانگی سے مزا ہے۔ تو کھڑا ہو جا۔ اور میدان میں آ" زرکاری بہوت کی طرح دیو پر لپکا۔ اور اپنی میان سے تلوار نکال کر اس کے سر پر چڑھنے لگا مگر اسی لمحہ میں دیو خونخوار نے اس کے سر پر تیر مارا جس سے وہ گر پڑا۔ اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دیو نے پریزاد کو گود میں اٹھا لیا۔ اور پردہ گر گیا تین منٹ کے بعد پہلا پردہ اوپر اٹھا۔ اور ایک مکان کمرے میں پریزاد اس کی والدہ اور شہزادہ عظیم بخت کھڑے ہوئے دکھلائی دیئے۔ شہزادی پریزاد شہزادہ عظیم بخت کے سینہ سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ اور شہزادہ اس کی والدہ سے کہہ رہا تھا "اے معزز خانم کی معزز ملکہ" اب اس پری چہرہ لڑکی کو میری زوجہ بننے کی اجازت دے" بڑھی والدہ نے مسکرا کر تماشائیوں

کی طرف دیکھا، اور ہنس کر کہا "دیکھو صاحب یہ بدمعاش مہوکے سے میری جائیداد چاہتا ہے۔ بیس ہزار لے کر اجاوت دو گی۔ اس جواب پر سب کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور بڑا قہقہہ پڑا۔ پہرتالیوں کی آواز میں پردہ گر گیا۔ امیر جان بھاگ کر نشست گاہ پر آگئی۔ بلند اختر نے گل جان کو تنہا پا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور اس کا منہ چوم کر کہا "پیاری تیری ماں بڑی کڑی ہے بیس ہزار کو کسی جگہ نہیں بھولتی"۔

گل جان نے فرط شوق سے بلند اختر کو سینہ سے لگایا۔ اور منہ چوم کر بولی بس اب ہم تم عنقریب شادی نذر وجہ ہونیوالے ہیں کیونکہ تھیٹر بھی ایک قسم کا پیش خیمہ تھا"۔

سب لوگ نشست گاہ میں آکر جمع ہوئے۔ اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیکر کہنے لگے۔ واقعی گل جان اور امیر جان کی رگ رگ میں ناٹک بھرا ہوا ہے اور اس سے زیادہ عمدہ پارٹ کون ادا کر سکتا ہے"۔

انسٹھواں باب

مہمانوں کی آؤ بھگت

۲۰ جنوری کی شام کو گل جان کے مصنوعی تھیٹر کی نمائش جس قدر شاندار اور دلکش تھی۔ اور اسی قدر معرکہ آرا وغیرہ متوقع نتائج سے بھری ہوئی تھی۔ ایک شاندار وسیع کمرے ہوئے ڈیرے کے اندر گل جان اور اس کی والدہ امیر جان بہ تزک و احتشام بیٹھی ہوئیں معزز احباب کا انتظار کھینچ رہی تھیں۔ جملہ مرد اسٹیج اور ضروری انتظام کی تکمیل میں مصروف تھے۔ گل جان نے جس وقت سے فرحت علی خاں کے یہاں میم لوگوں کا لباس پہنا تھا۔ اسے ہندوستانی لباس سے نفرت ہوگئی تھی۔ اور اس نے بلند اختر کے ذریعے سے ایک جوڑا سفید ولایتی لباس

کا منصوری کی مشہور دوکان پیری اسمتھ اینڈ کمپنی سے منگا لیا تھا اس وقت اس کے بدن پر یہ سفید ریشم کا لباس ایسا سجتا تھا۔ کہ اس کے سفید چمکدار رخساروں کی زیبائش بکثرت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا۔ اور بھورے سیاہی مائل بالوں کی عشوہ خیز مانگ تیز دھار تلواروں کی طرح چمک اٹھی تھی۔ اس انگریزی لباس کے ساتھ اس کے پاؤں میں سرخ رنگ کے ریشمی موزے اور کامدار سلیپر سونے پر سہاگہ کا کام دے رہے تھے۔ اور اسے اگر انگریزی النسل عورتوں سے دور کر دینے والی کوئی چیز تھی تو وہ اس کی خوبصورتی دل کش آنکھوں کی رنگت تھی۔ جو یورپین نسلوں میں کسی قدر نیلی ہو جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں بھوری سیاہی مائل تھیں۔ وسیع کیلے ہوئے خیمہ میں دو تین خوبصورت قالین بچھا کر اور چند خوبصورت کرسیاں اور چند چھوٹی چھوٹی میزیں لگا دی گئیں۔ جن کے اوپر زربفت کے کام کی میز پوشیں بھی پڑی تھیں۔ خیمہ کی چھت میں تین خوبصورت جھاڑ لٹک رہے تھے۔ اور سامنے کیلے حصہ پر تو یوں کہ لڑکی دار پردے چھم چھم کر رہے تھے۔ خیمہ کے آگے سرخ کنکر بچھا کر دور تک تختہ زمین صاف و گلدار کر دیا گیا تھا۔ اور آمد و رفت کے لئے تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر جا بجا پھولوں کے گملے قرینہ سے لگا دئے گئے تھے۔

اس وقت دونوں مال میٹیاں پان سے منہ سرخ کئے غرب کی جانب چہرہ اٹھائے بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ میں دو تار تھے جن میں چند منٹ گذرے۔ ایک بذریعہ اسپیشل میسنجر (تار رساں) سہارنپور سے ارجانب رفیق احمد کے یہ مضمون آیا تھا۔ کہ وہ سکیلہ پہر گھنٹہ سمیت چھ بجے شام کے موہنڈ پہر پہونچیں گے۔ دوسرا تار صاحب انجینئر محکمہ نہر تین شرقی سہارنپور کا بذریعہ ٹیلی فون سہارنپور سے آیا تھا۔ کہ وہ تین بجے چلدیئے۔ اور ساڑھے پانچ بجے نہر موہنڈ پر پہنچ جاویں گے۔ ان دونوں تاروں سے تھیٹر منعقد کرنے والوں کی باچھیں کھل گئیں۔ اور چونکہ مدعو شدہ احباب میں سب سے زیادہ معزز گروہ یہی تھا۔ تھیٹر کی کامیابی میں کوئی کسر باقی رہنے والی نہ تھی۔ چند دستاری روسا کے نام سے آج صبح سے کئی تار آچکے تھے۔ اور دونوں

ماں بیٹیاں اس وقت ہمہ تن گوش لگائے گاڑیوں کی آواز پر جھکی ہوئی تھیں ایسی ہی میں نہر کی پٹڑی پر ایک فٹن کی گھنٹی بجی اور گل جان نے دھڑکتے دل سے کہا۔ کوئی مہمان آیا۔ دوسرے لمحہ میں ایک شاندار فٹن سامنے آگئی۔ اور امیر جان نے میر عاشق حسین صاحب کہا" واقعی اس گاڑی سے ایک ادھیڑ عمر کا کچھ زیادہ میر عاشق حسین اترا جس کی عمر کوئی چالیس سال کی ہوگی۔ اس شخص کا چہرہ سفید زردی مائل تھا کہیں کہیں چیچک کے داغ تھے۔ ناک لانبی اور سوتواں سا کچھ بڑی۔ کان لانبے قد بھی معمولی سے زیادہ لانبا۔ اور کسی قدر فربہ تھا۔ اس رئیس کا لباس بالکل پرانی طرز کا تھا۔ سر پر کامدار کشتی نما ٹوپی جسم پر مخمل کا کامدار کوٹ ٹانگوں میں زیب دار سفید پائجامہ پاؤں میں دھاری دار موزوں کے اوپر سیاہ رنگ کی ولایتی گورگابی میر عاشق حسین کی مونچھیں لانبی لانبی تھیں۔ ڈاڑھی کے وسط میں سے نصف منڈی ہوئی تھیں۔ باقی تھوڑے سے خشخاشی بالوں میں کسی قدر سفیدی معلوم ہوتی تھی میر عاشق حسین کے اترتے ہی گل جان اور امیر جان نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لایا۔ اور امیر جان نے مسکرا کر کہا" ہم رہے کہاں نصیب آپ جیسے معزز دوست مہمان" میں رئیس نے تبسم سے مصافحہ کر کے پرشتیاقی نظر گل جان پر ڈالی۔ اور ہنسکر کہا" صاحب گل جان کے حسن سے کوئی مہتابی کر سکتا ہے۔ ماشاء اللہ بڑے ٹھاٹھ ہیں" مگر اس کے منہ سے اتنی ہی بات نکلی تھی کہ اس کی فٹن کے پیچھے دو گھوڑا گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ اور گل جان کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ ایک گاڑی سے نوجوان مہاجن زادہ موتی رام پورے چوہدری کے لباس فاخرہ میں گردن برادنی چادر ڈالے اترا۔ دوسری گاڑی سے دیوبند کا مشہور عیاش رئیس کرامت خاں اترا۔ دونوں ماں بیٹیاں نے میر عاشق حسین کو ایک مکلف کرسی پر بٹھلا کر دونوں آنے والے معززین کا استقبال کیا۔ اور ہنس مکھ چہرے سے تسلیم تسلیم کہہ کر مزاج پرسی کی۔ کرامت خاں نہایت جسیم کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ناک لانبی اور موٹی چہرہ سفید زردی مائل اور گول۔ کان اور دانت بڑے بڑے جبڑا مضبوط اور بہاری اس کے سر پر بہاگل پوری ریشم کا دوپٹہ تھا جس کے اندر سرخ کامدار کابی کلاہ نکلی ہوئی تھی۔

اس کے جسم پر سیاہ رنگ کا چوغہ تھا جس کے نیچے روئی کی جھپیٹ دار اچکن صاف اور ستھری دکھلائی دے رہی تھی اس کی ٹانگوں میں بڑے پائچوں کا سفید پائجامہ تھا اور پاؤں میں موٹے اونی موزوں کے اوپر دہلی کا کامدار سلیم شاہی جوتا تھا۔ ماں بیٹیوں نے تینوں مہمانوں کو آرام سے بٹھلا کر اسباب اتروایا۔ اور شجاعت کو آواز دی کہ اسباب توشہ خانہ کے ڈیرے میں جمع کرا دیا جائے شجاعت کی واپسی پر چارپائی کا حکم دیا گیا۔ اور دونوں نوکر سرخ بانات کی وردی پہنے ہوئے ایک انگریزی سینی میں چائے کا سامان لیکر سامنے آئے موتی رام کوئی پرہیزگار نہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کے برتنوں کی چار سے تکلف ہاتھ میں لے لی۔ اور ایک گول میز سے ولایتی بسکٹ اٹھا اٹھا کر تینوں آدمی ہنسی مذاق کے ساتھ چائے پینے لگے۔ موتی رام کسی قدر ان آداب سے باہر تھا۔ اس کے منہ سے سوائے معذرت اور مہذب باتوں کے کوئی کلمہ کم نکلتا تھا۔ مگر اوہیڑ عمر کے میر عاشق حسین صاحب ہر بات میں پھبتی اور ضلع تلاش کرتے تھے۔ کتنے ہی ان لوگوں کو دیکھے سفید پوش آدمیوں سے بھرے ہوئے شہر کی پٹڑی پر دکھلائی دیئے مال بیٹیوں کو تعجب تھا کہ یہ نا طبیدہ مہمان کون سے ہیں۔ مگر یہ سوہنے کی طرف بڑھے چلے گئے اور ان لوگوں کو یہ خیال ہوا۔ کہ محکمہ نہر کے متعلقین یا صاحب انگریز کے نوکر ہونگے۔ جو ساڑھے پانچ بجے شام کے آنے کا وعدہ کر چکے ہیں اسی اثنا میں کامران۔ دلاور علی بلند اختر اور حشمت خاں مہمانان کی آمد سن کر اصطبل سے باہر نکل کر خیمہ کی طرف آئے اور گل جان نے ان چاروں کو باضابطہ سب سے ملایا۔ موتی رام کامران کی گفتگو اور لب و لہجہ پر کسی قدر چونکا ہوتا تھا مگر کامران اس کے یہاں دو دفعہ مرزا اکبو بیگ کے لباس میں گیا تھا۔ اس واسطے بدوں اذکر اپنے شناخت نہ کر سکا۔ ان چاروں کے لئے بھی چائے بنگالی گئی۔ اور برتن اٹھ جانے پر پھر حقہ کا دور شروع ہوا حقہ کشی میں حشمت خاں کو ید طولے حاصل تھا جہاں اس کے ہاتھ میں حقہ آیا۔ اور اس نے تمام تمباکو کو دو ہوا بنا بنا کر اڑانا شروع کیا۔ ان معزز مہمانوں کے رعب و داب کا کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ وہ پیا پیے بے تحاشہ حقہ کے دھوئیں سے سارے خیمہ کو بھر دیتے تھے اور یہ سب لوگ

مغرب کی طرف منہ کئے دیگر مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ گل جان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر دیکھ کر کہا "ساڑھے پانچ بجگئے۔ صاحب اگر کھانا تیار ہو چاہتے ہیں ادھر کامران نے نہر کی پٹڑی پر نگاہ ڈالی۔ تو اسے ایک شخص کی جھلک پٹڑی جس سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے زمین پر نگاہ ڈال لی یہ شخص کامران کا چچا لاک اسسٹنٹ ہدایت علی تھا۔ جو اپنے معمولی لباس میں شمال سے جنوب کی طرف چلا جا رہا تھا ناظرین تعجب کریں گے۔ کہ کامران اپنے ماتحت کو دیکھ کر کیوں جھکا لیکن اس کی وجہ وہ خود دریافت کر سکتے ہیں۔ پانچ پر چالیس منٹ گذرے ہونگے۔ کہ ایک ہلکی ریٹر کے پہیے والی ٹٹم ڈیرے کی طرف بڑھتی آئی۔ اور ایک انگریز و انگریزی لیڈی کی صورت سے گل جان و امیر جان کے دل دھڑکنے لگے۔ سب لوگ خیمہ سے اٹھ کر استقبال کو آئے اور اسی ٹٹم میں ٹٹم کو روک کر بلند قامت بارعب مسٹر ہاکنس نے سب موجودین سے مصافحہ کر کے مسکرا کر کہا "میں مس گل جان کو ہندوستانی عورت سمجھتا تھا۔ مگر وہ تو انگریزی عورتوں سے کسی طرح کم نہیں۔ مارگیرٹ مس گل جان سے ملاقات کرو" مسز ہاکنس نے مسکرا کر گلجان سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس کی بوڑھی والدہ سے مصافحہ کر کے پوچھا "آپ ان کی والدہ ہیں" بوڑھی امیر جان نے "جی ہاں" کہکر ہاتھ نکال لیا۔ اور اپنے دل سے کہنے لگی "کاش میں بھی ہوتے کی جگہ کسی معزز رئیس کی بیوی ہوتی۔ مگر اب کیا علاج مسٹر ہاکنس لانبے قد کے بہادری بہرکم رعب دار آدمی تھے۔ اور مسز ہاکنس خوبصورت سفید خام لانبے قد کی عورت تھی۔ جو اس وقت سفید رنگ کا پھولدار ریشمی لباس پہنے تھی۔ اور منہ پر ہالیدار نقاب لگا رکھا تھا۔ کامران نے آگے بڑھ کر صاحب موصوف کو ڈیرے میں آجانے کی خواہش ظاہر کی لیکن صاحب بہادر نے مسکرا کر جواب دیا۔ مجھے آپ صاحبوں سے مل کر بڑی خوشی ہے۔ واقعی تھیٹر قابل دید ہوگا خوب سامان کیا ہے۔ اس وقت معاف فرمایئے۔ ناٹک کس وقت شروع ہوگا میں شب کی دعوت میں شریک ہو سکونگا کامران نے مسکرا کر جواب دیا "ناٹک آٹھ بجے شروع ہوگا کھانا نو بجے ضرور تشریف لایئے گا ضرور ضرور میں محض آپ صاحبوں کی وجہ سے یہاں آیا ہوں" ماہر

ایک اعزازی طریقہ میں سردار کمر جہ کا کر سٹر ہاکنس رخصت ہوئے۔ دیگر مہمانان بمشکل کرسیوں پر بیٹھے ہونگے۔ کہ انہیں سٹر ہاکنس کی گاڑی کی بائیں جانب نہر کی پٹڑی پر ایک اور گھوڑا گاڑی آتی ہوئی معلوم دی۔ کامران کا دماغ گھبرانے لگا۔ اس نے آہستہ سے کوئی بات گل جان کے کان میں کہی۔ اور جھٹ پٹ خیمہ کی دائیں طرف سے ایک ڈیرے میں گھس گیا جس میں اشیاء خوردنی تھیں۔ اور جس کی نگرانی کامران کے سپرد کی گئی تھی ماسی ڈیرہ اور باورچی خانہ میں سے کامران اس وقت نکلا۔ کہ وہ دیو بنکر اسٹیج پر بلایا گیا۔ گھوڑا گاڑی جب ڈیرے کے قریب پہنچی۔ تو بلند اختر نے دھڑکتے دل سے چلا کر کہا "رفیق احمد شکیلہ ہیرنگٹن" امیر جان۔ گل جان دلاور علی لپکے لپکے گئے بڑھے اور بلند اختر نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنے بہنوئی سے مصافحہ کیا۔ رفیق احمد اس وقت نئے چمکدار سوٹ سے لیس تھا۔ اس نے جھٹ کر باہتگی شکیلہ ہیرنگٹن کو نیچے اتارا۔ اور دلاور علی چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس گاڑی میں شکیلہ کے علاوہ رحمت اور عزیزہ بھی نئے کپڑے پہنکر آئی تھیں۔ پہر رحمت کے اترنے پر دلاور علی نے ان سلام کہا رفیق احمد شکیلہ وگل جان نے دلاور علی کو تعجب سے دیکھا مگر اسے مہمانوں میں سے سمجھ کر سب نے مصافحہ کیا۔ بوڑھی رحمت بڑی بیماری سے اٹھی تھی۔ اور کسی قدر کمزوری اب بھی موجود تھی۔ اس نے دلاور علی کو سینہ سے لگایا پہر بلند اختر کو تبسم سے دیکھ کر کہنے لگی۔ کہو بیٹا اختر اچھی طرح سے ہو۔ اس وقت دلاور علی شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کا ذرہ بھی علم نہ تھا کہ شکیلہ ہیرنگٹن ایسے معزز جلسہ میں اس کی ماں کو لاکر اس کی آزادی اور خود داری میں خلل انداز نہ ہوگی۔ لیکن اسے آج برسوں کے بعد شکیلہ ہیرنگٹن سے ہاتھ ملانے کا موقعہ ملا۔ اور گو برقعہ سے لپٹی ہوئی شکیلہ ہیرنگٹن نے دلاور علی کو شناخت کر لیا۔ اور اس سے ہاتھ کھینچنا چاہا لیکن موقعہ کی نزاکت اور خواہ مخواہ کے شبہات سے ڈر کر اس نے دھڑکتے دل ہاتھ ملا لیا۔ دلاور علی گو شاندان کی طرف سے ایک معقول گریجویٹ کا لڑکا تھا۔ مگر اس آداب بہگت میں شکیلہ ہیرنگٹن جیسی معزز اور خاندانی شریف زادی سے ہاتھ ملا کر پرانی آرزو اور تعشق کی آگ کو

تیزی سے محسوس کرنے لگا۔ نوجوان عزیزان اپنے دوپٹہ کو سنبھال کر شکیلہ کے پیچھے ہو لئے۔ اور رفیق احمد نے شکیلہ بیگم ٹنگسٹن کا برقعہ اتار کر اس کو خیمہ میں باادب پہنچایا جہاں جملہ معززین ان سب سے باضابطہ واقف کئے گئے۔ اور دلاور علی کی والدہ کو اس طرح بے نقاب و برقعہ پہنے ہوئے دیکھکر سب اپنے دل میں کہنے لگے کہ یہ شخص بہشتی یا حجاج پیشہ کرتا ہوگا۔ والدہ کی آؤ بھگت اور اس کی محبت بھی لگا ہوں سے دلاور علی اس قدر رنجور ہو رہا تھا۔ کہ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا اور اس نے خواہش کی۔ کہ یہاں سے بھاگ کر نہر میں ڈوب مروں مگر شکیلہ بیگم ٹنگسٹن کے ہاتھ ملانے کے بعد اسے ایک قسم کی کشش معلوم ہو رہی تھی۔ اور وہ یہ سمجھ کر کہ شاید اس وقت کی بے عزتی کسی طرح شکیلہ بیگم ٹنگسٹن سے پورا نے تعلقات از سر نو جاری کرا دے وہ اس جگہ سے ہلنے کا یارا ہی نہیں پاتا تھا۔

گل جان نے شکیلہ بیگم ٹنگسٹن اور اس کی دونوں خدام عورتوں سے خوب دل کھول کر باتیں کیں اور شکیلہ کی شیریں بیانی نیز شفقت بھرے الفاظ سے اس کا دل ایسا اچھل پڑا۔ کہ وہ چاہتی تھی۔ کہ شکیلہ کے سینہ سے لپٹ کر اسے سب کے سامنے اپنی پیاری بہن بنا لے۔ نصف گھنٹہ ہی کے اندر گل جان شکیلہ بیگم ٹنگسٹن کی گہری دوست ہو گئی۔ اور سب مہمانوں کو نظر انداز کر کے سب سے زیادہ آؤ بھگت اسی کی گل جان رفیق سے بھی فوراً مانوس ہو گئی۔ اور اسے در اصل شریف اور خاندانی آدمی اور نیز بلند اختر کا ماموں زاد بھائی سمجھ کر دل سے خوش تھی۔ کہ اسے ان لوگوں سے گہری ملاقات پیدا کرنیکا موقعہ مل گیا۔ مگر اسے رفیق احمد بلند اختر کے مقابلہ میں کم دلنظر آیا سچ ہے

"ایاز را بہ نظر محمود باید دید"

رفیق احمد شکیلہ بیگم ٹنگسٹن کی آنکھوں کا نور تھا۔ نصف گھنٹہ تک سب لوگ مزے مزے میں سب طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اور یہ وقت منٹوں کی طرح اڑنے لگا۔ یہانتک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اور لیمپ جھاڑ و فانوس جلائے گئے رفیق احمد نے تبسم سے پوچھا "کیا سب مہمان آگئے" گل جان نے زور سے جواب دیا "جی ہاں

سب آگئے۔ مگر مسٹر امداد علی کے مدعو کردہ وہ بزرگ۔ ایک مہنت لکشمی نرائن دوسرا ان کا چیلا اب تک نہیں آئے۔ شاید نہ آویں۔ فقیر لوگوں کو ان باتوں سے کیا سروکار" رفیق احمد نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "یہ مسٹر امداد علی کون ہیں؟"

گل جان نے ہنسکر کہا "اس نانک کی روح مدواں تو وہی حضرت ہیں اس وقت آپ صاحبوں کے واسطے کہانا تیار کروا رہے ہیں۔ دعوت میں ملاقات ہوگی"۔

رفیق احمد نے مسکرا کر جواب دیا "درست۔ درست" اور وہ دل میں سمجھ گیا کہ مسٹر امداد علی کامران کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کرامت خاں صاحب خشخاشی ڈاڑھی کو ہاتھوں کی انگلیوں سے کھینچ گل جان کی طرف دیکھا۔ اور ہنس کر پوچھا کیا آپ کے مراصین بھی لوگ بھی ہیں۔

کرامت خاں کے منہ سے یہ کلمہ نکلا ہی تھا۔ کہ سارے خیمہ کے جھاڑ و فانوس یکلخت گل ہو گئے۔ اور سب لوگوں کے کانوں میں تیز آندھی کی آوازیں آئیں سب کے دل لرز گئے۔ اور تاریکی کے ڈر سے ہر ایک شخص سکتہ کی حالت میں رہ گیا اسی لمحہ میں جھاڑ و فانوس خود بخود روشن ہو گئے۔ اور سب لوگوں کو اپنے سامنے دو آدمی نظر آئے ایک بوڑھا آدمی جس کے لمبے لمبے سفید بال ادھر ادھر پریشان بکھر رہے تھے سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اور اس کی ٹانگوں میں ایک سفید دھوتی معلوم دیتی تھی دوسرا نوجوان ننگے سر تھا۔ سر پر لانبے بال سیاہ پیچے پڑے ہوئے تھے۔ اور بدن پر سیاہ کمبل اوڑھے رکھا تھا۔ اور ان دونوں فقیروں کی صورت سے سب موجودین کے دل دہلنے لگے اور گل جان فق شدہ آنکھوں سے دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر زبان بند ہو گئی بوڑھے مہنت نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ اور گل جان سے مصافحہ کرنا چاہا۔ گل جان نہایت ادب سے ڈرتی ڈرتی کھڑی ہو گئی۔ اور بوڑھے فقیر کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر آہستہ سے بولی کیا آپ مقدس لکشمی نرائن ہیں؟" بوڑھے مہنت نے سر جھکا کر اقرار کیا۔ اور سب لوگ دم کتے دل سے کھڑے ہو گئے۔ اور یکے بعد دیگرے خود بخود فقیر کی طرف کھنچنے لگے

بوڑھے بزرگ نے سب سے ہاتھ ملا کر کہا "آپ لوگ ڈر گئے۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے کوئی سواری نہیں ملی۔ اور آپ صاحبوں کی دعوت میں شریک ہونا تھا" اس کلمہ سے جملہ موجودین کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ ہوا میں اڑ کر آئے ہیں۔ اور آندھی کا شور و غوغا محض ان کی کرامات تھی۔ سب عقیدہ مندی سے بوڑھے بزرگ کی طرف دیکھنے لگے۔ اور چند منٹ تک ڈیرے میں بالکل سناٹا رہا جس میں ہر شخص اپنے دل کے گناہوں سے "اڈنگ" کر پردہ فاش ہو جانے کے خیال سے صم بکم بیٹھا رہا" بوڑھے مہنت نے مسکرا کر کہا صاحب آپ نے تو خوب جلسہ لگایا ہے۔ وہ شخص کہاں ہے جس نے ہمیں مدعو کیا ہے"

گل جان نے دھڑکتے دل سے جواب دیا مسٹر امداد علی وہ باورچی خانہ میں ہیں۔ کیا بلاؤں" بوڑھے بزرگ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اچھا میں سمجھ گیا۔ ہرگز زحمت نہ بلائیے۔ پھر گل جان نے آہستگی سے کچھ ماں کے کان میں کہا۔ بوڑھی امیر جان کانپتی ہوئی آواز سے کہا "معزز سائیں جی آپ کے لئے کچھ سیب انگور لاؤں۔ بوڑھے فقیر نے ہنس کر جواب دیا فقیر کو سیب اور انگوروں سے کیا تعلق۔ خیر آپ کی دعوت منظور ہے۔ گوشت روٹی منظور ہے سیب انگور موجود ہے۔ دودھ چاول منظور ہے۔ اس وقت بوڑھے بزرگ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارے اور یکایک ایک خوان خیمہ کی چھت سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا جس کے اندر کل وہ چیزیں موجود تھیں جنکا بوڑھے درویش نے نام لیا تھا۔ دونوں فقیروں نے سیب اور انگور اٹھائے۔ اور دونوں کی زبان سے "بس بس" نکلا خوان دم کے دم میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور سب تماشائی حالت وجد میں بوڑھے فقیر کی طرف دیکھ کر کانپ گئے۔ بوڑھے بزرگ نے چند انگور کھا کر مسہم سے گل جان کیطرف دیکھا۔ اور ہنسکر کہا نا بدمعاش۔ بدمعاش کبھی باز نہیں آتے۔ تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ تھیٹر کب شروع ہوگا"

گل جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور اس نے آرزو کی کہ کسی طرح مقدس مہنت بلند اختر کے متعلق اظہار خوشنودی کر دیں۔ اسی لمحہ میں بوڑھے بزرگ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "بلند اختر بہت نالائق لڑکا ہے۔ خیر ہم نے معاف کیا۔ گنگا

جہنا نے معاف کیا غدار رسول نے معاف کیا؟ اس کلمہ میں معلوم نہیں کیا اثر بھرا ہوا تھا۔ کہ بلند اختر کی آنکھیں تاریکی سے بند ہوگئی تھیں۔ اور اس نے چیخ مار کر کہا۔ کہ پولیس پولیس مجھے بچاؤ۔ بوڑھے حشمت نے قہقہہ لگا کر بلند اختر کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اور سنجیدگی سے بولے گھبراؤ مت معاف کر دیا۔ مجھ سے گستاخی ہوگئی۔ بلند اختر بہت اچھا لڑکا ہے۔ اب جلدی تھیٹر شروع کرو۔ مجھے سہارنپور میں دس بجے ضروری کام ہے۔ بدلا اور علی رحمت اور موتی رام کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو ہلا بھی نہ سکتے تھے۔ بوڑھے حشمت نے حشمت خاں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔ باؤ گھنٹی بجاؤ۔ ناٹک شروع کرو۔ بچوں کا کھیل ہے۔ ہم آج ناٹک دیکھیں گے اسی دم میں سب لوگ اپنی اپنی اصلی حالت پر آگئے۔ اور حشمت خاں نے اسٹیج کی طرف بھاگ کر شجاعت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ناٹک کی گھنٹی کس چیز سے بجاؤں یہ دونوں ایک دوسرے کو ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔ کہ خود بخود اسٹیج کے اندر گھنٹی کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ اور دو منٹ تک بجکر خود بخود تھم گئیں۔

ساٹھواں باب

دوست سمجھے تھے جسے جان کا دشمن نکلا

گھنٹی کی آواز سنکر عیار کامران باورچی خانہ سے نکلا۔ اور گھنٹی کی آواز پر اسٹیج کی طرف روانہ ہوا جہاں اسنے حشمت خاں لباس تبدیل کرتا ہوا ملا۔ اسی لحظہ میں دیگر اکیڈمی تھیٹر کمپنی کے ممبر بھی پہنچ گئے۔ اور اپنا اپنا بھیس تبدیل کرنے لگے۔ گل جان نے مہمانان کو تھیٹر گاہ کی نشست میں بٹھلایا۔ اور کپڑے تبدیل کرنے چل دی۔ ابھی آٹھ بجے تھے مگر جملہ حضار تماشہ دیکھنے کے لئے تیار ہو بیٹھے تھے۔ ادھر مسٹر ہاکنس نے تھیٹر گاہ کی گھنٹی سے سمجھ لیا تھا۔ کہ وقت قریب آگیا۔ وہ بھی مسز ہاکنس کو ساتھ لے کر پیدل چل کھڑے ہوئے۔ محلہ نہر کی کوٹھی

بھلے تھیٹر گاہ سے دو فرلانگ ہونگے۔ مسٹر و مسز ہاکسن کے آگے ایک چپراسی لال پٹن لئے آرہا تھا۔ جب وہ تھیٹر گاہ میں پہنچے۔ تو اس کے دروازہ پر تیز جلدار لال پٹن کی روشنی میں خوش آمدید بزبان انگریزی اون کے کپڑے پر موٹے حروف میں لکھا پایا۔ دروازہ پر شجاعت علی پولیس کی وردی پہنے پہرا دے رہا تھا جس وقت مسٹر و مسز ہاکسن اندر گئے سب لوگوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ اور عمدہ کرسیوں پر سب سے آگے بٹھلایا۔ ادھر حشمت خاں نے زنانہ لباس میں پیانو بجانا شروع کیا۔ ادھر سب لوگ تھیٹر کے پردہ پر آنکھ لگا کر بیٹھ گئے شجاعت خاں نے بھاگ کر پردہ نما کا رخ لیا۔ اور یہ دیکھکر پریزاد منتظر اور تیار کھڑی تھی اس نے چرخی کے ذریعہ سے پردہ اٹھایا۔ گل جان کے ناٹکی لباس اور طرز خرام سے سب کے منہ سے واہ واہ نکلی۔ اور تالیاں بجنی شروع ہوئیں۔ اسی لحظہ میں شہزادہ عظیم بخت کے لباس اور طرز ادا پر سب نے آفرین کہی۔ اور پردوں پر پردے گرتے گئے۔ زرکاری قزاق اور شہزادی پریزاد کی والدہ کی چیخ و پکار اور دیو خونخوار کے پارٹ کو سب نے جوش و خروش سے دیکھا۔ اور رفیق احمد و شکیلہ پرنگٹن کے پیٹ میں ہنسے ہنستے بل پڑ گئے گیاس پیونس اور پرال کے اوپر پریزاد کی بیہوشی اور زرکاری کی گستاخانہ بے رحمی اس قدر ناگوار اور دلخراش معلوم ہوئی کہ مسٹر و مسز ہاکسن سے گذر کر بوڑھے مہنت اور نوجوان چیلے کے چہروں پر بھی اداسی چھا گئی۔ اور انہوں نے سب کے ساتھ تالیوں میں شریک ہو کر کہا "واہ واہ۔ شاباش۔ شاباش" ان تمام پردوں کی دلفریبی اور مصنوعی تھیٹر کی کامیابی اس وقت پورے عروج پر پہنچی ہوئی معلوم دی جب انھیکے منظر میں پریزاد شہزادہ عظیم بخت کی چھاتی پر سر رکھ کر روئی۔ نوجوان گل جان دراصل بلند اختر پر دل و جان سے مائل تھی۔ اور آج بوڑھے مہنت کی شقاوت اور بلند اختر کے متوحش خیالات سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ وہ ایسے بھرے دل سے روئی۔ کہ آنسو پٹ پٹ گرنے لگے۔ اس موثر نظارہ کی کشش اس وقت اور زیادہ مکمل ہو گئی جب ایسے دل کش سین پر بوڑھی عیار رہبر جان نے حاضر بیک افروہ دلوں کو یک لخت اس فقرہ نے نہلا دیا۔ صاحبو یہ مردود۔ مذاق مذاق میں میری

بیٹی سے نکاح کی اجازت مانگتا ہے۔ میں بیس ہزار سے بغیر اجازت نہ دونگی" سب لوگوں کے دانت ہنسی سے کھل گئے۔ اور جس وقت شجاعت نے آخری پردہ گرایا دو منٹ کامل نالیاں بجتی رہیں۔ پردہ کے گر جانے پر امیر جان بھاگ کر نشستگاہ میں آگئی۔ اور بلند اختر نے بہرے ہوئے دل سے گل جان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا "میری پیاری مجھ نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا۔ اس بوڑھے سنت کی صورت سے مجھے ڈر لگتا ہے"

گل جان نے بڑی افسردہ دلی سے بلند اختر کے سینہ پر سر رکھ دیا۔ اور آنسو بھری ہوئی آنکھوں کو بند کر کے بولی "مقدس سائیں جی تو بڑے بھلے آدمی ہیں۔ مگر شام سے میرا دل بھی ڈوبا جاتا ہے۔ معلوم نہیں۔ مجھے کسی کی نظر لگ گئی یا کیا ہوا۔

بلند اختر نے اس کے منہ سے منہ ملا کر بوسہ دیا۔ اور تڑپتے ہوئے دل سے بولا میں نے تمہاری محبت میں ایک بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید مجھے سزا بھگتنی پڑے کیا تم مجھے باوجود میری نالائقیوں کے بھی دل سے محو نہ کرو گی"

گل جان نے جھلا کر کہا۔ تم نے کیا گناہ کیا۔ کیا کسی کو مار ڈالا" اور اس نے اپنے ہاتھ اس کی گردن سے نکال لئے" بلند اختر کا دل لرز گیا۔ اور وہ گل جان کے دل کو اپنے گناہوں سے تبدیل ہو جانیوالا سمجھ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا "میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ لیکن ایک میں نے بڑا گناہ ضرور کیا ہے۔ کیا تم اس کی پاداش میں مجھے اپنے دل سے نکال پھینکو گی"

اس کلمہ سے گل جان کی آنکھیں تاریک ہو گئیں۔ سر چکرا گیا۔ اس نے سنبھل کر جواب دیا "میرے غریب دوست میں تمہیں کبھی بھولنے والی نہیں۔ جاؤ۔ جاؤ دعوت میں چلو۔ مگر میرا دل کہہ رہا ہے۔ کہ تمہارے ساتھ مجھے بھی کوئی مصیبت اٹھانی پڑیگی" بلند اختر نے اطمینان کا لمبا سانس بھرا۔ اور گل جان کو کھلے ہوئے میدان کی طرف سے بڑے خیمہ کے اندر لے گیا جس میں دعوت کا سامان ہو رہا تھا۔ کھانے میں سب لوگ اپنا اپنا لباس تبدیل کر کے شریک ہونا چاہتے تھے لیکن یہ بات آج صبح ہی طے ہو گئی تھی۔ کہ لباس تبدیل ہونے میں بہت دیر لگے گی۔ اور جلسہ کی رونق میں فرق آجائیگا

پس ہر ایک آدمی اپنے اپنے لباس میں خیمے کے اندر داخل ہوا۔ اور چوکیدار بلوری گلاس لہراتے ہوئے پائے۔ گل جان اپنی جیب سے رومال نکال آنکھوں کے اشک خشک کر چکی تھی۔ مگر ہنوز اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے تھوڑی دیر تک سب چیزیں دھندلی نظر آئیں۔ سب لوگوں نے گل جان کو تیئر کی عمدگی اور کامیابی پر مبارک باد دی۔ اور ایک منٹ کے لئے سب کی آنکھیں گل جان کی طرف جھک گئیں۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے گل جان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور مسکرا کر کہا "مجھے خیال بھی نہ تھا۔ کہ تم ناٹک کے معاملہ میں ایسی مشاق ہو۔ امید ہے۔ تم کسی روز آصف نگر آنے کی تکلیف کرو گی اور ایک تھیٹر میرے بنگلے پر منعقد کر سکو گی بڑا لطف رہیگا"

گل جان نے وٹر تے ہوئے دل سے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف پریشان چہرہ سے دیکھ کر کہا "میں ضرور کبھی آصف نگر آؤنگی۔ ابھی تو میں آپ کو یہاں ایک دو روز مہمان رکھونگی۔ گل جان کا دل بندہ اختر کی طرف سے اس قدر بے چین تھا۔ کہ کوئی نہ معلوم خوف اس کے عقل و دماغ کو زنجیروں میں جکڑے لیتا تھا۔ سب اصحاب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ولاور علی اور کامران کی ہیئت اس قدر بدل گئی تھی۔ کہ ہر شخص ان کی صورت دیکھ کر ہنسنا چاہتا تھا۔ حشمت خاں زنانہ لباس میں بالکل رنڈیوں کی طرح باتیں کرتا معلوم دیتا تھا۔ حشمت خاں کی نظر کبھی گل جان کبھی مسز ہاکنس پر پڑتی تھی۔ کبھی عزیز کو دوشیزہ عورت سمجھ کر بہت بری طرح گھورتا تھا۔ جو لوگ ہندوستان میں خواتین کا پردہ نہیں کرانا چاہتے۔ وہ ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ کہ اس وقت مرد کی اور نفس پرستی کی امنگ گل جان اور عزیزن کی صورتوں سے زیادہ موثر بن رہی تھیں۔ یا شکیلہ ہیرنگٹن کے برقعہ دار چہرہ سے ہندوستان میں زنانہ و دارزیبے بیاہ شادی کے طریق اس قدر قابل اعتراض چلے آرہے ہیں۔ کہ نانوے فی صدی آدمی بیبیوں کو خوبصورت نہیں سمجھتے۔ اور وہ دوسری عورتوں کو گھور گھور کر طبیعت سیر کر لینے کا بہانہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ پس اگر بیاہ شادی حسب دستور قدیم والدین ہی کی مرضی پر منحصر رہیں گے اور

خاوند درزوجہ نکاح سے پہلے واقف نہ ہونگے۔ تو ہندستان کے غیر مہذب مردوں کی اخلاقی حالت بھی درست نہ ہوگی۔ اور پیر عمر کے رئیس اور باش محمد عاشق حسین اور کرامت خاں بھی کبھی عزیزن کبھی گل جان کبھی مسز ہاکنس کی طرف دیکھتے ہے۔ اور اگر مہذب احباب برا نہ مانیں۔ تو ہم کہلے بندوں کہیں گے کہ ان کی ہر ایک نگاہ میں ایک آرزو تھی۔ اور ہر فعل کے پیچھے ایک گناہ پوشیدہ تھا۔ وردی پہنے ہوئے مخانساماں لوگوں نے کھانا لگانا شروع کیا اور آہستہ آہستہ کھانا شروع ہوگیا۔ بوڑھے مہتر اور اس کے چیلے نے سوائے انگور سیب امرود۔ نارنگی کسی تر چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ مگر وہ فواکہات میں لگے ہوئے سب کا ساتھ دیتے تھے۔ مسٹر ہاکنس ننگے سر وسط میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا سیاہ کوٹ سینہ کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ اور اس کے اندر سے سفید پلیٹ دار قمیص دکھلا رہی تھی جس کے اوپر سرخ رنگت کی ریشمی ٹکٹائی ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ جیسے سبز گھاس پر گلاب کا سرخ پھول دکھلائی دیا کرتا ہے۔

مسٹر ہاکنس دیدہ دانستہ شکیلہ ہیرنگٹن کے پاس بیٹھے تھے۔ اور اپنی زوجہ کو سامنے بٹھلا لیا تھا۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے بڑی دلچسپی سے باتیں کرتے رہے اور مسٹر ہاکنس نے شکیلہ ہیرنگٹن کو چند باتیں اس کے نانا صاحب کی سنائیں جن سے معلوم ہوا کہ مسٹر ہاکنس تھوڑے عرصہ تک ہردوار پر اس زمانہ میں اسسٹنٹ انجنیر تھے جب مسٹر ہیرنگٹن صاحب وہاں ٹھیکیداری کرتے تھے۔ نصف گھنٹہ تک ڈیرے میں مختلف اقسام کے کھانوں اور فواکہات کی خوشبو سمارہی اور برتن و چمچوں کے شور کے ساتھ تھوڑی تھوڑی سی آواز بات کرنے والوں کی بھی ملتی تھی۔ بلند اختر گل جان کے پاس بیٹھا تھا۔ اور رفیق احمد محض بلند اختر کی قرابت کا خیال کرکے اس کے سامنے آبیٹھا تھا۔ کھانا ختم ہوگیا۔ تو دفعتہ برتن اٹھنے لگے۔ اور قہوہ کا حکم دیا گیا۔ اسوقت نو بج چکے تھے۔ رات بالکل تاریک ڈراؤنی اور سرد تھی۔ خیمہ کے اندر چمک دمک تھی اس کے مقابلہ میں دو سو گز پرے تاریکی نہایت ہیبت خیز معلوم دیتی تھی۔ بڑے خیمہ

کی چمک دار ٹھنڈی روشنی باہر تک خوبصورت گملوں اور کنکر بچھے ہوئے فرش پر پھیل رہی تھی۔ اور سیکڑے خوابیدہ پودے اس وقت ایسے چپ چاپ اور عجیب وغریب مخلوق معلوم ہو رہے تھے جن کے بے انتہا علم سے انسان کبھی واقف نہ ہو سکیگا پھول پتوں پر نہ صرف ایک قسم کی خاموشی اور حیرت طاری تھی۔ بلکہ وہ بصورت حال اس دوسری دنیا میں پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس کا علم اشرف المخلوقات انسان کو مرنے کے بعد ہی نصیب ہوگا۔ پرتکلف قہوہ کے بعد سگریٹ سگار تقسیم ہوئے اور حقہ و پان کا دور شروع ہوا۔ گل جان کے آکر وہ اور پریشان دل کو ان نعمت ہائے گوناگون سے بھی کوئی تسلی نہ ہوئی۔ اور وہ بار بار بلند اختر کی طرف دیکھ دیکھ کر دل سے کہتی تھی "معلوم نہیں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی مجھ سے بلند اختر کو چھیننے کے لئے آ رہا ہے۔ اس وقت کچھ لوگ سیلابچی میں ہاتھ دھو رہے تھے۔ کچھ کھڑے ہوئے پان کھا رہے تھے۔ چند مسٹر ہاکسن کے پاس کھڑے ہوئے۔ صاحب کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ کہ یک لخت خیمہ کے پاس کسی نے زور سے آکر کہا "حق بحق دار" سب لوگوں کے دل اس کلمہ سے اچھل پڑے۔ اور کامران گھبرا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت سب لوگ بے ترتیبی سے ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اور کسی کی کوئی خاص جگہ نہ تھی جس شخص نے حق بحق دار کہا تھا۔ وہ اس وقت خیمہ کے اندر گھس آیا۔ اور دوبارہ چلا کر کہا "حق بحق دار" تمام آدمیوں کو سخت حیرت تھی۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ان الفاظ کا متکلم ایک دبلے پتلے بدن کا بوڑھا فقیر تھا جس کے سر پر لانبے لانبے سفید بال لٹک رہے تھے۔ لمبی سفید ڈاڑھی سینہ پر لٹکی ہوئی تھی۔ مونچھیں اور بھویں بالکل سفید تھیں اسکی کمر پر شیر اور ہرن کی کھال لپٹی ہوئی تھی۔ ٹانگیں بالکل ننگی تھیں مگر ایک کپڑا جائے ستر پر ضرور تھا۔ اس کے پاؤں بھی بالکل ننگے تھے خیمہ میں بالکل سناٹا ہو گیا اور بوڑھا مہنت اور اس کا چیلہ بھی اس آنے والے فقیر کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ فقیر نے ایک آہنی دست پناہ میز پر مار کر کہا "یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں اس جلسہ میں کیوں نہیں بلایا"

بوڑھے مہنت نے اس فقیر کو زور سے آواز دے کر کہا "بھیا تو ادھر چلا آ۔

"کند ہم جنس باہم جنس پرواز"

مگر نووارد فقیر نے بڑے زور سے میز پر دست پناہ مارا۔ اور چلا کر کہا "اس خیمہ میں بہت سے آدمی ایسے ہیں۔ کہ خدا کی دنیا میں جنگ و فساد کرتے ہیں" پھر غضب ناک آنکھوں سے مسٹر ہاکنس کی طرف دیکھ کر بولا "تو نہر کا صاحب ہے۔ اگر تیری خیریت ہے ابھی یہاں سے نکل ورنہ تیری نہر کا مخرج توڑ دونگا"

مسٹر ہاکنس فقیر کے اس گستاخانہ کلمہ سے گھبرا گئے۔ اور سب لوگوں کے دل لرز گئے۔ مسٹر ہاکنس و مسز ہاکنس فق شدہ رنگت سے زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ اس وقت یہ بوڑھا غضب ناک ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور زور سے میز پر ہاتھ مار کر بولا "ہمیں اس ناٹک میں کیوں نہیں بلایا" پھر خوفناک نگاہ سے کامران کی طرف دیکھ کر بولا "تو دیوخوتھار ہے۔ تو بالکل جہڑا ہے تو ایک چالاک سرخ رنگ ہے۔ باہر نکل اور اس دروازہ پر کھڑا ہو جا۔ میں چار آدمیوں کو جہنم بھیجتا ہوں"۔ کامران دھڑکتے دل سے باہر نکل گیا۔ اس وقت تمام آدمی ڈر رہے تھے۔ کہ یہ کیا معاملہ آ پڑا۔ بوڑھے مہنت کے چہرہ پر تبسم کے آثار ہویدا ہوئے۔ اور انہوں نے آہستہ سے کہا "بس سائیں جی اب غصہ کو دور کرو۔ جبلنے دو بچوں کا کھیل ہے۔ نووارد فقیر نے بار دیگر میز پر دست پناہ مارا۔ اور ناراض ہو کر بولا "ہم ان سب بچوں کو نہر میں ڈالنے آئے ہیں۔ یہ ولایت آپ کی نہیں۔ آپ خاموش بیٹھے رہیں"

بوڑھے مہنت اور اس کے چیلے کے منہ سے "بہت اچھا" بہت اچھا" نکلا اور اس عجیب و غریب فقیر نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے دلاور علی اور دوسرے سے رحمت کی گردن پکڑ لی۔ اور چلا کر بولا "پولیس والو۔ بھاگو۔ دوڑو۔ گھیر لو۔ رفیق کا قاتل اور سکیلہ سیرنگھٹن کے دفینہ دکاغذات کا چور۔ اسی وقت سب حاضرین کو خیمہ کے پیچھے سے لوگوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ دلاور علی اچھل کر فقیر پر جھپٹا۔ اور گردن چھوڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ کہ کامران نے فرش پردے مارا۔ اور اس کا خود سر سے علیحدہ ہو گیا۔ رحمت نے زور سے چیخ ماری۔ اور فرش پر گر پڑی۔ گل جان کو اس منظر سے غش آگیا۔ اور

اس کی والدہ نے چھاتی سے لگا کر کہا "بلند اختر معجلہ ہی پانی لا" اتنے میں ایک پولیس افسر چار کنسٹیبل وردی سے مسلح دلاور علی اور رحمت پر آ گرے۔ اور دم کے دم میں انکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں دلاور علی نے مجروح چیتے کی طرح آنکھیں پھاڑ کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اور ہتھکڑی سمیت بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ سینکڑوں بھوت چلاتے ہوئے بھاگے آ رہے ہیں۔ گھیر لو گھیر لو۔ جانے نہ پاوے" جملہ حاضرین پولیس والوں کے گرد جمع ہو گئے۔ اور تھر تھر کانپنے لگے یکبارگی وہ اس سارے واقعہ کو اس سفید ریش دبلے پتلے فقیر کی کرامات سمجھ رہے تھے۔

پولیس والوں نے ان دونوں کو مضبوط جکڑ لیا۔ تو پُراسرار فقیر نے زور سے چلا کر کہا "بلند اختر کون ہے" اس وقت گل جان بالکل بیہوش تھی۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوا۔ بلند اختر کے گلے سے ایک چیخ نکلی۔ اور رفیق احمد کی روح لرز گئی۔ فقیر نے ایک ہاتھ بلند اختر پر بڑھایا۔ دوسرا موتی رام پر اور چلا کر کہا۔ ان دونوں کو بھی گھیر لو پس بدمعاش بلند اختر نے اپنے بھائی کے باپ کا وصیت نامہ اور خط چورایا۔ اور چالیس ہزار کا جعلی نمک بنایا۔ جو یہ بے ایمان موتی رام وصول کرنا چاہتا تھا۔ بلند اختر اور موتی رام کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور انہیں ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ تحت الثرے میں اترے جاتے ہیں۔ دونوں نے چیخ مار مار کر اور پولیس والوں کے ہاتھوں کو کاٹ کر نکلنا چاہا۔ مگر پولیس کے کنسٹیبل ہڑکائے کتے کی طرح آ پڑے اور دم کے دم میں دونوں کو کس لیا۔ بلند اختر کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑ جانے سے رفیق احمد کو خون کا جوش آ گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ اسے چھوڑ دو۔ اگر جعلی نمک بنایا۔ تو روپیہ مجھ سے وصول کیا جاتا۔ میں نے معاف کیا۔ پولیس والوں نے رفیق احمد کو ادب سے اٹھا دیا۔ اور سب انسپکٹر سخاوت علی جو رفیق احمد سے پانچ ہزار وصول کر چکا تھا۔ کہیا ہا ہو کر کہنے لگا وہ معاملہ دوسرا تھا۔ یہ بات اور ہے۔ سر دست آپ خاموش رہئے۔

سب انسپکٹر کی بے مروتی اور کج خلقی سے رفیق احمد کے بدن میں آگ

لگ گئی۔ اور وہ اپنے پانچزار کا خون ہوتا دیکھکر چلا سا اٹھا۔ سب انسپکٹر کو چھاجاوے مگر اب انسپکٹر اس کے پاس آیا۔ اور کان میں کہنے لگا "آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپکے حکم سے سرتابی نہیں کرونگا۔ لیکن مجھے خود معلوم نہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے"

رفیق احمد نے مصلحت وقت اسی میں سمجھی۔ کہ صبر کرکے معلوم کرے آیا کیا ہونیوالا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے بلند اختر کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں وحشت اور خون برس رہا تھا۔ اور آہستہ سے کہا "مجھے نہایت رنج ہے۔ کہ تم نے اپنے آپ کو اس طرح بدنام کیا۔ آخر میں اب دیکھتا ہوں۔ کہ تمہاری رہائی کی کیا صورت ہے"

بلند اختر کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا موتی رام کی حالت بالکل مجنون لوگوں کی سی ہونے لگی۔ جسے کانسٹیبلوں نے بڑی مشکل سے دبا رکھا تھا۔ ان لوگوں کی گرفتاری پر کانسٹیبلوں نے بڈھے فقیر کی طرف دیکھکر کہا "اب آپ ان الزامات کا ثبوت دیجئے۔ جو آپ ان لوگوں کے سر تھوپ رہے ہیں" بوڑھے فقیر نے اپنے دست پناہ کو میز سے اٹھالیا۔ اور انسپکٹر کے پاس جاکر کان میں کہنے لگا۔ باہر مسٹر کامران بی اے سراغرسان لاہور "دیوخونخوار" بنا کھڑا ہے۔ میں اس کا ماتحت ہدایت علی ہوں۔ وہ ہر ایک بات کا ثبوت دے سکیگا۔ آپ ان چاروں کو اپنی حراست میں رکھئے۔ اس نے دراصل رفیق احمد کے سامنے کلام مجید پر حلف اٹھالیا تھا۔ کہ وہ اس کے بھائی بلند اختر کو پولیس کے حوالے نہ کریگا اسی وجہ سے سب کام میرے ذریعہ سے کرایا۔ اور اس کا ذمہ وار میں ہوں لیکن مزید ثبوت اس سے لیگا جو آپ تھوڑی دیر بعد تنخلیہ میں رفیق احمد سے ملاقات کرکے قطعی رائے قایم کریگا"

یہ کہکر فرضی فقیر نے زور سے "حق بحق دار" کی صدا بلند کی اور جھپٹکر باہر نکل گیا اس کی پہاری آواز سے گل جان کو ہوش آگیا۔ اور وہ رو کر بولی "اماں یہ کیا ہو رہا ہے" اختر کہاں ہے۔ یہ پولیس والے یہاں کیوں آئے ہیں؟ اسی لحظہ میں کامران باہر سے جھپٹ کر آیا۔ اور گل جان کے پاس جھک کر کہنے لگا "پیاری گل جان تم گھبراؤ مت بلند اختر سے ایک بڑا جرم سرزد ہوگیا ہے۔ لیکن رفیق احمد اسے یقیناً معاف کردے گا۔ تم

گھبراؤ نہیں۔ خاموش رہو"

گل جان نے آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "ان سب آدمیوں کو رخصت کرو۔ یا وہ ہمارے ڈیرے میں لے جاؤ"

میں لکشمی نرائن اپنے چیلے سمیت زور سے خدا حافظ کہہ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور کامران نے سب لوگوں کو دوسرے مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں سب کے لئے قیام گاہ بنائے گئے تھے۔ امیر جان ہکی بکی دیوانوں کی طرح ساکت بیٹھی ہوئی معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کر رہی تھی۔ اور بلند اختر کی گرفتاری اور گل جان کے تعشق کا خاتمہ سمجھ کر میٹی کی طرف سے سخت متردد ہو رہی تھی۔ کامران نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو بھی رخصت کر دیا۔ اور اشارہ سے مسٹر رفیق احمد و شکیلہ ہیرنگٹن کو بھی ٹال دیا۔ جس وقت اس ڈیرے میں تخلیہ ہو گیا۔ کامران نے مسکرا کر استعادت علی سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا "جناب من آپ کو یاد ہو گا۔ کہ آپ نے چند روز گذرے۔ اپنے کاغذات میں بلند اختر رفیق احمد کے متعلق شبہات ڈالے تھے۔ اس وقت میں نصف گھنٹہ کے اندر یہ ثابت کر دونگا۔ کہ آپ نے بڑی ساری غلطی کی تھی۔ آپ ان چاروں کو کانسٹیبلوں کی حراست میں چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں رفیق احمد سے اجازت لے کر معاملہ آپ کے گوش گذار کرونگا۔ اگر اس نے یہ معاملہ آپ کے ہاتھوں میں ڈالنے سے انکار کیا۔ تو میں دوسری تدبیر چلونگا۔ آیئے میرے ساتھ تشریف لایئے۔ تاکہ آپ کے لئے کھانا منگاؤں"

کامران اور سب انسپکٹر باہر نکل آئے۔ اور کامران سب انسپکٹر کو باورچی خانہ میں لیگیا"

اکسٹھواں باب

جرائم اور ان کے ثبوت

کامران ایک چھوٹی سی چور لالٹین ہاتھ میں داخل ہوا۔ جہاں رفیق احمد اور شکیلہ ہیرنگٹن کے لئے عزیز بستر سے کھول رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی منیر پر نیچی دیوار گیری روشن تھی لوار کی دو چھوٹی چھوٹی چارپائیوں پر بستر بچھے تھے۔ کامران ابھی دیوخونخوار کے بہیس میں تھا۔ شکیلہ ہیرنگٹن نے اپنے چہرے سے برقعہ اتار ڈالا تھا۔ اور پلنگ کے پاس کھڑی ہوئی رفیق احمد سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی شکیلہ کامران کو اندر دیکھ کر چونک گئی۔ کامران جھک کر باہر کھڑا ہو گیا۔ اور رفیق احمد کو باہمشگی باہر بلایا۔ رفیق احمد نے جھلا کر پوچھا آپ کون ہیں۔ مجھ سے کیا کام ہے؟"

کامران نے متین آواز میں جواب دیا "مجھے آپ اس وقت دیوخونخوار کے بہیس میں دیکھ کر ڈر گئے ہونگے۔ میں دراصل آپ کا محرم راز سراغرسان کامران ہوں میں ولادر علی بالخصوص بلند اختر کے معاملہ میں آپ سے گفتگو کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آیا میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں۔ یا نہیں"

رفیق احمد نے شب کی تاریکی میں کامران کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ پھر دھڑکتے دل سے بولا "اوہو آپ مسٹر کامران ہیں۔ تو میں سب معاملہ سمجھ گیا لیکن آپ نے حلف اٹھایا تھا۔ کہ بغیر میری اجازت آپ بلند اختر کو پولیس کے ہاتھوں میں نہیں ڈالو گے۔ کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اسے اس کا کلام مجید کے تقدس اور اپنے حلف کی یاد بجلکار ستارہ کی طرح دکھائی دینے لگی۔ جسے فراموش کر کے اپنی جولانیاں دکھلانے پر تل گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھیاں بند کر لیں۔ اور دل کو قابو میں کر کے بولا "بیشک میں نے کسی قدر شرعی پابندی سے انحراف کیا ہے۔ لیکن میں گنہ گار نہیں ہو سکتا۔ اول تو میں نے یہ کارروائی اپنے ماتحت ہدایت علی کے ذریعہ سے کرائی ہے۔ دوسرے میں ایک جرم کے ارتکاب اور اصلی مجرم کو کیفر کردار پر پہنچا کر انصاف چاہتا ہوں۔ آپ اب جلدی یہ بتلا دیں آیا آپ مجھ سے اس معاملہ پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ اور بلند اختر کو پولیس کے ہاتھوں سے بچانے کے خواہش مند ہو یا نہیں"

رفیق احمد کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اور اس کے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ اس نے

نے چھولداری کے اندر شکیلہ کی طرف آنکھ اٹھائی۔ پھر آہستہ سے بولا "اچھا آپ ٹھہریئے میں شکیلہ سے مشورہ کرلوں" رفیق احمد اندر گیا۔ اور دو تین منٹ تک سرگوشی کی آواز میں باتیں کرتا رہا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں کو سنبھال کر باہر آیا۔ اور کامران سے نرم آواز میں کہا "مسٹر کامران شکیلہ ہیرنگٹن بھی انصاف چاہتی ہے آپ مہربانی کرکے سخاوت علی انسپکٹر کو بھی بلالیں سب باتیں ابھی فیصل ہوجانی چاہئیں مجھے سخاوت علی کا ڈر نہیں میں اس سے نمٹ لونگا"

کامران شگفتہ دلی اور اطمینان کے سانس بھر کر لپکا لپکا سخاوت علی کے پاس پہنچا جہاں مضمحل کر جلدی جلدی کچھ سیر ہو رہا تھا۔ کامران نے اسے جلدی ساتھ لے چلنے کے لئے تیار کیا۔ اور تین منٹ بعد یہ دونوں رفیق احمد سے ملاقی ہوئے شکیلہ ہیرنگٹن نے اس وقت پھر پردہ پہن لیا تھا۔ کیونکہ اس چھولداری کے پاس ایک بڑے خیمہ میں عام قیام گاہ تھا۔ اور یہاں کی آوازیں دوسرے لوگ سن سکتے تھے۔ کامران نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ یہاں یہ چاروں اسٹیج پر چلے جاویں۔ اور وہاں سب امور طے کرلیں۔ اسٹیج کے اندر ابھی تک سب سامان اسی طرح تھا۔ جیسے تماشائیوں نے چھوڑا۔ کامران نے خدمتگاروں کو باہر کھڑا کردیا۔ کہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ اور یہ چاروں چار کرسیوں پر بیٹھ گئے کامران نے اپنی جیب سے ایک سگار نکالا۔ اور اسے روشن کرکے کہنا شروع کیا سخاوت علی صاحب۔ اب مسٹر رفیق نے مجھے پوری آزادی دیدی ہے میں سب معاملہ آپ صاحبان کے گوش گذار کرتا ہوں" پھر اس نے دو منٹ کی اجازت مانگی اور اپنے ایک ٹرنک میں سے ایک چھوٹا سا بکس نکال لایا۔ اس بکس کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا "میں سارا معاملہ شروع سے عرض کردونگا۔ مس شکیلہ ہیرنگٹن آپ سب سے پہلے یہ بتلایئے۔ کہ یہ شخص ولاور علی کون ہے۔ آیا آپ اسے جانتی ہیں یا نہیں اس کا رحمت سے کیا تعلق ہے۔ کیونکہ مجھے تقریباً سب باتیں معلوم ہیں اس وجہ سے میں جملہ باتیں سچی اور بے کم و کاست معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ولاور علی سے آپ کا کیا تعلق تھا؟"

اس آخری فقرہ سے شکیلہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اور اس کے ماتھے سے پسینہ آ گیا۔ رفیق احمد اس معاملہ میں بوئے رقابت پا کر گھبرا گیا۔ اور وہ اپنی عفت مآب معشوقہ کے چال چلن پر اس فقرہ کو ایک قسم کی گستاخی سمجھ کر اس کنے ہاتھ پاؤں تہرانے لگے اس نے بات کاٹ کر کہا۔ مسٹر کامران آپ حد سے تجاوز نہ کریں مس شکیلہ ہیگٹن کے خاندانی اعزاز کا بھی خیال کر لیں۔ دلاور علی رحمت کا بیٹا ہے مس شکیلہ سے صرف اس کا اتنا تعلق ہے کہ اس نے لڑکپن میں شکیلہ کے ساتھ پرورش اور چند سال تعلیم پائی"۔

کامران کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے متین آواز میں کہا۔ "مسٹر رفیق احمد ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں میں مس شکیلہ ہیگٹن کی عفت مآبی اور نیک چلنی سے خوب واقف ہوں۔ اور سچ پوچھئے۔ تو آپ سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ آپ مس شکیلہ کو بلا سوچے سمجھے نیک چلن سمجھ رہے ہیں۔ میرے پاس عملی ثبوت موجود ہیں بس نیک چلنی یا خاندانی شرافت کا ذکر نہیں یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ شکیلہ دلاور علی سے کس طرح واقف ہوئی شکیلہ نے گھبرا کر بٹوہ سے ایک ہاتھ نکال لیا۔ اور بات کاٹ کر بولی مسٹر کامران آپ ہر قسم کے سوالات کر سکتے ہیں۔ دلاور مجھ سے عمر میں ایک سال بڑا ہوگا۔ لڑکپن میں ہم دونوں ایک ساتھ پرورش پائی ہے بچپن میں چھوٹی تھی۔ اور مسز بالٹی مور مجھے پڑھانے آیا کرتی تھی۔ تو دلاور علی بھی میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا جب والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ دلاور علی حسب معمول میرے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس سے مجھے کوئی پردہ نہ تھا۔ اور نہ دراصل میں اس سے یا کسی سے پردہ کرتی تھی۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی۔ مجھے دلاور علی کے اطوار و عادات سے نفرت ہونے لگی۔ ایک روز اس کی والدہ نے مجھ سے گستاخانہ طریقہ میں کہا کہ میں دلاور علی سے شادی کر لوں۔ تو بہت بہتر ہوگا۔ مجھے رحمت کی گستاخی پر بڑا غصہ آیا۔ اور میں نے کہہ دیا کہ دلاور علی کبھی میرے بنگلہ میں قدم نہ رکھے۔ اس وقت سے میں نے دلاور علی کی کبھی صورت نہیں دیکھی۔

کامران نے اچھل کر جواب دیا۔ "بس مجھے اس بات کی ضرورت تھی آپ کے بیان سے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ شخص دلاور علی آپ کے مداحین میں سے تھا۔ اور اب بھی آپ پر فدا ہے

خیر تو جناب سخاوت علی صاحب معاملہ یہ ہے کہ جس روز جہاں آصف نگر کے پل پر کسی شخص نے سٹر رفیق احمد کے گولی ماری۔ میں شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں مرزا کلو بیگ ٹیکیدار کے یہیں میں کہدئی کرا رہا تھا۔ اور ایک چھوٹا [illegible] میں مقیم تھا؟

سخاوت علی کے چہرہ پر بے اعتباری اور ندامت کے علامات ظاہر ہوئے۔ اور اس نے جھوٹے متبسم سے پوچھا۔ مسٹر کامران کیا واقعی آپ نے مجھے بڑا احمق دیا۔ کامران نے قہقہہ لگا کر کہا۔ جی ہاں میں نے آپ سے کئی ایسی باتیں پوشیدہ رکھیں جن سے آپ حملہ آور کا پتہ لگا سکتے۔

سب انسپکٹر کے چہرہ پر تردد کے نشانات ظاہر ہوئے۔ اور اس نے کامران کو بنظر تعظیم دیکھ کر جواب دیا۔ واللہ آپ بڑے ہوشیار سراغرساں ہیں۔ مجھے آپ کے پہلے بھیس پر شبہ ہوا تھا اور میں آپ کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت خیریت ہوگئی ورنہ آپ کم از کم شکلات میں پھنس جاتے۔

کامران نے مسکرا کر کہا۔ جی میں نے سب باتیں پہلے ہی سوچ لی تھیں۔ خیر تو جناب جس وقت مجھے آبشار کے پل سے پستول کی گولی کی آواز آئی۔ میں پل کی طرف بھاگا اور یکلخت مجھے ایک کیمیت میں کھڑا ملا۔ میں نے اس آدمی کا تعاقب کیا مگر شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ کے آس پاس غائب ہوگیا۔ میں نے ہدایت علی اور اپنے باورچی کی مدد سے نہر کے آس پاس ادھر ادھر بڑی عرق ریزی سے جہان بین کی لیکن کوئی مشتبہ آدمی نہ ملا۔ اس وقت میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ لیکن حملہ آور کی عجیب و غریب فراری یا گمشدگی سے میرے شبہات قایم ہوگئے تھے۔ اور میں خفیہ طریقہ سے شکیلہ ہیرنگٹن کے نوکروں میں تحقیقات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جس وقت سے شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں قدم رکھا۔ مجھے اس ملعون عورت وحشت کی صورت سے ڈر لگتا تھا۔ آپ صاحب کو شاید معلوم نہیں شکیلہ ہیرنگٹن نے مجھے اپنے نانا کی دولت کا پتہ لگانے کیلئے بلایا تھا جسکے متعلق چند پراسرار کاغذات شکیلہ ہیرنگٹن کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اس وقت کامران نے اپنا بکس کھول کر ایک پرزہ کاغذ نکالا اور سب لوگوں کے قریب ہو کر کہنے لگا

یہ پُراسرار خط شکیلہ کے والد مسٹر شفیع احمد نے بستر مرگ پر شکیلہ کے لیے چھوڑا تھا اس کاغذ کی عبارت یہ ہے:

شرقی برآمدہ چالیس گز ہے پیپل کا درخت بجانب دس گز بجانب شمال دس گز وغیرہ چنانچہ میں ان پراسرار درختوں کے نیچے سے دفینہ یا ان کے متعلق کاغذات برآمد کرنے کے لئے بلایا گیا تھا رشاید شکیلہ نے میری آمد کی خبر رحمت کو دیدی تھی۔ کہ وہ شروع ہی سے مجھے گھور گھور کر دیکھتی تھی۔ چنانچہ مجھے فوراً ہی یہ شبہ پیدا ہوا۔ کہ شاید رحمت نے یا اس کے ذریعہ سے کسی اور شخص نے اس کاغذ میں مداخلت یا ترمیم و تغیر پیدا کیا ہو محض اتفاق سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ شکیلہ کے احاطہ میں پیپل کا کوئی درخت کبھی نہیں تھا ببول کے دو درخت البتہ تھے۔ اس وہم سے میں نے اس کاغذ کو پھر غور دیکھا۔ اور سچ مچ پیپل کے درختوں کا نام چھلا ہوا معلوم دیا۔

رفیق احمد اور سب انسپکٹر نے کاغذ کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ اور ٹھہر کے دل سے دونوں بولے۔ واقعی آپ نے بڑی دور کی سوچی۔ واہ واہ بیشک آپ کا دماغ سراغرسانی ہی کیلئے بنا ہے" کامران نے کاغذ واپس لے لیا۔ اور مسکرا کر کہا" کاغذ کی جعلسازی سے مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ کام صرف ان اشخاص کا ہو سکتا ہے۔ جن سے شکیلہ ہیرنگٹن کی واقفیت رہی ہو یا جنہیں شکیلہ نے یہ کاغذ دکھلایا ہو"

رفیق احمد و سب انسپکٹر دونوں نے "بیشک۔ بیشک" کہا اور کامران نے خوش ہو کر پُرتبسم آواز میں کہا شکیلہ ہیرنگٹن سے بڑی جرح و قدح کے بعد پتہ لگا۔ کہ اس کاغذ کو صرف دو اشخاص نے دیکھا تھا۔ ایک تو رحمت نے جو لڑکپن سے شکیلہ کو بطور والدہ کے پرورش کرتی تھی۔ دوسرے مسٹر رفیق احمد نے جو شکیلہ پر دل و جان سے مفتون ہیں خیر مجھے مسٹر رفیق احمد پر بھی شبہ ہوا تھا لیکن ابھی میں ان سے واقف ہونے کی تیاری ہی کر رہا تھا۔ کہ بنگلہ میں درختاں مذکورہ کے آس پاس کھدائی کراتے وقت مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس زمین میں کوئی دفینہ نہ تھا۔ اور یہ لاجرم سمجھا گیا۔ کہ کاغذات یا دفینہ کسی نے خود برد کر لیا ابھی ہم اس خلجان میں پڑا ہوا تھا کہ رفیق احمد صاحب پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا اور اس

عجیب وغریب قاتل کی فراری سے مجھے اس بات کی طرف توجہ ہوئی۔ کہ کسی طرح اس کا پتہ لگاؤں۔ میں نے سب سے پہلے شکیلہ ہیرنگٹن کے نوکروں میں رسائی پیدا کرنے کی سبیل نکالی۔ اور عورت بن کر شب کی تاریکی میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ ایک شب مجھے رحمت ایک کمرہ پر جناب غرب لائبریری کی طرف کھڑی دکھائی دی جہاں وہ دیا سلائی جلا کر تفتیش کر رہی تھی۔ بارہ بجے شب کو رحمت کا اس کمرہ کے دروازہ پر کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں نے اگلے دن مسٹر رفیق احمد سے اجازت لے کر بلند اختر کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے واسطے سہارنپور کی تیاری کی۔"

سخاوت علی کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے رفیق احمد کو کن آنکھوں سے دیکھکر گردن جھکا لی۔ اسی لمحہ میں کامران بولا "جی ہاں لیکن سہارنپور جانے سے پہلے مجھے نوکروں سے بر سبیل تذکرہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ کہ رحمت سہارنپور کی رہنے والی ہے۔ مجھے شبہ ہوا۔ کہ شاید بلند اختر نے مسٹر رفیق احمد پر حملہ کیا ہو۔ اور بلند اختر و رحمت کا یارانہ ہو۔ مگر رحمت اس معاملہ کی تردید کر چکی تھی کیونکہ اس نے اپنے اظہار میں بلند اختر کے متعلق لگاتا چاہا اس تذکرہ سے یہ پتہ لگا۔ کہ رحمت یا تو اصلی مجرم کے نام سے واقف تھی یا بلند اختر سے واقف نہیں تھی کیونکہ بعد کے تجربہ سے معلوم ہوا۔ کہ بلند اختر اور دلاور علی کی بڑی گہری دوستی ہے غالباً رحمت کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ سہارنپور جانے سے پیشتر میں نے محض اپنے تعجب اور اشتیاق کو محظوظ کرنے کے واسطے اس کمرہ کا قفل کھولنا چاہا جس پر میں نے رحمت کو ہاتھ لگاتے دیکھا تھا۔ اور بڑی تدبیروں کے ساتھ رات کی سیاہی میں بنوا کر لایا میں نے اس کمرہ کا جو کوشخانہ کے نام سے مشہور ہے قفل کھولنے میں کامیابی حاصل کی اور اس کے اندر مجھے چند ایسی چیزیں ملیں۔ کہ میں قاتل کی سراغ جوئی کے قابل بن گیا۔"

شکیلہ برقعہ سے دونوں ہاتھ نکال کر اور چلا کر بولی "مگر مسٹر کامران آپ نے مجھ سے سب باتیں پوشیدہ رکھیں۔ اور گول مول کرتے رہے اس کمرہ میں آپ نے کیا دیکھا؟"

کامران کا سگار گل ہو گیا تھا اس نے اور دیا سلائی جلائی۔ اور چند دم کھینچ کر

بولا "اس کمرہ میں میں نے سب کچھ دیکھا۔ اگر اس گوشہ خانہ کا نام زنبیل عمرو عیار رکھو تو بجا ہے جناب اس کمرہ میں ایک میز پر ایک بستر تہ شدہ رکھا ہوا تھا میں نے دھڑکتے دل سے بستر کھولا۔ اور اس کے تکیہ کے نیچے سے مجھے ایک رومال ملا۔ یہ کہہ کر کامران نے ایک خوشبودار رومال بکس سے نکالا۔ اور سب لوگوں نے اس پر شوق سے نگاہ ڈالی اس رومال کے اوپر حرف ڈی (د) سرخ ریشم میں بنا ہوا تھا۔ سب انسپکٹر کے چہرہ پر تردد اور ناکامی کے علامات ظاہر ہوئے۔ اور اس نے دھڑکتے دل سے کہا "ڈی سے کیا مطلب دلاور علی" کامران نے سگار میں دم لگا کر جواب دیا "جی ہاں دلاور کے سوا کون ہو سکتا ہے اس رومال کے علاوہ میں نے ایک الماری کے پیچھے ایک نیلے خط کے پرزے پائے اور ان پرزوں میں شکیلہ اور مسٹر رفیق احمد میری آنکھوں سے گزرا۔ ان الفاظ کی برآمدگی اس امر کی دلالت تھی۔ کہ یہ خط وہ تھا۔ جو مسٹر رفیق احمد کی لائبریری سے وصیت نامہ کے ساتھ چوری گیا تھا۔ اب مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید رفیق احمد کا حمد آور اور خط اور وصیت نامہ کا چور ایک ہی آدمی تھا۔ اور ان ہی وجوہ سے میں بلند اختر کو اس وقت دونوں الزامات کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ پھر اس کمرہ میں میں نے میز کے نیچے نظر ڈالی۔ تو مجھے لمبے پاٹ غلافات کا کھلا ہوا بیاجس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ کوئی شخص اس کمرہ میں دو تین روز رہا تھا یہ شخص کون ہو سکتا تھا۔ میں نے بہت کچھ غور کیا لیکن سوا اس کے اور کوئی بات اس وقت معلوم نہ ہو سکی۔ کہ یہ شخص کوئی عربی ہو۔ رحمت کا رازدار دوست یا عزیز تھا اس لمحہ میں مجھے یہی شبہ ہوا تھا۔ کہ جس شخص کا میں نے ہدایت علی اور باورچی کے ساتھ تعاقب کرنا چاہا تھا بظاہر اسی کمرہ میں متمکن رہا تھا"

تینوں آدمیوں نے ان پراسرار رازوں کو بڑے غور اور دلچسپی سے سنا۔ اور شکیلہ ہنگرین رحمت کی خونناکی اور گہری سازش سے اس قدر ڈر گئی۔ کہ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ پھر کامران۔ رفیق احمد کی طرف دیکھ کر اس طرح گویا ہوا۔ کہ آپ کے بہنوئی مسٹر بلند اختر کا معاملہ شروع ہوتا ہے میں نے سہارنپور آکر آپ کے بہنوئی کے محلہ میں مکان لیا تھا۔ اور وہاں ہی مقیم رہنے اور بلند اختر کی نقل و حرکت کا مطالعہ کرنے سے مجھے اچھی طرح

معلوم ہوگیا۔ کہ بلند اختر اور دلاور علی میں گہرا یارانہ تھا۔ نیز بلند اختر کی کمل جان سے بڑی گہری دوستی تھی۔ میں نے پہلے ہی شب بلند اختر اور دلاور علی کی باتوں سے پتہ لگا لیا تھا کہ وصیت نامہ اور خط بلند اختر نے چرایا تھا۔ اور رفیق احمد کا خیال اور دلاور علی تھا۔ کیونکہ دلاور علی نے خود اپنی زبان سے اس قسم کے کلمات ادا کئے تھے۔ لیکن میرا نشانہ خطا کر گیا لیکن میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ اسے قتل کئے بغیر شکیلہ ہنگلین کے نانا کی دولت میرے ہاتھ نہیں آسکتی میں پانچ سال سے بے تاب ہوں وغیرہ"

شکیلہ ہنگلین ان الفاظ کے اظہار سے شرما گئی۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسی لمحہ میں اس کے خیالات کی آنکھ دلاور علی کے مکروہ چہرہ پر پہونچی۔ جہاں اسے کانٹے بل دبائے بیٹھے تھے۔

• رفیق احمد کے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔ دلاور علی کو پولیس کی ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا سمجھکر اس کا دل جلد مطمئن ہوگیا۔ کامران نے سگار میں دو تین دم لگائے اور مسکرا کر کہنے لگا "میں الف لیلہ جیسی کہانیاں سنا رہا ہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے بلند اختر کا قفل کھولا۔ اور ایک الماری میں جہاں بین کرنے سے مجھے آپکے والد صاحب کا وصیت نامہ کتاب کی صورت میں رکھا ملا۔ رفیق احمد نے مسکرا کر سانس لیا۔ اور جلدی سے پوچھا "کیا وصیت نامہ آپ کے پاس ہے" کامران نے مسکرا کر جواب دیا "آپ اس قدر جلدی کرتے ہیں۔ میں اگر وصیت نامہ نکال لاتا۔ تو آج یہ لوگ میرے ہاتھ میں کہاں ہوتے"

تینوں سننے والوں کے شوق و اضطراب کی حد نہ رہی۔ اور اسٹیفن نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ہاں آگے چلیئے۔ آپ تو غضب کے جاسوس ہیں۔

کامران نے مسکرا کر سگار کو پرے پھینک دیا۔ کیونکہ وہ ختم پر پہونچ گیا تھا اور رومال سے منہ پونچھکر کہنے لگا۔ اس دیو خونخوار کے بھیس میں میری آنکھیں دھوکہ کھا گئیں جی ہاں تو جب مجھے یہ وصیت نامہ کتاب مذکور میں رکھا ہوا ملا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ بلند اختر اسے کیوں چرا کر لایا تھا۔ لیکن اس سے چند روز پیشتر میں ایک فقیر کی مدد سے یہ بات

معلوم کر چکا تھا کہ بلند اختر و دلاور علی گل جان کے سوا اس ہندو مہاجن زادہ موتی رام کے یہاں بھی بہت آمد و رفت رکھتے تھے اس کے ساتھ ہی مجھے بلند اختر کے کوٹھی کی انگیٹھی میں تھوڑے سے سوختہ پرزے ملے جن میں سے چند میرے پاس ہیں۔ پھر وہ بکس کے اندر سے ایک پرزہ نکال کر اور مسکرا کر کہنے لگا۔ دیکھئے اس پر کیا لکھا ہے۔

رفیق احمد نے ہاتھ بڑھا کر یہ پرزہ لے لیا۔ اور تینوں کی آنکھیں اس پر لگ گئیں رفیق احمد نے فوراً لہرا کر کہا "یہ تو میرے والد صاحب کے دستخط ہیں" پرزہ پر صاف طور سے شفیق احمد شکستہ میں لکھا ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے پرزہ کو بغور دیکھ کر کہا "کیا آپ کے والد صاحب بالکل اسی طرح دستخط کیا کرتے تھے"

رفیق احمد نے سر سے اشارہ کیا۔ اور زبان سے جی ہاں" ادا کر کے بتلایا کہ اس پرزہ کی تحریر اور اصلی دستخط میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ پھر کامران نے پرزہ واپس لیکر بیان کیا "ہاں تو اس قسم کے دستخط بلند اختر کے بلا تنگ (جانب) پر موجود تھے۔ وصیت نامہ کی موجودگی پرزہ پر دستخط کی مشق اور موتی رام سے ان دونوں نوجوانوں کی ملاقات و دوستانہ نیز بلند اختر کے عشق گل جان نیز اس کی والدہ کے منہ سے گل جان کی قیمت بیس ہزار سنکر مجھے خیال ہوا کہ بلند اختر کے موجودہ بے بضاعتی کی حالت میں کسی طرح بیس ہزار روپیہ کا بندوبست نہیں کر سکیگا۔ کیا عجب کہ وہ کوئی جعلی وصیت نامہ بنا رہا ہو۔ لیکن اس تھیٹر کے انعقاد سے چند روز پیشتر مجھے مسٹر رفیق احمد کے خط سے معلوم ہو گیا۔ کہ بلند اختر جعلی وصیت نامہ کی فکر میں نہ تھا بلکہ اس نے دو جعلی رقعات بیس بیس ہزار روپیہ کے مولوی شفیق صاحب کے دستخطوں سے بنا کر موتی رام کے سپرد کر دیئے تھے میں نے مزرکلوب گ کے بیس میں موتی رام سے آخری ملاقات کی۔ اور ان رقعات کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی کہ یہ چھ بلند اختر کی بدمعاشی کے نتیجہ تھے میں نے موتی رام کے دلپر شبہات کو پیدا کرنے کے ڈر سے سب معاملہ کو پوشیدہ رکھا۔ اور کوئی جرح نہ کی بلکہ برخلاف اس کے میں ہر طرح پر مطمئن کیا۔ کہ میں مسٹر رفیق احمد کا کارندہ ہوں مگر اصل میں اس کی طرف سے اطمینان دلاتے آیا تھا۔ کہ اس کا روپیہ بہت جلد ادا ہو گا بلکہ

نے مجھے ان جعلی تمسکوں کی طرف سے مطمئن کیا۔ وہ یہ تھی۔ کہ تمسک کی پشت کا نام و پتہ بالکل محو کیا تھا۔ بھلا فروشندہ کے نام مٹانے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ تمسکوں کی تاریخ و تحریر مستحکم اور باقاعدہ بنانے کے لئے فروخت تمسک کی تاریخ مٹا دینا نہایت ضروری تھا اب لوگ اگر موقع پر تمسک ملاحظہ فرمائیں گے تو میرے بیان کی تصدیق ہو جاوے گی۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ وصیت نامہ اور خط بلند اختر نے چرایا تھا۔ اور جعلی تمسک اسی نے بنائے ہیں۔ مولا داد علی کے جرم کو میں ہر طرح ثابت کر چکا ہوں صرف اتنا کہنا باقی ہے کہ بظاہر مولا داد علی اور بلند اختر کسی ضرورت سے لڑکی آئے تھے بلند اختر اپنے ماموں کا وصیت نامہ چرانے آیا ہوگا۔ ادھر مولا داد علی اپنی والدہ سے ملنے یا شکیلہ بیگم کے بنگلہ میں کھدائی کی خبر سنکر معاملات کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے شکیلہ کے بنگلہ میں چھپ رہا ہوگا۔ اصلیت یہ ہے۔ کہ قاتل اپنے قتل کی جگہ سے اس قسم کی انسیت محسوس کیا کرتا ہے جیسی طرح مجرم اپنے جرم کی جگہ کو محبت یا نفرت کی نگاہ دیکھ کر اس پر ہمیشہ اشتیاقانہ نظر ڈالا کرتا ہے شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ میں مولا داد علی کسی زمانہ میں اس کے والد صاحب کے پراسرار خطا کے ذریعہ سے اس عجیب و غریب دفینہ کے متعلق کوئی راز افشا ہو چکا تھا جس کا میں اب ذکر کرتا ہوں۔ مولا داد علی ہی نے شکیلہ کی توجہ ببول کے درختوں سے دوسری طرف ہٹانے کے لئے پیپل کے درخت بتا دیئے تھے۔ چونکہ مولا داد علی کے ہاتھ میں اس پراسرار خط کی کنجی تھی جس سے وہ ببول کے درختوں کے نیچے سے نکال چکا تھا میری کھدائی کی خبر سنکر وہ محض یہ بات دیکھنے آیا ہوگا۔ کہ اب کیا برآمد ہوتا ہے۔ یا مجھے ہوشیار آدمی سمجھ کر وہ ڈر گیا ہوگا۔ کہ شاید اس کی چوری اور مداخلت کا بھانڈا پھوٹ جاوے۔ وہ مجھے قتل کرنے آیا ہوگا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس لمحہ میں مسٹر رفیق احمد بڑے دن کی شب کو شکیلہ ہیرنگٹن سے ملاقات کرنے آئے۔ اس وقت رحمت مسٹر موصوف کی آمد سے مطلع ہو گئی تھی۔ بظاہر اس وقت رحمت مولا داد علی کو کھانا پہنچانے کے لئے تہہ خانہ پر گئی ہوگی اور وہاں اس کے منہ سے رفیق احمد کا ذکر نکل گیا ہوگا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ مولا داد علی مس شکیلہ پر جان دیتا تھا۔ اور مسٹر رفیق احمد کو اپنا رقیب

سمجھ کر اپنی آرزوؤں کا دشمن سمجھتا تھا پس کیا عجب کہ دلاور علی جلدی جلدی کتابا خاتمہ کرکے آیا۔ خوفناک قتل کا منصوبہ باندھ چال آصف نگر کے پل پر آکر مڑا ہوا ہوجاتی حالات آپ خود معلوم کرسکتے ہیں چند روز گذرے۔ میں نے اس شخص دلاور علی کے مکان پر رہو کے سے قیام کیا۔ اور اس کی غیر حاضری میں اس کی ایک الماری توڑ ماری۔ جس کے اندر سے مجھے دو قطعات نقرہ ملے جن سے ایک بڑی کاغذ تحریر کا پتہ لگ گیا۔ یہ دونوں ٹکڑے میں آپ کو دکھائے دیتا ہوں لیکن باقی حالات تحکیلہ ہیرنگٹن کی مرضی بغیر کسی سے نہیں کہہ سکتا۔

سب انسپکٹر اور رفیق احمد کے چہروں کی رنگت فق ہوگئی۔ اور انہیں اس عجیب وغریب سراغرسان کی باتوں میں بھوت اور پریوں کی کہانیوں کا لطف آگیا جس نے نکبس کے اندر سے دو قطعات نقرہ نکال کر رفیق احمد کے ہاتھ میں دیئے۔

رفیق احمد اور سب انسپکٹر نے ڈھکتے دل سے چاندی کے ٹکڑوں کو بغور دیکھا۔ اور دیوانوں کیطرح پوچھنے لگے "اس سے کیا مطلب" کامران نے دونوں ٹکڑے واپس لے لئے۔ اور سنجیدگی سے جواب دیا "ان ٹکڑوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ صرف یہ بات ثابت کرنی تھی۔ کہ اگر دلاور علی رفیق احمد پر یہ دلانہ حملہ کرنے کا مجرم ہے۔ تو اس سے وہ نہایت کمینہ پن کے ساتھ شکیلہ ہیرنگٹن کے نانا کی دولت کثیر خرد برد کرلینے یا کم از کم ارادہ کرنے کا مجرم ضرور ہے۔ اور یہ سب آسانی اس بدبخت نوجوان دلاور علی کو اپنی والدہ کے تقرب وراز داری شکیلہ ہیرنگٹن سے پیدا ہوئی۔ اس عورت نے اپنے بیٹے کو لڑکپن ہی سے شکیلہ ہیرنگٹن کا آئندہ شوہر سمجھ کر شکیلہ کو بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ اور اس کے والد کے پراسرار خط کے مضمون سے دلاور علی کو مطلع کرکے اسے کثیر رقم کی امید دلائی جس کی طمع نیز شکیلہ کے تعشق سے اب وہ اس درجہ پر پہنچ گیا۔ کہ اس نے رفیق احمد کو ذبح کردینے کی ٹھان رکھی تھی۔ اگر اسے اس تھیٹر گاہ میں موقعہ مل جاتا۔ تو رفیق احمد کا سر پاش پاش کردیتا۔ اور کسی کو کیا معلوم ہے۔ کہ وہ گرفتار ہونے سے پہلے کس فکر میں تھا شکیلہ ہیرنگٹن اور رفیق کے دل لرز گئے

اور سب انسپکٹر نے خوف زدہ نگاہ سے کامران کی طرف دیکھ کر کہا "واقعی آپ بالکل درست فرما رہے ہیں میں اس شخص کا چالان کر دینے کو تیار رہوں۔ اسے پھانسی مل جاوے گی۔ اور اس کی والدہ "بور دریا کے شور کی سزا پائیگی" خس کم جہاں پاک"۔ پھانسی اور دریائے شور کے نام سے شکیلہ کا دل دہل گیا۔ اور اس نے چیخ مار کر کہا۔ "ٹھہریئے" ٹھہریئے" اس قدر جلدی ابھی نہیں۔ میں نے عرصہ تک رحمت کا دعویٰ کیا ہے میں اس کے لئے اس قدر سخت سزا تجویز نہیں کر سکتی"

کامران اور رفیق احمد نے سنجیدگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر کامران نے شکیلہ کی طرف دیکھکر جواب دیا۔ خیر ان ماں بیٹیوں کی بابت تو کل فیصلہ کرنا چاہیئے بلند اختر کی بابت کیا کرنا چاہیئے"

رفیق احمد نے دانت پیس کر جواب دیا "میں اس ملعون کو بھی کالے پانی بھیجنا چاہتا ہوں" لیکن میری بدبخت بہو بھی اور ہمشیرہ دیواروں سے سر مار کر جان دے دینگی" سخاوت علی صاحب بلند اختر کو رہا کر دو" کامران نے وحشت ناک آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھا۔ پھر کچھ غور کر کے بولا "بلند اختر کی رہائی سے موتی رام بھی خود بخود بری ہو جاویگا۔ ان دونوں کے ہاتھ سے وصیت نامہ اور جعلی تمسک لے لیتے ہیں۔ آپ اس قدر جلدی نہ کریں۔ بلند اختر اور موتی رام دونوں کو ایک شب قیدیوں کی طرح رہنے دیجئے آئندہ ایسی قبیح حرکت کے مرتکب نہ ہوں۔ اب ہم بالکل تھکے ہوئے ہیں اب آپ معاملہ اسی طرح رہنے دیجئے جس طرح ہے"

سب انسپکٹر نے کامران کی رائے کی تائید کی شکیلہ ہنگلن نے کامران کا ساتھ دیا۔ کامران تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا "مسٹر رفیق احمد آپ مس شکیلہ ہنگلن کو اس چوکیداری میں نہ رکھیں مگر عزیز آخر موجود رہے لیکن آپ دونوں کی عزت اور ناموس کے خیال سے یہی بہتر ہے۔ کہ شکیلہ ہنگلن عزیز آگوگل جان اور امیر جان کے خیمہ میں بھیجدیں۔ اور مجھے اپنے ڈیرے میں جگہ دیں شکیلہ کا دل اچھل پڑا۔ اور وہ کامران کی ذہانت کو ہر جگہ موجود اور حاضر سمجھ کر اس کی دانش مندی پر

ش عش کرنے لگے۔ رفیق احمد نے مسکرا کر فتحیہ کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس کر بولا "واقعی مسٹر کامران بڑے صوفی منش آدمی ہیں۔ جبھی تو ان کا چیلا ہدایت علی ایسا کٹر ولی بن کر آیا تھا۔ چاروں آدمیوں کے منہ سے قہقہوں کی آوازیں نکلیں۔ اور تاریک ڈراؤنی رات کی یخ بستہ ہواؤں کے ذریعہ سے ان چاروں قیدیوں کے کانوں میں پہنچیں۔ جو خون جگر پی پی کر آپ کو دنیا دی آزادیوں سے ہزار ہا کوس دور پا رہے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو دنیا کی معمولی زندگی میں ہزار ہا آدمی ہر روز قیدیوں جیسی مشکلات اور نا امیدیاں محسوس کرتے ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو کوئی دن ایسا نہیں گذرتا۔ کہ کسی کا شیشہ دل نہ ٹوٹ جاتا ہو یہ دنیا فی الحقیقت ایک تماشا گاہ ہے۔ پھر کیا عجب اس کے عجیب و غریب اور وسیع تختوں پر روز جا بجا ہزاروں ایسے تھیٹر کھڑے ہوتے ہوں۔ جیسا گل جان کی سادگی اور کامران کی عیاری سے عظیم الشان نہر جن کے موہنڈے پر جنگل کے خس و خاشاک کے اندر اس وقت رشب میں کھڑا بے فکری اور تھیٹر کے قہقہے لگا رہا تھا۔

باسٹھواں باب

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت

دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

جس معرکہ آرا شب میں کامران کی ذہانت طبع نے چار نابکار جوشیلے نادانوں کو پا بزنجیر کر دیا تھا اس کی صبح کو کامران اور سعادت علی بہت سویرے اٹھے ان دونوں نے معاملہ کی نزاکت اور دست اندازی پولیس کی ذمہ داریوں پر غور کیا۔ اور رفتہ رفتہ رفیق احمد کے بیدار ہو جانے پر یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ مرحومین کی ایک باقاعدہ کمیٹی کر کے کوئی تحقیقی اقدام کیا جائے چنانچہ

سب صاحبوں کو سرگوشیوں کے ذریعہ سے سب معاملہ سنا دیا گیا۔ اور بڑے خیمہ کے دروازہ پر ملازمین کا پہرا قائم کر کے پنچایت کی گئی۔ شکیلہ ہنگلش حسب دستور برقعہ میں تھی۔ گل جان کے چہرہ پر وحشت اور اداسی برس رہی تھی۔ امیر جان کا دماغ قابو میں نہیں تھا۔ اور وہ اپنی بیٹی کے عاشق یا دوست کو گہری مصیبت میں گرفتار پا کر سوچ رہی تھی کہ آیا معاملہ کا اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ سب صاحبوں کے کرسیوں پر متمکن ہو جانے پر کامران نے اپنی تقریر شروع کی۔ جو حسب ذیل تھی:۔

صاحبو۔ شب گذشتہ منشی سخاوت علی صاحب نے جن چار آدمیوں کو گرفتار کیا۔ اور جو اس وقت تھیٹر گاہ میں مقید ہیں۔ ہم ان کے معاملہ پر اس وقت باضابطہ میٹنگ کر کے انہیں کیفر کردار کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس معاملہ میں دست اندازی پولیس کا خاص خطرہ ہے۔ اور چند آدمیوں کی گرفتاری بہت سے خوفناک مشکلات پیدا کر سکتی ہے اس وجہ سے ہم نے آپ سب صاحبوں کو جمع کیا ہے۔ کہ آپ اپنی تجربہ کاری اور معاملہ فہمی سے ہمیں معقول مشورہ دیں۔ ان چار آدمیوں میں ایک عورت رحمت ہے جس نے مسز شکیلہ ہنگلش کو لڑکپن میں ماں جیسی محبت میں پالا پرورش کیا۔ اور پیس سال سے شکیلہ موصوف کی خدمتگذاری میں لگی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی زوالت اور حماقت سے شکیلہ ہنگلش کے وصیت نامجات میں اپنے بیٹے دلاور علی کو مداخلت بیجا کرنیکا موقعہ دیا۔ اور باوجود اپنے بیٹے کی نالائقی اور سفلہ پن کے شکیلہ ہنگلش کو رائے دی کہ وہ دلاور علی کی زوجہ بن جاوے۔ کیونکہ اس نے نمک حرامی اور عیاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہم اسے باضابطہ سزا دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن شکیلہ موصوف اس کی خدمات پیشین کے معاوضہ میں نہایت نرمی اور معافی کا برتاؤ کرنا چاہتی ہے دوسرا مجرم دلاور علی ہے جس پر مسز شکیلہ موصوف نے کاغذات خرد برد کرنے کے علاوہ دوسرا زبردست الزام یہ ہے۔ کہ اس نے ایک شب مسٹر رفیق احمد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اس الزام کے متعلق ضروری ثبوت بہم پہونچ گئے ہیں۔ اور مسٹر رفیق احمد و سخاوت علی صاحب سب انسپکٹر پولیس طور پر مطمئن ہو گئے ہیں۔ کہ اس نیز دل اور نالائق آدمی

کا جرم قابل دست اندازی پولیس ہے چنانچہ اس شخص کا معاملہ عدالت میں بھیجا جانا جس قدر ضروری ہے اسی قدر اس سے ایک نئی دقت پیدا ہوتی ہے۔ کہ جب کا معاملہ دوسرے عدالت میں جاکر از سر نو کچھ نئی مشکلات کا مقابلہ کیا جاوے تیسرا مجرم بلند اختر ہے جس نے اپنے ماموں زاد بھائی رفیق احمد کے گھرانے سے باوجود احسانات کثیر اس کے والد صاحب کا وصیت نامہ اور ایک پرائیویٹ خط چوری کیا ہم اس وقت پورے طور پر متیقن ہو گئے ہیں۔ کہ اس وصیت نامہ کی مدد سے وہ جعلی رقعہ جات ایک کثیر رقم قرضہ چالیس ہزار کے متعلق بنانے گئے ہیں جنکا تعلق مولوی شفیق احمد صاحب مرحوم سے رکھا گیا ہے۔ گویا بلند اختر نے باوجود قرابت اور احسان گذاری اپنے بھائی رفیق احمد کو ایسی کمینہ پن کے ساتھ بقدر چالیس ہزار روپیہ غریب بنانا چاہا ہے۔ اور اس قرضہ کا مالک اس احمق نوجوان موتی رام کو بنایا ہے جسے آپ دیکھ چکے ہیں جس قدر ضرورت بلند اختر اور موتی رام کو سزا دینے کی واقع ہوئی ہے۔ اسی قدر خیال اس بات کا ہے۔ کہ مسٹر رفیق احمد اپنے بھائی کی ہتک یا بے عزتی اپنی بیوی کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری بات قابل تذکرہ یہ ہے۔ کہ مجھے پورے طور پر یقین ہے۔ کہ بلند اختر نے یہ جعلی رقعہ جات محض اس غرض سے بنائے ہیں۔ کہ وہ اس بیوی بہالی لڑکی گل جان پر فریفتہ ہے۔"

گل جان نے شرم سے گردن جھکالی۔ اور اس کی پژمردہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر کامران ذرا ادھر ادھر دیکھ اس طرح گویا ہوا "بلند اختر کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ چالیس ہزار روپیہ حاصل کر کے گل جان کی والدہ کے آگے بیس ہزار ڈالے۔ جو اس کی والدہ اس معزز نگر رؤسیل دل عورت نے اس کی قیمت لگا رکھی ہے۔ اس خیال کے چہرہ پر زردی پھیل گئی۔ اور وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن موجودین کے رعب سے زبان نہ ہل سکی پھر کامران نے اپنی گفتگو کا سلسلہ اس طرح قایم رکھا بلند اختر کی انتہا درجہ کی بیوقوفی اور حماقت میں ذرا کلام نہیں لیکن مثل مشہور ہے "موتا کیا نہ کرتا" وہ گل جان کی زلف گرہ گیر میں بری طرح پھنس گیا اور اپنے افلاس اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اس جال سازی کا مرتکب ہوا ہے

اب میں آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ اس معاملہ کا فوراً فیصلہ کر لیا جاوے۔ تاکہ ہمارے تھیٹر کے لطف و حظایف کسی خوفناک و دلخراش منظر کی صورت اختیار نہ کریں۔

کامران کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو رفیق احمد نے کھڑے ہو کر اس طرح گفتگو کی "

صاحبو۔ مجھے شکیلہ ہیرنگٹن کے نقصانات یا تکالیف پر گہری ہمدردی ہے اور اپنے بھائی بلند اختر کی احسان فراموشی کا خاص رنج ہے۔ میں اپنے خاندانی اعزاز اور خانگی مشکلات کے سبب آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ بلند اختر و موتی رام کو رہا کر دیں۔ اور دلاور علی و رحمت کو جو سزا آپ تجویز کریں دیجاوے "

رفیق احمد کے بیٹھ جانے پر شکیلہ ہیرنگٹن کرسی سے اُٹھی۔ اور حسب ذیل تقریر کی۔

حضرات دوستو میں مسٹر رفیق احمد کی تائید کرتی ہوں۔ بلند اختر و موتی رام کو رہا کر کے ان سے باضابطہ اقرار نامہ لے لیا جاوے۔ کہ مونوی شفیق احمد صاحب ان کے مقروض نہ تھے۔ اور دلاور علی و رحمت کے بارے میں رائے یہ ہے۔ کہ اس معاملہ کو پولیس کے ہاتھوں میں ڈال کر بڑی طوالت ہو جاویگی میں یہ بہتر سمجھتی ہوں کہ ان مار پیٹے کو نوآبادی افریقہ یا آسٹریلیا بھیج دیا جاوے۔ جہاں ہم لوگ ان کی عیاریوں سے محفوظ رہیں " شکیلہ ہیرنگٹن کے بیٹھ جانے پر خاوت علی سب انسپکٹر اس طرح گویا ہوا۔

صاحبو آپ لوگ محض بطور تماشائیوں کے اس معاملہ میں شریک ہوئے ہیں لیکن سب سے زیادہ ذمہ داری میری گردن پر ہے۔ میں اگر اس معاملہ کو پوشیدہ کہتا ہوں۔ تو شکل اگر نہ چھپاؤں تو شکل میں دراصل مسٹر رفیق احمد کے آگے خلاف اٹھا کر اقرار کر چکا ہوں۔ کہ اس کے بھائی بلند اختر کو سزایاب نہ ہونے دونگا پیشتر اس کے کہ میں اس معاملہ پر اپنی تحقیقی رائے دوں۔ میں آپ صاحبوں سے ایک عہد نامہ اس امر کا لینا چاہتا ہوں۔ کہ اگر کوئی معاملہ پیش آ گیا۔ تو آپ لوگ یہاں میری موجودگی کی لاعلمی

ظاہر کر دیں گے۔ آپ لوگ پہلے اقرار کیجئے"

کامران نے آہستہ سے کہا" ہم لوگ حلفیہ وعدہ کرتے ہیں۔ کہ سخاوت علی صاحب کا نام پوشیدہ رکھا جاویگا۔ بشرطیکہ اتفاق ہو۔ اپنا اپنا ہاتھ اٹھا لیں"

اس کلمہ پر سب آدمیوں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ سخاوت علی نے لمبا سانس بھر کر کہا۔ صاحبو میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ بندا خترو موتی رام کو رہا کر دیا جاوے۔ میں ان دونوں سے حلفی رخصت لے کر رفیق احمد کو دیوانگی و للہ علی درجہ سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں بہتر یہ ہے کہ میں وہ کانسٹیبلوں کو تین تین ماہ کی رخصت دلا کر ان دونوں کے ساتھ کر دوں۔ اور یہ دونوں ملاکر بند کر دیئے جاویں۔ ان کے لئے مکہ معظمہ سب سے بہتر جگہ ہے۔ وہاں ان کی بدعنیاں دور ہو جاویں گی" درست درست بہت سی زبانوں سے نکلا۔ اور سب انسپکٹر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اسوقت کامران پہرہ کرسی سے اٹھا۔ اور جھک کر کہنے لگا" اگر آپ لوگ اجازت دیں میں ان جملہ مجرموں کو آپ کے سامنے لا کر ان سے اپنے اپنے جرائم کے اقبال کرا دوں"

رفیق احمد اور شکیلہ ہیرنگٹن نے بکزبان ہو کر نہیں نہیں کہا۔ اور گل جان نے کامران کو منت بھری آنکھوں سے دیکھکر کہا" مسٹر کامران آپ جب سے مجھے ملے ہیں میں ہمیشہ آپ کی شرافت اور محبت کی قائل رہی ہوں۔ مجھے نہایت رنج ہے کہ آپ میری دلآزاری کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور بندا خنر کو میرے سامنے بلا کر میرے زخموں پر نمک پاشی کرنا چاہتے ہو"

کامران نے متین صورت بنا کر جواب دیا" گل جان صاحبہ! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں لیکن آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی۔ کہ میں امداد علی کی جگہ کامران ہوں"

شکیلہ ہیرنگٹن نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں گل جان کو سب معاملہ سنا چکی ہوں۔ دس منٹ تک سب لوگ ڈیرے میں باتیں کرتے رہے پھر سب کے لئے چائے

لائی گئی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ رفیق احمد تنہا بلند اختر سے ملاقات کرے۔ اور اسے اسکی بدعملی کا قائل کرکے اپنے ہاتھ سے ہتکڑی نکال دے۔ رفیق احمد نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور کپتان نے نوکروں کو حکم دیا۔ کہ فی الفور مزدوروں کو جمع کرکے تھیٹر کو توڑ کر سب سامان روانگی سہارنپور کے ارادہ سے بند کرنا شروع کریں۔ دنیا کی زندگی دراصل ایک قسم کی قمار بازی ہے۔ کوئی شخص اپنے اثاثہ سے دوسروں کو ہرا دیتا ہے۔ کوئی دوسروں کے ہاتھ ہار جاتا ہے۔ نہر جمن شرقی مرہٹہ پر جس بانکپن اطفال میں ان سمجھ دار اور بے سمجھ مخلوط الخیال آدمیوں نے ایک تھیٹر گاہ یا بساط شطرنج پھیلائی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ ناکامیاب گل جان جیسی بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی کو نصیب ہوئی۔ ایک نوجوان پر ارمان دوشیزہ لڑکی کے واسطے اس سے زیادہ بدنصیبی اور مصیبت کا سامان اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ایسے مفلس اور ناقابل نوجوان کے عشق میں گرفتار پاوے۔ جو اپنی ناگوں تباہیم رہنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈلوانے پر مجبور ہو جاوے۔ لیکن اگرچہ گل جان کا تخاول اس خوفناک تھیٹر کے نتائج پر ٹوٹ گیا۔ اور اس کے ارادوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ مگر اس کے دل کے اندر محبت اور دلداری کا تخم موجود تھا۔ کیا عجب کہ یہ تخم پھولے اور پھلے اور اس کے برائے ثمار شجر کے نیچے کسی دن بلند اختر پاچشم تر بیٹھ کر اپنی حماقت اور احسان فراموشی پر کف افسوس ملے۔ نوجوان رفیق احمد نے درحقیقت بڑی فراخدلی اور عالی نسبی کا ثبوت دیا۔ اس وقت کوئی پولیس یا کوئی منصف عدالت بلند اختر کو آزادی بخشنے والی نہ تھی۔ مگر رفیق احمد سب منصفوں سے زیادہ رحمدل اور احسان کیش آدمی تھا۔ اور اصلیت یہ ہے "ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"

تریسٹھواں باب

پشیمانی و خودکشی ۶

رنج و غم مصیبت و ناامیدی کیسے دلخراش مواقعات ہیں۔ ذرا سی دیر میں انسان کی دنیا کو تبدیل کر کے اس کے خیالات منصوبوں پر ظلمات کی گھٹا ٹوپ تاریکی کہری کر دیتی ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو اس مصیبت خیز بے یار و غمگسار ناامیدی کی زنجیروں میں کسا ہوا پا کر دین و دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ابھی چند روز گذرے بلند اختر و دلاور علی اپنے شباب اور نوجوانی کے زعم میں سکندر وقت اور افلاطون زمان بنے ہوئے تھے۔ ایک اپنے ارادوں میں رستم جیسی دلاوری اور سہراب جیسی سعدی پا کر رفیق کو آبشار آصف نگر میں دھکا دیکر تلف کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب مدبر سمجھ کر جعلی رقعات کی مدد سے گل جان کے زاہد فریب جسم کو آغوش میں کھینچ لینے کی تیاری کر رہا تھا لیکن جیسا کہ مشہور ہے۔ انسان تدبیر کیا کرتا ہے۔ اور قسمت قہقہہ لگایا کرتی ہے۔ ان دونوں کے سر پر تقدیر کی خوبصورت دیوی حور بن کر منڈلاتی آئی۔ اور تنفر بھری آواز میں ایک کو بچہ عرب کے عمور کی شہزادی گئی۔ دوسرے کو بلائے چندے دنیاوی آزادی دیکر پابزنجیر چھوڑ گئی بلند اختر نے خوفناک جال سے رہائی تو پالی۔ لیکن اس کے سب ارادوں پر بجلی گر گئی۔ ایک ہی شب کی قید غم اور ذلت سے اس کے منصوبوں کے چیتھڑے ہو گئے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس بدنصیب مصیبت زدہ کسان کی طرح سمجھنے لگا جس کی لہلہاتی ہوئی کھیتی کو ایک ہی شب میں ٹڈی دل صاف کر کے ہنستا ہوا کہلا جاوے "جا اب اپنے قرض خواہوں کی جوتیاں کھا"

بلند اختر کے دل میں اب تک دنیا کی امنگ اور ولولے اگر پیدا ہوئے

تو وہ سب پری چہرہ گل جان کے جسد تک محدود تھے۔ سچ پوچھو۔ تو اس کی دنیا محض گل جان تھی۔ وہ گل جان ہی کے سہارے سے زندہ تھا اسی کی آرزو میں دن رات بسر کرتا تھا۔ اور اسی کو اپنا مذہب اور عقیدوں کی دیوی تصور کر کے الفت کا خیالی مندر بنا رہتا تھا۔ اس دلفریب خیالی مندر کے اندر اس کی آنکھیں صرف گل جان کو دیکھ سکتی تھیں۔ اور وہ مثل پیش آگئی تھی ؎

دیدہ یعقوب سے دیکھا جو عالم کی طرف
یوسف اس بازار میں ہر سو نظر آیا مجھے

لیکن اس کے خیالی عشق کا قلعہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس وقت مسمار ہوگیا جب اسے رفیق احمد نے اپنے ہاتھ سے آزاد کر کے کہا "تیری بدعملیوں کی حد ہوگئی۔ تو رنڈی زادی کے عشق میں اس حد تک پہونچ گیا۔ خدا تجھ کو ہدایت کرے"

بدنصیب نوجوان اس ڈراونے جواب سے اچھل پڑا۔ اور ہراساں نظر ڈال کر دیکھا۔ تو اپنے آپ کو گل جان سے ہزارہا کوسوں دور پایا۔ اسے سہارنپور آئے ہوئے تین روز گذر گئے تھے۔ اور یہ دن جس مصیبت اور نا امیدی سے گذرے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے دو شبانہ روز نہ کچھ کھایا نہ پیا"

رفیق احمد نے اس کے عشق اور جرائم کا کچا چٹھا اپنی پھوپھی کو سنایا لیکن ماں بہن کی محبت حیوانوں جیسی ہوتی ہے۔ ان دونوں کو بلند اختر لعل و جواہر سے زیادہ پیارا اور لخت جگر تھا۔ وہ اس کی جملہ خطاؤں اور تقصیرات پر اغماض کر سکتی تھیں۔ اور اگر ضرورت پڑتی۔ تو اس خاطر سو اور نا اہل پر اپنی جان قربان کر دیتیں۔ بلند اختر اپنے مکان میں خراب و خستہ حال پڑا تھا اس کے چہرے کی رنگت زرد ہوگئی تھی۔ بھوک پیاس کے مارے تمام جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا معلوم دیتا تھا۔ اس کے بدن میں اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ عالم شباب کا سارا زور داغ پر آرہا تھا۔ اور داغ میں ایک گرہ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس کے اندر گل جان کے کھڑے کی صورت پیوند ہوگئی تھی اسکی جان

اور بہن بار بار اس کے پاس آتیں اور اسے کھانا کھانے کی ترغیب دیتیں منت وسماجت کرتیں۔ آنکھوں سے اشک حسرت بہاتیں۔ بلند اختر آنسو بہا کر روٹیں بدل لیتا اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ہر بات کے واسطے وقت اور حد معین ہے۔ اس کی والدہ اور ہمشیرہ اسے بستر پر چھوڑ کر مکان کے غربی سائبان میں بیٹھی ہوئی شب بیداری کر رہی تھیں۔ اور یہ سمجھ کر کہ شاید بلند اختر کسی وقت کھانا مانگ بیٹھے۔ اس سائبان سے جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ رات کے دس بجے ہونگے۔ شب تاریک اور سرد تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بدن میں گھسے جاتے تھے۔ سائبان میں بالکل تاریکی تھی جس کمرہ میں بلند اختر پڑا تھا۔ اس کے اندر لیمپ ضرور جل رہا تھا لیکن بلند اختر کی ہمشیرہ ابھی کیواڑ بند کر کے آئی ہی تھی۔ اس نوجوان خوبصورت لڑکی کا نام رسیدہ تھا۔ اس نے آنسوں کو پونچھ کر ماں کی طرف دیکھا اور چپکی باندھ کر کہنے لگی۔ اماں اختر کا براحال ہے حکیم کو بلواؤ" ماما کو بھیجدو"

بوڑھی بدنصیب ماں سائبان سے اٹھ کر سر پر ضائی درست کر کے اندر داخل ہوئی۔ اور بلند اختر کے سر سے لحاف ہٹا کر کہنے لگی "جان مادر اختر تجھے کیا ہو گیا خیر کہنے سے تو بتلا کل جان تجھ سے کسی طرح نکاح کر سکتی ہے؟

کل جان کے نام سے بلند اختر کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اس نے کراہ کر جواب دیا اماں اب تم میرے سامنے سے چلی جاؤ" میرا وقت قریب آگیا ہے عنقریب دوسری دنیا کو سدھارا چاہتا ہوں"

بوڑھی ماں کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ نوجوان بیٹی بھاگ کر پاس آئی۔ اور گھبرا کر کہنے لگی۔ اماں کیا ہے؟ شریف اور مجسم محبت ماں نے رو کر جواب دیا" اختر کو جنون ہو گیا ہے۔ ایک نہیں سنتا۔ ہائے اللہ کیا کروں۔ رسیدہ اپنے والد کی کتاب جلد الشکات نکال کر لائی تعویذ دے اختر کو پلاؤں" رسیدہ نے آنکھوں سے آنسو پونچھ کر الماری سے کتاب نکالی۔ اور اس کے اندر سے ایک تعویذ جھٹ پٹ نقل کر کے والدہ کے ہاتھ میں دیا۔ بوڑھی عورت نے ایک کٹورے میں تھوڑا پانی لے کر اس

تعویذ کو حل کیا۔ اور زبردستی بلند اختر کے منہ میں ٹپکا دیا۔ بلند اختر نے ماں کے ہاتھ سے کٹورہ پرے پھینک دیا۔ اور جھلا کر بولا۔ اماں ان باتوں سے کیا حاصل ہے۔ مجھے کیا منگوا دو میں دراصل گل جان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا میں اپنی بداعمالی کی وجہ سے اس قابل نہیں رہا۔ کہ اس کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لوں۔ اس کی ماں میں ہزار روپیہ مانگتی ہے۔ میں کہاں سے لاؤں۔ میں نے کل گل جان کے پاس ماما کے ہاتھ خط بھیجا تھا جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسے بھی اب مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔ بس سوائے موت کے چارہ نہیں۔ تم صبر کرو۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دو۔ اگر ماما سے تھوڑا سا زہر منگا دو۔ تو مجھ پر بڑا احسان کرو گی"۔ اس کلمہ سے خود بلند اختر کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور وہ زور زور سے رو کر "ہائے گل جان ہائے گل جان" بکنے لگا۔ دونوں ماں بیٹیوں کا دل بھر آیا۔ اور ان کے منہ سے بے اختیار ہائے لاڈلے ہائے اختر نکلا۔ ماں اور بہن کے لئے اس سے زیادہ دل خراش موقعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہ ایک جوان فخر خاندان خوبصورت باپ دادا کا نام لیوا بیٹا زہر سے خودکشی کرنے پر آمادہ ہو کمرہ میں ان تینوں کی آہ و بکا سے اچھا خاصا کہرام مچ رہا تھا۔ دیوار گیری در و دیوار پر حسرت بھری روشنی ڈال رہی تھی۔ باہر تیز رفتار ہوا سائبان میں تھپڑ مار مار کر کہہ رہی تھی "نہیں نہیں" ہر شخص کو میری طرح دنیا میں مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مگر ان تینوں کی مصیبت اور رنج و غم کو کوئی چیز کم کرنے والی نہ تھی۔ اور نہ ان تینوں کی خستہ حالی اور نہ بے بسی پر کوئی ترس کھانے والا تھا۔ سچ ہے مصیبت میں کوئی کام نہیں آتا۔ محلہ کا ایک کتا کھڑکی کے پاس آکر بھوں بھوں کرنے لگا لیکن جس وقت ان تینوں کے دل ہیبت ناک ناامیدیوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ اور انہیں اس منحوس گھڑی سے نجات پانیکا کوئی موقعہ نظر نہیں آتا تھا۔ تقدیر کی مذاق پسند پری چہرہ دیوی اس مکان پر قدم جمائے کہہ رہی تھی۔ اے احمق انسانو تم بڑے بے بس ہو۔ تم ہمیشہ قبل از وقت واویلا مچاتے رہتے ہو۔ بولو تو بلند اختر کے منہ سے آہ و بکا کے ساتھ

گل جان گل جان نکلا۔ اور اسی لمحہ میں ماں بیٹیوں کو ایسا معلوم ہوا کہ ایک تیز رفتار دوڑنے والی گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بالاخانہ کے دروازہ کے سامنے پہنچتے ہی طلبہ اختر نا امیدی سے دانت پیس کر دوسری کروٹ پر گر گیا۔ ماں بیٹیوں نے آنسو پونچھ کر دھڑکتے دلوں کو قابو میں کرنا شروع کیا۔ وہ کوئی غیر یا اقربا شب باشی کے لئے مہمان بن کر آیا ہے۔ بہرحال شریف نیک بخت عورتوں کو اس وقت کسی نا طلبیدہ مہمان کی آمد بھی بری نہ تھی وہ طلبہ اختر کی مصیبت کو کسی طرح ٹالنا چاہتی تھیں۔ اسی لمحہ میں ان دونوں کو اپنے مکان کے دروازہ پر دستک کی آواز سنائی دی۔ بوڑھی عورت گھبرا کر زینہ پر گئی۔ اور بغیر کچھ بولنے سے پہلے بآہستگی پوچھنے لگی۔ کون ہے؟ "اشفاق احمد" رفیق احمد" بوڑھی عورت نے اپنے استفسار کے جواب میں یہ آواز سنائی دی۔ کیا ز کہ ئے میں ہوں گلجان" معزز عورت نے دھڑکتے دل سے زنجیر کھول دی۔ اور شب کی تاریکی سے شال میں لپٹی ہوئی نوجوان رنڈی زادی نے ہانپ کر پوچھا "اختر کہاں ہے؟" معزز عورت اسے اپنے پیچھے پیچھے لائی۔ اور ایک لمحہ میں خوبصورت نوجوان پری چہرہ لڑکی نے دلوار گیری کی مدہوشی میں ماں بیٹیوں کو ہکا بکا دیکھ کر پوچھا "کیا معاملہ ہے آپ کی آنکھوں میں آنسو کیسے؟"

بوڑھی عورت نے رو کر جواب دیا "زاہد فریب عورت تو نے میرے بیٹے کا کیا حال کر دیا ہے تجھے بیس ہزار کہاں سے دوں۔ وہ بستر مرگ پر پڑا ہے"

گل جان کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ مجروح شیرنی کی طرح اچھل کر بستر پر آئی "اور میرا پیارا اختر میرا لاڈلا اختر" کہکر طلبہ اختر سے لپٹ گئی۔ اسی لمحہ میں ماں بیٹیوں کو ان دونوں کے منہ سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسی ماں کے محبت بھرے بوسہ میں اس وقت سنائی دیا کرتی ہیں جب وہ اپنے ننھے بچے کو گود میں لے کر پیار کیا کرتی ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں سائبان میں چلی گئیں۔ اور دونوں کو گلجان کے منہ سے یہ الفاظ سنائی دیئے۔ اختر میں نے تجھ سے بیس ہزار کب مانگا ہیں تو ہمیشہ سے یہ کہہ رہی ہوں کہ مجھے تیرے ساتھ مفلسی میں بسر کر لینا منظور ہے۔ میں

نے تیری نادانی اور حماقت پر معافی دی۔ اماں نے بھی اجازت دیدی ہے۔ اب میں تیرے دروازے پر آپڑی ہوں خدا کے واسطے منہ سے بول سہائے لوگو دودھ دو۔ دودھ دو بلند اختر کی آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔

ماں بیٹیاں بھاگ کر بلند اختر کے سرہانے آئیں۔ نوجوان آدمی کا سر معشوقہ کے قریب اور محبت بھری آنکھوں کی نظروں سے چکرا گیا تھا۔ وہ مرنے والا نہ تھا اس نے آنکھ کھول کر تبسم سے ماں کی طرف دیکھا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولا "اماں اب مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میرے لئے جلدی دودھ لاؤ۔ گل جاں سہاگن گل جان میرے دین و ایمان کی مالک گل جان تو نے میری جان بچائی۔

اچونٹھواں باب

خوش نصیب آدمی

رات کے نو بجے ہونگے۔ مولوی شفیق احمد صاحب آنجہانی کی کوٹھی کا مکلف شاندار گول کمرہ جھاڑ فانوس اور جگمگا فرش فروش کی زیبائش سے جگمگا رہا تھا شاندار لیمپوں کی تیز برقی روشنی لانبی میز کی سفید کامدار چادر اور رنگ برنگ نقرئی بلوری برتنوں کے رنگ در رنگ میں جلوہ گستر ہو رہی تھی۔ خاص میز کے دونوں طرف خاص خاص معزز دین شریک دعوت تھے۔ ایک طرف امیر آدمی کا اکلوتا بیٹا فخر خانماں مسٹر رفیق احمد ننگے سر انگریزی لباس میں ڈٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر نوجوان پری چہرہ شکیلہ ہیرنگٹن زریں برقعے میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ کھانے کی میز پر کھلے ہوئے تھے اور اپنی دلفریب عریانی سے انسانی صنعت کے مذاق برق چمک دمک کو خفیف کئے دیتے تھے۔ شکیلہ ہیرنگٹن کے پاس ایک کرسی پر نوجوان خانہ سہ عزیز آجڑا ڈگر ٹے ٹھیپے کے کپڑوں میں حجابانہ کو شرم آب

کن انکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ سامنے مسٹر کامران بی اے سیاہ کشمیرے کا کوٹ و پتلون پہنے سنگے سر بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں طرف رفیق دیا رغار ہدایت علی ہندوستانی لباس پہنے سر پر عمامہ باندھے بیٹھا تھا کامران کے دائیں ہاتھ پر قصبہ بنگلور کا نوجوان سب انسپکٹر پولیس وردی میں لیس ہو بیٹھا تھا۔ سخاوت علی کے بائیں ہاتھ پر سوتیلا بھائی اور شیر محمد کا خانساماں علی الدین ایک پورانے کوٹ پتلون میں لپٹا بیٹھا تھا۔ مزہ دار کہانے کی قابیں آرہی تھیں۔ اور دو تین سفید پوش مستعد ملازم ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ میر گھرانے کی امیر دعوت پوری زیبائش اور آب و تاب سے جاری تھی۔ مہمانان مزے مزے سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ اور زیادہ تر تذکرہ کامران کی جولانیوں اور ذہانت طبع کی داد دے رہا تھا۔ درحقیقت یہ دعوت رفیق احمد نے اس غرض سے دی تھی۔ کہ کامران علی الدین سے واقف ہو کر کوئی بات ایسی دریافت کرے جس سے علی الدین کا دعویٰ اور قرابت رفیق احمد سے فسخ ہو جاوے۔ نصف گھنٹہ کے بعد دعوت ختم ہوئی۔ اور قہوہ کا دور شروع ہوا۔ جب حقہ اور پان لایا گیا۔ تو کامران نے ایک خوشبودار سگریٹ الٹا کر دل ہی دل سے رفیق احمد کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر پوچھا "تو مسٹر علی الدین آپ کے سوتیلے بھائی اور آپ کی نصف دولت کے حصہ دار ٹھہرتے ہیں"

رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے علی الدین کی طرف دیکھا۔ پھر جھوٹے تبسم سے کامران کی طرف منہ کر کے جواب دیا "جی ہاں" مسٹر علی الدین کے پاس میرے والد صاحب کا ایک خط ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کے دعاوی سچے ہیں"

کامران نے پیشانی پر بل ڈال لئے اور سخاوت علی نے بے چینی اور بے اعتباری سے علی الدین کی طرف دیکھا۔ کامران نے ادب اور تعظیم کی نگاہ علی الدین پر ڈالی۔ اور مسکرا کر بولا "مسٹر علی الدین میں مسٹر رفیق احمد کا خاندانی سرغرساں ہوں۔ کیا آپ مہربانی فرما کر وہ خط مجھے دکھلا سکیں گے"

علی الدین کا چہرہ سفید ہو گیا۔ مگر اس نے سنجیدہ لہجہ میں بسر و چشم کہا اور

جیب سے ایک بنڈل کاغذات کا نکال کر خط مستفسرہ کو تلاش کرنے لگا۔ دوسرے لمحہ میں اس نے ایک پرانا پوسٹ کارڈ کامران کے ہاتھ میں دیا۔ کامران نے مشتاق اور متجسس نگاہوں سے پوسٹ کارڈ پڑھنا شروع کیا۔ اور سب انسپکٹر سخاوت علی بھی اس پر جھک گیا۔ پوسٹ کارڈ کی تحریر حسب ذیل تھی۔

از روڑکی

محرم راز اور دل وجان سے پیاری

تمہارے خط سے برخوردار کی ولادت معلوم ہوئی۔ میں نے آج منی آرڈر کے ذریعہ سے سو روپیہ روانہ کر دیا ہے۔ میں ایک ہفتہ کے اندر نینی تال آؤنگا بچہ کا نام جو تم پسند کرو۔ رکھ لو۔ مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

فقط

مولوی شفیق احمد

کامران نے اس وقت پوسٹ کارڈ بڑے غور سے پڑھا۔ اور جیب سے خوشخط خوردبین نکال کر کئی منٹ تک پوسٹ کارڈ کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس اثنا میں اس نے روکی کی اور نینی تال کی مہریں اچھی طرح دیکھیں پھر بے چین اور خوفزدہ ہو کر بولا "مسٹر رفیق احمد یہ خط بالکل سچا ہے۔ اور میں پورے طور پر قائل ہوں کہ یہ آپکے والد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے آپ کے والد صاحب کا وصیت نامہ والا دستخط بلند اختر کی الماری میں بہت اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔ آپ مسٹر علی الدین کو اپنا بھائی تصور کریں۔"

اس وقت سخاوت علی نے پوسٹ کارڈ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ پھر وہ پوسٹ کارڈ ہدایت علی کے ہاتھوں سے گذر کر شکیلہ بیگم کے ہاتھ میں آیا جس نے سرسری طور سے دیکھ کر کہا "کس قدر پرانا خط ہے۔ زمانہ کس قدر جلدی گذر جاتا ہے۔" بالآخر پوسٹ کارڈ مذکور رفیق احمد کے سامنے آیا جس نے گو اسے پہلے ایک دفعہ دیکھا تھا۔ مگر انسانی دل ہمیشہ مذبذب اور پیاسا واقع ہوا ہے۔ کہ

اس کا تعجب اور اضطراب کسی پہلو کم ہونے میں نہیں آیا کرتا۔ رفیق احمد نے پوسٹ کارڈ کو خود بین سے کر دیکھا۔ پھر ہٹر کتے دل سے بولا "بہت اچھا میں مسٹر علی الدین کا دعویٰ تسلیم کرتا ہوں لیکن نصف روپیہ اس وقت مل سکتا ہے۔ کہ میں بینک کے روپیہ پر قابض ہو جاؤں"

علی الدین کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک خانساماں کے لیے پچاس ہزار روپیہ یک لخت پردہ غیب سے برآمد ہو جانا قارون کے خزانہ سے کم نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ اور دماغ کے سامنے بڑے بڑے محلات اور خوبصورت پریاں ناچتی ہوئیں آکھڑی ہوئیں۔ اس نے دھڑکتے اور بیقرار دل سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بہت اچھا کچھ جلدی نہیں"۔ اسی لمحہ میں اس نے پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا پڑھا کر اسے کانپتی ہوئی انگلیوں سے واپس لے لیا۔ اور اس بے قیمت فرسودہ پرزہ کاغذ کو لاکھوں روپے کے برابر قیمتی سمجھ کر بڑی احتیاط سے بنڈل میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا رفیق احمد نے لمبا سانس بھرا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اس کے والد کی عظیم الشان کوٹھی کو ایک گرز کے صدمہ سے دو پارہ کر دیا۔ اس کا سر چکرا گیا کاش اس لمحہ میں وہ خیال کرتا۔ کہ جو نازنین عورت اس وقت اس کے دائیں ہاتھ پر بیٹھی تھی۔ اس کے آرزو میں وہ اس کثیر دولت پر لات مار چکا تھا۔ اور اس کے لئے پچاس ہزار ایک پیسہ کے برابر وقعت بھی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن انسانی تغافل تھوڑی دیر کے لئے سب کائنات پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے۔ اور انسان کو صرف موجودہ مشکل یا تکلیف کا احساس ہوا کرتا ہے۔ وہ اس ادھیڑ عمر آدمی علی الدین کو اپنی دولت کا دشمن سمجھ رہا تھا۔ اور علی الدین رفیق احمد کے دلی ارادہ سے بے خبر اسے دنیا بھر کا سازشی اور مکار سمجھ کر ڈر رہا تھا۔ مبادا وہ اسے اس دولت کثیر سے محروم رکھنے کے لئے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دے۔ دراصل انسان کے خیالات عجیب و غریب دھوکے باز آئینے ہیں۔ کبھی تو یہ کوسوں دور کی خبر پڑھ لیتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے دل سے ایک ہی کوٹھڑی کے اندر بے خبر رہتے ہیں۔ واقعی اگر کون و مکان

کا مالک انسان کے دلوں پر بے خبری اور لاعلمی کا پردہ نہ ڈالتا۔ تو دنیا میں ذرا ذرا سی باتوں پہ جنگ وجدل ہوا کرتی۔ یہ دونوں آدمی ایک ہی باپ ایک ہی خون کے ناچیز پتلے ایک دوسرے کو نظر استعجاب اور بے اعتباری سے دیکھ رہے تھے۔ ادھر کامران ان دونوں کے دلی اضطراب سے کچھ کچھ واقف ہو رہا تھا۔ اسی لمحہ میں وہ چلا کر بولا "لیکن مسٹر علی الدین" آپ کو قانوناً ابھی ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑیگا۔ آپ کوئی کاغذ یا گواہ ایسا پیش کیجئے۔ کہ جس کی صداقت پر عدالت آپ کی والدہ صاحبہ کے نکاح سے باخبر ہو کر آپ کی ولادت کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ کیا معلوم آپ کی والدہ صاحبہ نے مولوی شفیق احمد صاحب سے نکاح کیا تھا یا نہیں یا محض آپ کو متبنےٰ کر لیا ہو"

اس کلمہ پر سب انسپکٹر اور جملہ حاضرین نے کامران کی ذہانت اور حاضر جوابی پر دل کی دھڑکن سے داد دی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تمام کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

علی الدین کی آنکھوں میں بے چینی اور غصہ ظاہر ہوا۔ اور اس نے خشم ناک نگاہ سے کامران کو جہانک کر جواب دیا "مسٹر سراغرسان آپ کے دماغ میں ذہانت تو آئی ہے لیکن آپ مطمئن رہیں جس شخص نے میری والدہ کا نکاح پڑھا تھا وہ ابھی زندہ ہے۔ اگرچہ اس کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ اور وہ لب گور ہو چکا ہے۔ دوسرے میری والدہ کی دایہ یا قابلہ ہنوز حیات ہے۔ اور میرے پاس مولوی شفیق احمد صاحب کی ایک تصویر ہے جس کے نیچے صاف طور سے شفیق احمد صاحب مدرس کا دستخط موجود ہے۔

کامران کا کلیجہ اچھل پڑا۔ اور اس نے جھوٹے تبسم سے رفیق احمد کو جہانک کر جواب دیا "مسٹر علی الدین اگر آپ سچے ہیں۔ اس تصویر کو ساتھ لائے ہونگے لائیے دکھلائیے۔ علی الدین نے کانپتی ہوئی انگلیوں اور غصہ بھرے دل سے اپنی جیب سے کاغذات کا بنڈل باہر نکالا۔ اور اسی لمحہ میں ایک موٹے کاغذ کا فوٹو کامران کی طرف

پھینکدیا۔ سب لوگ کھڑے ہوکر اس تصویر پر جھک گئے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں خاموشی اور مرگ آسا حیرت طاری رہی۔ پھر سب سے پہلے رفیق احمد کی زبان ہلی جس نے دھڑکتے دل سے یہ کلمہ نکالا "مسٹر کامران یہ شبیہ میرے والد کی ہے۔ میری الماری میں والد صاحب مرحوم کی زمانہ شباب کی تصویر موجود ہے جو بالکل اسی فوٹو گرافر کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔ اب شبہ کرنیکا مطلق موقعہ نہیں" شکیلہ ہیرنگٹن نے بھی تصویر کو بغور دیکھا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی "رفیق تم بالکل اپنے والد صاحب کی صورت ہو۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ تمہارے ڈاڑھی نہیں اور تمہارے والد صاحب نوعمری میں بھی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ پھر تنظر بھری آنکھوں سے علی الدین کی طرف دیکھ کر بولی "مسٹر علی الدین آپ کی صورت مولوی شفیق احمد سے بالکل نہیں ملتی"

رفیق احمد کا دل اچھل پڑا۔ اور اس نے شکیلہ کی طرف منت اور عجز سے دیکھ کر کہا۔ پیاری شکیلہ میرے بہائی کی شان میں ایسا کلمہ نہ نکالو۔ میں پورے طور پر یقین مند ہوگیا ہوں۔ کہ وہ میرے والد صاحب کا لڑکا ہے۔ بہت سے آدمی اپنی والدہ کی صورت پر ہوتے ہیں۔

شکیلہ ہیرنگٹن کے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ اور وہ دھڑکتے دل سے کرسی پر بیٹھکر اپنی نامعقول تقریر پر شرمندہ ہونے لگی۔ کامران نے بار دیگر تصویر کو دیکھا۔ اور مصنوعی مسکراہٹ سے رفیق احمد کو دیکھ کر بولا "آپ کے والد صاحب کا دستخط بڑا خوشنما ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ہی طرح کا دستخط کرتے آئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ میں نے اس دستخط میں پچھلی مرتبہ بڑی بھاری کامیابی حاصل کی۔ پھر اس کا خیال اس کمرہ میں پہونچگیا جہاں اس نے بلند اختر کے کمرہ کی انگیٹھی میں سوختہ کاغذات کے اندر سے وہ پرزہ پایا تھا۔ اسکے دستخط نے اسے کامیابی کے زینہ پر چڑھا دیا تھا۔ رفیق احمد نے تصویر علی الدین کے ہاتھ میں دیدی۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھائی صاحب آپ مطمئن رہیں۔ آپ کو پچاس ہزار ملینگے لیکن یہاں روکر کی میں اس معاملہ کا چرچا نہ کیجئے گا" رفیق احمد کے منہ سے ابھی یہ

کلمہ پورے طور پر ختم نہ ہوا تھا کہ ایک خدمت گار لپکا ہوا آیا اور رفیق احمد کے سامنے ایک نقرئی پلیٹ پر ایک تار پیش کیا۔ سب آدمیوں کی نظر اس پلیٹ پر پڑ گئی۔ تھوڑی دیر کیلئے سب خاموش ہو گئے۔ رفیق احمد نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے تار کی رسید پر دستخط کر کے تار کھولا اور ایک لمحہ بعد پسینہ آلود پیشانی سے شکیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تیری تعیناتی ہو گئی ڈپٹی کلکٹری مل گئی ضلع بجنور کو جانا پڑیگا۔ لیکن تار کا ایک فقرہ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنے والد کی یادداشت یا جنم پتری سے ٹھیک عمر فوراً لکھو۔ ڈائرکٹری سارٹیفکٹ نا مکمل ہے۔"

کامران نے اچھلتے ہوئے دل سے فوراً کچھ جواب دینا چاہا مگر سخاوت علی نے مسکرا کر کہا "ہنود کے لئے جنم پتری درکار ہوتی ہے آپ کے پاس کوئی کاغذ یا تحریر آپ کے والد صاحب کی ہوگی جس میں آپ کی تاریخ ولادت درج ہو اس کاغذ کو تلاش کر کے بھیجا دیجئے۔" سمجھ گیا۔ سمجھ گیا" رفیق احمد کے منہ سے نکلا مگر وہ اس قدر جلد ڈپٹی کلکٹر ہو جانے سے گھبرایا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر تک اسے مہمانوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ معلوم ہوئی۔ شکیلہ میز نگشن نے اجازت روانگی مانگی کامران نے اسے آصف نگر تک پہنچا دینے کی مستعدی ظاہر کی اور مہمانان رخصت ہونے لگے۔

پینسٹھواں باب

امانت میں خیانت

اگلی صبح کو مولوی شفیق احمد کا خوش نصیب قابل بیٹا غیر مطمئن اور مضطرب دل سے اٹھا اس سے بڑی کامیابی اس کے لئے کیا ہو سکتی تھی کہ آسے بیٹھے بٹھائے

ڈپٹی کلکٹری مل جاوے لیکن جس چیز کی بڑی بھاری آرزو ہوتی ہے اس کی ذمہ داریاں اور تردوات بھی گراں بار ہوتے ہیں یہ ناتجربہ کار نوجوان گورنمنٹ کی ملازمت اور اسکی انجام دہی سے بالکل نابلد تھا۔ اب تک ساری عمر آزادی تمول اور بے فکری سے گذری تھی۔ اب اسے دوسرے آدمیوں کی ماتحتی اور خلامی کے واسطے تیار ہونا پڑیگا۔ گھر پر بیسیوں نوکر چاکر والدین دن رات اس کی محبت اور آرام دہی کا دم بھرتے تھے اب اُسے خود دوسروں کے خوش رکھنے اور کارمفوضہ خوش اسلوبی سے انجام دینے میں محبت اور تن دہی سے کام لینا پڑیگا۔ باپ کی عظیم الشان کوٹھی اُس کا پایہ تخت بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر سے اپنے مشاغل اور آرام طلبی کے احکامات صادر کیا کرتا تھا۔ اب اُسے دوسروں کے احکامات کی تعمیل میں آزادی اور اوقات فروخت کر ڈالنے پڑینگے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے معزز اور خاندانی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن گورنمنٹ کے محکمہ جات میں خاندانی اعزاز اور وجاہت ظاہری و باطنی چنداں وقیع نہیں سمجھی جاتی صرف فرائض کی انجام دہی پر جملہ اعزازات کا قیام بحال رہتا ہے اور فرائض کے دشوار گذار راستہ میں ایک ہی ٹھوکر لگ جانے سے امیدوں اور توقعات کا شیرازہ بکھر جاتا ہے نوکری یا ترقی کے بے رحمی تنزلی یا علیحدگی کا سامان کھڑا ہو جاتا ہے۔ نوجوان قابل ضرور تھا خدا نے اُسے دل و دماغ اور عمدہ صحت عطا فرمائی تھی مگر وہ اس وقت اپنی ساری قابلیت اور ذہنی رسائی کو تھیلی پر رکھ کر امتحان دینے جا رہا تھا مگر وہ اس امتحان میں ناکامیاب رہا تو اس کی ساری زعم اور امنگوں کی جڑ کٹ جاویگی اور وہ دنیا کی آنکھوں میں ہمیشہ کیلئے ذلیل ہو جاوے گا کیا اس نے نوکری کی مشکلات اور تردوات کی رام کہانیاں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے نہیں سنی تھیں کیا اُس نے ہندو مسلمانوں کے تعصب کے بکھیڑے اخبارات میں نہیں پڑھے تھے کیا وہ افسروں کی تعدی اور بے انصافی سے ڈرا ہوا نہیں تھا اصلیت یہ ہے کہ نوکری کی آرزو اس نوجوان مجرد آدمی کی خواہش اور امنگوں کے برابر نہیں

ہے جو ایک باکرہ لڑکی کو زوجیت میں کھینچنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ جب یہ لڑکی اسکی زوجہ بن جاتی ہے وہ اُسے بتدریج طوق آہنی سمجھنے لگتا ہے وہ لمبی رات کے کئی گھنٹوں میں نوکری کے پیچیدہ مصائب اور ذمہ داریوں پر غور کرتا رہا تھا۔ اور بار بار اپنی والدہ سے مشورہ لیتا تھا اس کی والدہ منت سماجت کرتی تھی ہر پہلو سے سمجھاتی تھی بیٹا نوکری کو مت جا میں تیرے بغیر بے کل ہو جاؤنگی باپ کے گھر کا کارخانہ سب درہم برہم ہو جاوے گا۔ تجھے میرا پانچسو روپیہ ماہوار کافی ہے" لیکن وہ بڑی ناراضی اور خلجان کے ساتھ ہر بار یہی جواب دیتا تھا میں والد صاحب کے روپے سے بالکل دست بردار ہو گیا ہوں اب تمہاری آمدنی سے مجھے کیا سروکار علاوہ ازیں مجھے تشکیلہ بیرنگٹن جیسی امیر نازپرورہ لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ ملازمت بغیر چارہ نہیں کیا کروں کیا نہ کروں؟" وہ بڑی دیر گئے بستر پر گیا تھا اور گھنٹوں نیند نہ آئی تھی علی الصباح اس نے ضروریات سے فراغت پاکر اپنے اعزہ و اقربا اور دوست اور احباب کو خطوط لکھنے شروع کئے اور سب سے بطور مشورہ دریافت کیا آیا وہ نوکری کو خوش آمدید کہیں یا نہ کہیں لیکن اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ فی زمانہ ڈپٹی کلکٹری جیسی نوکری کو کون برا کہہ سکتا ہے یا کسی کو اس کے خاندانی جھگڑوں یا عاشقانہ ضروریات کا کیا علم تھا ان جملہ افکارات سے اسے اپنے بدن میں ایک قسم کا انتشار معلوم ہوتا تھا جس سے اس کا دماغ قابو میں نہیں تھا اور اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جسم صورت شکل اور عمر میں تو اتنا ہی ہے جتنا کل تھا مگر اُس کے جسم کو کسی چیز نے ایسا دبا دیا ہے کہ ہر عضو معطل اور گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے اسے ذرا ذرا سے کام میں پریشانی اور الجھن معلوم ہوتی تھی پھر اُس نے اپنی ضروری چیزوں کی فہرست تیار کی جو وہ اپنے ساتھ لیجاویگا۔ بعد ازاں والدہ کے مشورے سے اپنے ساتھ چند نوکر اور ایک ٹرنک لیجانے کی تیاری کرنے لگا اس شغلہ میں دس بج گئے اور ڈاک کی سیکنڈ ڈلیوری (آمد) میں اس کے نام ہز آنر کے دفتر کا باضابطہ حکم اس مضمون کا موصول ہوا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر

صاحب مجسٹریٹ دکھلائے منصب بجنور کی عدالت میں حاضر ہو اور اپنی شریک عدالت کے خلاف اپنے والد کی تعریف یا جنم پتری فی الفور دا نہ کرے۔

اس حکم کے سنتے ہی اس کے ہوش حواس باختہ ہو گئے۔ اسسٹنٹ کلکٹر کے باضابطہ اور حاکمانہ الفاظ سے اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ بہت عرصہ سے گورنمنٹ کا نوکر ہے۔ اور اسے ایک ہفتہ کے اندر بلا تامل وچون وچرا بجوز جانا پڑیگا فی الفور گفت اور کانپتے ہوئے ڈاکٹ کے منشا پر غور کرتا رہا۔ پھر ہکا بکا اپنی والدہ کے پاس آکر بولا۔ اماں رات میں نے آپ سے جنم پتری کا ذکر کیا تھا۔ کیا والد صاحب نے میری تاریخ پیدائش درج کر لی تھی۔ کہاں تلاش کروں۔ اس کی والدہ نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا۔ "عربی مہینوں کے حساب سے تیری عمر چوبیس سال کی ہے۔ اللہ رکھے۔ ابھی بقرعید کو جو دھواں سال شروع ہوا ہے تیرے والد نے تیری پیدائش کی تاریخ ضرور لکھی ہوگی۔ لیکن مجھے انگریزی مہینہ اور سال بالکل یاد نہیں۔ اپنے والد صاحب کی کتابوں میں تلاش کرو۔ میں اپنی کتب اور ردی کے کاغذات میں دیکھتی ہوں۔

"رفیق احمد بہت اچھا کہہ کر اپنے والد صاحب کی لائبریری میں آیا۔ اور قفل کھول کر گرد آلودہ ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے شرقی دروازہ جھٹ پٹ کھول دیا۔ جس کے اندر سے برآمدہ کی دھوپ اندر داخل ہوئی۔ اور بدبودار ہواؤں کی جگہ صاف ہوائیں ادھر ادھر سے داخل ہونے لگیں۔ پھر اس نے سر اٹھا کر تین لبریز الماریوں کی طرف دیکھا۔ جس کے اندر ہزارہا کتب مجلد رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس قدر کتب کی چہار بین کس طرح کرتا۔ اس نے ایک نوکر کو آواز دے کر اپنے بوڑھے کارندہ کو بلایا۔ اور اسے ایک کرسی جھلا کر بولا۔ "منشی حسین بخش صاحب مجھے اپنی پیدائش کی تاریخ درکار ہے۔ صاحب لفٹنٹ گورنر نے اس عہدہ ڈپٹی کلکٹری کے واسطے مانگی ہے۔ کچھ کتابیں میں دیکھتا ہوں۔ کچھ آپ دیکھئے۔ بوڑھے کارندہ نے سکڑے پڑے ہوئے چہرہ اور پژمردہ چشمہ لگی ہوئی آنکھوں سے نوجوان

رئیس کی علمیت ادب سے دیکھ کر۔ بہت اچھا" کہا۔ اور رفیق احمد نے تینوں الماریوں کے قفل کھول دیئے۔ رفیق احمد اور بوڑھا کارندہ کامل دو گھنٹہ مختلف کتب کی جلدیں اور اوراق دیکھتے رہے۔ سب کتابیں علم حدیث، دینیات، فقہ، تصوف یا وعظ و تلقین سے متعلق تھیں۔ اور دنیا بھر کے علما اور مشاہیر کے مواعظ کا جوہر ان الماریوں میں بھرا پڑا تھا سینکڑوں جلد قلمی ہزارہا مطبوعہ نہیں۔ اور بعض بعض نسخے ایسے قیمتی اور انمول تھے۔ کہ یورپ کے محققین لاکھوں روپے بدلے خرید لیتے سینکڑوں جلدیں علم حکمت کے متعلق زبان فارسی میں تھیں۔ فی الجملہ مولوی شفیق احمد صاحب غضنفر کے علم دوست اور عالم متبحر تھے۔ کیا عجب جو انہوں نے بیٹے کو بی۔ اے پاس کرا کر اور ممالک غیر میں مجتہد بننے کے لئے تیار کیا ہو۔ اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ بینک کا ایک لاکھ روپیہ محض اس نیت سے چھوڑا ہو۔ کہ رفیق دوسرے ممالک میں جا کر وعظ و تلقین کرے۔ اور یہود و نصاریٰ کو جو ہر زبان کی طاقت سے مشرف باسلام کرے مگر انسان ہمیشہ تدبیریں لڑایا کرتا ہے۔ اور قسمت قہقہہ لگایا کرتی ہے ایسی زاہد متقی کا بیٹا مسائل دینیات سے یہی اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ اور ڈاڑھی منڈانا اور انگریزوں کے ساتھ ان ہی کے برتنوں میں کھانا کھانا عین بزرگی اور شرافت کی نشانی سمجھتا تھا "ومن تشبہ بقوم الخ" کا مطلق قائل نہ تھا۔ بارے جب رفیق احمد اور بوڑھے کارندہ نے ہزارہا کتب کی ورق گردانی کر لی۔ اور لائبریری کے فرش پر چاروں طرف کتابیں بکھر گئیں۔ تو ایک ماما نے اندر سے آکر کہا "سرکار کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔ بیگم صاحب جھلا رہی ہیں"

رفیق احمد نے پریشان آنکھوں سے کارندہ کی طرف دیکھا۔ اور ہاتھوں کی گرد میز پر جھاڑ کر بولا "شیخ جی آپ کے لئے کھانا بھیجتا ہوں۔ آپ نوکروں کو حکم دیجئے۔ کہ ان کتب کو ہوشیاری سے دھوپ دیویں۔ آج ان سب الماریوں کی کتابیں سوکھ جاویں گی۔ اور کمرہ مکمل طور پر صاف ہو سکے گا" بہت اچھا حضور" بوڑھے کارندہ کے منہ سے نکلا۔ اور پانچ منٹ بعد بوڑھا کارندہ دوسرے کمرہ میں نوکروں کی طرف

ہاتھ بڑھا کر بولا "کتابیں جلدی جلدی باہر ڈالو۔ ایک بڑی حاجم بھالو۔ اگر ایک کتاب بھی چوری گئی۔ تو خون پی لونگا"

یہ کتب لوگروں کے کام کی نہیں تھیں۔ بہرحال انہوں نے چابکدستی سے کتابیں باہر ڈالدیں۔ اور ایک آدھ خرد برد بھی کرلی۔ وہاں کیا حساب تھا۔ نہ کوئی نمبر درج تھا۔ اور نہ کوئی فہرست نصف گھنٹہ کے بعد رفیق احمد کہانے سے فارغ ہوکر دراننشش والیس آیا۔ اور کارندہ کو تبسم سے دیکھ کر بولا "واہ شیخ جی ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے" بوڑھے کارندے کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے کہانے سے ہاتھ کھینچکر کہا حضور دانت نہیں چلتے۔ مگر میں فارغ ہوگیا ہوں"

رفیق احمد نے شرمندہ ہوکر دیوار کی طرف دیکھا۔ اور گھبرا کر بولا "بہت اچھا آپ گھبرایئے نہیں۔ خوب سیر ہوجایئے۔ پانچ منٹ بعد یہ دونوں پھر کتابوں کی جہان بینی میں لگ گئے۔ اور ایک باقیماندہ الماری کی کتب نکالیں۔ ان کتب میں کئی بے بطر نمونے کلام مجید اور حمائل شریف کے نکلے۔ طرح طرح کے شکستہ اور طغرائی خط کے قلمی اور مضبوط نمونے مجلد کتابوں میں برآمد ہوئے لیکن جس تحریر کی ضرورت تھی۔ وہ عنقا بن کر اڑ گئی تھی۔ رفیق احمد کی تاریخ پیدائش پر کوئی تحریر روشنی ڈالنے والی نہ تھی۔ وہ گھنٹہ کامل کی محنت اور تجسس کے بعد تیسری الماری بھی خالی ہوگئی۔ اور اس کی جملہ کتب نوکر لوگ ادب اور تعظیم سے اللہ اللہ بڑے سرکار کی بڑی شان تھی" کہہ کر باہر لے گئے۔ اور یہ سمجھ کر کہ چھوٹی سرکار اب ان کی جگہ انگریزی کی کتب بھریں گے۔ دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ آیا سب مذہبی کتب نیلام پر چڑھا دی جاوینگی یا کیا ہوگا۔ جملہ کتب کے باہر پہنچ جانے پر رفیق احمد نے بھاری الماریوں کے باہر پہنچانے کا حکم دیا۔ حکم دیتے ہیں۔ نوکر مزدور وغیرہ دم کے دم میں اندر بلائے گئے۔ اور باہتھوں کو جھاڑ کر الماریاں ڈکانے لگے۔ بھاری مضبوط اور اساپ بڑی ہوئی الماریوں کے پیچھے بکثرت جالے تنے ہوئے تھے۔ پہلی الماری جب اپنی جگہ سے علیحدہ ہوئی۔ تو رفیق احمد کو اس کے پیچھے کوئی چیز گری ہوئی معلوم دی الماری کے

ہٹ جانے پر اس کے نیچے بکثرت گرد اور چوہوں کے سوراخ نکلے۔ اور رفیق احمد نے اس چیز پر نظر ڈالی۔ جو الماری کی پشت سے گری تھی۔ اسی لمحہ میں اس نے اپنے ناک کو بدبو سے بچا کر اس چیز پر ہاتھ بڑھایا۔ اور اسے ایک مجلد بہت چھوٹی حمائل نظر پڑی جس کے اوپر کا چمڑا چوہوں نے کاٹ ڈالا تھا۔ رفیق احمد نے حمائل کو نظر تفتیش سے دیکھ کر ایک رومال سے جھاڑا۔ اور اس وقت اسے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اسی زنانہ میں اس کے اوپر ایک ریشمی مطلا جزدان تھا۔ اس نے اس فرسودہ اور بوسیدہ جزدان کو پھینکدیا۔ اور اس کے اندر سے منقش مگر موش خوردہ حمائل نکل پڑی۔ رفیق احمد نے معمولی بے پرواہی سے اس حمائل کا پٹھا کھولا۔ اور جلد کے اندر اسے ایک خط رکھا ہوا ملا۔ اس نے سمجھا۔ شاید کوئی بات اس کی پیدائش کے متعلق معلوم ہو۔ اس نے اس فرسودہ سفید کاغذ کے خط پر آنکھیں جھکا دیں لیکن اس خط کے ہر لفظ پر اسکا دل دھڑکتا گیا۔ اور آنکھیں کھلتی گئیں۔ یہاں تک کہ جب اس نے سارا خط ختم کر لیا۔ تو اسے سارا کمرہ گھومتا ہوا معلوم دیا۔ اور وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا۔ کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ اسے صرف اس بات کا علم تھا۔ کہ اس نے کوئی متوحش اور ڈراونی خبر پڑھی ہے اور اسے اس خبر کی معانی اور مطالب کا اپنے دماغ پر اس قدر اثر معلوم ہوا۔ کہ وہ اس کے منشا کو آواز غیب سمجھ کر ڈر گیا۔ اس کے کانوں میں شاں شاں کی آوازیں نکلیں اور اسے اپنے سے پانچ گز کے فاصلے پر بوڑھے کارندہ کی صورت تبدیل شدہ معلوم ہوئی وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس خط کو بار دیگر پڑھنے لگا خط کسی قدر بھدا اور بے ربط عبارت میں تھا۔ اور کچی سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔

از بردوان بکلم تمبر ۱۸۰۰ء

قبلہ کونین کعبہ دارین حضرت پیر طریقت و مرشد دینی و دنیوی جناب مولوی شفیق احمد صاحب مدظلہ تعالے۔

پس از بجا آوری کورنشات بے پایاں۔ عرض نگار ہوں۔ کہ میں اس وقت اپنے نرسنگ پر پڑا ہوں اور [illegible] سے سخت بیمار ہو گیا ہے جس سے جانبری کی

امید نہیں معلوم نہیں یہ عریضہ حضور کی خدمت میں کب پہنچے گا۔ شاید میں اس وقت تک زندہ نہ ہوں۔ بہرحال ایک خاص آدمی کے ہاتھ اس واسطے بھیج رہا ہوں کہ آپ کی خدمت میں آج پہنچ جاوے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو بہ طریقت سمجھا ہے اور اب مرتے وقت بھی آپ ہی پر بھروسہ ہے۔ اگر میں مرجاؤں۔ تو دعائے مغفرت سے محروم نہ رکھئے گا۔ اس خط کے بھیجنے کی صرف اس وجہ سے ضرورت لاحق ہوئی۔ کہ میں ایک بھاری کام حضور پر چھوڑتا ہوں۔ آپ کو میری چارپائی کے نیچے زمین کے اندر ایک بڑا لوہے کا صندوق ملیگا جس میں میں نے اپنی ساری عمر کی کمائی ٹھیکیداری کی مدفون کر رکھی ہے۔ میری بیوی دو سال گذرے جیسا حضور کو معلوم ہے انتقال کر گئی تھی۔ میری لڑکی غریبہ خاتون میرے پاس ہے۔ آپ خدا کے لئے جلدی آویں۔ اور اس روپیہ پر قبضہ کرلیں۔ صندوق کے اندر اشرفیاں ہیں۔ اور کل روپیہ گنتی میں ایک لاکھ روپیہ سے کم نہیں۔ آپ اس میرے باورچی وغیرہ سے اس معاملہ کو مخفی رکھیں۔ اور اس رقم کو کسی بینک میں جمع کردیں۔ میرے بھتیجے اور بھانجوں کو اگر خبر ہوگئی۔ تو غریبہ کا گلا گھونٹ دیں گے آپ اسے اپنے پاس رکھکر پرورش کریں۔ مجھے اس سے زیادہ کبھی خوشی نہ ہوگی۔ کہ اپنی قبر سے اپنی لاڈلی غریبہ خاتون کو صاحبزادہ رفیق احمد کی زوجہ دیکھوں۔ زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں۔ غریبہ خاتون کی عمر اس وقت تین سال اور کچھ مہینے کی ہے۔

آپ کا ادنےٰ غلام صادق علی"۔

رفیق احمد نے اس خط کو تین چار مرتبہ پڑھا۔ اور ہر مرتبہ اس کے دماغ کا اضطراب اور پریشانی بڑھتی گئی۔ اس نے فق شدہ آنکھوں سے بوڑھے کارندہ کو باہر بھیجدیا کیونکہ وہ گھور گھور کر رفیق احمد کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ اس خط میں کیا لکھا ہے کس کا ہے۔ رفیق احمد نے بوڑھے کارندہ کے چلے جانے پر لمبا سانس بھرا اور دھڑکتے دل سے بولا" اس عجیب و غریب خط کا کیا مطلب ہے "غریب خاتون" ایک لاکھ روپیہ میں نے والد سے کبھی اس عورت کا نام نہیں سنا لیکن یہ روپیہ کہاں گیا" وہ سر پر ٹوپی رکھکر والد کے پاس چلا گیا۔ جو اس وقت نماز ظہر سے فارغ ہو رہے تھے۔ اور اس کی دعا

ختم ہونے پر آہستہ سے بولا "اماں مجھے آپ سے نہایت ضروری کام ہے۔ اور تخلیہ چاہتا ہوں"

رفیق احمد کی فق شدہ رنگت اور پسینہ بھرے چہرے سے عزیزہ خاتوں کا دل دہل گیا اور وہ الٰہی خیر۔ دونوں جہان کے مالک خیر کہہ کر کھڑی ہوگئی۔ اور دھڑکتے دل سے مری ہوئی زبان کو ہلا کر بولی۔ بیٹا کیا ہے۔ تمہاری صورت پر وحشت برس رہی ہے"

رفیق احمد نے رومال سے پسینہ پونچھ کر کہا "اماں غضب ہوگیا جلدی اوپر چلیئے" بڑھی عزیزہ خاتوں بیٹے کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھ گئی۔ بچے کے والدین میں ایک ماما نرکاری کرتی تھی دوسری مصالحہ پیس رہی تھی۔ ماماؤں کو رفیق احمد کے فق شدہ چہرہ پر ترس آیا اور یہ سمجھ کر کہ امیر باپ کا لاڈلا بیٹا لاکری کی خبر سے پریشان ہو رہا ہے۔ انہوں نے ماں کی ممتا کا خیال کر کے دل میں رنج کیا۔ بیچاری عورتوں کا دل ہی کیا ہوتا ہے اور جن عورتوں نے ساری عمر غلامی اور نازبرداری میں بسر کی ہو۔ ان کے دل سے خیال کہاں سے لاویں۔ رفیق احمد اوپر کے کمرہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی والدہ کو نماز کی قالین دار چوکی پر بٹھلا کر ہانپتا ہوا بولا "اماں صادق علی کون شخص تھا۔ کیا آپ اس کی بیٹی عزیزہ خاتون سے واقف ہیں۔

بوڑھی عورت کی آنکھوں میں مردنی چھاگئی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہوگئے اور اس نے دھڑکتے دل کو سنبھال کر جواب دیا "نا بھائی ہیں ان دونوں میں سے کسی کو نہیں جانتی۔ کیوں خیریت۔ کیا معاملہ ہے"

رفیق احمد نے جھلا کر کہا "خیریت میں سمجھتا ہوں۔ کہ بڑا غضب ہوگیا۔ یہ جو آپ اپنے گھر کے بڑے ٹھاٹھ اور پانچسو روپیہ ماہوار کی آمدنی دیکھ رہی ہو۔ اب چشم زدن میں اڑ جاویگی۔ ابا نے کسی شخص صادق علی کا ایک لاکھ روپیہ مار لیا۔ اس سخت اور بے رحم کلمہ سے بڑھی عورت کی روح کانپ گئی۔ اور وہ اپنے متوفی اور زاہد و متقی محرم راز اور معزز شوہر کی شان میں ایسی ذلت اور سختی کے الفاظ سنکر آپے سے باہر ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں تاریکی پھیل گئی۔ اور وہ چکرا کر دھاڑ سے

نشستہ فرش پر گری۔ رفیق احمد نے کانپ کر ماں کو فرش سے اٹھایا۔ اور اسے کرسی پر بٹھلا کر بولا اماں آپ کو بڑا صدمہ پہنچا۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں لیکن آپ کے سوائے نچھاور ہی کیا تھا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے صادق علی کا خط نکال کر ماں کے ہاتھ میں دیا۔ مگر اس کے ہوش و حواس معطل ہو رہے تھے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا رفیق احمد تم مجھے کیوں ستاتا ہے۔ سب معاملہ خود کیوں نہیں سنا دیتا۔ رفیق احمد نے صادق علی کا خط لفظ بلفظ سنا دیا۔ اور بوڑھی عورت کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ دیوانوں کی طرح اس خط کو سنتی رہی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ چاروں طرف شور محشر بپا ہو رہا ہے اور ہزاروں آدمی چلا رہے ہیں نکلو بھاگو یہ گھر تمہارا نہیں ہے۔

خط کے ختم ہونے پر عزیزہ خاتون نے دہشت سی چیخ ماری۔ اور اس کی آنکھوں سے ایسی دہشت اور بے بسی ہویدا ہوئی جیسی ذبح ہونے والی بکری کی آنکھوں میں دکھائی دیا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بوڑھی عورت کو تمام کمرہ گھومتا ہوا معلوم دیا۔ اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا سانس رک گیا اور اسے ایسا معلوم دیا کہ کوئی شخص گلا گھونٹ رہا ہے۔ اور اس کا پیشاب خطا ہونے کو ہے۔ نوجوان رفیق احمد والدہ کی یہ حالت دیکھکر گھبرا گیا۔ اور ماں کا سر پکڑ کر بولا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کا غم میرے دل کے ساتھ ہے۔ اگر یہ سب دولت صادق علی کی ہے اسی کی بیٹی کو مبارک ہے۔ مجھے کیا بات ہے میں مزدوری کروں گا اور آپ کو اپنے سر آنکھوں پہ بٹھلاؤں گا۔ صرف باپ کی عزت کا ڈر ہے آہ بدنصیب باپ جھوٹے ریاکار باپ تیری عزت۔ تیری عزت میں تیری عزت پر جان دے دوں گا۔

اور یہ کہکر اس نے فرط جوش میں ماں کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور ماں بیٹوں کے آنسو جاری ہو گئے۔ بوڑھی عورت کی آنکھوں سے آنسو پٹ پٹ گرنے لگے۔ اور وہ بچوں کی طرح بے بس ہو کر بولی۔ رفیق احمد میں تیرے والد کو ہر روز خواب میں دیکھتی ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کھڑے ہوئے رو رہے ہیں ہائے اس شخص نے ان کے ہاتھ یہ روپیہ کیوں دیا تھا۔ یا الٰہی میرا دم نکل جاتا ہے میں کیا کروں بیٹا جلدی بینک

کے روپیہ پر قبضہ کر کے سادی دولت اس لڑکی کے پاس پہنچا دی"

رفیق احمد نے آنسو پونچھکر جواب دیا۔ لڑکی کے پاس روپیہ کہاں سے پہنچاؤں مجھے اس کا پتہ ہی معلوم نہیں علاوہ ازیں جب مجھے شکیلہ ہرنگٹن سے خلاف مرضی بزعم خود بالجبر شادی کرنی ہے۔ تو اس روپیہ پر کس طرح قبضہ کروں۔ ہائے شکیلہ کیا کروں۔ تو کتنی مجھ نہیں نامی چوری محبت نے مجھے دین دنیا سے بے خبر کر دیا کیا کیا کروں کیا نہ کروں۔ مگر ہائے ضمیر! باپ کی عزت و ناموس میں تیری عزت پر بھی دیر ہو گا۔ اور تھوڑی دیر کیلئے دونوں ماں بیٹوں کی آنکھوں سے آنسو پھر جاری ہو گئے۔"

چھیاسٹھواں باب

شبہات اور ثبوت

رفیق احمد اپنی والدہ مضطرب بے بس اور مایوس غم خوردہ عورت کے پاس سے سوچ اور پریشان خیالات کے ساتھ رخصت ہوا۔ اور اپنی عالیشان کوٹھی کے گول کمرہ میں آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کا دماغ قابو میں نہیں تھا۔ اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے صرف دو چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک غریبہ عائشہ کا نام دوسری ایک لاکھ کی رقم کثیر یہ بالکل درست ہے۔ کہ غیر متوقع حملے نے اسے تھوڑی دیر کے لئے گہرے شبہات کی پیدائش سے باپ مقدس اور متشرع خدا پرست آدمی کی طرف سے بالکل بے اعتبار کر دیا تھا۔ اور وہ اس بوڑھے معزز آدمی کو جس کی دولت اور شہرت کے جگمگاتے محل اور جس کے رسوخ اعتبار اور وجاہت سے اسے عزت کی کرسی پر بیٹھ جانے کو جگہ ملی تھی۔ ریاکار دنیادار اور بے ایمان سمجھ رہا تھا لیکن رفیق احمد نے بہت باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ اور اس کا دماغ بھی فطرتاً سمجھ دار واقع ہوا تھا اس کے دل میں [illegible] یا ذاتی تعصب نام کو نہ تھا۔ وہ ہر [illegible] اور [illegible] کا عادی

اور دنیا کی ناتجربہ کاری کے سبب سے ابھی تک اس کا دل اس نوخیز دریا کی طرح تھا جو اپنے راستہ کے تذبذب اور خمدار پیچیدگی یا نشیب و فراز سے ناواقف ہو کر ادھر اُدھر منڈلاتا پھر رہا ہو۔ وہ اس وقت اپنے متوفی باپ کو گنہگار اور ساتھ ہی بے قصور سمجھ رہا تھا۔ بار بار اس کا تجربہ کار دماغ کہتا تھا کہ ایسا متقی اور پرہیزگار آدمی جسے ہزارہا آدمی ذی رتبہ اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے۔ دوسرے وقت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بار بار یہ خیال آتا تھا۔ کہ آخر اس کے باپ کو پیٹھے بٹھلائے اس قدر رقم کہاں سے مل گئی۔ اور اس نے ایک لاکھ دس ہزار بینک میں جمع کر دیا۔ یہ رقم فرزند صادق علی کی تھی۔ اس کے آبا و اجداد کچھ امیر آدمی نہ تھے صحرائی دسکنائی جائداد کی آمدنی چار پانچسو روپیہ ماہوار تھی لیکن وہ لڑکپن سے بچشم خود دیکھتا آرہا تھا کہ اس کا باپ امیروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔

ایک عظیم الشان کوٹھی کھڑی تھی۔ اصطبل میں دو تین گھوڑے ہر وقت کھڑے رہتے تھے بیسوں نوکر چاکر خدمت میں موجود رہتے تھے۔ کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہوگا۔ کہ مولوی صاحب موصوف کے دسترخوان پر دس مہمان موجود نہ ہوں۔ یہ سچ ہے۔ کہ بہت سے معتقدین مولوی ممدوح کو معقول رقمیں بطور نذرانہ کے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اس ٹھاٹھ اور فضول خرچی کے سامنے جو مولوی صاحب مذکور کی تھی اگر ایک لاکھ روپیہ کی کوٹھی اور اس کی تعمیر کا خیال کیا جاوے تو بینک کا ایک لاکھ دس ہزار کس انداز رقم ہو سکتی تھی۔ یکمان غالب یہ روپیہ صادق علی کا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ کامل اس نازک معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا۔ اور اس کی بدگمانی اور وسوسہ لحظہ بلحظہ ترقی پذیر ہوتا گیا۔ اس معاملہ پر پورے طور سے غور کرنے کے بعد ایک بات تو اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ یہ تھی۔ کہ اگر اس کے باپ نے صادق علی کی دولت کو ناجائز حملہ سے غصب کر لی۔ تو یہ گناہ جس قدر مکروہ اور مصائب خیز تھا۔ اسی قدر مولوی شفیق احمد صاحب مرحوم کی خاندانی عزت اور حرمت اولاد پر گہری روشنی ڈالتا تھا۔ رفیق احمد کو بتدریج یہ احساس ہوا۔ کہ اس کے باپ نے اپنے اوپر جہنم کا دروازہ کھول لیا لیکن یہ سب خیالات اور

غیر شرعی ایثار محض اس کی خاطر کیا تھا۔ اگر مولوی شفیق احمد بالواسطہ اس گناہ کبیرہ کے
مرتکب ہوتے تھے۔ تو رفیق احمد اس سارے جنجال کا ذمہ دار اور سزاوار ٹھہرا تھا ماں
کا مذبذب دل تڑپ تڑپ کر سینہ میں بہرنے لگا۔ اور وہ اپنے باپ کی جگہ اپنے آپ
کو گنہگار اور خود سر سمجھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور دل
دہل گیا کاش اس افسانہ کے پڑھنے والے والدین کے ایثار اور مصائب کا خیال کر کے کچھ
شکر گذاری اپنے والدین ہی کی فرض کر لیا کریں۔ والدین اپنی اولاد کو پالتے اور پرورش کرتے
ہیں۔ ان کی بردباری اور آرام کی خاطر اپنے آرام اور دیسا عیش پر لات مار دیتے ہیں مٹی ملنے
ہنر سکھلانے میں گھر باہر نیلام کرا کر تہی دست ہو بیٹھتے ہیں۔ اولاد کی خاطر راشی مرتشی گہگار
فاسق اور بے ایمان بنتے ہیں۔ اور اس بلا خیز دنیا دی زندان سے اپنی گردن میں ایک
بھاری دردناک طوق پہن کر نکلتے ہیں۔ جو میدان حشر تک ان کی گردن میں پڑا ہوا ان
دین معذور جہنم کی آگ اور اس کے بے درمان سختی کے ڈر سے دن رات تڑپتا رہتا ہے
ان کے کالبد خاکی میں سانپ بچھو گھر بنا لیتے ہیں۔ اور شب و روز ڈنگ مار مار کر پوچھتے
ہیں "تو نے یہ گناہ کس لئے کئے" ان ناعاقبت اندیش اولاد کے شید والدین کے منہ
سے سوائے "اولاد۔ اولاد" اور کیا نکلتا ہوگا۔ درحقیقت دنیا کے مال و متاع اور
اولاد تعلقات انسان کے واسطے دوزخی محتسب یا ہرکارے کتے ثابت ہوتے ہیں
وہ انہیں اپنا خون جگر پلا پلا کر پالتا ہے۔ اور ان کی محبت و واسطہ داری کو چھوڑ کر اس
دنیا سے نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ رفیق احمد کے تعلیم یافتہ اور مخیلہ دماغ میں یہ خیالات بجلی
کی تیزی کے ساتھ فی الفور سما گئے اور وہ "ہائے باپ۔ ہائے باپ" "کمبخت باپ یہ
سب کچھ تو نے میرے لئے کیا" یہ کہکر کرسی سے اٹھا اور دیوانہ وار ادھر ادھر ٹہلنے
لگا۔ اس کے نمک حلال نوکر بوڑھے کارندہ کی ہدایات کے اشارہ سے پوربی کتب کو الماریوں
میں لگا رہے تھے۔ اور رفیق احمد کی نگاہ بار بار ان پر پڑتی تھی اس وقت اسکے دماغ
سے تو کری یا تاریخ پیدائش کا خیال بالکل نکل گیا تھا۔ اور وہ اپنے باپ کی ہر ایک کتاب
کو اس کے گناہوں کا بوجھ سمجھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا مصیبت کے

وقت انسان کو ہر ایک چیز میں پریشانی اور الجھن دکھائی دیا کرتی ہے وہ ان جملہ کتب کو مقدس اور فخر خاندان سمجھنے کے لئے ایک کوہ غم یا انبار مصیبت سمجھ رہا تھا۔ اور یہ خیال کر کے کہ اس کے باپ نے اسے اسلامی مجاہد بنانے کے واسطے یہ سب کتب جمع کی ہونگی۔ ایک طرف تو وہ اپنے باپ کے مصائب کے بوجھ سے دبا جاتا تھا دوسری طرف اپنے آپ کو اس گراں بار ذمہ واری سے ناقابل سمجھ کر اپنے آپ کو ایک لادو گدھے کی طرح سمجھ رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے دوبارہ "ہائے باپ ہائے باپ کم بخت باپ" نکلا۔ اور اس نے باآہستگی اپنے دل سے کہا "معزز باپ مقدس باپ" تو نے جو کچھ گناہ کیا۔ وہ سب میری وجہ سے تھا۔ میں تجھے معذور سمجھتا ہوں۔ اور میدان حشر میں تیرا جرم میں اپنے اوپر لونگا۔ یہ فقرہ ادا کر کے اس کے بھرے ہوئے دل سے ایک شعلہ سا اٹھا۔ اور دماغ چکرا کر آنکھوں سے آنسو پٹ پٹ نکل پڑے۔ اس نے اس عالم بیتابی و بے خبری میں ایک آہ دل سے نکالی۔ اور رو کر باآہستگی بولا تیرے گناہوں کا عالم الغیب گواہ ہے مگر تیری معذوری اور خاندانی عزت کا میں نام لیوا ہوں۔ اس دنیا میں میں تیرے گناہوں کا بوجھ سر پر لادونگا۔ اور اس دنیا میں تیری عزت پر دھبہ نہ آنے دونگا۔ تیری ننگ و ناموس کی درخشاں روشنی قیامت تک برق تابی سے چمکیگی۔ اور میں تیرے زہد و اتقا کے عمامہ کو سر پر رکھکر تجھے میٹھی نیند سے چونکا نہ ہونے دونگا۔ پیارے باپ غریب باپ آسمان کے مقدس فرشتے تجھے بے چین کر رہے ہونگے مگر میں کیا کروں۔ میرے قابو کی بات نہیں۔ ہاں اس دنیا میں جب تک میرا دم ہے۔ میں تیرے معصیت کو ہنکا کرنے کی کوشش کرونگا۔ اور اس دولت کو اس غریب لڑکی کے پاس پہنچا دونگا۔ جس کے مقابلہ میں تو نے میری ضرورت کو زیادہ سمجھا۔ اے کارساز حقیقی میری مدد کر۔ اس نے پھر اکر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ایک پردہ کی آڑ میں کھڑا ہو کر آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگا۔ اس کے دل سے اس وقت باپ کی ناعاقبت اندیشی اور معصیت کا دفتر بالکل محو ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنے متوفی والد کو ایک خاندانی شہید سمجھ کر اسے

ایسی عزت اور تقدس کے خیالات سے پڑھ رہا تھا۔ کہ جس کی نظیر صرف مجذوب یا صلیانہ نگاروں میں مل سکتی ہے۔ اس نے میز پر آکر ٹوپی اٹھائی۔ اور سر پر رکھکر لائبریری کی طرف گیا یہاں آکر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا کوئی تحریر میری پیدائش کے متعلق ملی"

بوڑھے کارندے نے نفی میں جواب دیا۔ اور اس نے ایک نوکر کی طرف دیکھکر کہا۔ ٹم ٹم تیار کراؤ۔ میں ذرا کچہری جاؤنگا۔ رفیق احمد آشفتہ ناول اور منشی خیالات سے بھرگول کمرہ میں واپس آیا۔ اور دس منٹ بعد جیب سے گھڑی دیکھکر ٹم ٹم میں سوار ہوگیا۔ ابھی صرف تین بجے تھے۔ کچہری کا وقت تھا۔ وہ پندرہ منٹ بعد بخیر ٹرک کے راستوں سے صاحب مجسٹریٹ کی کچہری میں پہنچا۔ جہاں اسے معلوم ہوا۔ کہ صاحب ممدوح فی الفور دفتر سے اٹھنے والے تھے۔ دربان کارڈ اندر بھیجا چاہتا تھا۔ کہ صاحب مجسٹریٹ بہادر باہر نکل آئے۔ اور مسکراکر رفیق احمد سے پوچھنے لگے "مسٹر رفیق احمد آپ نے کیسے تکلیف کی۔ آپ کی ڈپٹی کلکٹری کا کیا ہوا۔ تو نوجوان رفیق احمد کے چہرہ پر پریشانی اور انتشار موجود تھا۔ اس نے دل کو قابو میں کرکے جواب دیا تسلیم مجھے ڈپٹی کلکٹری مل گئی ہے۔ میں اس وقت ایک خاص غرض کے لئے آیا ہوں صاحب موصوف اسے اندر لے گئے۔ اور ایک کرسی پر بٹھلا کر پوچھا۔ میں آپ کے لئے کیا کرسکتا ہوں"

رفیق احمد نے جھوٹے تبسم سے جواب دیا۔ میں اپنے والد صاحب کے کاغذات دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اپنے ہیڈ کلرک کو حکم دیں گے۔ کہ وہ فی الفور مجھے کاغذات دکھلادے۔

مجسٹریٹ بہادر نے بیشک بیشک کہا۔ اور اسی لمحہ میں میز پر گھنٹی بجائی جس کی تعمیل میں ایک وردی دار چپراسی بھاگا آیا۔ صاحب بہادر نے چپراسی کو دیکھکر کہا بڑے بابو کو سلام دو۔ ایک منٹ بعد ایک بوڑھا ہندو کلرک ہچکچاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور صاحب نے اسے تبسم سے دیکھکر کہا "بابو مسٹر رفیق احمد اپنے

والد مولوی شفیق احمد صاحب کا فائل (مسل) دیکھنا چاہتے ہیں۔ فی الفور دکھلا دو۔"
بابو نے بہت اچھا حضور" کہا اور صاحب موصوف نے رفیق احمد سے مساوات کی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ اور کچھ کام میرے قابل؟"

نوجوان رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے کہا "میں کاغذات کے علاوہ آپ سے یہ دریافت کرنے آیا ہوں۔ کہ اگر میں اپنے والد صاحب کے وصیت نامہ کی پورے طور سے فی الفور تعمیل کر دوں۔ تو آپ مجھے بنک سے فی الفور روپیہ دلوا دینگے یا نہیں؟"

صاحب مجسٹریٹ بہادر نے تھوڑی دیر کچھ سوچا۔ پھر مسکرا کر بولے "مجھے آپ کے والد صاحب کا وصیت نامہ یاد نہیں لیکن آجتک دعویدار پیدا نہیں ہوا ہیں اس وقت نہایت عدیم الفرصت ہوں۔ چار بجے کی گاڑی میں سہارنپور جا رہا ہوں۔ اگر کوئی بات مداخل ہوئی تو آپ کو اپنے والد صاحب کا ترکہ فی الفور بھی مل سکتا ہے۔ صرف ایک قسم کا اقرار نامہ متعلقہ دعوے واراں پیش کرنا پڑیگا" یہ کہکر صاحب مجسٹریٹ گوڈا یو نگ کہلا باہر نکل گئے۔ اور رفیق احمد نے صاحب مذکور کے دفتر خانہ میں جاکر ہیڈ کلرک کی طرف دیکھا۔ ہیڈ کلرک نے ایک بھاری صندوق کے اندر سے مولوی شفیق احمد صاحب کے وصیت نامہ اور ایک پاس بک (بینک کی کتاب) نکالی۔ رفیق احمد نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے کاغذات لے لئے۔ اور دیوانوں جیسی بے خبری اور اضطراب سے پاس بک پر لیٹ گیا اس کا اصلی مقصد یہ تھا۔ کہ پاس بک کے اندر کے اندراج سے معلوم کرے۔ پاس بک میں صرف دو تاریخیں معلوم ہوئیں۔ ایک لاکھ ایک ہزار کی رقم دس ستمبر ۱۸۸۰ء کو جمع ہوئی تھی۔ اور بقیہ ۱ ہزار کی رقم یکم جولائی ۱۸۸۱ء کو داخل کی گئی ہے۔ ان رقوم کی تواریخ دیکھکر رفیق احمد کا دل اضطراب سے لرز گیا۔ مگر اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے دماغ سے ایک بھاری بوجھ فرد ہو گیا ہے۔ اس نے مسکرا کر کاغذات ہیڈ کلرک کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اور ایک منٹ تک بے پرواہی سے ہیڈ کلرک کی باتوں کے جوابات دیکر ٹم ٹم میں سوار ہوا۔ اور اس وقت اُسے اپنے

دل میں ایک قسم کی نئی کمزوری اور ناطاقتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جس شاندار ٹم ٹم میں سوار تھا۔ وہ اس کی نہ تھی۔ جو چکدار کپڑے اس کے بدن پر تھے۔ وہ اس کی ملکیت نہ تھی۔ پاس بک کی سچی اور معتبر تحریرات نے اسے مبہم طریقہ میں اس بات کا قائل کر دیا تھا۔ کہ ایک لاکھ ایک ہزار کی رقم کہ جو اس کے باپ نے ۱۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو جمع کی تھی۔ وہ صادق علی کے سوا کسی اور کی ملکیت ہرگز نہ ہو سکتی تھی یہ گرانبہا رقم غریبہ خاتون کے لئے تھا۔ مگر اب مدرسہ عربی دیوبند۔ رفیق احمد اور علی الدین کہاں تھے۔ اسے اپنا دماغ بے قابو ہوتا ہوا معلوم دیا۔ مگر اس نے جوش پر سے ارادہ سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور خلقت کی آگشت نمائی کو تعریف اور اعزاز کی جگہ تعجب اور انکساری سے دیکھ کر اپنے دل میں کہنے لگا۔ دنیا کے سب ٹھاٹھ جھوٹے ہیں۔ اور میں کسی کو ذمہ دار نہیں سمجھ سکتا۔ اس دنیا میں عزت بنہانی بڑی دشوار ہے۔ میں کسی کے بل بوتے پر صاحبزادہ بنا ہوں۔ محض باپ کے؟ والد مرحوم کس کے روپیہ پر نازاں تھے۔ صادق علی کے؟ غرض ہر شخص بے ایمان اور خائن ہو سکتا ہے۔ غریب باپ میں نے تجھے معاف کیا نیک و بد کے بدلے کرنا کا تمین تیری مدد کریں۔ میدان جزا میں تیرے گناہوں کا بوجھ میں اٹھاؤں گا۔ اور تیری عزت دنیا میں قائم رکھنا میرا فرض اولین ہوگا۔ یارب العالمین میری مدد کر۔

ستاسٹھواں باب

ہٰذَا الْفِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ

نوجوان صیبت زدہ رفیق احمد کو بہت کچھ کہنا سننا تھا۔ لیکن جس اسم ناک اور ناگفتہ بہ معاملہ کی گرہ اس کے دماغ میں لگ گئی تھی۔ اس کا سلجھاؤ نہ اس کے ہاتھ میں اور نہ اس کے والد کے کامران یا کسی اور تجربہ کار آدمی کے سامنے اس خاندان مصیبت کی لب ضبانی کس طرح کر سکتا تھا۔ جہاں اسے اپنے والد کی غفلت اور ناعاقبت اندیشی

کا خمیازہ بھگتنا۔ وہاں ہی اسے اُس نامعلوم لڑکی کا پتہ لگانے اور اس کے پاس ایک لاکھ ایک ہزار پہنچانے کی فکر دامنگیر ہوگئی تھی لیکن برسوں کی غلطیاں اور تقصیرات چھوہارے کی طرح منٹوں میں حل نہیں کی جاسکتیں۔ اور تجربہ کار نوجوان کی بردباری اور اضطراب اس بات کے متقاضی تھے۔ کہ فوراً جو بھی طے کیا جاوے۔ اسی کل کا کام آج کر دیا جاوے وہ ہشاش بشاش اپنی والدہ کے پاس آیا۔ اور اس کی فق شدہ رنگت اور غم بھرے ہوئے چہرہ سے تاڑ گیا۔ کہ اگر وہ اپنی مشکلات اور مصائب کو کھلے ہوئے آسمان کے نیچے لے پھر رہا تھا۔ تو اس کی والدہ گھر کی چار دیواری اور چھتوں کے نیچے اسی غم سے گھٹی جاتی تھی۔ جو دم زدن میں اس چمکدار اور پُر امن گھر نے پر غلیظ اور خوفناک ابر کی طرح چھا گیا تھا۔ بڈھی عورت نے دھڑکتے دل اور غمناک آواز میں رفیق احمد کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ جہاں وہ اپنی چوکی پر نماز عصر ادا کر رہے تھے۔ اور نوجوان بیٹے کو شرم اور تردد بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی رفیق تو کہاں گیا تھا۔ چار تیار کہی ہے چند ہی گھنٹوں کے اندر کیا حالت ہوگئی۔ رفیق احمد نے پیشانی پر بل ڈال لئے۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ جس چادر کا اس کی والدہ ذکر کر رہی تھی وہ ایک قسم کی ناجائز اور جابرانہ شرب تھا جسکے پیسے کا اس کی جگر غریب خانوں کے دیوالہ استحاق حاصل تھا۔ کیا معلوم۔ غریب کم بخت باپ کی بیٹی اس وقت کس حال میں تھی۔ اور اس پر کیا گذر رہی تھی۔ آیا وہ زندہ تھی یا مر گئی۔ نوجوان لڑکی کی موت کا خیال کر کے اس کا دل گلے میں آرہا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس کا باپ انگلی اٹھائے کہہ رہا ہے تو چاہی رہا ہے اور اس لڑکی کا خیال نہیں۔ جو تیری وجہ سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس بات پر غور کیا۔ کہ اگر وہ مر گئی ہو۔ تو وہ اس ناجائز دولت اور اس بارگراں یعنی قتل کی تجہیز و تکفین کس طرح کریگا۔ اور اپنی گردن کو اس پریشان کن ذمہ داری سے کس طرح نکال سکیگا۔ اس نے دل قوی کر کے ماں کی طرف دیکھا۔ اور ادب سے بولا۔ اماں میں ابھی کچہری سے آرہا ہوں۔ بابا کے پاس بک دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک لاکھ ایک ہزار روپیہ ۱۸۹۰ء کو جمع کیا تھا۔ صادق علی نے یکم ستمبر کو وفات پائی۔ یا اس روز خط لکھا۔ بہر حال قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ رقم صادق علی کی تھی اور میں چاہتا

چلیا۔ کہ فی الفور اس رقم پر قبضہ کروں۔ اور غریبہ خاتوں کے پاس پہنچا دوں"
بوڑھی ماں کا دل دہلنے لگا۔ اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا "تجھے اس لڑکی کا
پتہ کیسے معلوم ہوا" رفیق احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا "پتہ ابھی نہیں چلا۔ مگر کچھ بڑی بات
نہیں۔ صرف اس بات کا ڈر ہے۔ آیا لڑکی زندہ ہے۔ یا مر گئی۔ یا کس حالت میں ہے"
عزیزہ خاتون کی رعشہ کانپ گئی۔ اور اس نے بیٹے کو منت بھری نگاہوں سے دیکھ
کر کہا۔ بیٹا خدا کیواسطے یہ دولت جلدی غریبہ خاتوں کے پاس پہنچا دے یہ تو بتا کہ یہ کوٹھی
اور سامان تو غریبہ خاتون کا نہیں۔ یا اللہ میں کہاں نکل جاؤں" رفیق احمد کا دل
بھر آیا۔ اور اس نے شفقت بھری آواز میں جواب دیا "اماں آپ مفت میں جان
کھوئے لیتی ہیں۔ غریبہ خاتوں صرف ایک لاکھ ایک ہزار کی دعویدار ہو سکتی ہے کوٹھی
بنگلے سے کسی کو واسطہ نہیں۔ اور میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔ کہ آپ میری جان سے
لگی ہوئی ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنی جان پر مصیبت سہولنگا۔ اور آپ کو کوئی
تکلیف نہ ہونے دونگا" بوڑھی عورت نے اپنے سفید دوپٹے کے دامن سے آنسو
پونچھے۔ اور تھرائے ہوئے ہونٹوں سے بولی "میرے لاڈلے اماں واری۔ اس لڑکی
کی جلدی خبر لے۔ اور اپنے باپ کے سر سے یہ بلا جلدی ٹال۔ رفیق احمد نے اُفسردہ
بھری ہوئی آواز میں جواب دیا "اماں میں ابھی پتہ لگاتا ہوں۔ میں والد صاحب
کو پہلے بڑا دھوکے باز اور دنیا فریب سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا ہے
کہ یہ سب کچھ انہوں نے میرے لئے کیا۔ اب میں ان کی شفقت اور احسانات
کے معاوضہ میں ان کی عزت پر اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ اور میں قسم کھا چکا ہوں
کہ عمر بھر قیامت کو بھی اپنے بزرگ باپ کے معصیت اپنی گردن پر لے
لونگا۔ بوڑھی ماں کا دل نئے خیالات اور نئے جذبات سے اُچھل پڑا۔ معصیت
کے وقت ہمدردی کیسی دل گداز معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس نے محبت سے بیٹے
کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیکر بولی "میرے لاڈلے
تیرے سر آفت تیری پیشانی پر لکھی ہوئی ہے۔ اور تیری غریب ماں کو

نجم پر ناز ہے" ایں کار از تو آید و مرد اں چنیں کنند" رفیق احمد طمکین اور قوی دل سے ماں کے پاس سے علیحدہ ہونے لگا۔ بوڑھی ماں نے اُسے بٹھلایا۔ اور ایک ملاما کو آواز دے کر فوراً چاء منگائی۔ رفیق احمد نے جلدی سے چاء پی لی۔ اور گھبرا کر بولا۔ "اس وقت بہت جلدی ہے۔ اس معاملہ کو فوراً طے کرنا چاہتا ہوں" وہ جھٹپٹا سا نیچے اترا۔ اور اسی وقت ٹم ٹم پر سوار ہو کر بجانب آصف نگر روانہ ہو گیا۔ نصف گھنٹہ کے بعد جب وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بنگلہ پر پہنچا۔ مغرب کی طرف آفتاب زرد پڑ گیا تھا۔ اور اس کی ہلکی دھیمی روشنی سے غروب کا وقت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں اس وقت بہت سے خیالات موجزن تھے۔ لیکن وہ کسی خاص خیال کو پیش نظر نہیں لا سکتا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی ٹم ٹم شرقی برآمدہ کی طرف پہنچائی۔ اور ایک بوڑھے ملازم نے جھک کر سلام کیا رفیق احمد نے ٹم ٹم سے اتر کر پوچھا "کیا مس صاحبہ ہیں"

نوکر نے اس بات کا جواب دیا۔ اور وہ فوراً سیدھا اندر گھسا چلا گیا۔ اسے بڑے کمرہ میں شکیلہ ہیرنگٹن ننگے سر اپنی طرف آتی ہوئی معلوم دی۔ جس نے سلام کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اور شگفتہ دلی سے کہنے لگی "میں ابھی تمہارے پاس آ رہی تھی" پھر غور سے اس کے چہرہ کی دہشت اور اداسی پر ٹھنڈے ہاتھوں کی خنکی محسوس کر کے بولی "کیسی طبیعت ہے۔ اور اداس کیوں ہو"

پھر اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ اُسے اپنی لائبریری میں لے گئی۔ اور ایک کرسی پر بٹھلانے لگی۔ رفیق احمد نے کرسی لے لی۔ اور آہستہ سے بولا "مس شکیلا میری دل جان کی معشوقہ مجھے آج ایک ضرورت آ پڑی ہے۔ اور تمہاری محبت کا امتحان کرنا ہے۔

شکیلہ ہیرنگٹن اس کلمہ کو مذاق یا معمولی چھیڑ چھاڑ کر ہنسنے لگی۔ اور منہ موڑ کر کے بولی "تمہیں کیا چاہیئے۔ روپیہ تو میرے پاس نہیں ہے۔ جان ہے سو تمہاری نظر ہے"

رفیق احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے سنجیدگی سے شکیلہ کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ دیکھو اس کمرہ میں کوئی آ نہ جائے۔ میں آج تم سے ایسا نازک معاملہ کہنے آیا ہوں۔ کہ جس کے اوپر میری حیات و ممات کا انحصار ہے؟

اس فقرہ سے شکیلہ کی رنگت فق ہوگئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اُٹھ کر دونوں دروازے دیکھے۔ پھر آہستہ سے بولی "عزیزاً پرجان نہیں ہے۔ اس کا چچا آیا ہوا ہے۔ نوکروں کی کوٹھڑی میں ہوگی۔ میں ڈر گئی۔ کیا معاملہ ہے؟"

رفیق احمد نے اپنی کرسی شکیلہ سے بہت قریب کھینچ لی۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھڑکتے دل سے بولا "پیاری تم مجھ پر جان دینے کو تیار ہو۔ لیکن جھوٹ سچ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو اگر تم مجھے چوریا کسی کا قاتل بنتا ہوا دیکھو یا لوگ مجھے جیل خانہ لے جاویں۔ تو کیا تم مجھ سے نفرت کروگی؟"

شکیلہ ہرنگٹن کی آنکھوں میں تاریکی پیدا ہوئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ لرز گئی۔ اس نے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا "خدا کے واسطے کچھ منہ سے تو کہو۔ کیا تم کسی کو قتل کر آئے ہو۔ کیا بلند اختر سے لڑ پڑے؟"

رفیق احمد نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا "نہیں۔ نہیں لیکن تم پہلے بتلاؤ۔ کہ اگر میں کسی کو مار کر آؤں۔ تو تم مجھے اپنا دوست سمجھ کر معاف کردوگی یا مجھے اپنے بنگلہ سے نکال دوگی؟"

شکیلہ ہرنگٹن کے ہاتھ پاؤں کانپ گئے۔ اور اس کی زبان بے قابو ہوگئی اس نے اپنا دل دبا کر جواب دیا "خدا کے واسطے جلدی بتلاؤ۔ تم سے کیا جرم سرزد ہوگیا۔ ہائے ہائے میں برباد ہوگئی۔ میں تمہارے اوپر جان دیدوں گی مگر خدا کے لیے تو کہو!"

اس وقت شکیلہ نے رفیق احمد کو ایسی وحشت و خوف بھری نگاہوں سے دیکھا کہ اس کا دل کانپ گیا۔ اور وہ اس کے ہاتھوں کو آہستگی سے چوم کر بولا "میری لاڈلی میں تمہاری محبت کا قائل ہو گیا ہوں۔ معاملہ یہ ہے۔ کہ میرے والد صاحب جو ایک لاکھ روپیہ کی رقم بینک میں چھوڑ گئے تھے وہ دراصل ان کی نہیں۔ بلکہ انہوں نے ایک شخص کی امانت میں خیانت کی اور اب یہ ساری رقم اس لڑکی کو دینی پڑیگی۔ جو اس کی اصلی وارثہ ہے"

شکیلہ ہیرنگٹن کے جسم میں رکا ہوا خون از سر نو حرکت کرتا معلوم دیا اس نے اطمینان کا لمبا سانس بھرا۔ اور تبدیل شدہ آواز میں جھلا کر بولی "تم بھی بڑے مذاق پسند ہو میں ڈر کر مر جاتی۔ اس معاملہ میں تمہارا کیا قصور ہے میں تم سے کیوں نفرت کروں۔ بہت سے والدین نالائق نکلتے ہیں۔ اولاد نیک چلن اور قابل ثابت ہوتی ہے"

رفیق احمد نے جھوٹے تبسم سے شکیلہ کو دیکھا۔ اور دانتوں میں انگلی دبا کر بولا میری جان۔ میرے باپ کی شان میں ایسا لفظ نہ نکالو۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ سب میرے لئے۔ میں ان کی عزت پر جان دینے کے لئے تیار ہو چکا ہوں۔ اور ان گناہوں کا بوجھ میدان حزا میں اپنے سر پر لے لونگا" شکیلہ ہیرنگٹن کے پاؤں تلے سے زمین نکلنے لگی اور اس کے خیالات دور پہنچ گئے۔ اس کا دماغ اس موقعہ پر پہنچا جہاں مولوی شفیق احمد صاحب مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں یہ کلمہ درج کیا تھا۔ کہ رفیق احمد شکیلہ ہیرنگٹن سے تاوقتیکہ وہ مسلمان نہ ہو جاوے۔ شادی نہ کرے۔ اس نے ایک سسکی بھری۔ اور مستفسر نگاہ سے رفیق احمد کو دیکھ کر بولی "پھر اب کیا منشا ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"

رفیق احمد شکیلہ کے چہرہ کی تبدیلی دیکھ کر تاڑ گیا۔ کہ وہ اس کے والد صاحب کی تقصیرات کو معافی کی نظر سے دیکھنے والی نہ تھی کیونکہ انہوں

نے اپنی مذہبی تعصب اور ذاتیات سے ثابت کر دیا تھا۔ کہ شکیلہ ہیرنگٹن کو ان کے دل میں ذرا بھی جگہ نصیب نہ تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور ہلی ہوئی زبان سے بولا "پیاری شکیلا تم میرے والد صاحب کو سختی سے مت دیکھو دنیا میں ہر انسان غلطی کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ دولت کس کے لئے چھوڑی میرے لئے۔ میں کون ہوں۔ تمہارا شوہر۔ پس جب تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اور مجھ پر جان دینے کے لئے تیار ہو۔ تو میرے والد سے نفرت نہیں کر سکتیں"

اور یہ کہکر رفیق احمد شکیلا ہیرنگٹن کے خوبصورت ہونٹوں پہ بوسہ دیا۔ اس نے رفیق احمد کے ہاتھ اپنی گردن سے نکال دیئے۔ اور جھلا کر بولی "میں تمہارے والد صاحب کی تقصیرات پر ہرگز اغماض نہیں کر سکتی۔ وہ شخص بلا کا متعصب تھا۔ اور میرے چچا جان کا دشمن۔ خیر مجھے ان باتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ مجھے تم سے سروکار ہے۔ اور اس واقعہ کے اندر میں تمہیں کسی طرح ملزم نہیں ٹھیرا سکتی۔ بے شک اگر اس لڑکی کی دولت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تو اس کے حوالے کر دو"

رفیق احمد کے چہرہ پر رونق آگئی۔ مگر سانہ ہی اس کے دل میں نا امیدی کی لہر چھا گئی۔ اور وہ خفیف آنکھوں سے شکیلا ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر بولا "

لیکن روپیہ میرے قبضہ میں کہاں ہے۔ روپیہ تو صرف اس وقت مل سکتا ہے۔ کہ میں کسی مسلمان عورت سے شادی کروں۔ یا تمہیں مسلمان بناؤں"

شکیلہ ہیرنگٹن کے ہاتھ پاؤں کانپ گئے۔ اور اس کا دل دہلنے لگا کسی مسلمان عورت سے شادی کروں" کیا یہ شخص اسے اینٹ پتھر کی طرح سمجھ رہا تھا۔ کہ اس کی فراست سے دیکھ کر اپنی عمارتی ضرورت کے لحاظ سے

جسے اپنے حسب حال پاوے کام میں لاوے۔ ناراض شدہ عورت کا غصہ مشہور ہے۔ اس نے جھلا کر ایک ہاتھ میز پر مارا۔ اور خشم آلودہ آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھکر بولی۔ تم تو میری محبت کا یہ معاوضہ پیش کرتے ہو۔ کہ اپنے باپ کے گناہوں پر مجھے بھینٹ چڑھا دو۔ میں اس جھگڑے کو ہرگز خیال میں نہیں لاسکتی۔ میں پندرہ لاکھ کی دولت پر لات مار کر مقدس مسیح کے سچے مذہب پر اڑی ہوئی ہوں۔ میں تمہارے گناہوں کا کفارہ ہرگز نہیں دے سکتی۔ میں ہرگز مسلمان نہ ہوں گی۔"

رفیق احمد کا دل لرز گیا۔ اور وہ اس نوجوان نا ہنر فریب عورت کو چقماق کی طرح سخت دیکھ کر کانپ گیا۔ اس کے دل میں اس وقت اپنے باپ کی عزت ایسی گہری اور مضبوطی سے دل نشین ہوگئی تھی۔ کہ اسے اپنے ریشہ ریشہ میں باپ کی عزت کا خون دوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یک لخت اس کا دماغ ان خیالات اور اپنی ناکامیابی پر بے قابو ہوگیا ہر کہ تنگ آید بجنگ آید۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا۔"

پیاری شکیلا بے انصافی مت کرو۔ تم اپنے آباؤ اجداد کی روحانیتی حرمت کے لحاظ میں اس مذہب پر اڑی بیٹھی ہو۔ میں اپنے مقدس باپ کی عزت کو جس کے خون سے میں پیدا ہوا۔ جس نے میرے لئے دنیاوی و دینی وبال مول لیا کس طرح نظر انداز کردوں۔ میں تم پر جان دے دینے کے لئے تیار ہوں۔ اور تمہارے بغیر زندگی دوبھر ہوجاوے گی لیکن سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں۔ کہ یہ روپیہ کس طرح اس لڑکی کو دیا جاوے اور روپے کو بینک سے لینے کے واسطے یہ ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ کہ میں مسلمان عورت سے نکاح کروں۔"

شکیلا ہیرنگٹن کا غصہ اس وقت حد پر پہنچ گیا تھا۔ اور اُسے مسلمان عورت سے نکاح کروں" ایسا دل خراش اور گستاخ کلمہ معلوم ہوتا تھا۔

کہ اُس کی روح کانپ گئی۔ اور وہ چلا کر بولی "آپ کو منع کون کرتا ہے۔ آپ شوق سے مسلمان عورت کے ساتھ نکاح کرلیں۔ میں آپ کے والد کی نجات اپنے مقدس مذہب کو فروخت کر کے نہیں خرید سکتی۔ خدا حافظ"!

رفیق احمد کا دل خوف اور غصہ سے بگھل گیا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ سینکڑوں آدمی اُس کی طرف بھاری بھاری پتھر پھینک رہے۔ اور مسکرا رہے ہیں۔ اُسے شکیلہ ہیرنگٹن ایسی معلوم ہوتی۔ کہ کوئی بھولوں کی ٹوکری میں پری کی لڑکی کو بھلا لایا ہے۔ اور سنگدل لڑکی کی سختی اور بے رحمی سے اُس کا دل اس کی الفت کے جال میں اور زیادہ جکڑتا ہوا معلوم دیا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر شکیلا ہیرنگٹن کے پاؤں پر گر گیا۔ اور رو کر کہنے لگا"!

میری سنگدل معشوقہ تمہیں میرے دل کی خبر نہیں۔ میں تمہیں اپنے دین وایمان کی نگہبان دیوی سمجھتا ہوں۔ تم پر جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر ہائے میرے عزیز بدبخت باپ کی عزت دو کوڑی کی ہو جاوے گی۔ میری پیاری شکیلہ مجھ پر رحم کر۔ میں تیرے لئے دین دنیا سے نکما ہو جاؤنگا۔ لیکن باپ کی عزت قائم رہنے کا میں نے عہد کر لیا ہے۔ میں اپنے باپ کے سب عیوب خفیہ سے چھپاؤنگا اور میدان حشر میں اس کے گناہوں کو اپنی چھاتی پر لے کر اوسے نجات دلاؤں گا۔ میری لاڈلی۔ میری حور۔ میری مدد کر۔ اور میرے ایمان کی نگہبان بن"!

رفیق احمد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شکیلہ ہیرنگٹن کا دل پگھلنے لگا۔ اور آنکھوں کے دماغ میں آنسو جمع ہونے لگے۔ اس نے اپنا دل مضبوط کر کے رفیق احمد کے سر کو اپنے پاؤں سے اٹھایا۔ اور چلا کر بولی"

پیارے رفیق۔ تم مجھے پھانسی پر چڑھاؤ۔ لیکن میں تمہارے والد صاحب کے گناہوں کو ہرگز نہ خریدوں گی"! رفیق احمد کا دل نا امیدی سے کانپ گیا۔ اور اُس کے قلب پر وہ بے رحمی اور سفاکی پیدا ہوئی۔ جو میدان حرب میں ایک جنرل خونی سپہ سالار کو اُس وقت [illegible] ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے قاتل کو اپنے اوپر [illegible]

بنوک مار رہا تھا۔ رفیق احمد کی آنکھیں یک لخت سرخ ہوگئیں۔ اور اس نے چلا کر کہا "شکیلا ہیرنگٹن تو نے مجھے بہت ذلیل کیا اگر تجھے میرے باپ کی عزت کی قدر نہیں۔ تو میں بھی تیرے آباؤ اجداد کی عزت کو قابل وقعت نہیں سمجھتا"۔ بذالفراق بینی وبینکم" وہ فرش سے اپنی ٹوپی سر پر رکھکر باہر نکلنے لگا شکیلا ہیرنگٹن نے جھپٹا کر اس کا دامن پکڑ لیا اور رو کر بولی "پیارے رفیق اپنی معشوقوں سے کوئی اتنی سختی بھی برتتا ہے۔ صبر کرو۔ ٹھیرو مجھے سوچنے دو۔ میں تمہاری ضرورت کی قائل ہوگئی ہوں اپنا سب خاندانی اعزاز فنا کرکے تمہاری خوشی خرید لونگی۔ اور تمہاری کفش برداری پر ناز کروں گی"۔

شکیلا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ رفیق احمد کا دل رحم اور محبت سے لبریز ہوگیا۔ اس نے فرط اشتیاق میں شکیلا کو چھاتی سے لگا لیا۔ اور اس کے اشک آلودہ آنکھوں کو بار بار چوم کر بولا "

میری لاڈلی میرے دین و ایمان کی مالک میں تم پر قربان گیا۔ میں خواب دیکھ رہا ہوں" شکیلا ہیرنگٹن کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک مضبوط بہادر نوجوان کی چھاتی سے لگی ہوئی ہے۔ اور اس کے سینے کے اندر کچھ ایسی طاقت موجود ہے جو اس کی روح کو یک جان دو قالب سمجھکر جذب کیے لیتی ہے۔ دراصل وہ عشاق کی جنت العلیین میں پہنچ گئی تھی۔

اڑسٹھواں باب

عجیب و غریب خواب

جس شام کو خوبصورت مذہب پرست عیسائی لڑکی شکیلا ہیرنگٹن نے اپنے عاشق رفیق احمد کی جدائی اور "بذالفراق بینی وبینکم" کو ناقابل برداشت سمجھکر اس کی خواہش سے مشرف باسلام ہوجانے کے مسئلہ پر غور کرنے کی آمادگی ظاہر کی وہ شب اس کے لئے امید افزا اگر عظیم الشان انقلابات سے لبریز تھی۔ انسان اپنے ارادوں

میں کیسا ہی مستحکم ہو۔ اور اُس کے ارادات و جذبات کتنے ہی وقیع مدلل اور ناقابل تغیر معلوم ہوں۔ مگر انسان کو اپنی آئندہ زندگی کی کبھی خبر نہیں ہوتی۔ بہت علم دوست صاحب خرد بزرگوں کی نسبت سننے میں آیا ہے۔ کہ وہ ساری عمر مسلمان رہے۔ مگر بالآخر کسی بیسوا لڑکی کے دامِ تزویر میں پھنس کر عیسائی بن گئے۔ ہزاروں بندگان خدا ایسے گذرے ہیں۔ کہ ساری عمر خدا رسول کے ارشادات پر جان دینے کو تیار رہے مگر ایک ذرا سی غفلت اور اُن کے دل کی رسائی اور رسوخ سلب ہو گئے۔ اور وہ اپنی زندگی کی منزل کو ہنوز روز اول سے تعبیر کرتے ہوئے موت کی تلخ کام لذت کو چھک کر دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو خوش نصیب یا مستقل مزاج نہیں کہہ سکتے۔ جب تک کہ اُس کے دم واپسین کے وقت خوش نصیبی یا استقلال کا ثبوت بہم نہ پہنچ جاوے۔ یہ تا تجربہ کار بھولی بھالی لڑکی صرف اپنی ماں کی تقصیر سے مقدس مسیح کے تابعین میں شریک ہو گئی تھی۔ اس کی مذہبی تعلیم دراصل نقش بر آب سے زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ ورنہ اسی لغزش۔ ذرا سا بادِ تھوڑی سی مصیبت اس کے خیالات اور عقیدوں کے قلعہ کو ہوا میں اڑا سکتے تھے۔ بالآخر وہ انسان تھی۔ لڑکپن سے ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر دنیا کے ناز و نعم میں جوان ہوئی۔ تو رفیق احمد کے خوبصورت مکھڑے کو وہ نامعلوم چیز سمجھنے لگی جس کے لئے وہ اپنے وجود کو دنیا میں لائی تھی۔

رفیق احمد اُسے دنیا بھر کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ خوبصورت دلنشیں اور بہادر معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا سہارا اگر کسی کے اندر پاتی تھی۔ تو رفیق احمد ہی پر نظر جماتی تھی۔ وہ اس کا ایمان وہی اس کا روح پرور والی و وارث تھا جس نازک موقعہ پر شکیلہ ہیرنگٹن نے بڑی بہادری سے مولوی شفیق احمد مرحوم کے گناہوں کو اپنی چھاتی پر لینے سے انکار کیا۔ وہ دراصل اُس کی فتحیابی کا جھنڈا کھڑا کر دینے والا ثابت تھا۔ اپنے معشوق۔ اپنی دنیاوی دولت اپنی آرزو اپنی زندگی کی روح کو شکیلہ ہیرنگٹن نے اپنی زبان کی مدد سے کہو دیا تھا "جاؤ۔ جاؤ میں تمہاری ذری پرواہ

نہیں کرتی مجھے مقدس مسیح کا مذہب کافی ہے" لیکن جس کا دل و دماغ و جگر سوزی سے اس نے یہ کلمات ادا کئے۔ اس کا اثر کوئی محسن ہونے کی جگہ اس کے لئے دوسری جگہ کا پیش خیمہ ثابت ہونے لگا۔ اور اسے ایک آن واحد میں معلوم ہوگیا۔ کہ مقدس مذہب پر قائم رہنے کے لئے اُسے جس دل و دماغ اور جگر و جبر و روح کی ضرورت تھی۔ وہ جملہ اعضاء اس مقاومت کی تاب لانے سے معذور رہے تھے۔ اُسے اپنی روح پرواز کرتی معلوم دی۔ اور وہ اپنے ہاتھ سے نکلتی ہوئی طاقت ہمدرد معشوق رفیق احمد سے لپٹ کر کہنے لگی "

"میری روح۔ میری جان۔ میری نجات۔ میرا بید تو مت جا۔ صبر کر۔ ٹھیر مجھے سوچنے دے۔" آہ اس سے زیادہ ایثار کون شخص کر سکتا ہے۔ یہ نازنین کار بھولی بھالی لڑکی مقدس مذہب پر اپنی جان قربان کر دینے کو تیار تھی۔ مگر اُسے عین آخری وقت میں معلوم ہوگیا۔ کہ گو وہ خود اپنے دم سے یہ عہد قایم کر سکتی تھی۔ لیکن جن اعضا کی مدد سے وہ اس عہد پر قایم رہتی وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر رفیق احمد کی روح سے جا ملے تھے۔ بیچاری نازک اندام لڑکی عین فتحیابی کے وقت پسپا ہوگئی۔ اور کامیابی کا جھنڈا اس کے ہاتھ سے گر پڑا پھر آنکھ کھلی تو یہ اجاڑ تاہوا علم رفیق احمد کے ہاتھ میں پایا۔ وہ اپنی شکست و ناکامی سے اس قدر خونزدہ اور پریشان ہو گئی تھی۔ کہ اسے در و دیوار ہوا۔ زمین آسمان نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے اعضا اسے ظاہری و باطنی طعن و تشنیع دے رہے تھے۔ اس کے آباؤ اجداد اپنی قبروں کے اندر سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے "مرتد، دین کے بدلے دنیا خریدنے سارے خاندان کی عزت ڈبو دینے والی۔ عیسائی بے ایمان لڑکی تیرے اوپر مسیح کا قہر نازل ہو"

وہ متوحش آنکھوں سے سب معلوم و نامعلوم نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ اور فہم و ادراک کے نازک مرحلوں کا مدوجزر پڑھ رہی تھی۔ اُسے دین و دنیا کے متوحش قیامت خیز گھاٹیاں اپنے دائیں بائیں نظر آرہی تھیں۔ وہ ان دونوں گھاٹیوں کے

اندر اپنے آپ کو محبوس و مقید پا رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اس نورجان خوبصورت و غریب آدمی کی تصویر تھی۔ جو ہاتھ پھیلائے اُسے سب گھاٹیوں سے نکال دینے کی قسم کھا رہا تھا۔ وہ شام اُس نے نہایت بے قراری اور اضطراب میں گزاری اور شب کا کھانا اُسے نہایت بے مزہ اور جگر سوز معلوم دیا۔ اُس نے گھڑیاں گن گن کر رات کے دس بجائے اور وہ بستر استراحت پر جانے سے پیشتر اپنی آرامگاہ میں مقدس مسیح کی تصویر کے نیچے گر کر نصف گھنٹہ تک روتی رہی۔ اس کے منہ سے بار بار یہ الفاظ نکلے۔ اے مہربان خداوند دین و دنیا کے محافظ۔ خداوند میں تیرے مذہب پر قربان ہوں سب کچھ کر چکی۔ اب میرے قابو کی کوئی بات نہیں۔ میرے معشوق نے مجھے اندھا کر دیا۔ مجھے اپنی محافظت میں لے اور میرا سچا رہنما بن۔ آمین!

وہ دھڑکتے دل اور کانپتے جسم بستہ ہاتھ پاؤں سے بستر پر گری اور اپنے حالات کو بھلا دینے کی غرض سے آنکھیں بند کرنے لگی۔ مگر اس کا دماغ ایسا خشک اور بے چین ہو رہا تھا۔ کہ اُسے نیند کی جگہ متوحش ڈراؤنی صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ اور اسے اپنے بستر کا چپہ چپہ خوفناک مذہبی بھوتوں کی شکل میں "مردار۔ مردار" چلاتا ہوا دکھلائی دے رہا تھا۔ وہ بارہ بجے شب تک ہیبت ناک خیالات میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہی اسے کسی کروٹ چین نا معلوم ہوئی۔ دماغ کی خشکی اور بدن کے اضطراب سے اس کی روح نحیف ہونے لگی اُسے اپنا سارا جسم جکڑا ہوا معلوم دیا۔ پھر اسے یکایک ایک قسم کی بیہوشی معلوم دی۔ اور وہ عالم رویا میں پہنچ گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ چاروں طرف سیاہ مکروہ اور ڈراؤنی صورت کے بیل ہاتھی شیر پلنگ اُس کی طرف چلاتے آ رہے ہیں اور وہ اپنا کوئی یار غمگسار نہیں پاتی۔ خوفناک درندے اُسے چیر پھاڑ دینے کو بھاگے آ رہے ہیں۔ اور وہ کانپ کانپ کر چلا رہی ہے۔ اسی لمحہ میں اُسے ایک سفید ریش بزرگ صورت مقدس آدمی کی جھلک پڑی جس کے سر پر ایک سیاہ قبل تھا۔ اُس بزرگ کے آتے ہی تمام درندے فوراً غائب ہو گئے۔ اور بزرگ نے مسکرا کر شکیلا ہیرنگٹن کی طرف دیکھا اور اس کے بستر کے قریب پہنچکر کہا "تو آلیور ہیرنگٹن کی دختر ہے۔ تیرا بارا خاندان

حضرت عیسےٰ کی امت میں شمار ہوتا رہا ہے۔ مگر تو اب مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ ہم تیری مدد کو آئے ہیں۔ گو تم ہمیں نہیں جانتی لیکن ہم تمہیں خوب جانتے ہیں۔ ہمارا نام لارڈ لٹن ہیرنگٹن ہے۔ ہم نے اپنی اولاد کو اپنے اپنے بازوؤں پر ایک شلث کے اندر آنکھ گودینے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ کہ حضرت مسیح کے بعد پیغمبر آخر الزمان کا دور شروع ہو گیا ہے جس سے نہ ہمیں انحراف ہے۔ اور نہ تجھے ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی امانت واپس لینا چاہتے ہیں۔ اپنا بازو کھول!"

شکیلا ہیرنگٹن عالم خواب میں اس مقدس بزرگ کی صورت سے اس قدر ڈر گئی تھی۔ کہ اس نے کانپ کر اپنا بازو کھول دیا۔ اور اسے اپنے جگمگا رہا نور پر صاف طور سے شلث اور ایک آنکھ نظر آئی۔ مقدس بزرگ نے اس نشان پر ہاتھ پھیر دیا۔ اور مسکرا کر کہا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ! جا اب تو مسلمان ہو گئی!"

شکیلا ہیرنگٹن کی ایک دم سے آنکھ کھل گئی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہ سوئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اور پردوں کے اندر سے دیکھنے لگی۔ آیا کیا وقت تھا۔ پہرا اس نے دیا سلائی جلا کر دیکھا۔ تو صبح کے پانچ بج رہے تھے اسے اپنے خواب اور مقدس بزرگ کی آمد کا قصہ اس قدر تازہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اوسے ابھی تک اس بزرگ کے بھاری وزنی ہاتھ کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لیمپ جلا کر اپنا بازو کھول دیا۔ اور اس پر وہ ہی نشان پایا۔ جو اس کے اباواجداد میں ہمیشہ سے چلا آتا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ سمجھنے لگی۔ کہ اسے دھوکا ہوا۔ لیکن اس وقت اس کا دل اس قدر بشاش اور مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے اپنے آباواجداد کی روایات مثل خواب نظر آ رہی تھیں۔ اور اسے کسی روایت کے تعرض یا خلاف ورزی کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔ معلوم نہیں یہ کیا اثر تھا۔ اوسے اب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ حضرت مسیح کی تصویر بھی اسے تبسم سے دیکھ رہی تھی۔ باہر صبح کے اٹھنے والے پرندوں کے چہچہے سنائی دے رہے تھے۔ اور اسے ہر چیز شگفتہ اور مسکراتی ہوئی دکھلائی دیتی تھی اس نے پاس کے کمرے سے عزیزاً کو اٹھایا۔ اور اپنے غسل ضرورت کے واسطے گرم پانی مانگا

چندنٹ کے اندر اُس نے لیمپ گل کر دیا۔ اور شٹر کھول کے اوپر سے پردے ہٹا دیئے صبح کی نورانی چاندنی اور رات کی آلائشوں سے پاک دن اور سے انقلاب عظیم کی صورت میں دیکھ دیکھ کر بتلا رہا تھا۔ کہ ہر مصیبت کے بعد راحت ہے ہر تاریکی کے بعد روشنی ہے۔ وہ اپنے دل کی عجیب و غریب تبدیلی کا ایک شائبہ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مگر یہاں وہ اپنے آپ کو قوی دل اور بشاش پا رہی تھی۔ اس کا دل کھیلنے کودنے کو چاہتا تھا۔ اور اس وقت اس کی عین آرزو یہ تھی۔ کہ وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر رفیق احمد کے ساتھ شکار کو نکل جاوے۔ کیا عجیب و غریب خواب تھا۔

انہترواں باب

گم و نام و نشان لڑکی کا کھوج

جس وقت رفیق احمد شکیلا ہیرنگٹن کے پاس سے اپنے والد کی عالیشان کوٹھی پر واپس آیا۔ خوب تاریکی پھیل گئی تھی۔ اور شرقی دروازوں میں جگمگاتے ہوئے لیمپوں کی روشنی چمک رہی تھی۔ وہ لانبا سانس بھر کر اندر داخل ہوا۔ اور جس مستقیم دل سے گول کمرہ میں آیا۔ اس کا اُس وقت قابو میں نہ تھا۔ اوسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ اپنی فتحیابی کے میدان میں اندر کے اکھاڑے کی سرمیندہری کو تسخیر کر کے آیا ہے جس کے پائنتی میں دنیا کے جواہرات گرانمایہ بکھیڑے پڑے تھے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ گو رفیق احمد اس وقت شکیلا ہیرنگٹن کے آباواجداد کی دولت سے مستفیض ہونے کا تہیہ نہ کر رہا تھا۔ مگر مس موصوف اپنی دولت گرانمایہ کے بغیر بھی بذات خود لعل و جواہر میں تلنے کے قابل تھی۔ اوسے پچھلے دنوں شکیلا ہیرنگٹن کے عشق میں اپنے باپ کی دولت وار دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس وقت تسخیر خیز خوبصورت حور نے نہ صرف اس کے اوپر عارضی مشکلات کا پروانہ بھیج کر اوسے ڈرا دیا تھا۔ بلکہ اسی لمحہ میں ایک منہری مرقع کے ذریعہ سے اوسے اطلاع دے دی تھی۔ کہ یہ سب کچھ ایک قسم کا فاقہ تھا۔ ہم تیرے ایک لاکھ کے بدلے تجھے پندرہ لاکھ دلاویں گے۔

مگر رفیق احمد کو اس پندرہ لاکھ کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ شکیلا ہنگٹن کے لئے ہر قسم کی غلامی اور ذلت برداشت کر کے اپنے ہاتھ پاؤں سے کمائی کھونے پر کمربستہ تھا۔ وہ گرانا ہوا اپنے خوشنما کمرہ کی ولکش میز پر بیٹھا تھا۔ اور نوکروں نے بھاگ کر اس کے احکامات سننے پر کان لگا دیئے۔ مگر اوسے نوکروں کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے نوکروں کو رخصت کر دیا۔ اور میز سے کاغذ قلم دوات لے کر سوچنے لگا۔ کہ وہ اپنی فتحیابی دنیا پر کس طرح اعلان کرے۔ وہ اس وقت اس بہادر جنرل (سپہ سالار) کی طرح سفراتی اور فتحمندی کے ولولوں میں سرشار تھا جو عظیم الشان مہیب غنیم کی افواج کو پسپا کر کے آرہا ہو۔ اور اپنی کامیابی اور فتحمندی کے مقابلہ میں دنیا کے جملہ اسکندران وقت کو ناچیز سمجھ رہا ہوں۔ وہ اپنے دل کے اندر نپولین جیسے بے چین اور کم چیز جیسی استحکامی پا رہا تھا۔ اور اپنی فتوحات کا ہار اپنے سر کی جگہ خوبصورت پری چہرہ شکیلا ہنگٹن کی زاہد فریب گردن میں ڈالنا چاہتا تھا۔ واقعی اگر شکیلا ہنگٹن اس کے "ہذا الفراق بینی و بینکم" سے مغلوب ہو کر اس کی متابعت کا عہد نہ کر لیتی تو اسے اپنے ارادوں میں بڑی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک طرف اسے ایک لاکھ ایک ہزار غریبہ خانوں کے پاس پہنچانا تھا۔ دوسری طرف پچاس ہزار کا وعدہ علی الدین سے کر چکا تھا۔ تیسری طرف اُسے ایک رقم کثیر کامران کی خدمات کے صلہ میں ادا کرنی تھی۔ اور سب سے آخر میں اوسے پانچ ہزار روپیہ کا قرضہ ایک مہاجن کے ہاتھوں میں ادا کرنا تھا۔ جس سے یہ رقم سخاوت علی انسپکٹر کو دینے کے واسطے مستعار لی گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بال بال بندھا ہوا پاتا تھا۔ اور جب ساری دولت غریبہ خانوں کے پاس پہنچ جاتی۔ تو علی الدین کو پچاس ہزار دینے کے لئے یا تو وہ مزید قرضوں کی جانستاں بلا اپنے سر پر لیتا۔ یا اپنے باپ کی عالیشان کوٹھی کو نیلام کر کے ان اخراجات سے سبکدوشی حاصل کرتا۔ پھر اسے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر سب طرح کی تکالیف اور ذلت برداشت کر کے اپنی ماں کی عزت قایم رکھنے کے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی۔ باپ کے ایک لاکھ دس ہزار پر قابض ہونے کے

واسطے اور کسی مسلمان عورت سے نکاح کرنا پڑتا۔ اور آخر لیکا اس کے دل کی معشوقہ شکیلہ ہرنگٹن کسی اور کی آغوش میں پہنچ جاتی۔ اس آخری خیال کے ڈر سے اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہوئی۔ اور وہ متین لہجہ میں آہستہ سے بولا:

"خدا کرے کہ یہ کبھی بڑی مصیبت نہ ہو۔ الحمد للہ کہ آج سب طے ہو گئی ہے مجھے مجتبیٰ فقط وفا قہ منظور ہے۔ مگر شکیلہ ہرنگٹن بغیر ایک لحظہ بھی زندگی منظور نہیں"

اور دراصل اس کا خیال درست بھی تھا جس ماہوش لڑکی کو انسان اپنی آنکھوں کا نور اور اپنے امراض کا مداوا سمجھ رہا ہو۔ اس سے ہمیشہ کی جدائی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اور زندگی دوبھر ہو کر لحظہ بلحظہ مصیبت خیز بن جایا کرتی ہے۔ اس نے اس وقت اپنے سامنے شکیلا ہرنگٹن کا سنس کھٹ روتا ہوا چہرہ دیکھا۔ جو اسے اشک آلودہ آنکھوں سے مسکرا کر کہہ رہی تھی: "تیرے لئے میں دین و دنیا دونوں قربان کر سکتی ہوں"

شکیلا ہرنگٹن کیسا پیارا نام تھا۔ اس کی باتیں اس کا استقلال اس کا غصہ اس کی سختی۔ اس کی ہٹ کیسی دلفریب تھی۔ کوئی عاشق کے دل سے پوچھے مگر اب وہ سنگدل لڑکی اس کے ہاتھوں میں موم ہو گئی تھی۔ اور وہ اسے چھاتی سے لگا کر کہہ آیا تھا: "میری ناؤلی شکیلا تیرے لئے میں بھی دین و دنیا سے ہاتھ دھو سکتا ہوں"

اور وہ دونوں عاشق و معشوق اشک آلود آنکھوں سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تھے۔ مگر اس بلا خیز اور مہیب موقعہ پر ان کی روحیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہو کر یک جان و دو قالب بن گئی تھیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت۔ کوئی تعزیت کوئی درد و کلفت یا شر انہیں علیحدہ کرنے والا نہیں تھا۔ وہ شیر و شکر تھے۔ ایک بغیر دوسرے کی زندگی نصف۔ رفیق احمد بغیر شکیلا کے زندگی ادھوری کس قدر بڑا انقلاب تھا۔ کیسا زلزلہ مہیب تھا۔ اور نتیجہ اس کا کس قدر خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ دونوں ساری عمر کے لئے ایک ہو گئے تھے۔ ایک کی آغوش سے دوسرے کی امنگیں ہم کنار ہو گئی تھیں ایک کی جوانی سے دوسرے کی رعنائی چسپاں ہو گئی تھی۔ جل بے اثنائی تغیر و تبدل

وخواہشات۔ تمہارے امنگوں کا کسی کو علم نہیں۔ تم پتھر کے اندر لات مار کر پانی نکال دیتے ہو۔ تمہارے استقلال سے فرہاد شیریں کے لئے جوئے شیر کھود لاتا ہے تمہاری بلند پروازی سے دنیا کے عظیم الشان پہاڑوں کا زہرہ آب ہے۔ تمہارے جادہ اور بلند نظری سے چاند و سورج جھک جاتے ہیں اے انسان تو واقعی اشرف البنیان ہے اس وقت رفیق احمد کے دل میں شکیلہ ہیرنگٹن کی محبت اور بے بسی کوٹ کوٹ کر بھر گئی ہے۔ اور وہ اسے اپنی رگ رگ میں بھری ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اس کی مست راز آنکھوں کو چوم کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اس کے زاہد فریب ٹکڑے کی چوٹ سے اس کے سارے جسم میں بہادری اور جوانمردی جوش میں آگئی تھی۔ کیا صفائی کا ذکر اگر دو کوڑی کو محتاج ہو جاوے۔ اس کے پاس زر و جواہرات کی دیوی موجود تھی۔ اس نے اپنے والد صاحب کی میز پر ایک مطبوعہ فہرست ان اشخاص کی پائی۔ جو ان کے گہرے معتقدین میں تھے۔ لیکن ان کے اندر صادق علی کا نام تھا۔ بظاہر اس کے والد نے صادق علی کا نام ضعف ہستی سے محو کر کے اپنے خمیر کی پریشانیاں دھو ڈالی تھیں۔ ان اسماء میں سے دسواں آدمی رفیق احمد خود دیکھ چکا تھا۔ اس نے دس بارہ معزز آدمیوں کے نام جلدی جلدی خطوط لکھے۔ اور ان سے دریافت کیا "آیا وہ اس کے والد صاحب کے دوست صادق علی صاحب سے واقف تھے؟"

پھر اس نے ایک درجن خطوط لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور میز سے ایک ضروری سرکلر نکال کر دیا سلائی سے روشن کیا۔ اسی اثنا میں اس کے نوکر نے نقرئی پلیٹ پر ایک کارڈ پیش کیا۔ جسے پڑھ کر اسے بے چینی سے کہا "اچھا سلام دو"

اسی وقت مسٹر کامران اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ رفیق احمد نے اس سے مصافحہ کر کے کرسی دی۔ اور دھڑکتے دل سے بولا:

"میں آپ کا نہایت عدیم الفرصت ہوں۔ میری بے اعتنائی سے ناراض نہ ہوئیگا

پھر سگریٹ کا بکس کامران کے آگے ڈال دیا۔ کامران اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا۔ جو سب اس کی ملازمت اور روانگی وغیرہ سے تعلق رکھنے والی تھیں۔ رفیق اس وقت ایک اور خط لکھ رہا تھا۔ وہ بے پرواہی سے کامران کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ پھر ایک خط ختم کر کے بولا "معاف کیجیگا۔ ہاں آپ میری روانگی کی بابت پوچھ رہے تھے۔ اب لڑکی پریشانا رشوار ہے۔ نیکسلیا ہیرنگٹن نے مجھے چند روز کے لئے روک لیا ہے۔ شاید لڑکی پر سردست نہ جاؤں"

کامران اس کے پرائیویٹ معاملات میں جرح و قدح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ دراصل اس وقت رفیق احمد سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ رفیق احمد نے اپنے خط سے ہاتھ روک کر کامران کی طرف دیکھا۔ پھر منہ سرخ کر کے بولا "مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ اس قدر جلدی واپس جانے پر تیار ہو گئے۔ ابھی ٹھہریئے۔ میں ایک ہفتہ کے اندر آپ کی عنایات کا شکریہ ادا کر دونگا"۔ کامران کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ اور اس نے گھبرا کر کہا "معاف فرمائیگا۔ میں آپ سے معاوضہ مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ آپ ابھی کہاں سے دے سکتے ہیں۔ ابھی تو آپ کو عرصہ دراز تک اپنے والد صاحب کا ترکہ نہیں مل سکتا"۔

رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "میں آپ کی شرافت کا مشکور ہوں لیکن کسی نہ کسی طرح آپ کو فی الفور معاوضہ دونگا۔ لفظ معاوضہ پر مجھے معافی چاہیئے جلدی میں زبان سے نکل گیا۔ دراصل نذرانہ زیادہ زیبا ہوگا"۔ کامران نے دھڑکتے دل سے تبسم ظاہر کیا۔ اور وہ قیمتی سگریٹ کا دھواں اڑا کر سوچنے لگا۔ کہ رفیق احمد کا کیا مطلب تھا۔ وہ اس وقت رفیق احمد کو اس قدر مصروف اور گھبرایا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا۔ کہ اس سے سبب دریافت کرے۔ لیکن وہ اس وقت دراصل معاوضہ کی نیت سے آیا تھا۔ اور واقعی غرض ایسی بلا ہوتی ہے۔ کہ بہادر سے بہادر آدمی کو تھوڑی دیر کے لئے کمزور بنا دیتی ہے۔ شعر مشہور ہے "آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج۔ احتیاج است

احتیاج است۔ احتیاج"

رفیق احمد نے اپنا آخری خط ختم کر کے دوبارہ پڑھا۔ پھر اسے بلاٹنگ سے خشک کر کے لفافہ میں رکھا۔ یہ خط ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے نام حسب ذیل عبارت میں تھا:

"جناب من۔ تعلیم۔ میں پیسہ اخبار کا خریدار نمبر ۳۰۰۳ ہوں۔ براہ کرم اشتہار منسلکہ کو فوراً اس ہفتہ کے اخبار میں درج کر کے مجھ سے معاوضہ بذریعہ ویلیو پے ایبل وصول کر لیا جاوے۔

"اگر مسز ظریفہ خاتون مجھ سے فی الفور خط و کتابت کریں گی۔ اور اپنے والد صاحب کا پورا نام و پتہ شغل زندگی لکھیں گی۔ تو مجھ سے ایک نہایت ضروری بات اپنی فلاح کے متعلق فی الفور سنیں گی"

المشتہر۔ رفیق احمد خلف جناب مولوی شفیق احمد صاحب مرحوم شفیق منزل روڑکی"

رفیق احمد نے جملہ خطوط پر ٹکٹ لگائے۔ اور میز سے گھنٹی بجا کر نوکر کو بلایا جس کے کانے پر اس نے خطوط دیکر کہا "یہ سب خطوط ضروری ہیں۔ ڈاک خانہ کا وقت نکل گیا ہے۔ ریس پر لے جاؤ۔ اور جلدی واپس آؤ" پھر وہ مسکرا کر کامران کی طرف مخاطب ہوا۔

ستروال باب

غریبوں کی زندگی

غریبوں کی کون سنتا ہے؟ کیا وہ خدا کی پیاری مخلوق میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔ کیا انہیں اسی وسیع دنیا میں پاؤں پھیلانے کا حصہ نہیں کیا ہم آتے جاتے ان کی نالہ نہیں سنتے۔ کیا ان کی آہ و بکا کے تڑپا دینے والی آوازیں عرش معلے کے منصہ و درخشاں عدالت میں گونج گونج کر نہیں ٹکراتیں؟ کیا ہمیں دن رات سسکتے ہوئے بے زبان دست و پا بریدہ مفلوج و مجذوم کنگال سڑکوں

اور نالیوں میں پڑے نہیں ملتے۔ کیا ہم کبھی ان کی مصیبت ہٹانے کی فکر کرتے ہیں۔ کیا ان غریب بے بس اور مایوس العلاج لنگڑے لولے آدمیوں کے اندر نقل و حرکت کی قابلیت پاتے ہیں۔ کیا ہمیں کبھی یہ خیال گذرتا ہے۔ کہ انہیں تقاضائے بول و براز بستی سے دور جنگلوں میں جانے پر مجبور نہیں کرتا۔ پھر انہیں کون بچاتا ہوگا۔ کیا ہم مصیبت زدہ بیوگاں ہاتھ پاؤں سے عاری۔ بوڑھی عورتوں اور ننھے معصوم بچوں کے ہاتھوں کو پھیلا ہوا نہیں دیکھتے۔ کیا ہم نے کبھی انہیں مصیبت کی ٹھوکر اور ناطلبیدہ مصیبات سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ لاکھوں کروڑوں محتاج مرد اور عورات اور ان کے بچے اس خستہ حال اور بدنام گمنام زندگی سے نکل کر تمدن کے پر فضائل طبقات میں شریک ہونے کے قابل نہیں۔ آخر کیوں نہیں۔ کیا انہوں نے ہماری یا خدائی شان میں کوئی ظلم کیا ہے۔ کیا ان کے اجسام میں ہماری جیسی جان نہیں۔ کیا ہم نے قدم ازل سے آرام دولت۔ فروت اور نجات آخرت کا پٹہ لکھوا لیا ہے۔ کیا ہم ان بدے پس ماندہ محتاجوں پر حکومت کرنے اور جھڑکنے ڈرانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو ہم سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ کیا ہم کروڑوں بچوں کو تعلیم یافتہ بنا کر تہذیب اور مساوات کے درجوں میں لے آنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ سب کچھ ممکن ہے۔ مگر ہم کچھ نہیں کرتے۔ پیشہ ور گداگروں کو جانے دو۔ بازاروں اور سڑکوں میں لاکھوں بھیک مانگنے کتوں اور سانپوں کی طرح اپنی جان بچائے پھرتے ہیں۔ ہمیں ان کی جان ایک خرمہرہ کے برابر بھی قیمتی معلوم ہوتی۔ اور اگر ان میں سے کوئی گاڑی یا گھوڑے کے نیچے کچل کر مر جاتا ہے۔ تو ہمیں ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ کیا ہم اپنی کھلی ہوئی بے رحم آنکھوں سے وقتاً فوقتاً کسی بھوکے برہنہ بوڑھے محتاج کنگال کو سردی کا ٹھنڈی مردم کش ہوا یا بارش کے نیچے اداس سے مرا ہوا نہیں پاتے یا ہم نے کبھی خیال کیا ہے۔ کہ ہمارے سے ضعف اور بیماری سے گھبرا کے جان لڑی

کی طرح بے حس و حرکت معلوم ہوتی نہیں۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اس کی پیشانی پر بے شمار جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے بال عمر سے زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ پر ایک قسم کی سیاہی اور زردی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ناک لانبی تھی۔ لیکن اس وقت سوکھ کر ایک انگلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور ہونٹ کباب کی طرح سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس کے سر پر کچھ ادھ ڈھلے بال بہت کثرت سے بڑھ گئے تھے۔ چہرہ پر دار ہی بلا خیز سرعت کے ساتھ [illegible] کر پھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنی مصیبت اور تکلیف کے آخری حصہ پر پہنچ تو گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک سال سے سل کے عارضہ میں مبتلا تھا۔ اور اپنی حیثیت کے مطابق سب کچھ کر چکا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے ارادوں سے پسپا ہو کر سفر آخرت کا تہیہ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک نوجوان خوبصورت مگر مردنی چھائے ہوئے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ عورت اس کی زوجہ اس کی محرم راز تھی۔ خوبصورت نہیں مگر عورت کے چہرے پر زردی پھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور ناامیدی چھا رہی تھی۔ وہ محبت بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے تاامید چند دنوں کے مہمان نوجوان شوہر کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن محبت کی جگہ اس کی آنکھوں میں رنج۔ غم اور جگر سوزی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ دراصل وہ چھ ماہ سے رات دن شوہر کی خدمت گذاری میں بسر کر رہی تھی۔ اور سے ساری رات جاگتے گذر جاتی تھی۔ لیکن آج اس کی مصیبت کا خاتمہ تھا۔ جس وقت مصیبت حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ نوجوان خوبصورت معصوم فیاض ہنس مکھ لڑکی نے جس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اپنے شوہر کی علالت اور گھریلو مصیبت کو رضا و تسلیم سے قبول کر کے اپنی جان لڑا دی تھی۔ وہ پر امید زندگی سے بعد پر حوصلہ دل سے شب و روز بلا تنخواہ

نوکر کی طرح اپنے شوہر اپنے جان و مال کے مالک نوجوان کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنے آرام کو اس شوریدہ بخت شوہر پر نثار کر کے تکلیف اور بے آرامی کی قسم کھالی تھی۔ نہیں۔ نہیں۔ اس نے اپنے اوپر آرام حرام کر لیا تھا مگر اس سے کیا فائدہ۔ کچھ نہیں۔ شوہر کی علالت روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ گھر میں جو کچھ روپیہ پیسہ تھا۔ وہ سب علاج معالجہ میں صرف ہو گیا۔ اور اس غریب شوریدہ بخت لڑکی کے پاس جو کچھ ابا کا زیور تھا صدقہ بھی اس شوہر کے سر پر قربان کر دیا گیا۔ اس وقت وہ ایک ٹوٹی پھوٹی پرانی چارپائی پر پاؤں زمین سے لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے پلنگ پر صرف ایک پرانی دری تھی۔ اس کے سر کے نیچے کوئی تکیہ نہیں تھا اس کی چارپائی پر کوئی لحاف نہیں تھا۔ دو پرانی دھوتیاں جوڑ رکھی تھیں۔ اس کے جسم پر میلا کچیلا لباس تھا۔ اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے اور میلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے کان و ناک زیور سے خالی تھے۔ سر پر سرخ ٹول کا پرانا دوپٹہ تھا۔ بدن میں ٹول کا سرخ میلا کرتا تھا۔ ٹانگوں میں چھینٹ کا میلا پائجامہ اس کے پاؤں میں ایک پرانا پھٹا ہوا جوتا تھا۔ جو بظاہر اس کے شوہر کا اتارا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں نہیں۔ لیکن ہاتھ پاؤں کا سب زیور خاوند کی تیمارداری میں سنار کے یہاں رہن رکھ دیا گیا تھا۔ وہ دل کی مضبوط تھی۔ لیکن مضبوطی کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس کے خوبصورت رخساروں اور آنکھ ناک کی موزونیت سے وہ حسینوں میں بڑی ممتاز تصور ہو سکتی تھی۔ لیکن ہائے وہ دن کو ننھا ہو گا۔ کہ وہ خیالی صورت ہو گئی۔ اب وہ دن بظاہر آنے والا نہ تھا۔ کیا ان خوبصورت خدوخال کے لئے نئے شگفتہ اور خوشبو سے معطر کپڑوں کی ضرورت نہ تھی۔ کیا ان میں کچلی اکھڑی ہوئی لکھاں سے ڈھکی ہوئی انگلیوں کے واسطے صابون اور حنا کی ضرورت نہ تھی۔ کیا اس کے نازک خوبصورت ٹھڑے کے واسطے غازہ کی حاجت نہ تھی۔ کیا اس خوبصورت یا خوبصورت چوٹی کے واسطے تیل و کنگھی فضول ہے۔ کیا ان محبت بھری بڑی بڑی آنکھوں کے واسطے

سرمہ اور درخشاں موتی جیسے دانتوں کے واسطے مسی لاحاصل ہے۔ اُف کیسی صابر اور مستقل مزاج لڑکی تھی۔ وہ زلیخا کی طرح خوبصورت تھی۔ مگر اس مظلوم مصیبت زدہ نوجوان شوہر کی تندرستی کو لعل وجواہر دے کر خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے پاس لعل وجواہر نہیں تھے۔ کیا وہ اپنی جان کے بدلے اس شوہر کی تندرستی کو واپس لے لینے پر تیار نہ تھی کیا وہ اپنے خون جگر سے اس کی تیمارداری میں مصروف نہ تھی۔ مگر آہ آج ان سب مصیبتوں کی حد ہو گئی تھی اس کے پاؤں کے پاس کچھ روکھہ اور ایک خون ولعثم سے بھری ہوئی ٹین کی سیلا بچی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کی ناک میں اس ملغم اور خون کی بو پہونچتی تھی۔ مگر وہ اس کے پیارے جان سے زیادہ عزیز شوہر کے سینے اور دل ودماغ کا خون تھا۔ آہ۔ اس چند دنوں کے مہمان شوہر کی کھانسی اٹھی۔ اور اس نے سر اُٹھا کر سیلا بچی کی طرف منہ کیا۔ غم زدہ لڑکی کے سینے میں تیر سا چبھ گیا۔ اور اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر سر نیچا کر لیا۔ اور سیلا بچی پاس لگا دی۔ ملغم کے راستے بہت سا گلابی خون گرا۔ اور نوجوان مریض کے چہرہ پر مردنی اور زردی چھا گئی۔ نوجوان لڑکی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ نکل پڑے۔ مگر وہ اس قسم کے ہزاروں خون اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھی۔ وہ غش کھانے والی نہ تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایک میلا سڑا ہوا رومال اپنے سرہانے سے نکالا۔ اور خاوند کے ہونٹ صاف کر کے بولی "یا دون"

مگر اس آواز میں ایسی نقاہت اور ناامیدی تھی۔ کہ سننے والے کا دل بھر آیا۔ اس نے رو کر کہا "میری لاڈلی۔ تجھے ساری رات جاگتے گذر گئی تو آرام کر۔ آج میری حالت سب دنوں سے ابتر ہے۔ بس تو آرام کر۔ اور مجھ سے ہاتھ دھو لے ہائے تیری نوجوانی اور یہ مصیبت" نوجوان مریض کے منہ سے یہ الفاظ اس قدر دھیمی آواز میں نکلے۔ کہ اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے معلوم دیئے

معلوم دیئے۔ نوجوان لڑکی کا دل ہل گیا۔ اس کے سینے میں بے شمار تکلیفوں کی گرہ لگ گئی۔ اس نے سیلابچی کے خون پر آنکھیں لگا کر کہا "تم گھبراؤ نہیں۔ خداوند کریم سب سے بڑا حکیم ہے۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے"

نوجوان شوہر نے سر ہلا کر جواب دیا "نہیں نہیں۔ بس اب تم صبر کرو" نوجوان لڑکی کے ہوش و حواس باختہ ہونے لگے۔ آج اُسے اپنے شوہر کی حالت سب دنوں سے خراب تر معلوم ہو رہی تھی۔ یہ دونوں ایک چھوٹے سے مکان میں تھے۔ اس کمرے کے آگے ایک چھوٹی سی فرسودہ سہ دری تھی۔ اس کے آگے برائے نام صحن تھا جس میں اس وقت دھوپ چمک رہی تھی۔ اور اندر کے تاریک و تنگ کمرے کی تکلیف پر دھوپ بھی کڑکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ صحن میں میلے گھروندوں کے پاس ایک ننھا تین سال کا بچہ کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رات کی غلاظت جمع تھی۔ اس کی ناک اور ہونٹ تھوک اور رال سے بھرے تھے اس کے جسم پر ایک میلا کرتا تھا۔ سر پر کوئی ٹوپی نہ تھی۔ اس کی ٹانگیں ننگی تھیں۔ اس کے پاؤں پر میل اور سیاہی جم رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ پھٹے ہوئے تھے وہ ادھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ پر ایک گھڑے کے اندر ہاتھ ڈال کر منہ دھونے لگا اور مسکرا کر گھڑے کے اندر منہ دیکھنے لگا۔ گھڑا پانی سے بھر رہا تھا۔ اور ایک کنکر کے سہارے سے کچی زمین پر گرا رہا تھا۔ ننھے بچے کے زور سے گھڑا ہل گیا۔ اور سارا پانی بچے کے کرتے اور ٹانگوں پر آ رہا۔ بچے نے چیخ کر ہاتھ پاؤں مارے۔ اور اس کا سر کچی زمین سے لگا۔ وہ بھاپ کے بل گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اس کی چیخ سے نوجوان مصیبت زدہ ماں کی روح کانپ گئی۔ اور وہ بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بچے کو گود میں اٹھانا چاہا۔ مگر اس کا کرتا پانی سے شرابور ہو رہا تھا۔ مصیبت زدہ ماں نے بھرے دل سے بچے کو چمکا کر کرتا اتار دیا۔ مگر وہ گھڑے کے گر جانے سے ایسا ڈر گیا تھا۔ کہ رونا بند نہ کیا۔ اور "آبا۔ آبا" بھی بھولنے لگا۔ غریب آفت رسیدہ ماں اس کی ننگی کمر کو اپنے دوپٹہ

سے ڈھک کر باپ کے پاس لائی۔ ننھا بچہ آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے باپ کو دیکھ کر زور سے رونے لگا۔ اور چلا کر بولا "ابا مجھے ماں نے مار دیا"

نوجوان مریض تپ کی روح تڑپ گئی۔ اس کی آنکھوں سے حسرت کے آنسو نکل پڑے۔ اور رو کر بولا "

میرے معصوم بچے تجھے دنیا نے مار دیا" پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیوی سے کہنے لگا۔ میری پیاری اسے باہر لے جاؤ۔ مجھ سے اس کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی۔ ہائے۔ کیا یہ یتیم ہو جانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ آہ۔ مجھ سے تم دونوں کو رنج کے سوا کیا ملا" بے بس ماں کی آنکھوں میں خون حسرت جمع ہو گیا۔ وہ بچے کو لے کر باہر نکل آئی۔ اور اس کے سر کو کھول کر دیکھنے لگی۔ کہ کہاں چوٹ لگی تھی بچے کے ماتھے پر ورم ہو گیا تھا۔ اس اثناء میں بچے نے رونا بند کر دیا۔ اور اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھ کر کہا۔

"اماں۔ روٹی" نوجوان مفلس ماں کا دل تڑپ اُٹھا۔ اس کے گھر کا باورچی خانہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ دو وقت سے روٹی میسر نہیں آتی تھی۔ گھر میں آٹے دال کو کوڑی نہیں تھی۔ پھر بچے نے ماں کی چھاتی سے لگ کر کہا "اماں بڑا مزا دے"

آہ۔ کیا وہ مصیبت زدہ بچہ ان خبروں سے واقف تھا۔ مگر اُسے اپنے گھر کی مصیبت کی خبر نہیں تھی۔ مصیبت ماں اُسی مکان کے صحن میں بیٹھ گئی۔ اور گھڑے کو اس کی جگہ رکھتی ہوئی زار و زار رونے لگی۔ اس کی آہ رسا عرش معلّٰے پر دھواں بن کر پہونچی۔ اور فرشتوں کا زہرہ آب ہو گیا حضرت فرشتوں نے چلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کیا "اے رب العالمین کب تک حکم ہے۔

اس کے احکام کبھی خطا کرنے والے نہیں ہوتے۔ ایک آن واحد میں دنیا بدل گئی۔ اور نوجوان مصیبت زدہ عورت کے کانوں میں چاروں طرف سے آوازیں آئیں "صبر کر صبر کر۔ تیں کسی کی مصیبت پسند نہیں" اسی لمحہ میں

مکان کے دروازہ پر چپڑی رسان نے آواز دیکر کہا منشی جی آپ کا اخبار ہے۔ بابو صاحب نے رسان کی آواز پر ننھے بچے کو بیکل ہوتا دیکھکر چھوڑ دیا۔ اور وہ برہنہ پا دوڑتا دہلیز میں بھاگا ہوا گیا اور ایک ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے آیا۔ وہ اخبار کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اور "اماں الف بے" کہہ رہا تو شکستہ دل ماں نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اور اس کا منہ چوم کر کہا "ہاں بیٹا الف بے" اور اسی لمحہ میں اس مفلس اور نادار ماں کو اس ننھے بچے کی آنکھوں میں ساری دنیا کی دولت نظر آگئی۔ نوجوان زوجہ اخبار لئے ہوئے خاوند کے سرہانے آئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ تمہارا اخبار ہے۔ مگر طبیعت اچھی نہیں۔ اس وقت مت پڑھو۔

بیمار شوہر نے بے چینی سے ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ اخبارات پڑھنے کا بڑا شائق تھا۔ اور اسی شوق کی وجہ سے اس خستہ حالی میں بھی اخبار خریدنے پر مجبور تھا۔ وفادار زوجہ نے اخبار اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور ایک گٹھڑی میں سے دوسرا کرتا نکال کر بچے کو پہنانے لگی۔ بچہ کرتا تبدیل کرنے پر پہر میں ٹیں کرنے لگا مگر اس کے باپ نے اخبار کا ورق اس کی طرف پھینک کر کہا "بچہ رونا اچھا نہیں۔ لو اخبار پڑھو" ننھے بچے نے ہنس کر ورق ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور ہر ماں کرتا پہناتی رہی۔ وہ آبا الف بے۔ ابا۔ الف بے کرتا رہا مریض نوجوان نے بے چین اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اخبار کی ورق گردانی کی تعلیم یافتہ مفلس اور ناامید لوگوں کو دنیا کی ہر ایک چیز میں امید نظر آیا کرتی ہے معلوم نہیں یہ مصیبت زدہ نوجوان اس وقت کسی آرزو میں تھا۔ شاید وہ پیسہ اخبار کے کالم "حفظ صحت" میں کوئی دوا اپنے مرض کے لئے دیکھنا چاہتا ہو۔ اس کے ہاتھ میں یہ اخبار لاہور کا مشہور ہفتہ وار پرچہ پیسہ اخبار تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر جلدی جلدی پیسہ اخبار کلب کی سطور پر پہنچا جہاں اس نے پڑھا۔ اگر معزز غریبہ خاتون مجھ سے فی الفور خط و کتابت کرے گی۔ اور اپنے والد صاحب کا پورا پتہ و شغل زندگی لکھے گی۔ تو مجھ سے ایک نہایت

ضروری بات اپنی افلاس کے متعلق سنے گی۔

اشتہار۔ رفیق احمد خلف مولوی شفیق احمد صاحب شفیق منزل روڑکی"

اس اشتہار کے مضمون سے اس کے نیم جان دل میں برق تاب تیزی سے متحرکن پیدا ہوئی۔ اور اس نے دھندلی آنکھوں سے بار دیگر اشتہار پڑھا پھر دل میں کہنے لگا" غریبہ خالو ں مولوی۔ شاید یہ شخص اس آدمی کا بیٹا ہے جو میری دو جہ کو عرصہ دراز تک دس روپیہ ماہوار بطور وظیفہ کے دیتا رہا" پھر اخبار بند کر کے بیوی کی طرف دیکھکر بولا" میری پیاری کیا تم مولوی شفیق احمد صاحب کے لڑکے رفیق احمد سے واقف ہو"

نوجوان غریب عفت مآب لڑکی نے بے چین آنکھوں سے خاوند کو دیکھا اور دھڑکتے دل سے بولی۔

کون رفیق احمد خدا کرے میں کسی کو نہیں جانتی" نیم مردہ شوہر کے چہرہ پر امید تبسم ظاہر ہوا۔ اور اسے اپنا دماغ گرم اور حرارت خیز معلوم ہونے لگا۔ اس نے پھر اخبار کھولا۔ اور ہنسکر کہنے لگا" پیاری لو اس اشتہار کو پڑھو" پیسہ اخبار کلب میں ہے" نوجوان لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اخبار لے لیا۔ اور جلدی جلدی اس اشتہار پر پہنچ گئی جس کا اس کے شوہر نے ذکر کیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں ایک حرف نہ آیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی متوحش خواب دیکھ رہی ہے۔ اس نے اشتہار کو دوبارہ پڑھا۔ پھر فق شدہ چہرہ خاوند کی طرف کر کے بولی" میں اس شخص رفیق احمد کو نہیں جانتی۔ البتہ اس کا باپ مجھے دس بارہ برس تک محتاج سمجھکر دس روپیہ ماہوار بھیجتا رہا تھا۔ خالہ جان کے نام ہر ماہ منی آرڈر آیا کرتا تھا۔ اس اشتہار سے کیا مطلب ہے کیا اس کا بیٹا اس روپیہ کو واپس مانگتا ہے۔

اور اس کلمہ کے ادا کرتے ہی نوجوان لڑکی کی آنکھوں کے سامنے تاریکی آگئی۔ اس کے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا۔ کہ وہ شوہر کا علاج کر سکے۔

کسی کے احسانات کو کس طرح ادا کر سکتی ہے۔ مریض مشوہر نے مسکرا کر جواب دیا۔

نہیں پیاری۔ وہ روپیہ نہیں مانگتا۔ صاف طور سے کہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہارے والد صاحب کوئی ضروری چیز چھوڑ گئے ہیں۔ شاید کچھ روپیہ بینک میں ہو۔ چونکہ مولوی شفیق احمد صاحب عرصہ تک تمہاری پرورش کرتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ اشتہار محض تمہارے لئے ہے تم جھٹ پٹ جواب دو۔ کاش کچھ روپیہ مل جاوے۔ اور میرے بعد تم مصیبت سے آزاد ہو سکو۔

نوجوان زوجہ کی آنکھوں میں رونق آگئی۔ مگر اس نے جھلا کر کہا۔ تم بار بار میرا دل دکھاتے جاتے ہو۔ تمہارے بغیر مجھے روپیہ کیا فائدہ دے سکتا ہے تم ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ ہائے اللہ میں کیا کروں!!

اور یہ کہہ کر نوجوان لڑکی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے ننھا بچہ چارپائی سے اتر کر پھر باہر نکل گیا۔ اور صحن مکان میں الف ب الف ب کرنے لگا۔ حرمت علی نے لانبا سانس بھر کر کہا۔ میری لاڈلی رونے دھونے کی بات نہیں۔ خدا کرے تمہاری زبان مبارک ہو۔ اور میں اچھا ہو کر تمہارے احسانات کے بدلے تمہاری خدمت کر سکوں۔ اس اشتہار میں مجھے امید کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیا بھنگن آچکی؟

غریبہ خاتون نے آنسو پونچھ کر کہا۔ نہیں ابھی نہیں آئی۔ کم بخت حفیظاً بھی نہیں آئی۔ نانی جان سے کچھ اور صابر منگاتی۔ حرمت علی نے بیوی کی اشک آلودہ نگاہوں کو محبت سے دیکھ کر کہا۔ اپنی نانی صاحبہ سے ایک روپیہ قرض منگالو۔ اور رفیق احمد کو تار بھیجدو۔

اسی لمحہ میں صحن مکان سے بھنگن کی جھاڑوں کی آواز آئی۔ پھر ننھے بچے نے بھنگن سے کوئی بات کہی۔ غریبہ خاتون دوپٹہ کے دامن سے آنکھیں پونچھ کر باہر نکلی۔ اور بھنگن سے فی الفور اپنا پیغام کہا۔ پانچ منٹ کے

کے بعد بھنگن اُلٹے پاؤں واپس آئی ۔ اور غریبہ خاتون کے ہاتھ میں روپیہ دے کر بولی "آپ کی نانی جان نے میاں کا مزاج پوچھا ہے ۔ اور رات میں آنے کو کہا ہے ۔

غریبہ خاتون نے روپیہ ہاتھ میں لے لیا ۔ اور بھنگن سے بہری آواز میں کہنے لگی "اچھی صنیا ذری حفیظ کو بلا ۔ اللہ سنوار ہی اب تک نہیں آئی ۔ کچھ سودا سلف منگانی ہے" بھنگن اپنا ٹوکرہ ایک طرف رکھکر باہر گئی ۔ اور غریبہ خاتون نے دھڑکتے دل سے روپیہ خاوند کے تکیہ کے پاس رکھکر کہا "تم تار لکھدو ۔ حفیظ کو بلایا ہے" پھر ایک طاق کے اندر سے دوات قلم اور ایک تختہ کاغذ لاکر خاوند کے پاس رکھدیا ۔ حضرت علی نے لیٹے لیٹے حسب ذیل تار لکھدیا ۔

ادھر جانب غریبہ خاتون معرفت حضرت علی کلارک محکمہ نہر اوپر کوٹ میرٹھ ۔ بنام رفیق احمد شفیق منزل رڑکی ۔

والد کا نام صادق علی بھٹیکہ دار ہردوار ۔ شوہر سخت بیمار للہ مدد کرو ۔

محکمہ تار رسانی نے لاکھوں کروڑوں تار روانہ کئے ہوں گے ۔ مگر اس سے زیادہ ضروری اور کار آمد تار کبھی نہ روانہ ہوا ہوگا ۔ اے یہجان تار جلدی اپنا کام کر ۔ ایک شریف مصیبت زدہ نوجوان کی جان بچالے ۔

اکہترواں باب

غیبی امداد

دن کے آٹھ بجے ہونگے ۔ کہ اوپر کوٹ محلہ میں غریب خستہ حال پورانے مکان کے پاس ایک گھوڑا گاڑی نکلی ۔ پریشان تنگ آئے ہوئے گاڑی والے نے جسے گھنٹہ بابو حضرت علی کی تلاش میں گذر گیا تھا ۔ اپنے سامنے ایک بہشتی کو کمر پر مشک لئے ہوئے دیکھا ۔ اور جہلا کر پوچھا "او میاں بہشتی کچھ تمہیں معلوم ہے ۔ بابو حضرت علی کا مکان کونسا ہے ؟" بہشتی نے آنکھ اٹھاکر

گاڑی بان کی طرف دیکھا۔ اور مکان کی دہلیز میں گھستا ہوا کہنے لگا "یہی گھر ہے" پھر اس نے آنے والے مسافر کی طرف دیکھکر کہا۔ بابوجی تو سخت بیمار ہیں کیا آپ ان سے ملنے آئے ہیں"

گاڑی کے اندر سے نوجوان رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے سر نکالا اور جیب سے کارڈ نکال کر کہا "بھائی صاحب یہ کارڈ بابو صاحب تک پہنچاؤ" بوڑھے بہشتی نے بھیگے ہوئے ہاتھ سے چھپا ہوا کارڈ لے لیا۔ اور دہلیز میں چلا کر کہا "پانی آتا ہے"

ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد بہشتی اندر داخل ہوا۔ اور گھٹڑوں کے پاس ننھے بچے کو کھیلتا دیکھکر بولا "بیٹا یہ کارڈ اپنے ابا کو دیدو" پھر یہ سمجھکر کہ بچہ کہیں کارڈ کو پھاڑ نہ دے۔ اس نے زور سے چلا کر کہا "بابوجی کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ننھے کے ہاتھ میں ایک پرچہ ہے" بہشتی ننھے بچہ کو اندر جاتا ہوا دیکھکر باہر نکل آیا۔ اور خود دس سال صغرنے نے اجنبی مہمان کا کارڈ صحیح سالم ماں کے ہاتھ میں دیدیا۔ کارڈ پر انگریزی لکھی ہوئی تھی۔ جسے غریبہ خاتون نہ پڑھ سکی۔ مگر اس نے دھڑکتے دل سے یہ کارڈ اپنے شوہر کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور گھبرا کر پوچھنے لگی "کون آیا ہے"

مریض حضرت علی نے کارڈ کو پڑھ کر منہ سے رفیق کہا۔ اور بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وفا جسم سچے دل سے محبت کرنے والی عورت اپنے اپنی آنکھوں سے کب دور کر سکتی تھی۔ جب وہ اس کے بول و براز کو بھی اپنے ہی ہاتھوں سے سمیٹتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کو نرم ہاتھوں سے بستر پر لٹا دیا۔ اور گھبرا کر بولی "تم کہیں مت جاؤ۔ گر جاؤ گے۔ انہیں اندر بلا لو۔ مگر گھر میں سے کون آواز دے"

لیکن بوڑھا بہشتی اس گھر کی کیفیت سے پورے طور پر واقف تھا۔ اور وہ رفیق احمد کے ذکر سے جو کہ وہ اسباب لئے کھڑا معلوم

کر چکا تھا ۔ کہ نوجوان مہمان روکی سے آ رہا ہے ۔ اس نے سڑک کے اوپر ایک بڑھیا عورت کو جاتے ہوئے دیکھا ۔ اور اسے آواز دے کر بلا لیا پھر اس نے عورت کو اندر بھیج کر اطلاع کرا دی ۔ دو منٹ کے اندر غریبہ خاتون اپنے کوٹھے سے ملحقہ کوٹھڑی میں گھس گئی ۔ اور عورت کے ذریعہ سے نو وارد مہمان کو اندر بلا لیا ۔ جس وقت رفیق احمد اس شکستہ حال پرانے گھر میں داخل ہوا ۔ تو اس کی ناک میں گھر سے نمی اور غلاظت کی بو آئی ۔ نئی (نو) قعر امیر گھرانے کا عالی خاندان اور ذی رسوخ وارث اس سڑے ہوئے گھر سے کس طرح محظوظ ہو سکتا تھا ۔ وہ صحن مکان میں آیا ۔ تو اسے ننھے اصغر میلے کرتے میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑا دکھائی دیا ۔ جو اس وقت نو وارد کی صورت شکل سے ڈر کر اندر بھاگنا چاہتا تھا ۔ صاحب زادہ رفیق احمد کو معلوم نہیں تھا ۔ کہ یہ خورد سال بچہ کون تھا ۔ مگر اوسے اس کی معصوم صورت اور بوسیدہ حالت پر بڑا ترس آیا ۔ اور اس نے اسے ایسی سردی میں ننگے پاؤں اور ننگے سر پا کر غور سے اس کی طرف دیکھا ۔ اور اس کے دل میں ایک قسم کی بے چینی پیدا ہوئی ۔ اوسے معاً خیال گذرا ۔ کہ یہ لڑکا جس کے بدن پر کافی کپڑے بھی نہ تھے رشتہ دار غریبہ خاتون یا اس غریب محتاج لڑکی کا نتیجہ ہے اس کے والد نے دیدہ و دانستہ کنگال بنایا تھا ۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا دل بھر آیا اس نے ننھے بچے کی انگلی پکڑ لی ۔ اور اسے شفقت بھری نگاہ سے دیکھ کر بولا "تمہارا کیا نام ہے ۔

خورد سال بچہ اپنے نام سے ناواقف تھا ۔ اس کے چہرہ پر ڈر اور خوف کے علامات ظاہر ہوئیں ۔ اور اس کی نوبت بہ گریہ پہنچ گئی ۔ نوجوان رفیق احمد نے اس کے میلے کچیلے ہاتھ پاؤں کا کچھ خیال نہ کر کے اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے لئے ہوئے اندر داخل ہوا ۔ جہاں اوسے بڑھیا عورت نے خدمت علی کی طرف

اشارہ کر کے بتلا دیا تھا۔ رفیق احمد دھڑکتے دل سے اس تنگ و تاریک کوٹھی میں داخل ہوا۔ اور اسے ایک چارپائی پر سوکھی بوسیدہ صورت حرمت علی کی نظر آئی جس کی آنکھیں اس تاریکی میں بڑی متوحش اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ رفیق احمد اس مریض نوجوان کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختگی السلام علیکم نکلا۔ پھر اس نے بچہ کو پاس کی چارپائی پر بٹھلا دیا۔ مریض چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ اور رفیق احمد کے سلام کا جواب دیکر اس کی طرف دھڑکتے دل اور بے چین آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ رفیق احمد کو اس تنگ و تاریک غلیظ گھر میں پیشاب اور پاخانہ کی بدبو آئی۔ اور اسے ان پرانے میلے کچیلے کپڑوں سے نفرت ہوئی۔ جو دونوں چارپائیوں پر پڑے تھے۔ مگر اس کا دل اچھل اچھل کر بآواز بلند کہہ رہا تھا "یہ سب مصیبت تیری بدولت پیدا ہوئی۔ تیرے باپ نے اس لڑکی کو مصیبت اور افلاس کی گھاٹی میں دھکیل دیا۔ صرف تیری وجہ سے" رفیق احمد گھبرا کر بچے کے پاس بیٹھ گیا۔ اور مریض کو خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ کر بولا "میرے پاس غریبہ ..... آپ کی اہلیہ صاحبہ کا تار پہنچا تھا جسے صرف چند روز گزرے۔ اپنے والد صاحب کے کاغذات سے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ صادق علی صاحب اپنی صاحب زادی کے لئے ایک لاکھ روپیہ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ روپیہ اب میری حفاظت میں آ گیا ہے۔

"رفیق احمد کے منہ سے غریبہ صادق علی اور ایک لاکھ سن کر غریب نوجوان کا دل سینہ میں اچھل پڑا۔ ادھر کوٹھڑی کے اندر غریب غریبہ خاتون نے چیخ ماری۔ رفیق احمد نے کوٹھڑی کی طرف منہ کر کے بآواز بلند کہا "نہیں غریبہ خاتون تیرا باپ ایک لاکھ روپیہ چھوڑ گیا ہے۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا۔ کہ تیری اور تیرے شوہر کی یہ حالت ہے تو کبھی پیٹن بھاسی وقت سول سرجن کو بلا لاتا ہوں۔ اور اگر خدا نے چاہا۔ تیرا غریب شوہر بہت جلد شفایاب ہو جاویگا" یہ ایک لاکھ روپیہ تم دونوں کو ابھی دس بارہ دن کے اندر مل جاویگا"

اس اثنا میں خود وسال اصغر نے رفیق احمد کی جیب سے سنہری گھڑی نکال لی تھی اور جب وہ اس کمرہ سے رخصت ہونے لگا۔ تو بچے نے گھڑی دینے سے انکار کیا۔ اور سر ہلا کر رونے لگا۔ رفیق احمد نے اس کے غمناک چہرہ پر بوسہ دیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ غریبہ خاتون کا بچہ دنیا کی چیزوں سے محروم ہے!

وہ جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ اور غریبہ خاتوں نے کوٹھڑی کے اندر سے مکمل کر دیکھ کر اپنے دل سے اپنے شوہر کی صورت دیکھی۔ جو مسکرا کر بولا "میری لاڈلی غریبہ۔ تیرے باپ نے ہمیں مالا مال کر دیا۔ مجھے اپنے بدن میں طاقت معلوم ہوتی ہے۔ اور شریف نوجوان آدمی اصغر کو اپنی سنہری گھڑی دے گیا اس کے ہاتھ سے لے لو۔ ورنہ وہ پاش پاش کر دیگا"

نوجوان لڑکی نے خوشی کے آنسو بہائے۔ اور بچے کو چھاتی سے لگا کر بولی۔ تیرا نانا ایک لاکھ چھوڑ گیا ہے۔ اب تیرا ابا رئیس ہو جاویگا۔ اور تجھے ایک گھوڑا لے دیگا"

بچہ ان باتوں کو کچھ نہ سمجھا۔ وہ گھڑی کی زنجیر اور اس کے پرزوں کو ہلا ہلا کر توڑے ڈالتا تھا۔ نصف گھنٹہ تک خاوند و زوجہ تبسم تاب آنکھوں سے امداد غیبی کا ذکر کرتے رہے۔ اور غریبہ خاتوں کو اپنے شوہر کی حالت لحظہ بلحظہ بہتر معلوم دی۔ نصف گھنٹہ کے بعد سول سرجن اس کے مکان میں داخل ہوا۔ اور حرمت علی کا ملاحظہ کر کے تشویش ظاہر کی۔ لیکن حرمت علی نے مسکرا کر سول سرجن کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے بولا "اب میں مرونگا نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا بلغم خشک ہو گیا۔ نصف گھنٹہ سے مجھے کھانسی نہیں اٹھی"

سول سرجن نے رفیق احمد کی طرف دیکھ کر جواب دیا "میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کہ انہیں جلدی آرام ہو جاویگا۔ لیکن اس مکان کو آگ دے دو کسی بلند اور صاف مکان میں لیجا کر رکھو" پھر سول سرجن نے کاغذ منگا

کر نسخہ لکھا۔ اور رفیق احمد کے ساتھ ٹم ٹم میں سوار ہو کر دوا کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں محلہ کی کئی عورتیں جمع ہو گئیں۔ اور رفیق احمد کی آمد پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور رفیق احمد کے ملازم نے وہیں ایک چارپائی منگا کر رفیق احمد کا اسباب بچھا کر چسپٹ کر رکھا۔ اور ہر ایک ہی گھنٹہ کے اندر سارے محلہ میں مشہور ہو گیا۔ کہ غریبہ خاتون کا باپ اس کے واسطے کسی بینک میں ایک لاکھ روپیہ چھوڑ مرا تھا۔ رشتہ دار عورتوں میں کھل بلی مچ گئی بہت سی اپنی چھاتی پیٹ کر بیٹھ گئیں۔ جنہیں غریبہ خاتون اور اس کے شوہر سے محبت تھی۔ فوراً دوڑی کر اس نامعقول گھر میں آ پہنچیں۔ اور مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ غریبہ خاتون کو بے مانگے مفت کی نوکرانیاں بدرجہ مائیں مل گئیں۔ رفیق احمد نے شفاخانہ سے واپس آ کر حرمت علی کے پاس کسی کو کہلا بھیجا۔ کہ اس کے لئے ایک معقول بنگلہ کرایہ پر لیا جائے۔ جہاں حرمت علی کے بدن میں جان آ جانے پر اس کا گھرانہ مستقل ہو سکے گا۔ رفیق احمد کی مہربانی اور سرگرمی پر غریبہ خاتون عش عش کر رہی تھی۔ اور اس کی تکلیف کا خیال کر کے بار بار اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین رفیق احمد نے غریبہ خاتون کے افلاس کو چشم خود ملاحظہ کر کے فوراً اپنی جیب سے چند اشرفیاں اندر بھیجا دیں۔ اور اپنے آپ دلیز کلب کو روانہ ہو گیا جس کا وہ عرصہ سے ممبر تھا۔

بہتروں باب

دلی آرزو پوری ہو گئی

دو روز بعد چار بجے شام کی گاڑی سے رفیق احمد رڑکی سے واپس آیا۔ اور اس نے اسٹیشن کے باہر اپنی ٹم ٹم تیار پائی۔ جس کے لئے وہ تار بھیج چکا تھا۔ اس نے اپنا اسباب نوکر کے ساتھ ایک گھوڑا گاڑی میں

شفیق منزل کو بھیجدیا۔ اور خود شکیلا ہیرنگٹن سے ملاقات کرنے کو روانہ ہوئی۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ نصف گھنٹہ کی تیز رفتار ی سے وہ شکیلا ہیرنگٹن کے بنگلہ پر پہنچی۔ اور تم تم سے اتر کر مسکراتا ہوا اندر گھس گیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں سیکڑوں خیالات تھے۔ لیکن اُسے اپنا دل ہلکا معلوم ہو رہا تھا۔ اور میرٹھ جانے۔ اس غریب گھرانے میں امن اور شادمانی پیدا کرنے سے اُسے ساری دنیا مسکراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا دل انسانی شرافت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی سے لبریز تھا۔ اور وہ یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ صرف گذشتہ دو دن کے اندر وہ دنیا کے اصلی دائرہ اور انسانی فرائض کی نچلی سیڑھی پر پہنچا تھا۔ ابھی اوسے دنیا میں بہت سا کام کرنا باقی تھا۔ لیکن سب سے بالاتر اور عزیز مقصد جو اس کے دل کو دنیا بھر کی جملہ آرزؤں اور امنگوں سے زیادہ حظ اور نفع پہنچا سکیگا۔ وہ صرف غربا اور مساکین کی دستگیری میں نظر آرہا تھا۔ آہ۔ ان غریب پژمردہ اور متفکر لوگوں کو آزاد اور پر تبسم بنانے سے بہتر کیا بات ہو سکتی تھی۔ اوسے حرمت علی اور اس کے ننھے بچے کا بار بار خیال آتا تھا۔ اور وہ ان کی محتاجی اور بے بسی دیکھ کر دل میں کہتا تھا "کاش میں ان کی فلاح اور دستگیری پر اپنی جان نثار کر سکوں"

وہ فرحان دل سے شکیلا ہیرنگٹن کی لائبریری میں پہنچ گیا۔ جہاں خوبصورت لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر کرسی سے اُٹھ گئی پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس سے مصافحہ کرتی ہوئی بولی "تم کو سنی گاڑی پر آئے۔ تمہاری گاڑی کے پہیوں کی آواز بھی سنائی نہیں دی"

رفیق احمد نے بڑے اشتیاق دل سے اس کے پیار سے نرم ہاتھوں کو دبایا۔ اور مسکرا کر بولا "میری گاڑی کے پہیوں پر ربڑ لگی ہوئی ہے۔ میں ابھی میرٹھ سے آرہا ہوں"

شکیلا نے دھڑکتے دل سے اوسے کرسی پر بٹھلایا۔ اور شرم تاب آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ کر بولی "میں کل شام آپ کے درِ دولت پر گئی تھی۔ وہاں سے معلوم ہوا۔ کہ تم بلا اطلاع میرٹھ چلے گئے تھے۔ کیا ماجرا ہے؟"

رفیق احمد نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا "میرے لئے چار منگاؤ۔ میں تھک رہا ہوں۔ آج صبح سے خدا آرام نہیں ہوا لیکن آج کے مقدس کام سے میری روح مسکرا رہی ہے"

شکیلا نے میز پر گھنٹی بجا کر عزیز کو بلایا۔ اور چار منگانے کا حکم دیا پھر اپنے شرخ حیا بھرے ہوئے چہرہ کو رفیق احمد کی طرف کر کے بولی "میرٹھ میں کام کیا تھا؟"

رفیق احمد نے مسکرا کر دھڑکتے دل سے جواب دیا "میری لاڈلی اب وہ وقت ہے۔ کہ تم آج ہی مسلمان ہو جاؤ"

شکیلہ نے فق شدہ رنگت کو چھپا کر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا "آج ہی مسلمان ہو جاؤں۔ اس قدر جلدی" رفیق احمد نے متین لہجہ میں کہا "میری پیاری تمہیں سب قصہ سناتا ہوں۔ پہلے تو یہ خط پڑھو۔ اس سے تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ میرے بدبخت والد نے محض میری خاطر ایک غریب محتاج لڑکی کا ایک لاکھ روپیہ ضبط کر لیا تھا" شکیلہ نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے خط لے لیا۔ اور صادق علی کی اس تحریر کو جو مولوی شفیق احمد صاحب کے نام تھی۔ تمام و کمال پڑھ کر بولی "بے شک صاف ظاہر ہے۔ تو کیا آپ نے اس لڑکی کا پتہ لگا لیا؟"

رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "پتہ بہت جلدی لگ گیا تین روز گذرے۔ میرے پاس اس لڑکی کا تار آیا تھا۔ جس سے یہ معلوم کر کے کہ غریب خاتون کا شوہر بہت سخت بیمار تھا۔ اور ان غریبوں کو روپیہ کی اشد ضرورت ہے میں فی الفور روانہ میرٹھ ہوا۔ اور وہاں جا کر

میں نے غریبہ خاتون کے گھرانے پر اس قدر افلاس اور مصیبت گھری ہوئی پائی کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ غریبہ خاتون کا شوہر حضرت علی ایک سال سے بیماری سل سخت بیمار ہے۔ اور ان غریبوں کو روٹی کپڑا بھی میسر نہیں۔ میرے اس اعلان سے کہ غریبہ خاتون کا والد ایک لاکھ روپیہ میری تحویل میں چھوڑ گیا ہے۔ ان غریبوں پر امید کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اور اس مردہ جاں فزا سے مریض حضرت کے بدن میں جان آتی ہوئی معلوم دیتی ہے۔ لیکن اگر اب انہیں کسی وجہ سے ایک لاکھ روپیہ نہ مل سکا۔ تو یہ بات یقینی ہے۔ کہ حضرت علی خاں جانبر نہ ہو سکیں گے۔ میں اس لئے براہ راست تمہارے پاس آیا ہوں۔ کہ تم آج ہی مشرف باسلام ہو جاؤ۔ تاکہ میں تم سے نکاح کر کے فی الفور اگرہ جاؤں اور ایک لاکھ روپیہ غریبہ خاتون کے قدموں پر ڈال دوں۔ حضرت علی کی بیماری کے سوا مجھے ان کے ننھے بچہ پر اس قدر ترس آتا ہے۔ کہ میں اظہار مطلب کے واسطے کافی الفاظ نہیں پاتا۔ اس سردی اور خوفناک موسم میں غریب بچے کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں۔ ان الفاظ سے شکیلہ ہر مگدن کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے پر وحشت خوف زدہ آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھ کر جو بدستور بے فکر بے فسکر ان غریبوں کو روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سن کر میں اس قدر مضطرب مسلمان کس طرح ہو جاؤں۔ مجھے سوچنے دو۔ میرے آبا و اجداد کی عزت دم زدن میں برباد ہوئی جاتی ہے۔ ذرا غور تو کرو۔ کیا کوئی اور سبیل ایسی نہیں جس سے ہم ایک لاکھ روپیہ دلا سکیں؟

شکیلہ نے یہ الفاظ ادا تو کر دیئے۔ مگر اس کا دل بے قراری سے اچھل اچھل کر نکلا جاتا تھا۔ اور اسے ٹھیک طور سے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کیا کہہ رہی ہے رفیق احمد نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "میری لاڈلی۔ میری دین و دنیا کی محافظ بار بار اپنے آبا و اجداد کی عزت کا ذکر کیے جاتی ہو۔ تمہیں غور کرنا چاہیئے۔ کہ قبروں کے مردوں کی عزت انسان کا ناموس زیادہ عزیز ہے۔ یا ان غریب محتاج فاقہ کش مریض لوگوں کا جن

بدن میں جان شیریں تڑپ رہی ہے۔ اور چند دنوں کے مہمان ہیں۔ میں کسی مذہب کو مقدس نہیں سمجھ سکتا۔ جب تک اس کے فرائض غریب بھائیوں کی امداد کو مذہب کی تقلید اور راسخ الاعتقاد روایات پر ترجیح نہ دیتے ہوں۔ تمہارا تمہارے آباؤ اجداد کا مذہب اور ان کے تلقین وعظ و نصائح تمہیں یا مجھے ذرا بھر فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ ایک بنی نوع انسان کی حالت ہم سے چلا چلا کر کہہ رہی ہے "مدد کرو۔ مدد کرو" یہ بالکل ٹھیک ہے کہ یہ سب آفت میرے والد نے اپنے ہاتھ سے پیدا کی لیکن غور تو کرو۔ سب کچھ میرے لئے کیا۔ اور جب تم میری ہو۔ اور میں تمہیں اپنے دین و ایمان کا محافظ بنا چکا ہوں۔ افسوس ہے۔ کہ تم میرے دل کے خیالات سے متاثر نہ ہو سکو۔ مجھے اس وقت اپنے باپ کی عزت کا بھی اتنا خیال نہیں جتنا صدمہ ان غریبوں کی حالت کا میرے دل پر ہے۔ اگر تمہیں میرے باپ سے دشمنی ہے۔ تو ان کا ذکر جانے دو۔ للہ ان غریبوں پر رحم کھاؤ۔ ان کی مصیبت کو ہلکا کرو۔ میرے کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ میں عہد و اثق کر چکا ہوں۔ کہ ان غریبوں کی ساری مصیبت اپنے اوپر لونگا۔ اور جب تک ان کے پاس ایک لاکھ نہ پہنچ جائے اپنے اوپر آرام حرام کر لونگا۔ اگر تم اب بھی راضی نہیں ہوتی۔ تو میں تم سے دوبارہ نہیں کہونگا۔ میں ایک تحریر مجسٹریٹ بہادر رڑکی کے نام اس مضمون کی بھیج دونگا کہ میرے والد صاحب نے جس قدر رقم بینک میں جمع کی ہے وہ سب غریب خاتون کی ہے۔ اور میں اپنے باپ کے ننگ و ناموس قایم رکھنے کے لئے اس تحریر کو روانہ کرتے ہی کنوئیں میں ڈوب مرونگا" ان الفاظ سے رفیق احمد کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ادھر شکیلا ہیزگیٹن نے چیخ ماری۔ اور اچھل کر رفیق احمد سے لپٹ گئی۔ اور اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے محبت بھری آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھ کر کہا "میرے جان اور دل کے مالک میری آرزو کے بارے میں تیری شرافت کی قائل ہو گئی ہوں۔ بس صرف تیرا امتحان کر رہی

ہی۔ میں تین چار روز سے مشرف باسلام ہونے کو تیار بیٹھی ہوں۔ درحقیقت مجھے محض مذاہب کی تقلید سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑا اور سب سے بلند تر مقصد مذاہب کا یہ ہونا چاہیے۔ کہ ہم اپنے بنی نوع بھائیوں کے کام آویں۔ بیشک غریبہ خاتون اور اس کے شوہر کو ہماری امداد کی ضرورت ہے اور میں ان کے لئے ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ ابھی قاضی کو بلوا لو۔ اور مجھے مسلمان کر کے نکاح پڑھا لو۔"

رفیق احمد نے اچھلتے ہوئے دل سے شکیلہ ہیرنگٹن کو زور کے ساتھ چھاتی سے لگا لیا۔ اور اس کے خوبصورت زاہد فریب رخسار کو بار بار بوسہ دیکر کہا۔"

میری لاڈلی۔ کیا واقعی یہ سچ ہے۔ آج میرے دل کی سب آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ میں اپنے والد کی عزت قائم رکھنے کو اپنا فخر سمجھونگا۔ اور غریب محتاجین کی دستگیری کر کے انہیں نجات دلاؤنگا۔ تو میرے مقصد میں مدد کر۔ میں اور میرے دین و دنیا کے مراحل میں چمکدار رہنما ستارے کا کام دیگی۔"

شکیلہ ہیرنگٹن نے رفیق احمد کی بہادر شرافت مجسم پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہا کر بولی۔" آمین۔"

نہتر واں باب

شب زفاف

اگلا دن رفیق کے لئے دنیا دی کامیابیوں کی بہار و فتوحات کا تھا۔ اسے اپنی کامیابی میں کوئی دقیقہ باقی نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ صبح سے

اُٹھ کر ضروری کاموں میں اس قدر مصروف رہا تھا۔ کہ محض چار بجے شام کو اسے یہ معلوم ہوا۔ کہ اب اسے کپڑے تبدیل کر کے کسی دعوت میں شریک ہونا ہے۔ اور وہ دعوت محض اس کے روشن ضمیر و وسیع کی ایجاد تھی۔ اس نے جھٹ پٹ غسل کیا۔ اور نہایت شاندار کوٹ پتلون پہنکر مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ وہ جلدی جلدی اپنے وسیع باغ میں داخل ہوا۔ جہاں نوکر چاکر چاروں طرف روشنی اور میز کرسیوں کا انتظام کر رہے تھے۔ اس نے جھٹ پٹ نوکروں سے چند باتیں کیں۔ اور تیار شدہ ٹم ٹم میں سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ غروب آفتاب کے بعد نوکروں نے چاروں طرف چراغ روشن کر دیئے۔ اور ان کے آس پاس سرخ و سبز رنگ کی جاپانی قندیلوں میں موم بتیاں جلا دیں۔ باغ کے سبز سبز گھاس کے مقابلہ میں چراغاں اور قندیلوں کی روشنی ایسی دل فریب معلوم ہوتی تھی۔ جیسی ساحل سمندر پر عظیم الشان جہازوں کی روشنی جگمگا یا کرتی ہے۔ رات بالکل تاریک تھی۔ اور ان چراغوں لیمپوں اور قندیلوں کی روشنی سے ایک نئی دنیا قایم ہو گئی تھی۔ شفیق منزل کے چپہ چپہ پر ہزارہا چراغ کرم شب تاب کی طرح چمک اُٹھے تھے۔ چراغاں کے روشن ہوتے ہی مہمانان کی آمد شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ باغ کی میز کرسیاں گھرنے لگیں۔ میزوں کے پاس نوجوان بلند اختر زرق برق کپڑے پہنے ہوئے مہمانان کی آؤ بھگت کر رہا تھا۔ اور سب لوگوں میں سگریٹ سگار پان حقہ تقسیم ہو رہے تھے۔ اس اثنا میں چند معزز یورپین کرنل بنڈن بلڈ میجر لیچ کپتان بریٹ و کپتان براؤ فیلڈ صاحب مجسٹریٹ بہادر روکی آ گئے۔ اور بلند اختر نے تعظیم سے انہیں انگریزوں کی میزوں پر بٹھلا دیا۔ اسی لمحہ میں سفر مینا کی کمپنی نے جو کرنل بلڈ کی اجازت سے بلائی گئی تھی۔ ترانہ شادی

بجانا شروع کیا۔ اور اس کی آواز سے ساری روکی میں ہل چل مچ گئی ہزارہا تماشا ہی مرد و زن بچے بے تحاشا شفیق منزل کی طرف بھاگ پڑے۔ نصف گھنٹہ کے اندر تقریباً پچاس ہندو مسلمان معززین دس بارہ انگریز افسر اور ان کی لیڈیاں موجود ہوگئیں۔ اور ہزارہا تماشائیوں کا اژدہام لگ گیا۔ چاروں طرف ہاؤ ہو کا شور مچ گیا میز کے گرد جملہ معززین سگریٹ سگار اور پان خوری میں مصروف تھے۔ اور ان کے اندر ایک سرخ ریش قاضی صاحب سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ ان بزرگوار کا نام قاضی عنایت علی تھا۔ جو قصبہ منگلور سے محض اس بنیاد پر بلائے گئے تھے۔ کہ مولوی شفیق احمد کا ان سے بڑا دوستانہ رہا تھا۔ اور رفیق احمد کا نکاح ان ہی کی زبان سے بطریقہ احسن انجام پاسکیگا وہ دراصل ایک قسم کے متجر عالم بھی تھے۔ آٹھ بجے شب کے قریب تمام منتظرین کی آنکھیں شکیلہ بیگم اور رفیق احمد پر لگی ہوئی تھیں لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ سب حیرت میں تھے۔ کہ کہاں رہ گئے۔ ادھر سفرینا کے ہاجانوز اپنے شیریں سے شیریں نغمات سے باغ کے پھول اور پرند کو تڑپائے دیتے تھے۔ ادھر ضعفت دہلیز اور دہن کے دیدار میں آنکھیں پھاڑے منتظر کھڑے تھے۔ اسی لمحہ میں جنوب کی طرف سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک لمحہ بعد ایک چار گھوڑوں کی فٹن مہمانان کے پاس آکر رکی۔ سب سے یکساں زبان ہوکر کہا۔ آگئے۔ آ گئے" فٹن کے اندر سے نوجوان رفیق احمد مسکراتا ہوا اترا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر شکیلہ بیگم انگریزی دلہنوں کے چمکدار لباس میں ملبس تھی۔ جو راتوں رات بذریعہ تار منصوری سے منگایا گیا تھا۔ اس کے سر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ لیکن چہرہ گہری نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے شرم مآب لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور

اور عزیز آمس بالٹی مور نے اس کے دامن سنبھال لئے۔ تمام مسلمان کھڑے ہوگئے۔ اور سینکڑوں زبانوں سے السلام علیکم۔ تسلیم۔ آداب نکلا۔ رفیق احمد اشاروں سے سب کے سلام لیتا ہوا انگریزوں کی طرف پہنچا۔ اور وہاں سب لوگوں میں شکیلا ہیرنگٹن کو باضابطہ پیش کرکے بتلایا۔

یہ معزز لڑکی لارڈ بشپ ہیرنگٹن کی نام لیوا ہے" جملہ معززین کے دل دھڑکنے لگے۔ اور انگریزوں نے اس سے بڑی تپاک گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر نوکروں نے بھاگ کر گھاس کے اوپر ایک اونی قالین بچھایا۔ اور اس پر ایک چاندی کی میز لگا دی گئی۔ اس میز کی گردنیں چار مکلف کرسیاں بچھ گئیں۔ اور شکیلہ و رفیق احمد بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے مس بالٹی مور اور عزیز آکر کھڑی رہیں۔ قاضی عنایت علی صاحب فربہ جسم اور لمبے قد کے آدمی تھے۔ ان کے سر پر مقدس عمامہ بندھا ہوا تھا۔ بلند خوش نے انہیں اشارہ سے دلہا دلہن کے پاس بھیجدیا۔ اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر سرگوشی کی باتیں کرتے رہے۔ دو تین منٹ تک قاضی عنایت علی صاحب نے خضوع و خشوع کی آواز میں چند آیات قرآنی اور کچھ مسنون کلمات طیبات پڑھا کر شکیلہ ہیرنگٹن کو مسلمان کیا۔ اور اپنے چغہ کی جیب سے ایک ہار نکال کر اس کی گردن میں ڈال دیا۔ پھر رفیق احمد نے کانپتی ہوئی آواز میں کھڑے ہو کر کہا:

"معزز حاضرین اور عالی قدر یورپین افسرو۔ آپ لوگ اس بات کے گواہ ہیں۔ کہ معزز شکیلہ ہیرنگٹن لارڈ بشپ ہیرنگٹن کے خاندان کی نام لیوا ہے۔ اس وقت سے مسلمانوں کے بیت مقدس میں شریک اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر زمان کی امت میں داخل ہوگئی۔ سینکڑوں زبانوں سے یک لخت بجان اللہ جزاک اللہ نکلا۔ اور ادھر انگریزوں نے متہ بٹا کر

لمبے سانس بھرے۔ اسی لمحہ میں قاضی عنایت علی صاحب نے پھر کلمات طیبات پڑھے اور بلند آواز میں رفیق احمد سے پوچھا "کیا آپ شکیلا ہیرنگٹن کو بہ ادائیگی مہر شرعی اپنی زوجہ تسلیم کرتے ہیں"

رفیق احمد نے بھرے ہوئے دل سے جواب دیا۔ دل وجان سے"

پھر قاضی عنایت علی صاحب نے شکیلا ہیرنگٹن کی طرف منہ کرکے پوچھا کیا آپ صاحب زادہ رفیق احمد کو اپنا شرعی شوہر تسلیم کرتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے نوجوان عفت مآب لڑکی کی زبان بند ہوگئی پھر اس نے اپنے دل کو قابو میں کر کے جواب دیا "سر آنکھوں پر میں ساری عمر اس معزز اور شریف شوہر کی خدمت گذاری کرونگی اور اس کی وفاداری کو وسیلہ نجات سمجھوں گی"

چاروں طرف سے آمین آمین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اور اسی لمحہ میں سینکڑوں ہار رفیق احمد اور شکیلہ ہیرنگٹن کی گردن میں ڈالے گئے۔ اختر نے بتدریج ان ہاروں کو نکالنا شروع کیا۔ ادھر چھوہارے اور تازہ بتاشہ مٹھائیاں تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ بیس منٹ کے بعد جملہ تماشائیوں کو پولیس والوں نے ڈنڈے کے زور سے نکال دیا۔ اور معززین کے سامنے پر تکلف کھانے چنے گئے۔ ایک گھنٹہ تک اس باغ میں پر لطف چہل پہل رہی۔ اور شاندار دلکش باجوں کے نغموں سے جنگل میں منگل ہوگیا۔ دس بجے رات کو شکیلہ ہیرنگٹن رفیق احمد کے مہارے سے زنان خانہ میں لائی گئی۔ جہاں رفیق احمد کی والدہ اس کی پھوپی بہن اور ماماؤں نے اس کے سر پر ہزار ہا روپیہ نچھاور کر کے محتاجین میں تقسیم کرنے کے لئے علیحدہ کر دیا۔ شفیق منزل کے چپہ چپہ اندر اور

باہر چراغاں کی بے مقدار روشنی ہو رہی تھی۔ اور در و دیوار سے خوشی اور امن برس رہا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے شب کے دولہا و دلہن اپنے مکلف استراحت خانہ میں پہنچے۔ جو جھاڑ و فانوس اور جگمگاتے ہوئے لیمپ فرش و فروش دیبائے و حریر سے نمونہ فردوس بن رہا تھا۔ اس شاندار مکلف کمرہ میں اگر کوئی کمی تھی۔ تو وہ نوجوان زاہد فریب نیس تھا عروس کی صورت لئے پوری کر دی۔ دراصل آج شکیلہ ہیرنگٹن کی شب زفاف تھی۔ لہٰذا فوراً اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اور خوش نصیب دولہے نے عروس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اور سے چھاتی سے لگا لیا۔ اور اس کے گلابی ہونٹوں کو بوسہ دے کر کہا

"پیاری اب تو ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی"

شکیلہ ہیرنگٹن نے اچھلتے ہوئے دل سے رفیق احمد کے منہ کو بوسہ دے کر کہا "ہاں پیارے میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو گئی۔ اور آخرت میں بھی تمہارا ساتھ دونگی"

شکیلا ہیرنگٹن اپنی مسہری پر بیٹھ گئی۔ اور رفیق احمد اسے پر اشتیاق آنکھوں سے اندر کے اکھاڑے کی منتخب پری سمجھکر گھورنے لگا۔ پھر اس نے اس کی مسہری پر بیٹھ کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے شکیلا ہیرنگٹن نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے علیحدہ کر دیا۔ اور مسکرا کر بولی "میں دراصل اتنی جلدی ان باتوں کے لئے مسلمان نہیں ہوئی۔ جب تک تم ایک لاکھ روپیہ غریب خاتون کے پاس نہ پہنچا دو مجھے چین نہ پڑے گی۔ کیا یہ زیبا ہے۔ کہ وہ غریب لوگ محتاجی اور افلاس کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ اور ہم دنیا کی نعمتوں میں مزے اڑائیں"

رفیق احمد نے فرط شوق میں اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھتا ہوا کہنے لگا "پیاری میں انہیں ایک بنگلے میں مقیم کرآیا

ہوں۔ ان کے لئے نوکر چاکر موجود ہیں۔ ننھے بچے کے لئے آیا نوکر رکھ لی ہے۔ اور حرمت علی کی حالت روبہ صحت ہے۔ اب مجھے اپنے باغ کی سیر کرنے دو۔

رفیق احمد کو ایسے بے حجابانہ باتیں کرتے ہوئے دیکھکر شکیلہ ہیرنگٹن شرم کے مارے گھبرا گئی۔ اور مسکرا کر بولی "اچھا ٹھیرو ماس قدر جلدی ہم پسند نہیں کرتے۔ جب تم نے ہمیں مسلمان کیا ہے۔ تو ہمیں نماز پڑھنے دو۔ رات کی نماز کا کیا نام ہے عشا"

رفیق احمد نے جھلا کر کہا "اوہو۔ اب آپ نماز پڑھیں گی۔ کل سہی۔ اب کیا موقع ہے"

شکیلہ ہیرنگٹن نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "ابھی آپ کی چھیڑ خانی مجھے نہیں بھاتی۔ مجھے وضو کرا کر نماز پڑھا دو۔ پھر جو تمہارا دل"

رفیق احمد نے شکیلا ہیرنگٹن کے خوبصورت ہونٹوں کو چوم کر کہا۔ بڑی کٹر مسلمان نکلے گی۔ آخر ہے تو پادری لارڈ بشپ کی نواسی پہلے کٹر عیسائی تھی۔ اب کٹر مسلمان بنے گی"

شکیلہ نے پرمذاق آنکھوں سے رفیق احمد کو دیکھکر کہا "آج ہم صبح تک نماز پڑھیں گے" پھر شکیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بولی۔

"اچھا ہمیں نماز عشا پڑھا دو۔ پھر جو تمہارا دل" رفیق احمد مجبور ہو گیا۔ اور اس کے لئے آفتابہ میں پانی لایا۔ اور اس کے حکم کے بموجب وضو کرا کر سب سے پہلے عشا کی نماز پڑھائی۔ اور دنیا نے ایسے شریف ایسے معصوم ایسے سچے محبت کرنے والے ایسے خوبصورت خاوند و زوجہ اکم دیکھے ہونگے"

چونہترواں باب

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

میری تم اس وقت دنیا بھر کی پریوں سے زیادہ خوب صورت ہو"

یہ الفاظ نوجوان خوبصورت شوہر کے منہ سے نکلے۔ جو اس وقت اپنے شاندار مکلف کمرہ میں گرم آتش خیز دودکش کے پاس نازنین دلہن کے چہرہ پر جھکا ہوا اس کی دل آرام گردن میں اپنی والدہ کا قیمتی سنہرا ہار ڈال رہا تھا۔ یہ چہرہ عروس کے گلابی چہرہ پر عفت اور حیا کی سرخی چمک اٹھی۔ اور اس کی ہنس مکھ مگر رات بھر کی جاگی ہوئی آنکھوں میں روشنی نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے لمبے بالوں کو درست کر کے تبسم سے جواب دیا "تمہاری تعریف مجھے کہیں بدصورت نہ کر دے بیٹھ جاؤ"

مگر بے تاب پر اشتیاق شوہر رات بھر کے بوس و کنار سے اور زیادہ مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی نازنین عروس کے شگفتہ غسل خوردہ ہونٹوں پر بھرے ہوئے دل سے بوسہ دیکر کہا۔ میں کس طرح بیٹھ جاؤں میرا دل نہیں مانتا۔ یہ دل چاہتا ہے۔ کہ تمہیں اپنے سینہ کے اندر بند کر لوں"

خوبصورت عروس سنہرے ہار کو تبسم سے دیکھکر آرام کرسی سے لگ گئی اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرف نظر پھیر لی۔ سامنے ایک کرسی پر نوجوان دولہا بیٹھ گیا۔ اور نازک اندام دلہن کی خوبصورت ریشمی ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی پاجامے کی بہار کو دیکھکر اوس کے جسم میں مدہوشی طاری ہوئی۔ ہندوستانی پاجامہ شکیلہ ہیرنگٹن کے بھرے ہوئے سفید سرخی مائل بدن پر کس قدر موزون معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس کے ریشمی موزوں سے ڈھکے ہوئے پاؤں کو اپنی ران پر رکھ لیا۔ اور شکیلا ہیرنگٹن گدگدی محسوس کرکے پاؤں کھینچنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی "تم نے ساری رات مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ اب مجھے نیند آرہی ہے"

اس کے بھیگے ہوئے معطر گھنے بھورے بال آرام کرسی کے اوپر فرش تک لٹک رہے تھے۔ اور اس کی خوبصورت آنکھوں کے نیچے ساری رات کی شب بیداری سے ہلکے ہلکے گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کا چہرہ معمول سے زیادہ پیلا معلوم ہو رہا تھا۔ بعض عاشق مزاج شوہر اپنی معشوقہ زوجہ کے باغ حسن سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔

تندرست نوجوان نیک چلن رفیق احمد اس وقت اپنے عالم شباب میں تھا۔ رات بھر جاگنے سے اس کی آنکھوں میں بھی نیند بھر رہی تھی لیکن سویرے غسل کرنے سے اس کی آنکھیں بھی کسی قدر سرخ ہوگئی تھیں۔ اس نے نازک اندام بیوی کے دل فریب ابھرے ہوئے سینہ پر چمکدار سرخ اونی سوئٹر کو نہایت چستی اور مستعدی سے چسپاں دیکھا۔ اور اس کی گستاخی پر رشک کھا کر بے تاب ہوگیا۔ وہ بار دیگر اٹھ کر شکیلا کے پاس آیا۔ اور اس کے بالوں کو درست کرکے بولا۔

"میری جان تمہاری خوبصورتی لحظہ بلحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ہندوستانی

یا شکیلہ تمہاری ٹانگوں میں کس قدر بھدا معلوم ہوتا ہے"

یہ کہکر اُس نے پھر شکیلہ ہیرنگٹن کے منہ سے منہ لگا دیا۔ شکیلہ نے منہ ہٹا کر چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور ہنس کر بولی "تم باغ حسن کا بہت ذکر کرتے ہو۔ سیر باغ کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ اب اپنے کام دھندے میں لگو"

رفیق احمد نے رہ رہ کر کنکھیوں سے کمروں کے پردوں کی طرف دیکھا اور اس کے سینے سے منہ لگا کر کہنے لگا۔ میری بات کو سنو۔

شکیلہ ہیرنگٹن نے مسکرا کر شرم بھری آواز میں جواب دیا۔ خدا کی پناہ کوئی بات بھی ہے۔ ابھی غسل کر کے آئی ہوں تمہارا جسم خود سردی سے کانپ رہا ہے۔ تمہاری والدہ کیا کہے گی۔ دن رات غسل۔ بس ہٹو۔ دن میں ان واہیات باتوں کا کیا ذکر۔ تمہیں دنیا میں اور بہت سے کام ہیں۔ کیا ان غریبوں کو بھول گئے۔ جن کی مدد کے واسطے تم نے مجھے مشرف باسلام کیا ہے۔

"رفیق احمد کی رنگت فق ہوگئی۔ وہ لانبا سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے ولولوں کو یک لخت دبا ہوا پا کر نرمی سے بولا۔

"بیشک مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔ آج صاحب مجسٹریٹ بہادر سے سرٹیفکیٹ لے کر روانہ ہونا چاہیئے۔ اور روپیہ وصول کر کے غریب خاتون کے پاس پہنچانا چاہیئے۔ ادھر۔ تمہارے خوبصورت چہرہ کے آگے میں ان غریبوں کو بالکل بھول گیا تھا" شکیلہ ہیرنگٹن نے اسے پر تبسم آنکھوں سے دیکھا۔ اور متین لہجہ میں بولی "اب تم دنیا میں آئے۔

رفیق احمد نے لانبا سانس بھرا۔ اور شکیلہ ہیرنگٹن کے خوبصورت دل آرام جسم کی لطافت پر ہوس چاٹ کر متوحش نگاہوں سے شکیلہ

کو دیکھنے لگا۔ پھر شکیلا کی بہادر خوبصورت آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بولا۔

"میں نے تم سے اس قدر جلدی میں نکاح کر لیا۔ کہ بہت سی باتیں تم سے ٹھیک نہیں کہہ سکا۔ بینک کی رقم تو غریبہ خاتون کو دینی پڑے گی پچاس ہزار علی الدین کو کہاں سے دوں۔ میں اپنی بسر اوقات کے لئے تو ڈپٹی کلکٹری کو تو کافی سمجھتا ہوں۔ تمہیں اپنے عیش و آرام کے واسطے اپنے نانا کی دولت کافی ہے۔ جو اب بڑی آسانی سے تمہارے قبضہ میں آسکتی ہے۔ لیکن علی الدین کو پچاس ہزار کس طرح سے دوں۔ اماں سے مشورہ کرونگا۔ بہتر یہ ہوگا۔ کہ اس بنگلہ کو فروخت کر دوں۔ تیس چالیس ہزار وصول ہو جاویگا۔ باقی میں اپنی والدہ صاحبہ کے زیور کو فروخت کر کے ادا کر سکونگا"

اس وقت رفیق احمد کی آواز میں ایک قسم کا انتشار اور کمزوری معلوم ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت چھا گئی۔ اور اسے آن واحد میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ شکیلا اور اس کے مابین ایک زبردست سمندر موجود تھا۔ اور گو ان دونوں کا نکاح ہو گیا تھا۔ مگر وہ سمندر پار کی دیوی تھی۔ جو اب تھوڑی دیر کے بعد اڑ کر چلدیگی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اسے اس منزل کا خیال آگیا۔ جو وہ عنقریب گورنمنٹ کی ملازمت میں طے کرنگا۔

شکیلا ہیرنگٹن اس کی فق شدہ رنگت سے بے چین ہو گئی۔ اور سنجیدہ آواز میں بولی "تم کیا واہیات بک رہے ہو۔ ماں باپ کی کوٹھی کا نیلام۔ والدہ کے زیور کی فروخت۔ توبہ۔ توبہ۔ تمہیں علی الدین کو پچاس ہزار دینا ہے۔ چلو مجھے ولایت لے چلو۔ میں رائفس چائیلڈ۔ بینک سے روپیہ لاکر تمہارے سب قرضے بے باک کر دونگی"

"رفیق احمد نے خوفزدہ نگاہ سے شکیلا کی طرف دیکھا۔ اور مصنوعی

تبسم سے بے چینی کے ساتھ بولا "جی نہیں۔ میں آپ کی دولت سے ایک حبہ نہیں لونگا۔ میں تمہاری دولت پر دست درازی نہیں کرسکتا۔ خلقت یہ سمجھیگی کہ میں نے تمہاری دولت کے واسطے تمہیں زبردستی مسلمان کیا اور محض روپیہ کے لالچ سے تمہیں اپنی زوجہ بنایا۔ میری محبت کی وصبیاں اڑجاویں گی۔ اور تم رفتہ رفتہ مجھ سے نفرت کرنے لگوگی۔ بہتر یہی ہے کہ میں والدین کے مکانات وزیور کو فروخت کرکے علی الدین کو پچاس ہزار دوں۔ اور اپنی کمائی سے والدہ کی خدمت کروں۔ تمہیں میری کمائی کی ضرورت نہیں۔ تم آرام اپنے باپ کے بنگلے میں رہو۔ اگر تم مجھے اس قابل سمجھوگی کہ میرے ساتھ نوکری کے زمانہ میں رہو۔ تو میں تمہیں ساتھ رکھنے کا انتظام کرلونگا"

رفیق احمد کی آنکھوں میں اس وقت پشیمانی وحشت نمودار ہوئی اور وہ رات کے لطف اور شباب کی مستیوں کو اس وقت کے خیالات سے لاکھوں کوس دور اور حد درجہ رنج دہ سمجھکر کانپنے لگا۔ بشکیلہ ہنگیٹن گو عرصہ سے رفیق احمد کی شیدا تھی۔ مگر اس کے تعشق کی عملی اور اصلی زندگی صرف شب سے شروع ہوئی تھی۔ مرد نکاح سے پہلے پہل اپنی معشوقہ کو دین و دنیا سے زیادہ عزیز سمجھا کرتا ہے۔ نکاح کے بعد اس محبت اور عشوہ پرستی میں فرق آجاتا ہے لیکن عورت کی اصلی محبت شب زفاف کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور وہ ایک ہی رات میں سمجھ جاتی ہے۔ کہ جس نگاہ اور جس شوق سے اس کا شوہر اسے پیار کرتا ہے۔ وہ دراصل آئندہ زمانہ کی خوشگوار زندگی کی ایک سیڑھی ہوتی ہے۔ جس کے اوپر چلنے سے خاوند اور زوجہ اس قصر پر پہنچتے جو شادی خانہ آبادی کا مقصد عظیم کہلاتا ہے۔ اس قصر میں خاوند بغیر زوجہ کے زندگی ادھوری اور زوجہ بغیر شوہر کے زندگی ناتمام۔ پس سمجھدار نوجوان روشن ضمیر بشکیلا ہنگیٹن جس نے رفیق احمد کی محبت کو اپنے مذہب اور اپنی

دولت سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اپنی بیاہی ہوئی زندگی اسے اس فقر سے دھکا دے کر پھینکنے والی نہ تھی۔ وہ پورے طور سے مطمئن ہوگئی تھی۔ کہ وہ اس کا اس وقت سے شیدائی تھا۔ جب اسے اس کے نانا کی دولت کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور پھر اس نے اپنے باپ کے ترکہ پر لات مار کر اور سے باوجود اختلاف مذہب اپنے جان و دل سے محافظ بنانے پر مستعدی ظاہر کی تھی اب ایسے نازک موقعہ پر کہ اسے پچاس ہزار کی رقم کثیر اپنی چھاتی پر لینی تھی۔ اور اپنی زندگی کو قایم اور اپنی والدہ کی عزت کو بحال رکھنے کی خاطر اسے گورنمنٹ کی نوکری اختیار کر لینے کی ضرورت آپڑی تھی۔ وہ اُسے اُن غریب خستہ حال خاوند زوجہ کی طرح بے بس اور قابل امداد سمجھ رہی تھی۔ جو میرٹھ میں مولوی شفیق احمد کی ناعاقبت اندیشی کے آماجگاہ بن چکی تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ کرسی سے اُٹھ کر رفیق احمد کے پاس آئی۔ اور اس کے خوبصورت دن فریب مکھڑے کو نزدیک سے دیکھ کر بولی:

"میرے پیارے میرے دین دنیا کے مالک کیا تم ان مصائب سے اپنے آپ ہی تکلیف اٹھاؤ گے مجھے شریک نہ کرو گے؟"

رفیق احمد کا دل بیدار ہو کر اُچھل پڑا۔ اور اس نے پر تبسم آنکھوں سے نوجوان عورت کی طرف دیکھ کر جواب دیا "میری پیاری یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ تمہیں مجھ سے تکلیف پہنچ سکے۔ تمہارے معصوم دل کو میں نے اس لئے تسخیر نہیں کیا۔ کہ اوسے صدمہ پہنچاؤں۔ میں اوسے دنیا بھر کے لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی اور خوش نما سمجھتا ہوں۔ اور اس کی قدر و قیمت بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں بالکل محتاج اور مفلس ہوں میرے پاس کچھ نہیں۔ میں نوکری کرونگا۔ اور کماؤنگا۔ تم مجھے محض اپنا سچا شیدا سمجھ کر میری محبت کی قدر کرو۔ میں واقعی کنگال اور فقیر ہوں"

یہ کہکر رفیق احمد نے آنکھیں جھکالیں۔ اور اُسے خیال ہوا۔ کہ دراصل شکیلا ہیرنگٹن اور اس کے مابین ایک بڑی ضخیم دیوار حائل ہے۔ اور وہ اب کسی طرح ٹوٹنے والی نہ تھی۔ وہ گو اپنی طرف سے کتنی ہی محبت ظاہر کرے۔ مگر اس کے دل میں کبھی گھر نہ بنا سکیگا۔

قریب تھا کہ اپنی بے بسی سے اس کے آنسو نکل پڑیں کہ شکیلا ہیرنگٹن نے اس کی پریشانی محسوس کرلی۔ اور اس کے سینہ سے اپنا منہ ملا کر بولی

میرے پیارے تمہاری متوحش آہیں مجھے عجیب وغریب معلوم ہو رہی ہیں تم اپنے آپ کو فقیر سمجھتے ہو۔ تم مجھے دنیا بھر کے تاجدار بادشاہوں سے زیادہ مالدار اور بہادر معلوم ہو رہے ہو۔ تمہارے محبت بھرے دل میں دنیا بھر کی فیاضی اور عالی ظرفی موجود ہے۔ تم مجھے ہفت اقلیم کی دولت سے زیادہ پیارے ہو۔ اگر میرے نانا کی دولت میری اور تمہاری محبت میں مداخلت پیدا کرسکتی ہے۔ تو میں اس سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ تم کسی کی نوکری مت کرو۔ اپنے قرضوں سے بے باق ہونے کو اپنا اور میرا بنگلہ فروخت کردو مجھے جنگل میں ایک جھونپڑا بنا دو۔ میں تمہارے قدموں کو دھو دھو کر پیونگی۔ اور تمہاری والدہ کی خدمت گذاری کیواسطے ایک اونے آنیز کا کام دونگی۔ مجھے دنیا کی دولت درکار نہیں مجھے ناز نعم کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری تقویت اور تمہارے دلفریب مکھڑے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ساری دنیا کے معشوقوں سے زیادہ پیارا اور شریف تر سمجھتی ہوں۔ اور محض تمہاری دلجوئی کے واسطے اپنے نانا کی دولت کو بھول جانیکو تیار ہوں۔

رفیق احمد کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ اٹھ کر شکیلا ہیرنگٹن کے سینہ سے لپٹ گیا۔ اور آنسو بہا کر بولا

میری پیاری۔ میری دین ایمان کی محافظ میں بالکل کنگال اور

اور فقیر ہوں۔ تیرے پہلو کی قابلیت نہیں رکھتا۔ لیکن صرف تیرے عشق کی بدولت اتنی جرأت کر رہا ہوں۔ کہ تجھے ہاتھ لگا سکوں۔ تجھے ساری عمر ناز و نعم میں گذری ہے۔ تیرے نازک ہاتھ پاؤں میرا یہ زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ خدا تجھے مبارک کرے۔ تو اپنے نانا کی دولت کو قبضہ میں لا۔ اور اس سے فائدہ اٹھا۔

"رفیق احمد کے گرم گرم آنسو شکیلا ہیرنگٹن کے رخساروں پر گرے شکیلا کا دل بھر آیا۔ اور اس نے ایک شب کے شوہر کی پیشانی چوم کر کہا:

میرے آقا۔ میرے مالک میرے شہنشاہ تم اپنے دل کو مفت میں صدمہ پہنچا رہے ہو۔ تم مجھے فقیر نی سمجھ کر پاس نہیں رکھنا چاہتے میرے نانا کی دولت سے ڈرتے ہو۔ پھر میں کیا کروں۔ میں اس دولت سے ہاتھ اٹھا کر رانٹس چائلڈ بینک کو لکھے دیتی ہوں۔ کہ یہ سب دولت میرے شوہر کے نام منتقل کر دی جاوے۔ اور پھر تمہیں افتیار رہوگا۔ کہ جس طرح تمہارا دل چاہے خرچ کرو۔ میں باضابطہ اقرار نامہ لکھ دونگی۔ اور کبھی تعرض نہ کرونگی"

رفیق احمد کی آنکھوں سے دوسری دو آنسوؤں کی نکلی وہ شکیلہ ہیرنگٹن کی فیاضی اور تشخص کا قائل ہو گیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر اس کے قدموں پر گر گیا۔ اور محبت بھرے ہوئے دل سے بولا:

میری ملکہ میری شہزادی میں دراصل کنگال اور بے سہارا ہوں لیکن آج تو نے مجھے ہفت اقلیم کا بادشاہ بنا دیا ہے۔ میں تیری محبت کی قدردانی کو کسی طرح صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور تجھ فی الفور انگلستان لے چلونگا۔ تاکہ تو جلدی اس رقم پر قبضہ کر سکے۔ یہ دولت ہمیشہ تیرے ہی قبضہ میں رہے گی۔ اور میں ہمیشہ ایک ادنےٰ خادم کی طرح تیری مرضی پر چلونگا"

شکیلا ہیرنگلن نے اس کے سر کو بڑے ادب سے اٹھایا۔ اور اس کے منہ کو چوم کر بولی۔

بس اب ان شاعرانہ باتوں کو جانے دو۔ مجھے تمہاری محبت بغیر چارہ نہیں۔ تمہیں میرے بغیر چین نہیں۔ ہم تم دونوں اس دولت کے حصہ دار ہیں۔ نصف میری نصف تمہاری۔ آؤ اب آرام سے بیٹھو۔ اور اس کے استعمال کی تدبیر بتاؤ۔ ایسا معلوم ہوا ہے۔ کہ نظام ازل نے ہمیں تمہیں ایک۔ دوسرے کے لئے بنایا تھا۔ میں تمہارے بغیر اس دولت کی مالک نہیں بن سکتی تھی۔ اور تم میرے بغیر۔ غریبہ خاتون کو ایک لاکھ نہیں دے سکتے تھے۔ عوض معاوضہ گاہ ندارد۔ اب ہوش میں آکر باتیں کرو۔"

رفیق احمد وہڑکتے دل سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور شکیلا ہیرنگلن اپنی آرام کرسی پر گر گئی۔ اتنے میں ان دونوں کو اپنے کمرہ میں زنان خانہ کی طرف سے دستک کی آواز سنائی دی۔ رفیق احمد نے پردہ ہٹا کر باہمنگی چٹ خنی کھولی۔ اور اپنی والدہ کو مسکراتا ہوا پایا۔ جو کہہ رہی تھی۔ بیٹا دن رات بیوی ہی کے گلے کے ہار بنے رہو گے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ بہو کو گھر میں بھیجو۔ بیوبوں عورتیں رڑکی سے آئی ہوئی ہیں۔ تحصیلدار صاحب کی زوجہ بھی آئی ہے۔ پہلے چائے پی لو۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا"

رفیق احمد کے منہ سے نکلا۔ اور اس نے مسکرا کر شکیلا سے کہا۔ میری پیاری بہت سی عورتیں تمہارے دیدار کو آئی ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ تم دنیا بھر کی عورتوں سے زیادہ خوبصورت ہو"

اتنے میں چائے آگئی۔ اور خاوند و زوجہ خوش خوش گرم چائے سے محظوظ ہونے لگے۔ انہیں دراصل تمام رات جاگنے کے بعد چائے جیسی چستی

خیر شر سب کی مزدوت بھی تھی۔

پچھترواں باب

باپ کی عزت رکھ لی

سچے دل سے محبت کرنے والے خاوند و زوجہ کی راز و نیاز کی باتوں کو جو نیک اور لابد نتیجہ مترتب ہوا۔ دراصل غریبہ خاتون اور اس کے شوہر کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا۔ یہ بالکل درست ہے۔ کہ افلاس اور تمول خبر دے کر نہیں آیا کرتے۔ اس غریب مصیبت زدہ لڑکی نے آٹھ نو برس بڑی مصیبت اور افلاس میں بسر کئے تھے۔ اور اس شوہر جو ہمیشہ سے لاعزم انام اور مریض معلوم ہوا کرتا تھا۔ اپنے پر مصائب زندگی کی تلخی اور امیدوں کے انہدام سے روز بروز متفکر اور زیادہ پریشان ہو کر بالآخر مرض سل میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور ابھی چند روز گذرے۔ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو ہو کر نوجوان پر یکہ و زوجہ کو بیوی کی خوفناک اور متوحش گھاٹی کے خواب دکھلا رہا تھا۔ لیکن بعض اوقات قسمت ایسا زبردست اور باموقعہ راقی کیا کرتی ہے۔ کہ اس کی مہربانی اور پر لطافت بخشش وہم و گمان سے باہر معلوم دیا کرتی ہے۔ سچ پوچھو۔ تو ہر ایک مصیبت نرمی سختی اور بلا خیز ہی نہیں ہوتی اس کے سیاہ شب دیجور جیسے تاریک کناروں پر شفق جیسی چمک ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی انسانی امیدوں کے لئے ابر رحمت کا کام دے جاتی ہے۔ جو لوگ مصائب میں گرفتار ہو کر دنیا کی تکلیفوں اور تبدیلوں کا عملی تجربہ کر لیتے ہیں۔ ان کے دلوں سے نا قدری اور بے رحمی کا زنگ دھل جاتا ہے۔ پس یہ کہنا کسی طرح نا زیبا نہیں۔ کہ تقریباً ہر مصیبت

کے پردہ میں کوئی حکمت چھپی ہوئی ہے غریب خاتون اپنے شوہر اور بچے سمیت چار روز سے صدر بازار میرٹھ کے قریب نواب محمد اسحاق خاں بہادر کی عظیم الشان کوٹھی کے پیچھے ایک خس پوش بلند بنگلے میں مقیم تھی۔ جو سو روپیہ ماہوار کرایہ پر رفیق احمد نے بڑی جلدی میں حاصل کر لیا تھا۔ مریض شوہر کی تیمارداری اور علاج معالجہ کے واسطے صاحب سول سرجن بہادر کو معمولی فیس پر مامور کر دیا تھا۔ اور خاوند زوجہ کی خدمت کے واسطے معقول تعداد مرد ساور زنانہ نوکروں کی موجود تھی۔ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ شام کے پانچ بجے ہونگے۔ خس پوش بنگلہ کے جنوبی دروازہ سے سورج ہٹ گیا تھا۔ مگر غربی دیوار اور دروازوں پر دھوپ خوب پھیل رہی تھی۔ اور سامنے شاگرد پیشہ لوگوں کے مکانات کے آگے ننھے اصغر کو ایک آیا لکڑی کی گاڑی میں بہلا رہی تھی۔ گاڑی کے پاس دو تین مرغ مرغیاں خوفزدہ نگاہوں سے گاڑی کی کھڑکھڑ پر پر پھیلا رہے تھے۔ ننھا اصغر گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا متین آواز میں بولا "میں اس کا انڈہ کھاؤنگا۔" آیا نے مرغیوں کی طرف دیکھکر کہا۔ "ہاں بیٹا تم اس کا انڈہ کھاؤ گے؟"

ننھے اصغر کے جسم پر روئی کا کوٹ تھا۔ اس کی ٹانگوں میں سبز فلالین کا پاجامہ۔ سر پر اونی کن ٹوپ اور پاؤں میں ننھا سا انگریزی جوتا۔ اتنے میں آیا کو بنگلے کے پھاٹک پر ایک چھوٹا سا ٹٹو زین سمیت اندر آتا ہوا دکھلائی دیا اور اسی لمحہ میں ننھے نے چلا کر کہا "یہ گھوڑا کس کا ہے؟" آیا نے بے پروائی سے جواب دیا "بیٹا معلوم نہیں" مگر گھوڑے والا سائیس اس ٹٹو کو ننھے کی طرف لا رہا تھا۔ اور پاس آکر آیا سے پوچھنے لگا۔

"بابو حرمت علی اس بنگلے میں ٹھیرے ہیں؟" آیا نے متنفر نگاہوں سے دیکھ کر کہا "ہاں اسی بنگلہ میں ہیں۔ ٹٹو کس کا ہے۔"

ننھا اصغر اپنی گاڑی میں ٹٹو کی صورت دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اور بانہہ

پھیلا کر بولا۔ مجھے گھوڑے پر چڑھا دے" سائیس نے ہنس کر اصغر کی طرف دیکھا پھر آیا کی طرف دیکھ کر بولا" یہ ٹٹو دھیر کلب کے بابو صاحب بھیجت ہیں۔ کوئی امیر آدمی روڑکی سے آکر ٹھیرت تھے۔ ابھی آیا چاہت ہیں۔ بیر جانوں ٹٹو اِس بچے ہی کے لئے بھیجت ہوں گے اِس لئے ہیں تمہارے ٹٹو کے ہنہنانے سے نہایت بے چین ہوگیا۔ اور مجھے چڑھا دے۔ مجھے چڑھا دے" کہہ کر رونے لگا۔ آیا نے اسے گود میں اٹھا کر ٹٹو پر بٹھلا دیا۔ اور وہ کسی طرح سنبھل کر بیٹھا پھر اس نے گھوڑے کی زین پر دونوں ہاتھ مار کر کہا چل گھوڑے چل میرے گھوڑے کی چل" آیا نے اسے ایک ہاتھ سے سنبھالے رکھا۔ اور سائیس ٹٹو کو آہستہ آہستہ بجانب شمال لے چلا۔ اسی لمحہ میں ایک گھوڑا گاڑی بنگلے کے اندر داخل ہوئی۔ اور جنوبی برآمدہ کے سامنے ٹھہر گئی۔ گاڑی کے ارد گرد چند ٹرنک در و بستر سلے ہوئے تھے۔ بظاہر کوئی مہمان آیا تھا۔ آیا بچے کو گود میں لے کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ اور برآمدہ کے پاس جا کر اس نے دیکھا کہ اس کے اندر ایک نوجوان آدمی اور ایک بیش قیمت پوشاک عورت بیٹھی ہے۔ نوجوان آدمی نے اپنا کارڈ نکال کر ایک نوکر کے ہاتھ میں دیا۔ جو گاڑی کی آواز سنکر اندر سے آیا تھا۔ پھر اس نے نگاہ ہٹا کر بچے اصغر کو تبسم سے دیکھ کر کہا" ہماری گاڑی لاؤ"

خورد سال اصغر نے منہ بنا لیا۔ اور آیا نوجوان رفیق احمد کو سلام کر کے اندر گھس گئی۔ ایک منٹ کے بعد نوکر اور آیا بڑے ادب سے باہر آئے۔ اور نوکر نے ادب سے عرض کیا" حضور تشریف لے آویں" صاحب زادہ رفیق احمد شکیبا ہر نیشن کو آہستگی سے اتار کر ہاتھ پکڑے ہوئے اندر جانے لگا اور نوکر کو راستہ سے بتلایا۔ ہمارا اسباب اتار لو۔ ٹرنک فی الفور اندر بھجوایا پھر وہ ٹرنکوں کو اپنی نگاہ کے سامنے اتروا کر اندر داخل ہوا۔ جس وسیع اور صاف کمرہ میں وہ داخل ہوا۔ اس میں ایک عمدہ مسہری۔ کہ پلنگ پر

حضرت علی لیٹا ہوا تھا جس کے چہرہ پر اس وقت پہلے سے بدرجہا زیادہ رونق تھی۔ اس نے بستر سے اُٹھ کر السلام علیکم کہا۔ اور نوجوان رفیق احمد نے اس سے مصافحہ کر کے کہا۔ یہ میری زوجہ شکیلہ ہیرنگٹن ہے۔ جو آپ کی زوجہ محترمہ سے ملنا چاہتی ہے۔"

ذکر نے ٹرنک اور اسباب رفیق احمد کے پاس چٹائی کے فرش پر رکھدیا۔ اور آیا نے ایک پاس کے کمرہ کا پردہ ہٹا کر شکیلا ہیرنگٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ آپ اندر تشریف لے آویں" شکیلہ ہیرنگٹن ملحقہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور اسے ایک پلنگ پر نوجوان غریبہ خاتون بیٹھی دکھلائی دی۔ جو شکیلا ہیرنگٹن کو دیکھکر ڈر گئی۔ شکیلا نے اپنے جسم سے برقعہ اتار لیا۔ اور ان کے بدن پر انگریزی لباس نظر آنے لگا۔ اس نے مسکرا کر غریبہ خاتون کی طرف دیکھا۔ اور دھڑکتے دل سے بولی۔ میں مسٹر رفیق کی زوجہ شکیلہ ہیرنگٹن ہوں" نوجوان غریبہ خاتون کے چہرہ پر سرخی چمکی۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے انگریزی لباس عورت کے آگے ایک کرسی کر دی۔ پھر وہ دھڑکتے دل سے بولی۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی" جی کچھ نہیں۔ آپ کے شوہر اب کیسے ہیں" غریبہ خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ اب تو بہت آرام ہے جس روز سے انہوں نے سنا ہے۔ کہ آپا ایک لاکھ روپیہ چھوڑ گئے۔ ان کی حالت سنبھل گئی۔ سول سرجن ہر روز انہیں وزن کر کے دیکھتا ہے۔ اور آج کہتا تھا کہ ایک مہینہ کے اندر بالکل آرام ہو جاویگا۔

اس وقت ننھا صفر آیا۔ یہ کہ گود میں۔ اماں مجھے لے لے۔ مجھے لے لے" یہ کہہ کر شور مچا رہا تھا۔ اور اپنی ماں کو ٹھیک طور سے بات نہیں کرنے دیتا تھا۔ شکیلا ہیرنگٹن نے کرسی سے اُٹھ کر اسے گود میں لے لیا۔ اور وہ شکیلہ ہیرنگٹن کے انگریزی کپڑوں کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ادھر رفیق احمد نے ٹرنک کھول کر آگرہ بینک کی پاس بک نکالی۔ اور مسکرا کر فرحت علی کے

کہا "پیارے دوست۔ اس کتاب میں ایک لاکھ ایک ہزار کی رقم موجود ہے غور سے دیکھ لیجئے۔ اور اس وقت اپنی اہلیہ صاحبہ کو دکھا دیجئے۔"

حرمت علی نے کانپتی ہوئی انگلیوں میں پاس بک پکڑ لی۔ اور دھڑکتے ہوئے بے قرار دل سے بوالہوس لگا ہیں ایک لاکھ کی رقم پر ڈال کر بولا "اوہو۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔"

اسی لمحہ میں رفیق احمد کو حرمت علی کے چہرہ پر سرخی معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے پلنگ سے اُتر پڑا۔ رفیق احمد نے اسے پلنگ پر زبردستی بٹھلایا۔ اور مسکرا کر کہا۔ آپ ہرگز نہ اُٹھئے۔ آیا کو آواز دیدیجئے۔ وہ کتاب اندر پہنچا دیگی پھر خود زور سے آیا کا نام لے کر آواز دی۔ وہ فوراً اندر آئی۔ اور پاس بک لے کر عورتوں کے پاس پہنچ گئی۔ شکیلا بیگم نے پاس بک ہاتھ میں لے کر غریب خاتوں کو ایک لاکھ ایک ہزار کی رقم سے مطلع کیا۔ اور ننھے اصغر نے پاس بک پر ہاتھ پھیلا دیئے۔ غریب خاتوں کا دل اچھل کر بے تاب ہوگیا اور اس نے اس کتاب کو دین و دنیا کی دولت سمجھ کر پاس بک ننھے کے ہاتھ سے چھین لی۔ ننھا منہ بنا کر رونے لگا۔ اور آیا نے اسے چمکار کر گود میں لے لیا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اور آیا اسے [illegible] میں لے آئی۔ جہاں رفیق احمد نے گھبرا کر پوچھا کیوں ننھے تم کیوں روتے۔ آیا نے مسکرا کر کہا۔ کتاب پھاڑنا چاہتے تھے۔"

رفیق احمد نے اسے پیار کر کے گود میں لے لیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کہا "فریدا ٹھو کو اندر منگالو۔ ہم ننھے کو سوار کرائینگے۔"

آیا ٹھو کے لئے باہر گئی۔ اور ننھا منہ بنا کر کہنے لگا۔ مجھے ماں نے مارا۔ باپ نے مسکرا کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور بطور مذاق زور سے کہا "بدمعاش بات میں ماں پر الزام لگاتا ہے۔ لا ان کی گھڑی کہاں ہے جناب اس نے آپ کی گھڑی توڑی۔" رفیق احمد نے اوسے سینہ سے

لگا کر اس کا منہ چوما۔ اور اپنے دل میں کہا "کاش ایسی ایسی ہزاروں بچیاں غریبہ خاتوں کے بچے پرشاد کر سکوں۔ میرے باپ نے ان غریبوں کا دل توڑ دیا تھا۔ اور اسی لمحہ میں رفیق احمد کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے جنت اور انسانی کمالات کے دروازے کھل گئے اور اس کی روح کبھی نہ محو ہونے والی مسرت سے لبریز ہو گئی۔ اور اسے ساری کائنات پر تجسس شادمانی میں بہری ہوئی دکھائی دینے لگی۔ اور اسے جس چیز کی دنیا میں کمی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس لمحہ میں پوری ہو گئی۔ ایک منٹ کے اندر پوربیا سائیس ٹٹو کو کر کے اندر لے آیا۔ رفیق نے اوسے ٹٹو پر سوار کر دیا۔ آیا نے اوسے سنبھالے رکھا۔ اور رفیق احمد نے اس کی باگ ہاتھ میں لے کر اسے ادھر ادھر ٹہلانا شروع کیا۔ پھر اس کے بھرے ہوئے دل سے یہ آواز نکلی۔ یا رب العالمین اے دین و دنیا کے شہنشاہ حقیقی جس عورت کے ننھے دل کو میرے باپ نے صدمہ پہنچایا تھا میں آج اس کے بچے کا سائیس بن گیا ہوں۔ اور تیری بارگاہ میں اپنے باپ کی غفلت غلطی اور گناہ پر معافی کا خواستگار ہوں۔

اس کے کانوں میں شاں شاں کی آوازیں پہنچیں۔ اس کی آنکھوں میں تاریکی آگئی۔ اور اسے چاروں طرف سے ہزارہا آوازیں چلائی ہوئی معلوم دیں "بے شک بے شک۔ اس کی درگاہ میں کسی بات کی کمی نہیں"

اس اشک آلودہ آنکھوں سے سائیس سے بہ نرمی کہا "اس بچے کو باہر لے جاؤ۔ آیا تم ساتھ رہو" اور جب بچہ باہر چلا گیا۔ اس نے دروازہ پر زور سے آواز دیکر کہا "شکیلا ذرا معزز غریبہ خاتوں کو یہ رقعہ پہنچا دو۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ بلکہ بہتر ہوگا۔ کہ بہن غریبہ خاتوں یہ رقعہ پہنچ کر اپنے شوہر کے کمرہ میں آجاویں" پھر حرمت علی کی طرف دیکھ کر کہا جناب کیا

آپ کی اجازت ہے۔ حرمت علی نے جی۔ شوق سے کہا۔ اور رفیق احمد نے پلا کر شکیلا کو سنا دیا۔

"میری پیاری حرمت علی صاحب نے اجازت دے دی ہے۔ بہن غریبہ خاتون کو اس کمرہ میں بھیجدو"۔ بہت اچھا بھیجتی ہوں" شکیلہ ہنگلش نے جواب دیا۔ اور اسی لمحہ میں برقعہ میں لپٹی ہوئی غریبہ خاتون پاس بک ہاتھ میں لئے ہوئے دروازہ میں آئی۔ رفیق احمد نے اوسے ایک کرسی دیدی اور سامنے کے کیبوا ڑوں میں چٹخنی لگا کر پردہ ڈال دیا۔ پھر اس نے دھڑکتے دل سے برقعہ پوش عورت کی طرف دیکھکر کہا "محترمہ غریبہ خاتون میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ اصلیت یہ ہے۔ کہ مجھے آپ کی خدمت میں ایک نہایت ضروری مسئلہ پیش کرنا ہے۔ آپ شاید ناراض ہوں اور مجھے دنیا بھر کا نالائق آدمی سمجھیں۔

معاملہ یہ ہے۔ کہ جو ایک لاکھ ایک ہزار میں نے آپ کے نام ہینک آف بنگال آگرہ میں منتقل کرایا ہے۔ وہ دراصل غصہ گذرا۔ آپ کے والد صاحب نے میرے والد مولوی شفیق احمد صاحب کی نگرانی میں چھوڑا تھا۔ اور میرے والد سے درخواست کی تھی۔ کہ وہ آپ کی پرورش کریں۔ اور آپ کو دنیا کی دست برد سے بچاویں لیکن فی الحقیقت زاہد سے زاہد اور متقی سے متقی آدمی طمع کے ہاتھوں سے لاچار ہے۔ اور اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ گناہ سر پہ لے سکتا ہے۔ میرے باپ نے اس امانت میں خیانت کی اور اس رقم کو میرے نام لکھدیا۔ میں اس معاملہ سے بالکل ناواقف تھا۔ صرف ایک ہفتہ گذرا۔ مجھے خبر ملی۔ میں اپنے والد صاحب کی غفلت اور ناعاقبت اندیشی پر سخت متاسف ہوں۔ اور اس رقم کو آپ کے حوالہ کر کے آپ سے التجا کرتا ہوں۔ کہ آپ میرے باپ کے گناہوں کی معافی عطا فرمائیں۔ اور مجھے اس کے خاندان کا نام لیوا سمجھکر اپنی زبان سے معاف

دیدیں۔ یہ کہہ کر وہ غریبہ خاتون کے قدموں پر گر گیا۔ اور لپٹے ہوئے دل سے بولا۔ پیاری بہن۔ معزز غریبہ خاتون میرے والد کو آپ کی معافی بغیر کسی طرح نجات نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ نے اس کے گناہ کو معاف کیا؟

غریبہ خاتون کا دل بھر آیا۔ اس نے رفیق احمد کے سر کو ہاتھوں پر لے لیا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے بولی۔

مجھے اس واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ مگر آپ جیسے شریف بیٹے کا باپ بھی ضرور بڑا شریف آدمی تھا۔ میں اسے معاف کرتی ہوں۔ آپ سر اٹھائیے۔

رفیق احمد نے اشک آلود نگاہیں غریبہ خاتون کے برقعہ پوش چہرہ پر ڈالیں۔ اور فرحان دل سے بولا۔ "انک الیوم ذی الاراین خیرا"

پھر اس نے اپنی جیب سے صادق علی کا خط نکال کر غریبہ خاتون کے ہاتھ میں دیا۔ جس کی فرحان نگاہیں فوراً اس غریب۔ فخر خاندان باپ کے خط پر جھک گئیں۔ جس کو زمانہ نے اس کی یاد سے محو کر دیا تھا۔ باپ کے خط کا مطالعہ کرکے غریبہ خاتون کا دل اچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ وہ پکار کر بولی۔

ہائے باپ، پیارے باپ میں تجھے اس قدر پیاری تھی۔ کیا عجب کہ رفیق احمد اپنے باپ کو مجھ سے زیادہ پیارا ہو۔ میں نے غریب رفیق احمد کے باپ کو ٹھنڈے دل سے معاف کیا۔ اے معزز بھائی جس طرح تو نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ خداوند کریم تیرا اور تیری معزز زوجہ کا کلیجہ ٹھنڈا کرے۔

یہ کہہ کر غریبہ خاتون نے اپنے باپ کا خط اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھ پاؤں کو سنبھال کر اندر گھر گئی۔ جہاں عین دروازہ کے اوپر اس نے تکیہ پر لیٹی ہوئی اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

چھہترواں باب

خاتمہ بالخیر

ماہ فروری کی شروع تاریخیں تھیں۔ آسمان پر دو تین روز کا نیا ہلال چمک رہا تھا۔ ٹھنڈے نیلے آسمان پر چھٹکے چھٹکے ستاروں اور نقاب پوش چاند سے دودھ کی سی سفید چادر کھنچ رہی تھی۔ ہوا بند تھی لیکن سردی ہنوز کم ہونے میں نہیں آئی تھی۔ رات کے سات بجے ہوں گے شکیلہ ہیرنگٹن کے خاندانی بنگلہ میں رونق اور امن و امان برس رہا تھا بنگلے کے چپہ چپہ پر لاکھوں چراغ جگمگا رہے تھے۔ آج شکیلہ ہیرنگٹن نے ڈرگی کے معتبر اور غریب مرد و زن کو "دعوت شکرانہ" دی تھی۔ بنگلہ کے چاروں طرف پختہ چہار دیواری پر سرسبز بیلوں کے اندر جگمگاتے ہوئے چراغ نعش کھلا کر ہنس رہے تھے۔ گوشہ گوشہ پر جاپانی قندیلوں اور رنگا رنگ چراغوں سے سارا بنگلہ "شہر چراغاں" کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ بنگلہ کی چھت پر ایک رنگ برنگی جھنڈے کے پاس محراب دار روشنی میں ایک بجلی کا لیمپ ٹمٹما رہا تھا جس کے سامنے موٹے سبز حروف میں "امن و امان" لکھا ہوا تھا۔ اگلی دو پختہ مکانات کے پاس کچے چولہوں پر بیسیوں دیگوں میں انگیٹھوں کی ٹن ٹن سے شور مچ رہا تھا۔ اور گرم مہیب بھٹیوں کے اندر سرخ انگارے خوفناک بھوتوں کی پراسرار قربانی کا سماں پیش کر رہے تھے۔ پختہ چہار دیواری کے پاس بہ سمت شمال سینکڑوں چھوٹی چھوٹی چھپر کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے آگے چراغاں کی چمک دمک۔ درست ٹوں ٹنڈ سے ہوئے بانسوں سے خاصہ میلا لگا ہوا معلوم

ہوتا تھا۔ بنگلہ کے صدر دروازہ پر محراب دار چوبی دروازہ کے اندر بجلی کی روشنی کے لیمپ آویزاں تھے جن پہ جا بجا "سن داماں" لکھا ہوا تھا۔ خس پوش جھونپڑوں کے اندر محتلج مرد و زن بچے اور بوڑھوں نے شور محشر بپا کر رکھا تھا۔ اور چاروں طرف ان آوازوں کے ساتھ آبشار آصف نگر کی دھاں دھاں دبی ہوئی اور مغلوب سنائی دیتی تھی۔ بنگلہ کا شرقی برآمدہ معمول سے زیادہ درخشاں اور دلآویز ہو رہا تھا۔ اور یہاں جاپانی لال ٹینوں کی جگمگ جگمگ سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں برآمدہ کے پیچھے کمرہ کے اندر سے قہقہہ کی آواز آئی۔ اور چک اٹھ جانے پر برقعہ پوش شکیلہ ہیرنگٹن رفیق احمد کے سہارے سے باہر نکلی۔ جو انگریزی لباس میں ملبوس تھا۔ رفیق احمد نے باہر نکل کر شکیلہ ہیرنگٹن کی بغل میں ہاتھ دے لیا۔ اور مسکرا کر پوچھا "معاف نہیں کامران کدھر ہے؟" شکیلہ ہیرنگٹن نے قہقہہ لگا کر کہا۔ کھانا اتروا رہا ہوگا۔ ابھی عزیزاً کے ہاتھ چند سگار منگائے ہیں۔ جو میں نے بھیجے ہیں۔ یہاں سے یہ دونوں عاشق و معشوق روشن زمین پر ناز سے قدم دھرتے ہوئے شاگرد پیشہ مکانات کی طرف گئے۔ اور وہاں دور تک کچی رکابیوں کا ڈھیر لگا پایا۔ بیشک ایک مونڈھے پر کامران بیٹھا ہوا تھا۔ اور نوکر اس کی نگرانی میں پلاؤ زردہ اتار رہے تھے۔ "شاباش مسٹر کامران شاباش" رفیق احمد کے منہ سے نکلا۔ کامران قہقہہ لگا کر مونڈھے سے کھڑا ہو گیا۔ اور رفیق احمد کو شاباش آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ جناب آج تو میں آپ کا خانساماں بن گیا۔ کل مشعبی سہی۔ دوسرے مونڈھے سے ہدایت علی نے فرمایشی قہقہہ لگایا۔ اور دندناتے ہوئے صدر دروازہ کی طرف گئے۔ لیمپ اور لال ٹینوں کی بہار کا لحاظ کر کے وہ جھونپڑیوں کی طرف آئے۔ جن کے طوفان بے تمیزی سے عجیب ہل چل مچ رہی تھی۔ غریب کنگال آدمی شکیلہ ہیرنگٹن کے دیئے ہوئے کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے اور پلاؤ زردہ کی رکابیوں پہ چیل اور کوّے کی طرح گر رہے تھے۔ بعض اندھے اپاہج مرد و زن اور لنگڑے لولے یتیم بچوں کی حالت پر رفیق احمد کا دل بھر

آیا - اور اس نے شکیلہ ہیرنگٹن کی کمر میں مضبوطی سے ہاتھ دیکر کہا "میری پیاری ان غریبوں کی دستگیری اور شکم سیری سے زیادہ فرحت کس کام میں ہو سکتی ہے - وہ دیکھو غریب بڑھیا مسکرا رہی ہے - اگر ہم ایک غریب کا دل ہنسا دیں - تو ہماری دنیا بھر کی نیکیاں اور ارادے بارور ہو جاویں" شکیلہ ہیرنگٹن نے سکراتی ہوئی عورتوں کو دیکھا جو بظاہر ان خاندوجہ کی موجودگی سے شادمان ہو گئی تھیں - اور اپنے شوہر کی کمر میں ہاتھ دیکر بولی "میرے پیارے واقعی دنیا کی زندگی کسی مصرف کی نہیں - اگر ہم نصف حصہ دنیا کی محتاجی اور مصیبت پر آنکھیں بند کر لیں - درحقیقت میرے دل پر اتنی خوشی اور تبسم کبھی ظاہر نہیں ہوا - جیسا آج ہے - اگر ایمان سے پوچھو - تو آج میرے گلے پر اصلی عید بھی ہوئی ہے ہماری زندگی کسی مصرف کی نہیں - اگر ہم عیش و آرام سے شکم پروری کرتے رہیں اور اپنے بھائیوں کو فاقہ مستی سے مرتا دیکھیں - نہیں ان لوگوں کی دستگیری کو اپنا عین فرض سمجھونگی - اور اس کوٹھی پر ایک محتاج خانہ قایم کر دونگی" واقعی تم نے میرے دل کی بات کہی - اس سے بہتر طریقہ پر زندگی کا نہیں ہو سکتا - تمہارا بنگلہ محتاج خانہ کو دیدیا قرار دیا جاوے - اور تم اس کی لیڈی سپرنٹنڈنٹ بن جاؤ احاطہ میں چاروں طرف پختہ کوٹھڑیاں بنا دی جاویں - جو مرد و زن بعض لنگڑے لولے ہیں - ان کی پنشن مقرر کر دی جاوے - ہاتھ پاؤں سے کام لینے والے آدمیوں کی تنخواہ مقرر کر دیں - اور ان سے اس محتاج خانہ میں نوکری کرائی جاوے - جو یتیم اور محتاج بچے پڑھنے لکھنے کے قابل ہیں - ان کے واسطے ایک دو ماسٹر مقرر کر دیئے جاویں - مگر اس کام کے لئے ایک لاکھ روپیہ درکار ہے" شکیلہ ہیرنگٹن کا دل اچھل پڑا - اس نے اپنے شوہر کی کمر کو زور سے دبا کر کہا - میرے پندرہ لاکھ میں سے ایک لاکھ روپیہ کا خرچ کچھ بھی معلوم نہ ہوگا - اور میں اپنا تمام وقت اس کام پر صرف کروں گی - غریب محتاج لڑکیوں کے واسطے سینے پرونے کا کام نکالا جاوے گا - اور ان ہی لڑکیوں سے محتاج خانہ کے متوکلین کے واسطے کھانا پکوایا جاوے

فی الواقع اگر ہماری زندگی سے ان لوگوں کو کوئی نفع پہنچ سکے۔ اور ہم ان کے مصائب کو ہلکا کر کے اپنی ساری عمر میں دس آدمیوں کی زندگی بھی خوشگوار بنا دیں تو ہمیں ذریعہ نجات کی کمی نہیں۔ رفیق احمد اس وقت بجانب شرق چلنے لگا۔ اور محتاجوں کے شور سے کان جھاڑ کر بولا "میری لاڈلی تمہارے خیالات بہت پاکیزہ ہیں۔ تم ضرور ایسا ہی کرو۔ بہتر یہ ہوگا کہ اب محتاجوں کو یہاں سے جانے نہ دو۔ تم میرے ساتھ ایک ہفتہ کے اندر انگلستان چلو۔ ہم تین مہینہ کے اندر واپس آجاویں گے۔ اس عرصہ میں مسٹر کامران اور ہدایت علی اس کام کی نگرانی بخوشی منظور کرلیں گے۔ اور ہماری واپسی تک انہیں معاوضہ کی امید دلائی جا سکتی ہے۔ بلند اختر بھی بیکار ہے۔ وہ بھی اس کام پر لگا دیا جاویگا۔

شکیلہ ہیرنگٹن نے مضطرب آواز میں جواب دیا "بے شک ممکن ہے مگر بلند اختر تو اس کام پر نہیں لگے گا۔ آج ہی میں نے تمہیں گل جان کا خط دکھایا تھا۔ گل جان اب پردہ میں رہنا چاہتی ہے۔ اور اس حد فرد میں بلند اختر سے نکاح کرنے والی ہے۔ جیسا تمہیں میرا عشق ہے۔ ویسا ہی بلند اختر کو گل جان کا ہے۔ وہ گل جان کے پہلو سے جدا نہ ہوگا" رفیق احمد نے محتاجوں کے شور پر توبہ توبہ کہکر تبسم سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ اور اس حصہ بنگلہ پر اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے دور پا کر شکیلہ کو سینے سے لگا لیا۔ اور جوش بھری ہوئی آواز میں بولا "گل جان کے متعلق کیا ہی۔ میری رائے تو یہ ہے۔ کہ انہیں محتاجین میں سے چند لڑکوں اور چند عورتوں کو چھانٹ کر کچھ ناٹک کا حصہ انہیں ازبر کر دیا جاوے۔ اور مہینے میں ایک بار اس قسم کا تفریحی ناٹک یہاں ہوتا رہے۔ تو بہت اچھا ہے" واہ! واہ!! بے شک بہت عمدہ تجویز ہے۔ میں گل جان کو کل ہی خط لکھونگی" شکیلہ ہیرنگٹن نے جواب دیا۔ پردہ ایک دروازے کے راستہ سے اپنے بنگلے میں گئے۔ جہاں رفیق احمد کی بالا۔ بیوی اور اس کی بہو بھی زاد ہمشیرہ مکھمل قالینوں پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں شکیلہ ہیرنگٹن نے جسم سے برقعہ اتار دیا

اور مسکراتی ہوئی اپنے شوہر کیساتھ دوسرے کمرہ میں گھس گئی۔ جو اس کا استراحت خانہ تھا۔ رفیق احمد نے کمرہ کے دروازہ پر پردہ درست کر کے شکیلہ ہیرنگٹن کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور چکدار ریمپ کے آگے اس کی نیلی خوبصورت نرگاں کی بہار دیکھکر ایک بے تاب بوسہ اس کے معطر ہونٹوں پر دیا۔ شکیلا نے جھلا کر کہا "کوئی آجاویگا۔ بڑے بے چین ہو۔ پھر دونوں عاشق و معشوق دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شکیلہ ہیرنگٹن اپنی اہم بک ۲۲ تصویروں کی کتاب نکالکر والدین اور دیگر آدمیوں کی تصویریں دیکھتی رہی۔ رفیق احمد نے شکیلہ ہیرنگٹن کی چار سال پہلے کی تصویر ہاتھ میں لے لی۔ اور اس کے ہنس مکھ چہرہ پر بوسہ دیکر بولا "اگر تم ہمارے بوسہ سے گھبراتی ہو۔ تو ہم اس تصویر کا منہ چومیں گے" شکیلا نے منہ سرخ کر کے تصویر پر ہاتھ رکھدیا۔ اور آہستہ سے بولی "تم بڑے بے حیا ہو۔ اس تصویر میں میں کنواری ہوں۔ بھلا تم کنواری لڑکیوں کو ایسی گستاخی سے کس طرح بوسہ دے سکتے ہو" رفیق احمد نے بے چین دل سے جواب دیا "تمہاری دوشیزگی میں ہم نے تمہارا منہ چوما۔ لیکن جو بات اب ہے۔ وہ کبھی نہیں تھی" شکیلا ہیرنگٹن نے رفیق احمد کے منہ پر ہاتھ رکھکر جواب دیا۔ تم بڑے بیشرم ہو۔ توبہ توبہ معلوم نہیں تم نے اتنا عرصہ میرے بغیر کس طرح گذارا۔ اتنے میں شکیلا کو لائبریری کی طرف سے کسی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اور اسی لمحہ میں عزیز آسامنے آگئی۔ اور اپنے آپ کو رفیق احمد سے اس قدر قریب پاکر شکیلا کھسیانی ہوگئی۔ عزیز نے منہ سرخ کر کے عرض کیا مس صاحب دعوت ختم ہوگئی۔ خانساماں پوچھتا ہے۔ کہ آپ صاحبوں کے لئے کھانا لگایا جاوے۔ شکیلا نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ اچھا پہلے رفیق احمد صاحب کی والدہ اور ان کے عزیز کیلئے کھانا بھیجدو۔ پھر گول کمرہ میں ہمارے لئے بھی کھانا لگا دو۔ بیلداخبر صاحب کو سب سے پہلے اطلاع کر دو۔ کہ کھانا تیار رہے۔ اور سب آپ کے انتظار

میں ہیں"

عزیز نے ادب سے عرض کیا "بلند اختر تو آگئے گول کمرہ میں ہیں" کامران اور ہدایت علی نہیں آئے۔ ابھی برتن سنگوا رہے ہیں" اور یہ کہکر عزیز آ چلی گئی۔ شکیلہ بیگم نے اُٹھکر رفیق احمد کی والدہ کو کھانے کی خبر دی۔ اور خود معذرت مانگ کر چلی آئی۔ وہ درحقیقت اس وقت کامران اور ہدایت علی کے ساتھ کھانا کھانا چاہتی تھی کیونکہ آج کی دعوت کے ساتھ سسٹر کامران کے معاوضہ کا تصفیہ بھی پیش ہونے والا تھا۔ اسی لمحہ میں یہ دونوں خاوند زوجہ گول کمرہ میں آئے۔ اور بلند اختر نے ایک اخبار سے سر اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا شکیلا نے اپنے جسم پر برقعہ ٹھیک کر لیا۔ اور اُچھلتے ہوئے دل سے بولی "مسٹر بلند اختر میں صبح سے آپ کی منتظر تھی۔ آپ کہاں چلے گئے تھے" بلند اختر نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ "میں گل جان کو آپ کی دعوت میں لانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی والدہ کچھ علیل ہو گئی ہے۔ اس لئے نہیں آسکتی"

"میں سمجھی۔ میں سمجھی" شکیلا بیگم نے جواب دیا۔ لیکن آپ نے اس دعوت کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھائی"

جی نہیں کچھ تکلیف نہیں۔ عین راحت ہے۔ میں چار بجے کی گاڑی سے آگیا تھا۔ اس وقت سے باورچی خانہ کے انتظام میں لگا رہا اتنے میں کامران اور ہدایت علی اندر داخل ہوئے۔ اور پُرتبسم نگاہوں سے بلند اختر کو دیکھا۔ رفیق احمد بلند اختر کو اپنی طرف سے کامران کے آگے اپنے نکاح کے دن پیش کر چکا تھا اور بظاہر اُن لوگوں میں اب مصالحت ہو گئی تھی۔ پانچ منٹ تک دعوت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مزیدار کھانوں کی قابیں سامنے آئیں۔ اور نصف گھنٹے تک کھانے کے دوران میں ہر قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اس وقت کی گفتگو کا ماحصل یہ

تھا۔ کہ بلند اختر ایک ہفتہ کے اندر گل جان سے شادی کرے گا۔ اور اسے اپنے گھر میں رکھے گا۔ دوسرا مسئلہ یہ پیش ہو رہا تھا۔ کہ شکیلہ ہیر گڈشن اور رفیق احمد کب عازم انگلستان ہوں۔

کھانے کے بعد قہوہ اور سگریٹ سگار لگائے گئے۔ اور رفیق احمد احباب سے ایک منٹ کی اجازت لے کر شکیلہ کے استراحت خانہ میں گیا جہاں سے وہ اپنے ساتھ ایک ڈسپیچ باکس لایا۔ اور اسے ٹٹولتا ہوا کہنے لگا۔

مسٹر کامران میں آپ کی عنایات کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ اور مسز رفیق احمد کی طرف سے بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ آپ کو دو ماہ سے زیادہ ہمارے کاموں میں صرف کرنا پڑا۔ اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کی شکر گذاری میں کچھ نذرانہ پیش کریں۔

کامران نے سگار منہ سے نکال کر گہرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اے حضرت کونسی جلدی ہے۔ آپ ولایت سے فارغ ہو آیئے۔ دیکھا جاویگا۔ رفیق احمد نے سر ہلایا۔ اور بکس کے اندر سے چار ہزار کے نوٹ گن کر کہنے لگا۔ میرے عزیز دوست مسٹر کامران آپ کے احسانات کا بار عظیم ایسا نہیں۔ کہ ذرا سی رقم میں اس کے شکریہ میں سبکدوشی حاصل کر لی جاوے۔ یہ چار ہزار روپیہ آپ کی نذر ہے۔ اسے قبول فرمایئے کامران نے اچھلتے ہوئے دل سے نوٹ اٹھا لئے۔ اور منہ سرخ کر کے بولا۔

"جناب آپ نے اس قدر جلدی کیوں کی۔ پھر دیکھا جاتا" شکیلہ ہیر گڈشن نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

مسٹر کامران مجھے آپ سے ابھی اور کام ہے۔ میں اس بنگلے میں ایک محتاج خانہ قایم کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ سر دست ولایت جانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس عرصہ میں آپ ہدایت علی اور مسٹر بلند اختر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مفصل کل عرض کروں گی۔"

میں آپ کے لئے ہر طرح کا کام ہاتھ میں لے سکتا ہوں" کامران کے منہ سے نکلا۔

ادھر ہدایت علی اور بلند اختر نے رضامندی ظاہر کی شکیلہ بیگم تو گل جان کا دل اشتیاق سے شگفتہ ہو گیا۔ اور اس نے بلند اختر کی طرف محبت بھرے دل سے دیکھ کر کہا۔

مسٹر بلند اختر بہتر ہوگا۔ کہ آپ گل جان سے اسی بنگلہ میں نکاح کر لیں میں یہ بنگلہ مسٹر رفیق احمد کے نام لکھ دونگی۔ اگر ہمارے کام میں ہاتھ بٹانے پر راضی ہونگے۔ تو یہ بنگلہ آپ اور گل جان کو دیدیا جا ویگا۔ اور اس محتاج خانہ کا انتظام آپ کے ہاتھ میں رہیگا جس کے لئے آپ کو معاوضہ صلہ خدمات ملتا رہے گا"

بلند اختر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ادھر رفیق احمد نے دھڑکتے دل سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ بلند اختر کو اس کام سے کوئی عذر نہیں۔ اور نہ بنی نوع انسان کی دستگیری سے بہتر کوئی کام ہو سکتا ہے۔ گل جان بھی اس مقام پر بہت اچھی طرح زندگی بسر کرے گی۔ اور محتاجوں کے بچوں اور لڑکیوں کو پڑھا سکے گی"

نیز خانگی تھیٹر وغیرہ کے لئے اس سے زیادہ موزوں مقام ملنا دشوار ہوگا"

بلند اختر کے چہرہ پر تبسم ظاہر ہوا۔ اور اس نے دھڑکتے دل سے جواب دیا "گل جان واقعی تھیٹر وغیرہ پر جان دیتی ہے۔ وہ اس تجویز پر ضرور راضی ہوگی۔ مجھے بسر و چشم منظور ہے"

اور شکیلہ و رفیق احمد کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور اپنی تجویز کو عام طور پر منظور اور یقین سمجھ کر انہیں اس فرحت اور مسرت کا خیال آگیا۔ جو

ان کے ہاتھوں سے بالواسطہ محتاجین کو نصیب ہو سکے گی "

درحقیقت اس انسان سے زیادہ نیک۔ اصلی مفید اور سرگرم زندگی کسی آدمی کی نہیں ہو سکتی۔ جو اپنے قلم سے دم قدم یا دم سے بنی نوع انسان کی فلاح میں کوئی حصہ لے۔ رفیق احمد اور شکیلا ہیرنگٹن نے اتنے دلوں کو ٹھنڈا کیا۔ کہ اُس کا اجر اُنہیں دین و دنیا دونوں میں شاد کام اور بامراد رکھیگا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ تحقیق اللہ نہیں ضایع کرتا۔ بدلہ نیکی کرنے والوں کا چناں بحر عمیق است عشق ساقی۔ پایاں آمدایں دفتر حکایت ہم چناں باقی فقط

خاتمہ بالخیر

ذخیرہ صنعت و حرفت کا مبتدی و دلتمند بنانیوالی کتابیں حفظ صحت و طب

ذخیرہ صنعت وحصہ اول عہ
" " حصہ دوم عہ
" " حصہ سوم عہ
" " حصہ چہارم عہ
" " حصہ پنجم عہ
" " حصہ ششم عہ
" " حصہ ہفتم عہ
" " حصہ ہشتم عہ
چمڑا جاقو بنانا ۸ر
دباغت ۸ر
علی بابوں سازی عہ
رنگائی چھپائی ۸ر
روشنائی ۱۰ر
آتشبازی ۱۲ر
سیمنٹ ۸ر
جلد داری ۸ر
ہر قسم کے روغن روڈالنے
مصنوعی دانتوں اور انکے لگانے ۸ر
مٹی کے برتنوں ۶ر
بلاسٹک چڑھانا

کمل مرغی خانہ عہ
تربیت الدجاج ۸ر
موم بتی بنانا ۸ر
بسکٹ کا کارخانہ ۸ر
کلید صنعت حصہ اول عہ
قوانین عثمانی عہ
کاغذ سازی ۸ر
گنجینہ جواہرات ۸ر
آئینہ جواہرات عہ
روزنامچہ کتاب الاقتضا فی الاقتضا عہ
فتوح الیمن عہ
الکلینڈر اسلام ۸ر
سفرنامہ عرفی عرب عہ
تاریخ دربار دامرسر عہ
سیر و تفریح عہ
شرح عقائد نسفی عہ
خالد بن ولید عہ
مفتاح البلاغت عہ
مذاہب اسلام عہ
معجزات القرآن ۱۰ر
حج بیت اللہ اسلام عہ
فیض الرحمن فی تسہیل القرآن عہ
کشف الستور ۶ر
رسالہ حل القضاء ۱۰ر
پیغمبر عہ
تاریخ نبی عثمان عہ
حضرت ابوبکر صدیق

حضرت عمر عہ
تاریخ الحجاز ۸ر
تاریخ افریقہ کی عہ
حالات ایران عہ
سفرنامہ یمن عہ
الکلینڈر اسلام ۸ر
روزنامچہ ہمایوں عہ
نجیب بنگلہ
تاریخ ایران قدیم عہ
اقوام ہندی عہ
بورڈ والا کا کچھوا ۱۲ر
نامہ خسروان عہ
سلسلۃ الملوک ۸ر
روزنامچہ ہمایوں عہ
نجیب بنگلہ
تاریخ عہ
حیات امیر ۸ر
نور الایمان عہ
مذاہب اسلام عہ
عجیب و غریب معلومات
علم ہندسہ ۸ر
خط تقدیر ۱۲ر
رسالہ فن عطاری ۱۰ر
نوشتہ تقدیر ۱۲ر
دنیا کی عجیب الخلقتیں
دنیا کے عجیب و غریب مذاہب
عجائب دنیا عہ

حفظ صحت و طب
تجربات حفظ صحت یعنی وہ
مفیدی اور مجرب نسخے جو بیشمار اخبار
نفیہ وار کے حفظ صحت کے
کالموں میں گاہ گاہ چھپتے رہے
عمدہ دی میں شائع ہوئیں
اور حصوں میں جمع کئے گئے ہیں
مجربات حفظ صحت حصہ اول عہ
" " حصہ دوم عہ
" " حصہ سوم عہ
" " حصہ چہارم عہ
" " حصہ پنجم عہ
" " حصہ ششم عہ
" " حصہ ہفتم عہ
" " حصہ ہشتم عہ
" " حصہ نہم عہ
قوت سماعہ اور کان ۱۰ر
لکنت اور اسکا علاج ۶ر
دراز گوشوں کو ہر فن کی تعلیم ۳ر
طب کیمیائی ۸ر